

حکایت

بہمنیت

بین یو، ساتنگ

فختر صدیقی، ترجمہ

آزاد بکڈ پو - انبالہ

قیمت — ۱۲ روپے آٹھ آنے

Presented By

S. P. JOLLY

(Jolly Glass Industries)

A-87, Gujra Wala Town Part-I,

DELHI - 110033

ترتیب

باب اول طلوع

۹۳ ۵. مقبولہ جسم

۱۰۰ ۶. ذہن انسانی

باب چہارم
انسانیت پرستی

۱۱۶ ۱. انسانی شرف اور وقار

۱۱۸ ۲. تجسس اور انسانی تہذیب کی ابتدا

۱۳۰ ۳. انسان کے سونے

۱۳۹ ۴. زندہ دلی اور ظرافت

۱۴۹ ۵. مزاج کا تون

۱۵۸ ۶. انفسراو میت

باب پنجم

زندگی کو کون زیادہ جتن اٹھا سکتا ہے

۱۶۲ ۱. اپنی تلاش

۱۶۸ ۲. جذبہ

۱۹۲ ۳. لاد تریس کی تعلیم

۲۰۲ ۴. سی. سی. کی تعلیم

۲۰۹ ۵. زندگی کا شیدا بنی

(۱) زندگی کا راستہ

(۲) ایک نیم سائنسی فارمولا

(۳) آوارہ گرد ویشالی انسان

باب دوم
انسان کیا ہے؟

(۱) انسانیت کے بارے میں سی

یونانی اور چینی نقطہ نظر

(۲) خاک کا پتلا

(۳) جسم اور روح

(۴) انسانیت کے باہر حیاتیاتی نظریہ

(۵) حیاتیاتی انسانیت - ایک نظم

باب سوم -

ہمارا حیوانی ورثہ

(۱) بندر والی داستان

(۲) انسان کی تخلیق

(۳) انسان فانی ہے

(۴) ہمارا پیٹ

۶۴

۶۹

۷۱

۷۹

باب ششم زمی کی کھیتی

- ۲۲۲ (۱) خوش رہنے کا سلا
- ۲۲۸ ۲۔ افسانی مسرت
- ۲۳۶ ۳۔ مسرت کے ۲۲ ابحاث
- ۲۴۶ ۴۔ مادہ پرستی
- ۲۵۲ ۵۔ ڈبی یا اردھانی مسرت

باب ہفتم فطرت کے مزے

- ۲۶۲ (۱) کائنات کا واحد لیکن جاندار
- ۲۶۸ (۲) فطرت کا چینی نظریہ
- ۲۰۲ (۳) بیکاری ایک مسلک
- ۱۷۹ (۴) دنیا ہی ایک بہشت ہے
- (۵) قسمت کیا ہے

۲۹۰ ۱۶۔ تین امر کی عیوب

باب ششم گھر گزشت کے مزے

- ۳۰۱ (۱) جسم کا قاضی
- ۳۰۷ (۲) بچر اور کنوار پن
- ۳۲۰ (۳) جنسی کشش
- ۳۳۰ (۴) چینی گھر کی تصویر

۳۴۶

۵۔ پروتار بڑھاپا
باب ہفتم
خفینے کے مزے

۳۶۴

۱۔ ایتر

۳۷۱

۲۔ گرسی

۳۷۷

۳۔ گفتگو

۳۹۳

۴۔ چپے اور دوسری

۴۰۹

۵۔ لہیا کو لوزو شیو

۴۲۳

۶۔ شراب

۴۳۶

۷۔ غذا اور دوا

۴۴۹

۸۔ شرب کے کچھ عجیب دستور

۴۵۴

۹۔ مغزلی لباس

۴۶۴

۱۰۔ مکان اور اس کی آرائش

باب دہم فطرت کے مزے

۴۸۲

(۱) جنت گم گشتہ

۴۸۹

(۲) عظمت آدم

۴۹۳

(۳) درد چینی خواتین

۵۰۷

(۴) چپائیں اور درخت

۵۲۳

(۵) بھول اور بھولوں کی ترتیب

۵۳۴

۶۔ گلدان

(۱) چانگ چاؤ کے نولے ۵۴۷

باب سیر دہم
خدا کے نام

باب یازدہم
سفر کے فرے

۶۰۰

(۱) مذہب کا احیاء

۶۰۶

(۲) اپنی کہانی

(۱) سیر و سیاحت ۵۶۸

۲۔ جنگ لیانڈرے کے سفر ۵۸۴

باب چہار دہم
سوچنے کا فن

باب دوازدہم
ثقافت کے فن

۱۔ سوچ میں انسانیت پرستی کی کیفیت ۷۶

۲۔ عقل سیم کی طرف واپسی ۷۱۵

۷۲۴

۳۔ معقولیت
تعمیر

(۱) علم اور نذوق سلیم ۶۳۲

(۲) آٹھ، تفریح اور شخصیت ۶۳۰

(۳) پڑھنے کا فن ۶۳۶

(۴) لکھنے کا فن ۶۴۱

زندگی کا مقصد — جینا ۷۳۴

باب اول

طلوع

- (۱) زندگی کا راستہ
- (۲) ایک نیم سائنسی فارمولا
- (۳) مثالی انسان - آوارہ گرد

زندگی کا راستہ

آئینہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ ایک چینی کا نقطہ نظر ہے
 میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں زندگی اور کائنات کے بارے میں وہی نقطہ نظر
 پیش کرنے پر مجبور ہوں جو بہترین چینی دماغوں اور دماغوں کا نقطہ نظر ہے اور جسے
 انہوں نے چین کی لوک کہانیوں اور چین کے ادب میں پیش کیا ہے۔ میں جانتا
 ہوں کہ یہ نقطہ نظر ایک بے عمل فلسفہ ہے جسے کابا اور بے عمل زندگی نے جنم دیا
 تھا۔ میں بھی یہ جانتا ہوں کہ یہ فلسفہ اس زمانے کا فلسفہ ہے جو ہمارے زمانے
 سے بہت مختلف تھا۔ پھر بھی مجھے احساس ہے کہ زندگی کے بارے میں یہ نقطہ نظر
 بنیادی طور پر درست اور سچا ہے۔ انسان ہر جگہ اور ہر دور میں ایک ہی ہے۔ زندگی
 اور نسل کے امتیازات محض اوپر کی ہیں۔ جو بات ایک ملک میں بسنے والوں
 کے دلوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہی بات دوسرے ملکوں کے باشندوں کے
 دلوں کی بات ہوتی ہے۔ میں آئینہ صفحات میں زندگی کا وہ نقطہ نظر پیش کر رہا ہوں
 جس کی تشکیل چینی شاعروں اور غزلوں نے اپنی دانش اپنی حقیقت پسندی اور اپنے
 ذوق سلیم سے کی تھی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ حصہ جو اہم دین سے
 بے تعلق رہا اس کا سارا حسن آپ پر ظاہر ہو جائے۔ زندگی کا سارا موزون گواز
 زندگی کا سارا حسن اس کی ساری اہمیت اور سارا مزاج آپ کے سامنے آجائے
 اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے نقطہ نظر سے لکھا جائے جنہیں انسانی زندگی کی مجبوریوں

اور پابندیوں کا شدید احساس تھا مگر جو یہ بھی جانتے تھے کہ انسانی زندگی ایک بادقار
تجزیہ ہے اور جو ہا وقت انسانی زندگی کی عمدہ مثال بھی تھے۔

چینی فلسفی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں کے بجائے صرف ایک
آنکھ بند کر کے سینے دکھتا ہے۔ وہ محبت بھری نظروں سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے
اور ایک سیٹے زہر خند سے زندگی پر نگاہ کرتا ہے یعنی فلسفی اپنی تلخ گوئی میں گہری
دلجواری کی آمیزش کرتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ زندگی کے سنے دکھتا دکھتا جاگم
اٹھا پھر سنے دیکھنے لگے۔ یعنی فلسفی اپنے آپ کو اس وقت زیادہ زندہ محسوس کرتا ہے
جب وہ سینے دکھ رہا ہو۔ بیداری کے عالم میں وہ اپنے آپ کو اتنا زندہ نہیں
سمجھتا اس طرح وہ جیتی جاگتی زندگی کو بھی مسیوں کی دنیا بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک
آنکھ بند رہتی ہے اور ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔ اپنی اس ایک بند اور ایک
کھلی آنکھ سے وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ اس کے گرد ہوا ہے اس میں اکثر باتیں کتنی بیکار
اور بے مصروف ہیں۔ اکثر معاملات میں اس کی اپنی کوششیں کس قدر بے سود ہیں
پھر بھی وہ اتنا محوش متوجہ رہتا ہے کہ اپنے کاموں اور اپنی کوششوں کو برابر جاری
رکھے۔ چینی فلسفی کو شاید دنیا بھر کی تانگیوں اور نا کامیوں سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ وہ
زندگی کے بارے میں کوئی خوش فہمی رکھنے کا روادار ہی نہیں۔ اسے ایسی کسی کا سامنا
ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لمبی جوڑی اُسیوں سے نہیں ہی نہیں۔ اس طرح وہ اپنی
روح کو ہمیشہ آزاد رکھتا ہے۔

چینی ادب اور فلسفے کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوا کہ چینی
ثقافت کا نصب العین اس کی آنکھ کا تارا ایک ایسی ہستی ہے جس میں زندگی کے بانٹے
میں ایک علیحدگی ایک آزاد روی ہو۔ ایسی آزاد روی اور علیحدگی جو باطل و بھروسوں

اور خوش فہمیوں سے نجات پر مبنی جو جس میں لگاک اور لگاک کا شائبہ نہ رہے کیونکہ کسی
 سے انسان میں بلند خیالی پیدا ہوتی ہے اور بلند خیالی کی بدولت ہم زندگی
 کی منزل رولاری اور خوش طبعی سے طے کر سکتے ہیں۔ بلند خیالی میں وہ شے ہے جس
 کی بدولت ہمیں شہرت اور کامرانی اور دولت کا نشہ آپے سے باہر نہیں کر سکتا بلند
 خیالی کی بدولت ہی ہم جو کچھ سر پر پڑے خوشی سے بھیلے لیتے ہیں۔ زندگی سے لگاؤ یا
 لگ نہ رکھنے۔ سے انسان میں آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے آزاد دلی کی محبت
 پیدا ہوتی ہے۔ اس آزاد دلی اور لاپاہلی پن سے آخر کار زندگی کی گہری مسترتیں وجود
 میں آتی ہیں۔

یہ جتنا بے کار ہو گا کہ میرا فلسفہ اہل مغرب کے لئے بھی درست ثابت ہو گا
 یا نہیں۔ اہل میں مغربی زندگی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ مغربی
 لوگوں کے رہنے والے ہوں۔ آپ کی افتاد و طبع مغربی ہو اور آپ کا رویہ آپ کے اعصاب
 وہی ہوں جو مغربیوں کے میں ہیں جانتا ہوں کہ کئی لوگوں کے اعصاب ایسی بہت سی
 باتیں برداشت کر سکتے ہیں جنہیں برداشت کرنا چینیوں کے لئے ممکن نہیں چینیوں بھی
 ایسی بہت سی چیزیں برداشت کر لیتے ہیں جو امریکیوں کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اور
 یہ ٹھیک بھی ہے ہمیں پیدا انہی اختیار سے مخالف ہونا ہی چاہیے۔ پھر بھی یہ سارا اہل
 اپنی جگہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا یہ محض افسانہ فیہات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ امریکی زندگی کی
 ساری بھاگ دھاڑ اور مصروفیت میں یہ حسرت یہ خواہش موجود ہے کہ کاش ہم بھی کبھی اونچی
 پڑوں کے سائے میں ازم گھاس پاتا رام سے لیٹ سکیں اور کسی سہ پہر کو قطعاً
 کوئی کام نہ کریں۔ جب امریکہ میں یہ معرہ سنتا ہوں کہ اٹھو اور کوئی کام کرو تو مجھے بڑی
 خوشی ہوتی ہے یہ معرہ اس بات کی علامت ہے کہ امریکی لوگوں کا ایک عقلمند طبقہ

خوالوں میں کھو جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں اٹھ کر کام کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے۔
 یہ بڑی اچھی علامت ہے۔ گویا امریکہ کے لوگ ایسے بڑے بھی نہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ
 ہے کہ امریکی اس مسئلے میں کم ہفت صرف کریں گے یا پورا اٹھان کے لئے یہ کیڑا کر لیکن
 ہوگا؟ شاید امریکہ کے لوگوں کو بے کار وقت گنوانے کے الفاظ سے ڈرگتا ہے وہ
 ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص مصروف رہتا ہے پھر بھی امریکہ کے یہ منہ بول اور
 مصروف لوگ حیوان بھی ہیں اور حیوان کی طرح وہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اعصاب
 اور گچھوں کو آسائش دے سکیں ریت پر آرام سے لوٹ سکیں یا ایک ہاتھ کا تکیہ
 بنائے، ایک ٹانگ پھیلائے آرام سے لیٹ سکیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر سائنس کی
 پینٹی پینٹ کینیوشنس کے مشہور شاگرد سے کسی طرح تعلق نہیں کیونکہ اس میں بھی
 یہی خوابیں تھیں۔ انہیں خوبیوں کی بدولت وہ کینیوشنس کو محبوب تھا مگر میں چاہتا ہوں
 کہ تمدن دنیا کے لوگ اپنی ان دلچسپیوں کا دیانت داری سے اظہار بھی کریں اور اقرار
 کریں کہ یہ باتیں اچھی ہیں۔ وہ دفتر میں کام کرتے ہوئے نہیں بلکہ ریت پر بے کار بیٹھے
 بیٹھے ہمیں زندگی آخر کتنی حسین کتنی دلانور ہے!

اب ہمارے پیش نظر زندگی بسر کرنے کا ذہن اور ذہنگ اور وہ فلسفہ ہوگا جو
 مجموعی حیثیت سے چینی قوم کی دانش کا آئینہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی خوبیوں اور برائیوں
 دونوں اعتبار سے یہ فلسفہ دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ یہ زندگی کا ایک ایسا
 اوکھا فلسفہ ہے جسے چینوں جیسی اٹوٹھی قوم نے اپنا پایا ہے کہا جاتا ہے کہ کسی
 قوم کی ثقافت اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک مسلمہ حقیقت ہوتے ہوئے
 بھی بیانات بڑی فرسودہ سی ہے۔ بہر حال چینی ذہن نسلی طور پر مغربی ذہن سے مختلف ہے
 تاریخی اعتبار سے بھی چینی ذہن مغربی تمدن سے بہت الگ جگہ ہے لہذا ہمیں
 قدرتی طور پر یہ توقع رکھنی چاہیے کہ چینی ذہن زندگی کے مسائل کے بارے میں ہمیں نئے

اور ان کے جوابات مہیا کر سکے گا زندگی کے مسائل کو سمجھنے کے لئے نئی راہیں سمجھا سکیگا اور اس سے بھی خوب تر یہ بات ہوگی کہ چینی ذہن ان مسائل کو نئے انداز سے پیش کر سکے پر بھی قادر ہوگا ہمیں خوب معلوم ہے کہ چینی ذہن کی صلاحیتیں کیا ہیں اور اس کے عجیب کیا ہیں۔ یہ باتیں چین کا تاریخی مافیما ہی نہیں بتا چکا ہے چین کے آرٹ کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر چینی سائنس بے حقیقت ہے چینی قوم عقل سلیم اور درست سے مالا مال ہے مگر منطق سے قریب تر یہ کوئی ہے چینی قوم زندگی کے بارے میں بہت کچھ کہتی سنتی ہے مگر کوئی متکلم فلسفہ آج تک ترتیب نہیں دے سکی۔ عام طور پر دنیا کے لوگ جانتے ہیں کہ چینی ذہن بڑا عمل پسند اور ٹھوس ہے۔ مگر چینی آرٹ کے مشا قوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ چینی ذہن بے حد حساس اور نازک ہے پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ بھی جانتے ہیں کہ چینی ذہن نہایت درجہ شاعرانہ اور فلسفیانہ ہے اور یہ تو مشہور ہے ہی کہ چینی لوگ فلسفیانہ اور حکیمانہ طریقے پر واقعات کا اثر لیتے ہیں۔ گویا چینی لوگوں نے اگر نامور فلسفی پیدا نہیں کئے تو ساری کی ساری قوم فلسفی ضرور ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ اگر کوئی قوم چند ایک اعلیٰ پائے کے فلسفی پیدا کرے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اگر ساری کی ساری قوم کا انداز فکر حکیمانہ ہو تو اس کی مثال ملنی ہی ہے۔ یہ بہت ہی بڑی بات ہے کہ چینی قوم میں مستوری کے مقابلے میں فلسفیانہ صلاحیت زیادہ ہے اور اگر چینی لوگ بے حد مستور اور کارکن ہوتے تو ہزاروں برس تک قوم کی حیثیت سے زندہ بکھی نہ رہ سکے کیونکہ ہزاروں برس تک جو قوم مستعد اور چاق ہو بسند رہتی ہے اسے اس کے خون کا وہ باؤ ڈھکی تباہ کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ مغربی اقوام میں تو بے گلوں کو پاگل خانے میں رکھا جاتا ہے لیکن چین میں دیوانے اتنے نایاب اور اتنے غیر معمولی سمجھے جاتے ہیں کہ ہم چینی لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں (فارمن میں سے جو حضرات

چینی ادب سے لائق ہیں وہ اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں) — میرا مقصد اور
 مدعا بھی یہی ہے۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ چینی لوگوں کا فلسفہ حیات واقعی بڑا ہلکا
 پھلکا اور نشاطیہ ہے۔ ان کا حکیمانہ انداز اس کے فلسفہ حیات ہی سے ظاہر ہے۔ —
 چینی فلسفہ حیات حواہی اور دانشمندانہ بے حد نشاطیہ ہے۔

۲۔ ایک نیم سائنسی فارمولا

آئیے اس چینی ذہن کا تجزیہ کیا جائے جس نے چین کے اس فلسفے کو جنم دیا۔
چینی ذہن بے حد حقیقت پسند ہے مگر نصب العین کا اتنا قائل نہیں خوش طبعی کا شدت
سے دلدلاہ ہے اور زندگی اور فطرت کے سلسلے میں شاعرانہ احساس سے مالا مال ہے۔
 عام طور پر دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں ایک تو وہ جو حقیقت پسند ہیں اور
 دوسرے وہ جو کسی نصب العین کے پرستار ہیں یا مثالیت پسند ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حقیقت
 پسندی اور کسی نصب العین کی پرستاری ہی سے انسانی ترقی نے شکل پائی ہے۔ یہی دو
 دو قوتیں ذاتی معاشرتی تو عمومی غرض تمام انسانی سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے دست و
 گریباں رہتی ہیں۔ نوع انسان کی حقیقی ترقی انہیں دو قوتوں کے مناسب تقادد اور متعاقب
 آمیزش سے ممکن ہے۔ انسانیت کی عمارت میں نصب العین کی وہی حیثیت ہے جو مٹی
 کے بن بنانے میں پانی کی ہے۔ پانی کی بدولت مٹی میں نرمی اور چمک پیدا ہوتی ہے لیکن
 پانی کی مقدار کا حساب ضرور رکھنا چاہیے۔ اگر پانی کم ہو گیا تو بت ٹوٹ جائے گا اور اگر
 پانی زیادہ ہو گیا تو مٹی اس قابل نہیں رہے گی کہ اسے کوئی مستحکم دی جا سکے۔ یہ بالکل
 کچھڑن کر رہ جاتے گی۔ پانی اور مٹی کی بہترین آمیزش کہ مثالاً اگر یہ قوم ہے انگریز

قوم میں تعیقت پسندی اور نصب العین دونوں مناسب مقدار میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس ایسے ملکوں کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جہاں آتے دن انقلاب بپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیر میں بعض ایسے غیر ملکی اور اجنبی نصب العین راہ پائے ہیں جو پوری طرح قوم کے فزاج میں راجح نہیں کے اور اس لئے اس قوم کا خیر تینا سبب اور اعتدال کی سطح قائم نہیں رکھ سکا۔ ان کی مٹی بھی کھڑن کر رہ گئی ہے۔

بے سوچی سمجھی مبہم قسم کی مثالیت پسندی ہمیشہ دوسرے کے ذائقہ کا نشانہ بنا کرتی ہے۔ مثالیت پسندی اگر حسد سے بڑھ جائے تو انسانیت کے لئے خطرہ بن سکتی ہے کیونکہ اس طرح انسان کو خیالی نصب العین کے پیچھے فضول سرگرداں رہتا ہے اور اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اگر کسی انسانی معاشرے یا کسی قوم میں خیالی نصب العین کے بہت سے پرستار موجود ہوں تو وہ انسانی معاشرہ آتے دن نئے نئے انقلاب سے دوچار رہے گا ایسا انسانی معاشرہ ایسے مثالیت پسند مبالغہ بازی کی طرح ہے جو ہر تیسرے نہیں مکان بدلتے رہے کیونکہ کوئی گھر مثالی نہیں ہو سکتا۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ جہاں کہیں آپ کا قیام نہ ہو وہ جگہ ہمیشہ مثالی اور عمدہ لگتی جاتی ہے محض اس لئے کہ آپ وہاں نہیں رہتے۔ مگر خوش قسمتی سے انسان کو خدا نے ذوق سلیم اور خوش بھی عطا کی ہے اور میرے نزدیک ذوق سلیم کو قدرت نے کامیاب بنایا ہے کہ انسان کے خوابوں پر کھٹے پینے کرتا ہے ان خوابوں کو خدا دنیا کے حقائق سے بھی روتنا نہیں کرتا۔ رہے۔ ہوائی قلعے بنانا اور سینے پکھنا انسان کے لئے ضروری ہے مگر اہم تر بات یہ ہے کہ انسان اپنے خیالی پلاؤ اور اپنے سونوں پر خود نہیں بھیس سکتے۔ یہ صلاحیت قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے اور چینی اس

عیب سے مالا مال ہیں۔

اس ذوقِ سلیم اور اس خوش طبعی کا احساس حقیقت یا حقیقت پسندی سے بڑا گہرا ناتا ہے۔ بعض اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی مسخرہ یا پھبتی باز مشائیت پسند کا بڑی طرح مذاق اڑاتا ہے اور بڑی بے رحمی سے ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا مذاق نظامِ عالم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے اسی مذاق کی بدولت مشائیت پسند حقائق کی بھوس دلواردوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے سے بچ جاتے ہیں اس کے علاوہ اس کا تسمیر پر خوش مشائیت پسند کے اعصاب کا تناؤ بھی گھٹا کر دیتا ہے اور اس کی زندگی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ نصب العین کے پرستاروں کو مایوسی کا راستہ دکھا کر ظریفان کی موت کو نسبتاً آسان بنا دیتا ہے۔ ظریف کا تو کام یہ ہے کہ وہ مرتے ہوئے مریضوں کو بڑے قرینے سے ان کی موت کی خبر سناتے۔ بعض اوقات تو ظریف کی رسمی سرزنش مرتے ہوئے مریض کی زندگی کو موت کے پنجے سے چھڑا بھی لیتی ہے۔ اس دنیا میں نصب العین پسندی اور زندگی سے مایوسی چھٹی دامن کا ساتھ رکھتی ہیں۔ اس طرح زندگی بے رحم قرار پاتی ہے نہ کہ وہ ظریف جس کا کام صرف یہ ہے کہ ہمیں زندگی کے حقائق کی تلخی اور بے رحمی کی یاد دلاتا ہے۔

• میں نے بارہا غور کیا ہے کہ انسانی ترقی اور تاریخی تبدیلیوں کے اندر چڑھاؤ کا کوئی نارمولا کوئی قاعدہ وضع کیا جاسکے۔ یہ قاعدہ کچھ اس طرح کا ہے۔

اصلیت - خیالی پلاؤ = جانور۔

اصلیت + خیالی پلاؤ = دل کی خلش (جسے مشائیت پسندی یا نصب العین کی

پرستاری کہ یجئے)

اصلیت + خوش طبعی = حقیقت پسندی (جسے کو قدرت پسندی کہا جاتا ہے)

خیالی پلاؤ + خوش طبعی + تعصب اور کٹر پن!

خیالی پلاؤ + خوش طبعی + حلقہ دام خیال!

خیالی پلاؤ + حقیقت پسندی + جمع خوش طبعی = دانش مندی

گو یاد دانش مندی کہ ہو غور و فکر کی معراج ہے، یہ ہے کہ خیالی منصوبوں یا اپنی مشابہت پسندی کو خوش طبعی اور ذوقِ سلیم سے معتدل بنایا جائے اور اس میں حقیقت پسندی کی آمیزش بھی ہو۔

یہ فارمولہ سائنسی نہیں، کچھ نیم سائنسی سا ہے۔ مگر اس کی روشنی میں ہم مختلف قوموں کے کردار کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے دنیا کی بعض بڑی قوموں کے قومی کردار کے سلسلے میں کچھ ایسے فارمولے تیار کئے ہیں۔ جیسے کہ علمِ کیمیا کی کتابوں میں ملتے ہیں یہ فارمولے ذاتی ہیں۔ ان کا کوئی ثبوت ہے نہ ثابت کرنے کا ذریعہ۔ آپ چاہیں تو ان سے اختلاف کر سکتے ہیں! انھیں بدل سکتے ہیں۔ ان میں کچھ گٹھا بڑھا سکتے ہیں۔ ان فارمولوں کا اشاریہ

یہ ہے:-

ح - حقیقت پسندی - خ - خیالی منصوبے باندھنا - طرانت کو ظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اب اس میں احساس کا جزو ملاتی جسے "سچی" سے ظاہر کیا جائیگا یہ تو ہوتے فارمولے کے اجزاء۔ اب ان کی مقدار یوں ظاہر کی گئی ہے کہ ۴ کا عدد اس کی جزو کی بہت زیادہ مقدار کو ظاہر کرے گا، ۳ کا عدد کافی مقدار، ۲ کا عدد خاصی مقدار میں اور ۱ کا عدد کم کو ظاہر کرے گا۔ اس ہدایت کے پیش مندرجہ ذیل قوموں کے قومی کردار کا نیم کیمیا ہی تجزیہ پیش خدمت ہے۔ یاد رہے کہ انسان اور قومیں اپنے بنیادی عناصر کے تقاضے کے مطابق ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ میرے لئے یہ مشاہدہ کرنا ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہا ہے کہ یکساں حالات میں مختلف قومیں

کس کس طرح، کیا کیا کرتی ہیں۔ اب قوموں کے کردار کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثلاً عربوں کے
 کہ حقیقت ہندی، خیالی منسوبے، زندہ دلی اور خوش طبعی اور لطیف احساسات کو ملا دیا
 جائے تو ایک انگریز بنتا ہے۔
 ۱ تو لے ۲ تو لے ۳ تو لے ۴ تو لے
 ایک نولہ

ج	خ	ظ	س	=	انگریز
ج	خ	ظ	س	=	فرانسیسی
ج	خ	ظ	س	=	امریکی
ج	خ	ظ	س	=	روس
ج	خ	ظ	س	=	جاپانی
ج	خ	ظ	س	=	چینی
ج	خ	ظ	س	=	جرمن

مجھے اعتراف ہے کہ میں اٹالویوں، ہسپانویوں اور ہندوستانیوں کو قریب سے
 نہیں جانتا۔ اس لئے میں ان قوموں کے بارے میں کوئی فارمولا نہیں بنا سکا۔ خود مندرجہ
 بالا فارمولے بھی کچھ مشکوک سے ہیں، پھر بھی ان کی وجہ سے مجھ پر اعتراضوں کا طوفان اُٹھ گیا
 شاید یہ فارمولے مستند ہونے کے بجائے اشتعال انگیز سمجھے جائیں گے۔ میں اتنا دعوہ کر
 سکتا ہوں کہ جوں جوں ان قوموں سے میری واقفیت بڑھتی جائے گی میں اپنے فارمولوں میں
 (اپنے لئے) کچھ دودھ بھرا کچھ برسم کر لوں گا۔ اب تک جو کچھ ہے یہی ہے۔ یعنی یہ میرے
 علم اور میری جہالت دونوں کی یادداشت ہیں!

مندرجہ بالا فارمولوں کے بارے میں کچھ باتیں واضح کرنی ضروری ہیں۔ پہلے یہ دیکھیں
 گے کہ میں نے ان فارمولوں کے مطابق چینیں اور فرانسیسیوں کو بہت حد تک مماثل
 ٹھہرایا ہے کم سے کم ان دونوں میں ظرافت اور شدت احساس یکساں ہیں۔ ان فرانسیسیوں

کی ٹھکی ہوئی کتابیں پڑھنے اور یہ بھی دیکھئے کہ وہ کھانا کس طرح کھاتے ہیں تو آپ پر یہ مبالغہ
 واضح ہو جائے گی۔ فرانسسیسی قوم میں ذرا تلون زیادہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسسیسی
 نصاب العین کے رسیا ہوتے ہیں اور اس کی مثالیت پسندی کی بنا پر نظریات کے
 بھی بے حد ولادہ (ذرا فرانسسیسی قوم کی ادب اور فنون لطیفہ اور سیاست کے بارے میں
 وہ تمام تحسیر یکس ذہن میں لائے جو آئے مکتبہ بگڑتی تھی مگر چینی اور فرانسسیسی
 کے کرداری بگڑنے سے میں آپ دیکھیں گے کہ میں نے چینی کردار کے عناصر میں
 حقیقت پسندی کو شدید یعنی چار کے عدد سے ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ چینی بہت زیادہ
 حقیقت پسند ہوتے ہیں مگر ان کی زندگی کے طریقے یا میاں میں جو بہت کم تبدیلی
 ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خیالی منصوبہ بندی کی مقدار صرف ان سے چینی لوگوں
 میں احساس کی لطافت بھی بے حد زیادہ ہے۔ اور چینی شاعری چینی نثر اور چینی تصویریں
 اس کا ثبوت ہیں۔ جاپانی اور جرمن لوگ ظرافت کی کمی کی وجہ سے ایک دوسرے
 سے ملتے جلتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان فارسیوں میں کسی قوم میں کسی خصوصیت کی مقدار
 صفر سے ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ چاہے چینی قوم کی خیالی پرستی ہی کیوں نہ ہو۔ — یہ سارا
 مدافعاتی ہے کیونکہ کسی قوم کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں فلاں فلاں
 خصوصیت سرے سے موجود ہی نہیں۔ اسی لئے میں نے اپنے فارمولے میں لکھا ہے
 کہ جرمنوں اور جاپانیوں میں ظرافت کی مقدار صفر (۱) صفر نہیں! اور میرا خیال ہے
 کہ میں نے ٹھیک لکھا ہے۔ اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں محض اسی نوع کے باعث جو من اور
 جاپانی دونوں قومیں جیکل بھی اور باغی میں بھی سیاسی طور پر ہمیشہ تکلیف اٹھاتی رہی
 ہیں۔ — ”دقت کے تقاضے“ اور منطقی ضرورت پر کچھ اعتقاد رکھنا ضروری
 سہی مگر اپنے مقصد اپنی منزل کی طرف ناک کی سیدھ میں بھاگ اٹھنا بعض اوقات

نزل سے ڈوری کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ جس چیز پر آپ کا اعتقاد ہو وہ اتنی ضروری نہیں ہوتی اصل چیز یہ ہے کہ کتاب کا اعتقاد کس نوعیت کا ہے اور آپ اس اعتقاد کو جائز عمل پہناتے کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں! — جاپانی کے تو انگریزوں میں نے خیالی منصوبوں اور تصورات کو ریخ سے ظاہر کیا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ جاپانی قوم اپنے شہنشاہ اور حکومت کی اندھا دھند وقار ہے۔ یہ اندھی وقار کی طرہت کی کمی ہی سے ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ جس طرح خیالی منصوبہ بندی اور مثالیت پسندی ہر ملک میں الگ الگ بہرہ و پ میں منظر آتی ہے اسی طرح طرہت بھی بید و سیلج محنتی کی حاصل ہوتی ہے۔ امریکہ میں مثالیت پسندی اور حقیقت پسندی میں بڑی دلچسپ کش مکش نظر آتی ہے۔ اسی لئے میں نے دونوں کی مقدار کو اپنے فارمولے میں کافی شدید رکھا ہے۔ اسی کش مکش کی بدولت ہمادہ مستعدی ظہور میں آتی ہے جو امریکیوں کا خاصہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ امریکہ والوں کی مثالیت پسندی کی نوعیت کیسے ہے؟ تو اس کا فیصلہ میں امریکیوں ہی پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ امریکی لوگ نت نئی چیزوں کے بارے میں جوش و جذبہ کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی مثالیت پسندی اکثر دہشتہ بڑی بخیب ہوتی ہے۔ کیونکہ ان پر اعلیٰ قسم کے نصب العین یا اعلیٰ الفاظ بہت زیادہ اثر کرتے ہیں۔ — امریکی لوگوں کے یہاں طبع سلیم اور ذوق طرہت بھی وہ مفہوم نہیں رکھتے جو یورپ کے لوگوں کے یہاں ہے بلکہ سچا بات یہ ہے کہ امریکی لوگوں کا سب سے قیمتی سرمایہ یہی خوش مذاق اور زندہ دلی ہے۔ امریکی لوگ ہنسی مذاق کھیل کود کے بڑے دلدادہ ہیں۔ اور ان میں قدرتی طور پر بڑی عملی سوچ بوجھ بھی ہے۔ — یہی گری سوچ بوجھ امریکی قوم کو آنے والے نازک دور میں سلامتی سے پارا تار سکتی ہے۔ امریکی لوگوں میں احساس کی لطافت کم ہے کیونکہ میرا تاثر یہی ہے کہ امریکی خواہ مخواہ بہت سی

غیر ضروری مصیبتیں جھیٹتے رہتے ہیں اور ان نہیں کرتے۔ میرے نزدیک انگریز قوم
 سب سے زیادہ بے لاگ اور محکم قوم ہے۔ فلہذا مجھے کئی انگریزوں میں حقیقت پسندی
 کتنی زیادہ ہے اور خیالی منصوبہ بندی اور تصور پرستی کا جزو بھی نسبتاً کم ہے (یعنی ج پ خ)
 اس کے برعکس فرانسیسیوں میں حقیقت پسندی کم ہے اور تصور پرستی زیادہ ہے (ج پ خ)
 میرا دوط انگریز کی طرف ہے کیونکہ اس میں کفار کا استقلال زیادہ ہے۔ میرا خیال
 ہے کہ کرداری تجزیے کا مثالی فارمولہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت پسندی اور طرافت زیادہ
 مقدار میں اور نصب العین پرستی اور احساس کی لطافت زیادہ کم ہو کیونکہ ان کی زیادتی خرابی
 کا باعث ہوتی ہے تو ہمارا فارمولہ یہ ہے۔

ج پ خ ظ س
 ۳ ۲ ۳ ۲

انگریز کے تجزیے میں میں نے لطافت احساس کو دوسرے عناصر سے کم
 دکھایا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں، تصور انگریزوں کا اپنا ہے میں نہیں جانتا کہ انگریز
 کچھ محسوس بھی کرتے ہیں یا نہیں! کوئی بات انھیں خوش کرنی ہے؟ کسی چیز پر انھیں غصہ
 آتا ہے؟ وہ کبھی مطمئن محسوس کرتے ہیں؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب
 نہیں کیونکہ انگریز ہمیشہ سچے اور منہ ٹھکانے ہی نظر آتے ہیں!!
 اب اسی فارمولے کو ذرا دنیا کے عظیم شعرا پر منطبق کیجئے۔ مثال کے طور
 پر چند مشہور اور مخصوص نوع کے ادیب اور شاعر کیجئے تو نتیجہ یہ ہے:-

شلیسیر (انگریز) =	ج	خ	ظ	س	} اشاریہ
ہاتے (جرمن) =	ج	خ	ظ	س	
شیلے (انگریز شاعر) =	ج	خ	ظ	س	
ایڈگر ایلن پو (امریکی) =	ج	خ	ظ	س	
	۳	۲	۳	۲	
حقیقت پسندی	ج				
تصور پرستی اور خیالی بلاؤ	خ				
طرافت	ظ				
احساس کی نزاکت اور لطافت	س				

بی پو = ح ح خ ح
 تو نو = ح ح خ ح
 متونگ پو = ح ح خ ح

یہ عرض کر دوں کہ یہ درجہ بندی محض ڈوری ڈوری سی تجویز ہے۔ مگر اس سے یہ ظاہر ہے کہ تمام شاعروں میں احساس کی نزاکت اور لطافت حد درجہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ شاعر نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ چینی قوم کے ذہن کا فساد مولامسیر سے، نزدیک یہ ہے کہ

خ ح خ ح
 خ ح خ ح

گویا چینی قوم میں لطافت احساس بہت زیادہ ہے اور یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ چینی قوم اس ارضی زندگی کو خوبصورت عظیمہ سمجھتی ہے اور اسی لئے زندگی سے بعد محبت کرتی ہے لیکن اس سے محض یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنی لطافت احساس کی بدولت چینی قوم اور نادر فلسفے کے لئے بھی فنکارانہ اور شاعرانہ انداز رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی فلسفی کا نقطہ نگاہ زندگی کے بارے میں عین بعین وہی ہے جو چینی شاعر کا ہے یہی وجہ ہے کہ چین میں فلسفے اور شاعری کا چونی واسن کا ساتھ ہے حالانکہ مغرب میں فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے کے قسریہ تہ تکھے جاتے ہیں چینی قوم کی یہی لطافت احساس ہے جو اسے زندگی کی غمی خوشی اور زندگی کے بدلتے رنگوں کا سچا اور گہرا شعور دلاتی ہے اور اس شعور کی بدولت ہی چین کا نذہ دل فلسفہ حیات محدود میں آیا ہے۔ انسان میں الم کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ جاتی بہادروں کے جانے کو وہ دیکھتی آنکھوں دیکھے اور اس کے دل کو تکلیف ہو۔ ہماری اس زندگی کے ایسے احساس ہمارے اندر

اس وقت جہنم تیار ہے۔ جب تک کل کی تازہ کلیوں کو آج مر جھایا ہوا پاتے ہیں۔ ان مر جھاتی کلیوں کے لئے ہمارے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس المناکی اور شکست کے احساس سے ہمارا دل بیدار ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں مسرت کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے ہم سنتے ہیں دای، منسی جولا بالی دانشمندیوں کا خاصہ ہے۔

چینی کردار کے فارمورے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے حقیقت پسندی کی مقدار بہت زیادہ دکھائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چینی لوگ زندگی کو اسی شکل میں قبول کرتے ہیں جس شکل میں وہ ہے چینی کردار کا خاصہ ہے کہ جو مال گروہ میں ہو وہی مال چھپا ہے۔ یہ حقیقت پسندی فنکاروں کے اس دعوے کی سب سے بڑی شہادت ثابت ہوتی ہے کہ انسانی زندگی بڑی حسین شے ہے مگر اس کے حسن کو بقا نہیں۔ اسی حقیقت پسندی کی بدولت چینی دنیا کے دوسرے شاعروں اور فنکاروں کے برعکس زندگی سے فرار کرنے سے بچے رہتے ہیں۔ خواب و خیال کی دنیا میں اپنے دلوں کا یہ پرانا مقولہ ہے کہ زندگی ایک خواب ہے۔ مگر حقیقت پسند کا خواب یہ ہوتا ہے "مان لیا زندگی ایک خواب ہی ہے مگر اس خواب کو جتنے حسن و خوبی سے ممکن ہو سکے بسر کرنا چاہیے" جو شخص بیدار ہے اسکی حقیقت پسندی کا دباؤ باری قسم کی نہیں بلکہ شاعرانہ قسم کی ہوگی۔ زندگی کی مشکلات کے بارے میں اس کی ہنس میں تجربے کی دوزخ نہاں ہوگی۔ یوں محسوس ہوگا جیسے کوئی پرانا، تجربہ کار بڑھا سفید لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر ان مشکلوں پر ہنس رہا ہے اور ان کے بارے میں بڑی بڑی ہلکی بڑی تھوہکانے والی آواز میں باتیں کر رہا ہے۔ اس شخص کو سکون سے محبت ہے اس لئے وہ اپنے دیکھتا ہے اور سینوں کے لئے کوئی خون خرابہ نہیں کرتا یہ وہ حقیقت پسند ہے جو اپنے ساقھی خوابکاروں کے ساتھ مقول

طریقے پر زندگی بسر کرنے کا خواہش مند ہے اور اس طرح زندگی کی مشکلات اور تناؤ کو کم سے کم کر کے جاتا ہے۔

اس قسم کی حقیقت پسندی سب سے پہلے زندگی کے فلسفے سے تمام غیر ضروری باتیں نکال دیتا ہے گیا یہ حقیقت پسندی زندگی کو مضبوطی سے گرفت میں رکھتی ہے۔ تاکہ زندگی حقیقت کے پردوں پر اڑتی اڑتی خیالی دنیاؤں کے حسن اور غمیر حقیقی نفسانوں میں گم نہ ہو جاتے۔ سچ پوچھتے تو دانش مندی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ زندگی سے غیر ضروری باتیں الگ کر دی جائیں فلسفے کے مسائل کو چند ضروری باتوں تک محدود کر دیا جائے مثلاً یہ کہ گھر بلیو زندگی کیسے خوش گوار بن جاتے (یعنی مرد عورت اور بچوں کے باہمی تعلقات کیا ہوں) زندگی سے کیسے لطف اٹھایا جاتے فطرت کے حسن اور تہذیب و تمدن کی نعمتوں سے کیسے خفا اٹھایا جاتے دانش کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تنظیم کے سائنسی سلوں اور علم کی بے ثمر تلاش کو غیر ضروری قرار دیکر فلسفہ زندگی کے دائرے سے بیکار باہر کیا جائے اس طرح چینی فلسفی کے لئے زندگی کے مسائل بہت ہی کم اور بہت سادہ نوعیت کے رہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے تصوف اور ما بعد الطبیعیات کا کوئی انحصار نہیں رہتا ان سب علوم کے بارے میں تحقیق اور شوق دونوں ختم ہو جاتے ہیں جن کا زندگی سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں! ————— اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی کوشش اور سرگرمی کو اور حصول علم کو اس کسوٹی پر رکھنا ہوگا کہ اس کا زندگی سے کیا واسطہ ہے اور زندگی بسر کرنے میں اس سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ تمام انسانی کوششوں اور علم و دانش کے مفید ہونے کی ایک ہی کسوٹی ہے ————— زندگی۔ اس ساری بحث کا براہِ واضح اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کا مقصد کسی ما بعد الطبیعیاتی منزل تک پہنچنا

نہیں ہے۔ بلکہ زندگی بسر کرنا یا جینا ہے۔

چینی قوم کو خدا نے یہی حقیقت پسندی عطا کی ہے۔ چینی قوم منطقی اور ذہین انسانی پر بالکل بھروسہ نہیں کرتی۔ چینی کے لئے فلسفہ زندگی کے براہ راست اور گہرے احساس اور شعور کا نام ہے۔ اسی لئے چینی کسی نظام فکر کا پابند نہیں اسے حقیقت پسندی کا صوت مند شعور ملا ہے! اسی سوجھ بوجھ 'اسی' جس ازل 'مٹی' ہے جو خدا نے صرف حیوانوں کو دی ہے۔ چینی میں قدرتی طور پر بڑی معقولیت پسندی ہے۔ اسی معقولیت پسندی، جو خود عقل کو بے دہمت دیا بنا دے! اسی لئے چینی فلسفی کسی خاص نظام فکر کا پابند نہیں ہو سکا۔ اور چین میں کوئی ستم بند فلسفہ سرا اٹھا ہی نہیں سکا چین میں تین مذہب راج میں، کنفیوشس کا دین، تاؤ کا مذہب اور بدھ مت۔ یہ تینوں اعلیٰ درجے کے مذہب ہیں۔ مگر چینی کی صحت مند سوجھ بوجھ ان تینوں میں گھل مل چکی ہے۔ اس نے ان کے کڑن کو کم رکھا ہے اور ان تینوں کو ایک مسرت انسانی زندگی کی تلاش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ کوئی غمگین خیال، تحسیر، کار چینی گہرے سورج کا قاتل نہیں ہوتا، کسی ایک خیال یا عقیدے یا نظام فکر کا دل سے پابند نہیں رہ سکتا اہل چین کے اس ستم کو اس فلسفے کا اثر یہ ہے:

چین میں 'انسان مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ' فطرت اور چین سے قریب تر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ زندگی اسی ہوتی ہے کہ اس میں 'جھلکتا اور جذبات دونوں کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ عقلیت پسندی کے مقابلے میں انہی پر زور دیا جاتا ہے اس طرز زندگی میں انسانی جسم کے ساتھ گہرا لگاؤ بھی شامل ہے اور انسانی روح کی سر بلندی اور عظمت بھی حکمت اور احمقانہ خوش باشی، زبردست تکلفات اور بچنے کی سی سادگی یہ سب عناصر اس زندگی میں آمیز کئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں

عرض کر دوں گا کہ اس فلسفہ حیات کی خصوصیات یہ ہیں
 ۱۔ فنون لطیفہ میں زندگی کا پورا عکس دیکھنے کا شعور
 ۲۔ فلسفے میں سادگی کی طرف شعوری میلان
 ۳۔ زندگی بسر کرنے میں حقیقت پسندی کو نصب العین سمجھنا۔
 اس فلسفے کا نتیجہ کیا ہے۔۔۔ اس کا منہا اور اس کا نتیجہ بڑا عجیب اور وہ
 یہ ہے کہ چینی قوم شاعر کسان اور آوارہ گرد کی پرستش کرتی ہے!!

۳۔ آوارہ گرد۔ مثالی انسان

میرے نزدیک جو خصوصیات انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں وہ
 یہ ہیں۔ اول تو انسان میں جاننے اور تحقیق کرنے کی خواہش اور صلاحیت ہے۔ دوم
 یہ کہ وہ خواب دیکھتا ہے اور کسی نہ کسی نصب العین کو سامنے رکھتا ہے (اگرچہ اکثر
 اوقات یہ نصب العین بالکل ناممکن غیر یقینی اور غلط سلط ہوتا ہے پھر بھی ہوتا تو ہے!)
 تیسرا اور زیادہ اہم شرف انسان کو یہ حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالی منصوبوں کو اپنی طبعی طاقت
 اور زہد دلی سے درست کر سکتا ہے۔ اور اس طرح اپنی مثالیت پسندی کو صحت
 مند حقیقت پسندی کی بدولت قابو میں رکھتا ہے انسان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ
 ماحول اور فضا کے بارے میں اس کا رد عمل ہمیشہ یکساں اور لگا بندھانہ نہیں ہوتا جیسا
 کہ جانوروں کا ہوتا ہے۔ بلکہ انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ آزادی سے
 اپنا رد عمل معلوم کر سکے اور اگر چاہے تو اپنا ماحول بدل بھی سکے۔ اس طرح انسانی
 خصوصیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت کسی مشینی قانون کی پابند نہیں ہو سکتی۔

انسانی ذہن کسی نہ کسی طرح میکانکی قانونوں کی گرفت سے آزاد رہتا ہے اور اس کی راہ بھی متعین نہیں کی جاسکتی اور یہ جو کچھ پاگل قسم کے ماہرین نفسیہ اور نا اُسودہ ماہرین اقتصادیات، انسانی ذہن پر مشینی اور مادی اور جسدری ضابطے عائد کرتے رہتے ہیں انسانی ذہن ان کی جگر پندی سے بھی نکل بسا گتا ہے۔ اسی نے

خدا کا ایک عجیب و غریب خواب کار زندہ دل بے راہ بلکہ گمراہی مخلوق ہے !
 غمخیز یہ کہ میں انسانی شرف اسی میں سمجھتا ہوں کہ انسان کسے زمین پر سب سے بڑا ادارہ گرد ہے۔ انسانی دقت اور شرف کو ادارہ گردی کے اس تصور کے ساتھ متعلق کرنا ضروری ہے۔ انسانی دقت کو ایک تابعدار تنظیم و ضبط کے پابند سپاہی کے ساتھ ہرگز متعلق نہیں کرنا چاہیے۔ اس نظریے کے مطابق غالباً ادارہ گرد سب سے شاندار قسم کا انسان ہے اور سپاہی سب سے گھٹیا قسم کا انسان قرار پائے گا کہ اس کتاب سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ میں ادارہ گرد کو عظمت کی مسند پر بٹھاتا چاہتا ہوں۔ مجھے واقعی یہی مقصود ہے۔ موجودہ زمانے میں یہودیت پسندی اور انفرادی آزادی کو ہر طرف سے خطرے درپیش ہیں۔ صرف ادارہ گرد اور آزاد روی کا احساس ہی نہیں ان باوردی قلیوں کے گروہوں میں گم ہو جانے سے بچا سکتا ہے جو منظم و ضبط کے پابند ہیں بے حد فرما بنوا رہیں اور ہر طرح منظم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادارہ گرد ہی ڈکٹیٹر شپ یا آمریت کا سب سے آخری اور سب سے زبردست دشمن ثابت ہوگا۔ ادارہ گرد انسانی شرف و دقت اور فرد کی آزادی سب سے بڑا علم بردار ہوگا اور اسی کی ذات کو آمریت سب سے آخر میں مغلوب کر سکے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ تہذیب کی بقا کا دار و مدار اسی کی ذات پر ہے۔

انسان کو تخلیق کرتے وقت شاید ہمارا خالق اکبر جانتا تھا کہ وہ زمین پر

سب سے بڑا آوارہ گرد پیدا کر رہا ہے۔ یہ آوارہ گرد اعلیٰ پائے کی ذہانت ضرور رکھتا ہے مگر ہے آوارہ گرد اور اسل میں آوارہ گردی کی خیریاں ہی انسان کی سب سے امید افزا خیریاں ہیں۔ خالق اکبر کا پیدا کیا ہوا یہ آوارہ گرد بڑا ذہین ہے۔ وہ ابھی تک کچھ خود سرا اور کچھ عجیب انخلقت سا باغ پھوسے۔ وہ اپنے آپ کو بہت عظیم اور بہت دانش مند سمجھتا ہے، مگر وہ ابھی اتنا عظیم اور دانش مند نہیں ابھی تک راہ بہت شرارتی اور کھلتا رہا ہے اور ہر آزادی کو سب سے محبوب چیز جانتا ہے پھر بھی اس میں اتنی خیریاں باقی ہیں کہ قدرت اپنے مقاصد کی برآری کے لئے اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ سا کر سکتی ہے۔ قدرت انسان سے اسی طرح امیدیں لگاتے ہوئے ہے جس طرح بعض اوقات ایک باپ اپنے بیس برس کے زمین مگر کچھ خود سر کچھ بے راہ سے بچے کے ساتھ امیدیں وابستہ کیا کرتا ہے..... کیا کسی دن قدرت اس نظر ارم کائنات کو اپنے پیدا کردہ اس غلط کار بیٹے کے سپرد کر دے گی؟.....

یہ کون جانے.....!!

ایک چینی کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ کوئی تہذیب صرف اسی وقت مکمل کہلا سکتی ہے جب وہ تکلفات اور نفاستوں سے ترقی کرتے کرتے پھر سماجی تک آجائے اور شعوری طور پر فکر کی سادگی اور زندگی کی سادگی کی طرف لوٹ آئے! صرف وہی شخص عقلمند کہلا سکتا ہے جو علم کی دانش سے ترقی کرتے کرتے حماقت کی دانش "تک پہنچ جاتے" اور ایک زفرہ دل فلسفی بن جاتے جو پہلے تو زندگی کی المناکیوں کو محسوس کرے اور پھر زندگی کے طسریقے پر محسوس کرے۔ تاہم قدرت یہی ہے کہ محسوس کرنے سے پہلے ہم روٹنا سیکھیں۔ المناکی ہے دل اور روح بیدار ہوتے ہیں اور اس بیداری سے فلسفی کے اندلا سترت کا تجربہ

بھرتا ہے اور وہ ہمتا ہے۔ منہسی جس میں علم اور ہسر بانی اور رواداری کوٹ
کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں آج کی دنیا بڑی سنجیدہ ہے اسی لئے۔ اس آج کے کلبے حسد
سنجیدہ دنیا کو ایک خوش باش اور دانش سے بھر پور فلسفے کی سخت ضرورت ہے۔
چین کے فن زندگی کا فلسفہ یقینی طور پر ایک خوش باش سائنس کہلا سکتا ہے
اور اسل یہ ہے کہ خوش باشی کا فلسفہ ہی گہرا اور سچا فلسفہ ہوتا ہے۔
مغربی دنیا کے سنجیدہ اور بھاری بھر کم فلسفوں نے تو ابھی زندگی کی ابجد کو بھی نہیں
سمجھا۔ میرے نزدیک فلسفے کا کام صرف یہ ہے کہ ہمیں خوش باشی اور زندہ دلی سے
زندگی بسر کرنا سکھائے۔ یہ محض میرا خیال ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک یہ ایک عملی نظر یہ
ہے۔ اگر انسان خوش باشی اور زندہ دلی کی یہ روح اپنالیں تو یہ دنیا اب کے مقابلے
میں کہیں زیادہ دل کش اور معقول جگہ بن جائے گی۔ موجودہ زمانے کا انسان زندگی
کو بڑی سنجیدہ چیز سمجھتا ہے اور چونکہ وہ اتنا سنجیدہ رہتا ہے۔ اس لئے یہ دنیا
بھی اس کے لئے مصائب اور مشکلات سے پر بن جاتی ہے۔ ہمیں اس
ضابطے اس رویے کا اہل اصول دیکھنا ہے جس کی بدولت یہ زندگی زیادہ پختہ
زیادہ خوش گوار بنائی جاسکے جس کی بدولت یہ زندگی زیادہ معقول اور زیادہ چمکون
اور کم طرفانی بنائی جاسکے۔

میرا خیال ہے میں اس فلسفہ حیات کو کسی ایک درجہ خیال کا فلسفہ نہیں
بلکہ ساری چینی قوم کا فلسفہ کہہ سکتا ہوں۔ یہ فلسفہ چینی پیغمبر کنفیوشس اور لاؤ
کے فلسفوں سے عظیم تر ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ ان کے فلسفوں اور دوسرے قدیم

فلسفوں سے اعلیٰ منزل تک پہنچ گیا ہے۔ چینی قوم کا یہ فلسفہ پھر ٹاٹا دانش کے انہی قدیم سرچشموں سے ہے مگر اب یہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے اور ان سب سرچشموں کی ہم آہنگی سے ایک پورا نظام وجود میں آچکا ہے۔ اس فلسفے نے قدیم فلسفوں سے تھوڑی سی دانش جذب کی ہے اور اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ نین زندگی ایک زندہ جتیا جاگتا نظام حیات نظر آتا ہے جو عام آدمی کی سمجھ میں بھی آسکتا ہے سارے چینی ادب آرٹ اور فلسفے پر نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ چینی ادب آرٹ اور فلسفے کا پیغام کیلے ہے۔

وہ پیغام اور تعلیم یہ ہے کہ زندگی کا جی بھر کر لطف اٹھایا جائے اور حقیقت

پسندی سے اپنا ناما ہمیشہ مضبوط رکھا جائے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو چینی فکر و ادب میں ہر جگہ اور ہمیشہ رواں دواں نظر آتی ہے :

۱۔ جسے دوسرے جاننے ہیں۔

۲۔ جسے وہ خود جانتا ہے

۳۔ جسے دوسرے جاننے ہیں

۴۔ وہ خود جانتا ہے

۵۔ یہ اولیٰ ہیں

باب دوم

افسان کیا ہے

کہاں

(۱) افسانیت بارے میں سچی، یونانی اور چینی
نقطہ نظر

(۲) خاک کا تپا

(۳) جسم اور روح

(۴) افسانیت کے بارے میں حیا تیبائی نظر یہ

(۵) حیات افسانی — ایک منظم

۱۔ انسانیت کے بارے میں مسیحی یونانی اور چینی نقطہ نظر

انسانیت کے بارے میں ایک تو مسیحی دینیات کا روایتی نظریہ ہے۔ دوسرے یونانیوں کا فلسفہ نقطہ نظر ہے اور پھر چینی نظریہ ہے جو کنفیوشس اور تاؤ کی تعلیمات کا آئینہ ہے۔ میں نے چند ماہر عدمت کے نقطہ نظر کا ذکر نہیں کیا کیونکہ انسانیت کے بارے میں یہ نظریہ بے حد غم ناگہز ہے، اجمالی طور پر دیکھا جائے تو یہ نظریہ ایک دوسرے سے زیادہ مختلف ہیں خصوصاً آج کل حیاتیات اور علم الانسان کی روشنی میں تو ان نظریوں کی بڑی وسیع تعبیریں کی گئی ہیں ایک دوسرے کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس میں ان نظریوں میں کافی اختلاف موجود ہے۔

انسانیت کے بارے میں مسیحی مذہب کا روایتی نظریہ یہ ہے کہ ابتداء میں انسان کو مکمل، معصوم بے مشورہ اور خوش باش پیدا کیا گیا تھا۔ انسان تنگ دھڑنگ جنت عدن میں رہتا تھا۔ ہوا یہ کہ انسان کو علم و دانش ہاتھ آگئے اور انسان جنت سے نکالا گیا۔ اور انسانی مشکلات اور مصائب کا آغاز ہو گیا۔ یہ افسانہ مصائب کیا ہیں؟ اول مردوں کے لئے یہ مقدر ہوا کہ وہ اپنا ایڑھی چوٹی کا پسینہ بہا کر روزی کسٹیں گے۔ دوم عورتوں کے لئے یہ مقدر ہوا کہ انہیں بچے پہننے کی سخت تکالیف ہوں گی۔ جنت عدن میں انسان مکمل اور کامل تھا اب نہ زمین پر اس کے ناقص ہونے کا یہ سبب پیش کیا گیا کہ اس کا ناقص ہونا شیطان کی وجہ سے ہے شیطان، انسانی جسم کے ذریعے سے اپنا کام مکمل ہے اور انسان کی عالی قدرتی

اس کی روح کی دنیا میں سرگرم ہوتی ہے۔ مسیحی دینیات میں "روح" کا لفظ کب سے رائج ہوا میں نہیں جانتا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ "روح" ایک خصوصیت یا حالت کے بجائے ایک خاص چیز ایک مخصوص وجود بن کر رہ گئی۔ اور اسی "روح" کو انسان اور حیوان کے امین امتیاز قرار دیا گیا کیونکہ جانوروں کے پاس روح نہیں جس کی شیطان سے حفاظت کی جائے! اس مرحلے پر اس نظریے میں کچھ منطقی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شیطان کے وجود کی تشریح ضروری ہوتی۔ چنانچہ قسرون و سطی کے مسیحی عالموں نے اپنی منگھانہ منطقت سے اس مسئلہ پر ہاتھ ڈالا تو وہ عجب مجھ سے میں پڑ گئے۔ وہ یہ تسلیم کیسے کرتے کہ شیطان (جو خدا کی ضد ہے) خود خدا کا پیدا کیا ہے وہ یہ بھی نہیں مان سکتے تھے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے کائنات میں خدا اور شیطان دونوں ایک ساتھ ہمیشہ سے موجود تھے! — اسی لئے انھوں نے تھک ہار کر یہ رستہ نکالا کہ شیطان شیطان نہیں تھا بلکہ ایک راندہ ہوا فرشتہ تھا۔ اس موقع پر یہ سناں پیدا ہوتا ہے کہ پھر بدی کا وجود کہاں سے آیا کیونکہ ایک فرشتے کو بہکا کر مردود بنانے کے لئے بھی تو ایک شیطان ہونا چاہیے تھا، مگر ان عالموں نے اس سوال سے پہلے پہلو پھیر دیا۔ پھر بھی اس کی تعلیم سے جسم اور روح کا سارا جھگڑا شروع ہوا بد قسمتی سے یہ خیالی نظریہ اب بھی رائج ہے اور اب بھی ہماری زندگی اور ہماری خوشی پر بے حد اثر انداز ہے۔

انسان کے جنت سے نکلے جانے کے بعد مسیحی نظریے کے مطابق نجات کا مرحلہ آتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی نجات حضرت مسیحؑ کی شفاعت پر ہوگی اور انسان کو اس کا کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ اصل میں بہت پرانی مذہبی رسم ہے۔ مثلاً بتوں کو خوش کرنے کے لئے گوشت کی قربانی ضروری ہے۔ اس کی نجات

شفاعت کی بدولت انسان کے ایک بار پھر کامل ہونے کا راستہ ڈھونڈ لیا گیا کیونکہ کفارے کے بعد اس کے سارے گناہ ایک قلم معاف ہو سکتے ہیں۔ انسان کے کامل ہو جانے کا یہ نظریہ سچی دین کا سب سے عجیب پہلو ہے۔ یہ نظریہ اس وقت آج تک واجب قریم مہم ختم ہو رہے تھے۔ چنانچہ یہ رجحان ترقی کر گیا کہ حیات بعد میت پر ندر دیا جاتے۔ اس کے ساتھ ہی سیدھے سادے جینے کے مسئلے اور خوش باشی کے بجائے 'نجات پر توجہ دی جانے لگی۔ خیال یہ چلا کہ اس دنیا سے جو گناہوں کا گھر ہے اور جوانی بہتری کی وجہ سے مٹا کر رہے گی، کس طرح کٹا کر لیا جائے چنانچہ زندہ رہنے کے بجائے زندہ جاوید ہو جانے کو اہمیت دی گئی۔ یہ سب کچھ بائبل کے باب پیدائش کے اس بیان کے بالکل منافی ہے کہ خدا انسان کی بقا اور دائمی زندگی نہیں چاہتا تھا۔ باب پیدائش سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدم و حوا کو عام خیال کے مطابق) دانہ گندم کی بدولت جنت سے نکالا گیا۔ بلکہ یہ کھلے ہے کہ یہ پھر پیدا ہو گیا تھا کہ آدم و حوا اس شجر ممنوعہ کے بعد کہیں شجر زندگی کا پھل نہ چکھیں۔

اور کہیں اس طرح زندہ جاوید نہ ہو جائیں ملاحظہ ہو

اور خداوند خدا نے کہا: دیکھو انسان ہم جیسا ہو گیا کہ گناہ و
 قباہ میں امتیاز کر لیتا ہے ہمیں یہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے
 اور شجر زندگی کا پھل تارے اور کھائے اور اس طرح ہمیشہ زندہ رہے
 اس لئے خداوند خدا نے انسان کو جنت عدن سے
 نکال دیا اور اس زمین میں کھیتی کرنے کو بھیجا جہاں سے وہ اٹھا یا
 گیا تھا۔ چنانچہ خداوند خدا نے آدم کو نکال دیا اور جنت عدن
 کے مشرق کی سمت فرشتے تعینات کر دیے اور ایک شعلہ نشاں تلوار لٹکا

انسانیت کے بارے میں..

دی جو ہر طرف گھومتی تھی تاکہ شجر زندگی کا راستہ بند رہے!
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شجر مسدود توجہت عدن کے کہیں مرکز میں تھا مگر شجر زندگی
جنت عدن کے مشرقی دروازے کے قریب ہے۔ اور آج تک فرشتے انسان
کو شجر زندگی تک پہنچنے نہیں دیتے!

کچھ بھی ہو۔ یہ خیال آج بھی قائم ہے کہ زندگی کا نصف اٹھانا گناہ اور ابدی
ہے۔ اور اپنے آپ کو دکھ دینا نیکی ہے اور انسان ایک عظیم بیرونی قوت کی امداد
کے بغیر اس بدی سے بچ نہیں سکتا۔ گناہ کا عقیدہ آج بھی مسیحی دین کی
بنیاد ہے اور مسیحی مبلغ آج بھی کسی کو عیسائی بنانے کے لئے یہی پرچار کرتے ہیں کہ
انسان ازلی طور پر گناہ گار ہے اور انسانی فطرت کی بنیاد ہی بری ہے۔ گویا جب
ہم کسی انسان کو یقین نہ دلایا جائے کہ وہ گناہ گار ہے اسے عیسائی بنانا ممکن نہیں
اسی لئے تو کسی ستم طریقہ نے کہا ہے :-

ہمارے مسیحی مذہب کو اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ گناہ مذہب کا
مرکز خیال بن گیا اس لحاظ سے جو شخص ہر وقت گناہ کے
خیال میں ڈوب رہا ہے وہی مسیحی کہلا سکتا ہے۔ چنانچہ اب یہ
عالم ہے کہ شریف لوگ جو گناہ کے بار میں نہیں سمجھتے کس منہ
سے گرجے میں جاتیں۔ وہ تو سبھی ہی نہیں ہیں!

یہ تو مسیحی نظریہ اب انسانیت کے بارے میں یونانیوں کا نقطہ نظر
ملاحظہ ہو۔ یونانی دنیا مٹی جگہ ایک مخصوص دنیا تھی۔ اس لئے یونانیوں کا نظریہ
انسانیت بھی مسیحی نقطہ نظر سے مجید مختلف ہے۔ اہم بات یہ دیکھئے کہ یونانی
لپنے دیوتاؤں کو بھی انسان کا قالب دیتے تھے اس کے برعکس مسیحی دین آدمی سے

دیوتابننے کی توقع کرتا ہے۔ یونانی دیوتاؤں کا نام ان لوگوں پر رکھا گیا ہے اور ان لوگوں کے یہ دیوتا، خوش باش اور عشق پیشہ لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں آپس میں آتے دن لڑتے رہتے ہیں، عہد دہیان توڑتے ہیں، نیک چڑھے اور جھگڑتے ہیں۔ یہ دیوتا بھی ساری یونانی قوم کی طرح زرتھوں کے شیدائی ہیں تیرہ بازی کے متوالے ہیں، شکار کے رسیا ہیں، یونانیوں کی طرح یہ دیوتا بھی شادیاں کرتے ہیں اور کئی ایک کے قونا جائز اور لازمی ہے۔ یونانیوں کے نزدیک انسانوں اور دیوتاؤں میں فرق اتنا ہے کہ دیوتاؤں کو دسے زمین پر بھلیاں برسانے کا اختیار ہے، دیوتا زمین کو سرسبز بناتے ہیں، وہ انسانوں کی طرح فانی نہیں، اور وہ شراب کے بجائے آب حیات پیتے ہیں۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے وہ یکساں تھے۔ ان دیوتاؤں کا ذکر سن کر فوراً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس نجوم کے ساتھ تو گہری دہشت اور اپنا سیت بھی ہو سکتی ہے اور ہم آپ دیوتا اپا اور سورج دیوتا یا انتھین یا دیوتا مرکری اور پیغام رساں دیوتا کے ساتھ کندھے پر ایک جھولا ڈال کر شکار کو جاسکتے ہیں اور راستے میں اس پیغام رساں دیوتا سے گھل مل کر باتیں کر سکتے ہیں۔ اور وہ بکا ایک باتیں چھوڑ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ "اچھا بھائی مسافر بھرتا میں فنا لپک کر یہ خطا فلاں جگہ پہنچاؤں"۔ یونانیوں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یونانی لوگ تو دیوتا نہیں تھے، مگر یونانی دیوتا ضرور انسان تھے! ذرا ان کا مقابلہ سچی خدا سے کیجئے۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ چنانچہ یونانی دیوتا انسانوں کی ہی ایک ذرا مختلف نسل تھی۔ گویا یہ لوگ آدم زاد نہیں تھے جنہیں دائمی زندگی ملی تھی۔ اور جن کے برعکس زمینی انسانوں کو بعض فانی زندگی عطا ہوئی تھی چنانچہ دیوتاؤں کی اس کہانی سے ایسی خوبصورت کہانیاں وجود میں آئیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ان دیوتاؤں پر یونانیوں کا اعتقاد راسخ تھا، اس سے کوئی منہ نہ تھا۔

حتیٰ اسقراط جیسے فلسفی نے جب زہر کا جام پیا تو اس نے تھوڑا سا مشروب
 دیوتاؤں کی بھینٹ کے طور پر زمین پر چھڑکا تاکہ دیوتا اس کے ابدی سفر پر آنسکی
 معافت کریں۔ کم و بیش عیسائی پیغمبر سنیفوشس کا بھی یہی رویہ تھا۔ اصل میں وہ
 نانا ہی ایسا تھا کہ اسی بات کی جاتیں۔ آج کل کے زمانے میں یونانی روح انسان
 اور دیوتاؤں کے سلسلے میں کیا رویہ اختیار کرتی ہے؟ — قسمتی سے اس کا جواب نہیں
 دیا جاسکتا۔ یونانیوں کی یہ لمبی انہ دنیا آج کی دنیا نہیں۔ اور آج کی مسیحی دنیا قدیم
 یونانی دنیا نہیں۔ اور افسوس اسی بات کا ہے۔

بہر کیف یونانیوں نے یہ عقیدہ تسلیم کر لیا تھا کہ انسان فنا فی ہے اور اکثر اوقات
 مقدر کی ٹھوکریں بھی اس کا حصہ ہیں۔ بس اتنی بات تسلیم کر لینے کے بعد انسان اپنے
 حال پر ناخوش تھا۔ کیونکہ یونانیوں کو اس زندگی اس کائنات سے بڑی محبت تھی۔
 یونانیوں کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس زندگی کے حسن اس کی سچائی —
 اس کی خوبیوں کو سمجھ سکیں ان کا احاطہ کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ کائنات
 کو سائنسی طور پر سمجھنے میں بھی پوری دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ یونانی تاریخ میں انسان کا ایسا
 کوئی سنہری زمانہ نہیں ملتا جیسا کہ مسیحی روایتوں کے مطابق جنت عدن کا دور
 تھا۔ اسی نئے انسان کے ہبوط اور ذوال کی بھی کوئی داستان نہیں۔ یونانی شخص انسان
 تھے۔ وہ انسان جنھیں راہی کی روایتوں کے مطابق، عظیم معنیاتی کے بعد ساحلوں
 پر آئے ہوئے دیوسکلیں اور اس کی بڑی پائی رائے، کنگر سمجھ کر ادھر ادھر
 پھینک دیا تھا۔ اور یہی کنگر بعد کو انسان بن گئے تھے۔

یونانیوں کا دیرہ تھا کہ وہ بیماریوں اور تکلیفوں کا تذکرہ مزاجیہ انداز میں
 کرتے تھے۔ ایک نوجوان خاتون کو ایک صندوق میں جو اہرات بند کر کے دیتے گئے اور کہا گیا

کہ وہ نہیں ایک خاص مدت تک نہ کھوے۔ وہ حسینہ سمیرنہ کر سکی۔ اور جواہر است
 بیماریاں بن کر دنیا میں پھیل گئے۔ یونانیوں کا تخیل بے حد خوبصورت اور شاداب
 تھا۔ وہ انسانی فطرت کو عام طور پر اسی طرح قبول کرتے تھے جس طرح حقیقت
 میں رہتی تھی۔ گویا مسیحیوں کے قول کے مطابق یونانی اس فانی زندگی پر پوری طرح
 شاکر تھے بلکہ ان کے نزدیک فانی ہونا بڑی خوش آمد بات تھی کیونکہ ان کی بوجھ
 بوجھ کو ان کے تخیل کو اس صورت میں پوری آزادی ملتی تھی کہ اس کائنات کو جو
 چاہیں اور جس طرح چاہیں سمجھیں۔ مثلاً بعض سوفسطائی فلسفیوں کا خیال تھا کہ
 انسانی فطرت نیک اور محترم چیز ہے۔ در بعض یہ کہتے تھے کہ انسانی فطرت بدی
 کا اور سراسر نام ہے۔ مگر ان میں وہ تضاد اور تفاوت نہیں تھا جو مثال کے طور پر
 ہمیں انگریز فلسفی ہابز اور فرانسیسی انقلابی روسو کے متفکروں میں نظر آتا ہے یہ
 سوفسطائیوں کا حال تھا۔ افلاطون کو دیکھئے تو وہ یہ کہتا ہے کہ انسان خواہشوں
 جذبات اور خیالات کا مرکب ہے اور مثالی انسانی زندگی یہ ہے کہ انسان
 فطرتاً ہی اپنے ادراک کی رہبری میں اپنے ان تئوں اجتناب غامضات، جذبات
 اور خیالات کو پوری طرح ہم آہنگ رکھے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ خیالات
 یا تصورات تو غیر فانی ہیں مگر انسانی فطرت اعلیٰ یا اونے ہو سکتی ہے اور اس کے
 اعلیٰ یا اونے ہونے کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ انسان انصاف علم اعتدال اور
 حسن سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ پھر سقراط کے فلسفے میں انسانی لہجہ کو ایک
 مستقل اور خود مختار اور غیر فانی حیثیت دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی
 روح کے غیر فانی ہونے کا نظریہ مسیحی، یونانی، تار اور کنفیو شس۔ ہر نقطہ نظر میں
 مشترک ہے مگر آپ جا رہے زمانے کے لوگ اس بات پر تازہ نگاہیں کیوں کہ انسانی

انسانیت کے بارے میں..

۴۱
روح کی بقا میں سقراط کا عقیدہ آج کے انسان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا
وجہ یہ ہے کہ سقراط نے اس دعوے کے لئے جو دلیلیں دی ہیں مثلاً آواگون یا تاسخ وغیرہ
وہ جدید زمانے میں قبول نہیں کی جاسکتیں۔

اب تمہیں ان نظریہ سینے چینی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان مخلوقات کا بادشاہ ہے
وہ دس ہزار اشیاء کی روح رواں ہے، انکے نفس و شمس کا تئید خیال ہے کہ عالم اسباب
میں انسان کا مرتبہ آسمان اور زمین کے برابر ہے۔ اس نظریے کا پس منظر یہ ہے
کہ اس کائنات کی ہر شے زندہ ہے اور بیاں ہے، روح ضرور موجود ہے۔ مثلاً پہاڑ اور یا
یا ہر وہ چیز جس میں بڑھاپے کا شان دار دور آجاتے ہیں روح ہے آدھی اور رعد
تو خود روحیں ہیں۔ ہر اذنیے پہاڑ اور ہر دریا پر ایک روح کی حکمرانی ہے بلکہ ان
پر روحوں ہی کا قبضہ ہے۔ ہر قسم کے پھولوں کی ایک پر ہی محافظ ہے جو ان کے کھلنے
کی رت کی نگرانی کرتی اور ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ پھر سارے پھولوں
کی ایک ملکہ ہے جس کی سالگرہ سال کے دوسرے چاند کی بادہوں میں تاریخ کو ہوتی ہے
بید بخنوں ہو یا دیو۔ سر ہو گیا بڑ ہو یا کچھو۔ ان میں سے جو بھی پختہ عمر ہو کر
کسی سویرے کا ہو جائے وہ امر ہو جاتا ہے اور "ہر وہ جوڑ مطلق" کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے
اس ذی روح اور جان دار میں منظر کے ساتھ قدرتی طور پر انسان کو بھی
ایک روح کا منظر سمجھا جاتا ہے، یہ روح زندگی کی طرح 'مروانہ' 'فاعلی' 'مبہت'
(چینی میں یا 'نگ') اور 'زانہ' 'مفعولی' 'منفی' (چینی میں 'ین') کے اتصال سے وجود میں
آتی ہے آپ یہ سمجھ لیجئے کہ چینی دماغوں نے مشقت اور منفی برقی رو کا سا اصول دیکھ
کر دکھا تھا! — خیر، جب یہ روح انسانی جسم میں آتی ہے تو اسے "پو" کہتے ہیں
اور جب تک یہ کسی جسم میں قید نہ ہو اسے (دین) کہتے ہیں۔ موت کے بعد یہ روح

دوین) آواز پھپھرتی ہے اور عام طور پر کسی کو کچھ نہیں کہتی۔ لیکن اگر مردے کو دفن نہ کیا جاتے اور مرنے والے کی فاتحہ نہ دلوایا جاتے تو یہی روح بھوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ماسی لئے چین میں ساتویں چاند کا پندرہواں دن روحوں کا دن قرار دیا گیا ہے تاکہ تو لوگ ڈوب کر مر گئے یا دور دوس میں مرے اور نہ جانے کہیں دفن ہوئے یا نہیں ان کی فاتحہ نماز دلوائی جاتے اور ان کے لئے قرابانی کی جاتے۔ اس کے علاوہ اگر مرنے والا قتل کیا جاتے یا ظلم سہتے ہوئے مرے تو اس کے بھوت کو نا انسانی کا یہ احساس آواز پھپھرتا ہے اور وہ لوگوں کو دکھ دیتا رہتا ہے جسے اس ظلم کا بدلہ لیا جاتے اور اس کی روح کو تسکین دلائی جاتے۔ یہی اس روح اس بھوت کو کون ملتا ہے۔

افسان جب تک زندہ رہتا ہے یعنی جب تک روح انسانی چولا اختیار کئے رکھتے اس وقت تک اس میں لازمی طور پر کچھ خواہشات اور امنگیں اور ضروری طاقت جاری و ساری رہتی ہے اسے "اعصابی طاقت" سمجھ لیجئے۔ چیزیں، اپنی ذات میں نہ برسی ہیں نہ اچھی۔ بلکہ یہ چیزیں، تو محض زندگی کا لازمہ ہیں اور زندگی سے کسی طرح الگ نہیں کی جاسکتیں۔ تمام مردوں عورتوں میں انسانی خواہشیں ہیں قدرتی امنگیں بھی اور بچے خیالات بھی ہیں اور انہیں ضمیر بھی دے گئے ہیں۔ اور مردوں عورتوں میں جنس کا احساس بھی ہے اور انہیں بھوک بھی لگتی ہے ان میں خوف اور غصہ بھی ہے۔ یہ مرد عورت، بیماری، درد، تکلیف اور موت کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ مگر تمدن اور تہذیب کا کام یہ ہے کہ خواہشوں اور جذبوں کا اظہار پوری ہم آہنگی سے ہو۔

یہ ہے کنفیو شس کا نظریہ۔ جس کا اعتقاد یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی

انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے بسر ہو جائے تو انسان بھی آسمان اور زمین کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

بدھ مت کا نظریہ یہ ہے کہ جسمانی خواہشیں فانی انسانوں کی نجات راستے کے میں سخت رکاوٹیں ہیں جن پر غالب آنا ہی چاہیے۔ دیکھئے نظریہ عین لعین قرآن مجید کے مسیحیوں کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ چنانچہ اکثر اوقات جو مرد عورتیں بہت زیادہ ذہین ہوں یا جنہیں زیادہ مودت چنے کی عادت ہو، وہ بدھ مت کے اس نظریے کو قبول کر لیتے ہیں اور پھر بھکشتو اور ماہر بن جاتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر کنفیوٹس کی سکھائی ہوئی عقل سلیم اس کی ممانعت کرتی ہے اس کے علاوہ تاؤ کے خیال کے مطابق ماہ پیکر مگر بد نصیب لڑکیوں کو آسمان سے گری ہوئی پریاں سمجھا جاتا ہے، جنہیں فانی انسانوں کے خیالات نہ کھنے پر یا آسمان پر کسی فرض ہو کر تاہی کے جرم میں زمین پر بھیج دیا گیا ہے تاکہ وہ انسانوں کی سی نصیبتیں چھینیں۔

چینی نظریے کے مطابق 'انسانی ذہن کو قوت کا ایک دھارا سمجھا جاتا ہے۔ ذہن انسانی کے لئے جو چینی اصطلاح ہے اس کا قریب ترین مترادف 'اعصابی قوت' کو سمجھ لیجئے جو رات دن کے چکر میں ہر شخص کی زندگی میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ہر شخص اس دنیا میں کچھ نفسانی خواہشات اچھے منگس اور اس قوت کی کچھ مقدار ساتھ لے کر آتا ہے اور لگے بندھے چکر کے ساتھ اپنے بچنے، اپنی جوانی اپنی نچھتہ عمری لے پڑھائے اور موت کے لمحے تک اپنا یہ جھنڈا قائم کر لیتا ہے۔ اسی لئے تو کنفیوٹس نے کہا ہے:-

'جو جوانی میں لڑنے بھڑنے سے خبردار رہو۔ اگر طاقت ہو تو نفسی خواہشات سے خبردار رہو اور جب بوڑھے ہو جاؤ تو ملکیت کے جذبے سے ہوشیار رہو!'

اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کو رونا بھڑکانا بھارتا ہے جو انوں کو غم و رنج سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور لڑکوں کو دولت سے ناہانہ پیار ہوتا ہے!

گویا جسمانی لذتیں اور اخلاقی قدروں کے اس مرکب کے پیش نظر چھٹی کو دو کے مسائل کی طرح خود آدمی کے بارے میں ایک روٹیہ اختیار کرنا پڑ گیا ہے اور وہ روٹیہ یہ ہے کہ "معقول بنو"۔ اس روٹیہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے زیادہ امیدیں بانڈھ کر نہ کم درجہ ہی تصور کرے۔ گویا انسان زمین اور آسمان کے مابین حقیقت پسندی اور مشابہت پرستی کے درمیان گھلا ہوا ہے۔ اس کی ہستی، اونچے خیالات اور گھٹیا نفسانیت کے درمیان پھنسی ہوتی ہے یہی انسانیت کا اصل مفہوم اور نچوڑ ہے! علم کی ترقی اور پانی کی پیاس دونوں انسانی خصوصیات ہیں یہ بھی عین انسانیت ہے کہ انسان کو کوئی عمدہ خیال پسند بھی آئے اور کوئی لذت کھانا بھی من بھائے، اسے کوئی خوبصورت مقولہ بھی پسند آئے اور کسی حسین عورت پر بھی وہ کچھ حائے چنانچہ اسی لئے ہماری دنیا ناتمام اور نامکمل دنیا ہے۔ یہ تسلیم کہ انسانی دنیا کو اپنے قبضے میں لے کر اس کی اصلاح کرنے کی گنجائش موجود ہے مگر جینیوں کو تو کامن امن دیکھنا کی توقع ہے نہ مکمل مسترت کی امید ہے۔ اس نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے ایک کہانی سنتے!

"ایک شخص دوزخ میں تھا۔ اس کے آدھوں کا وقت آچکا تھا۔ اس نے خدائے تناسخ سے کہا اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک بار پھر آدمی کی شکل میں دنیا کو جاؤں تو میری چند شرطیں ہیں۔ خدائے تناسخ نے پوچھا، وہ کیا شرطیں ہیں بھائی؟۔ اس نے جواب دیا، شرط یہ ہے کہ اب کے میں ایک وزیر کے یہاں جنم لوں اور میرے یہاں جو بیٹیا پیدا ہو وہ ایک "ادبی دھوکا" ہو یعنی وہ ایسا ہو کہ قومی امتحانات میں

رٹا کر اول نمبر پڑتے میرے گھر کے ارد گرد دس ہزار ایکڑ زرخیز زمین ہو۔ گھر کے پہلو میں مچھلیوں کا تالاب ہو پائیں باغ میں ہر قسم کے پھلوں کے درخت ہوں۔ مجھے ایک نہایت خوبصورت بیوی دی جائے اور میرے لئے ماہ بیکر کتیرے ہوں سب کی سب مجھ سے والدانہ محبت کرتی ہوں میرے گھر کے کمرے چھت تک سوتے اور موتیوں سے بھرے ہوتے ہوں۔ میرے گودام اناج سے بھرتا ہوں۔ صندوق دولت سے پُر ہوں۔ مجھے شاہی مجلس کے نشیرو یا امیرالامرا کا رتبہ حاصل ہو اور میں اسی طرح باعزت اور خوشحال زندگی بسر کرتا کرتا سو برس کی عمر کو پہنچوں۔ یہ سرائے سننے کے بعد خدائے متعال نے جواب دیا۔ بھائی اگر زمین پر انسی زندگی ممکن ہو تو خود میں جا کر یہ زندگی اختیار کروں بھلا انسی زندگی میں کیوں دینے لگاؤ۔

گویا معقول رویہ یہ ہے کہ چونکہ ہمیں یہی فطرت دی گئی ہے لہذا ہمیں اسی کے ساتھ زندگی کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے کوئی مفتر نہیں۔ نفسانی خواہشیں اور ہمارے جاتی تقاضے یا تو بنیادی طور پر برے ہیں یا بنیادی طور پر اچھے۔ لیکن ان کے بارے میں زیادہ باتیں بنانے سے کیا فائدہ ہوگا بلکہ الٹا یہ اندیشہ ہے کہ ان کی باتیں کرتے کرتے ہم انہی کے غلام ہو جاتیں! اس لئے بہتر یہ ہے کہ سچ کا راستہ (اختیار) اختیار کر لیا جائے۔ اس معقول رویے کی بدولت اسپاٹر عقول فلسفہ وجود میں آتا ہے کہ ایک مہذب و سچ خیال اور معقول عالم ہر انسانی لغزش ہر قسم کی بد اخلاقی و چاہے اس کی نوعیت قانونی ہو اخلاقی یا سیاسی) کو معاف کر سکتا ہے۔ عام طور پر یہی چیزیں میں جنھیں انسان کی ذہن فطرتی یا انسان کی عام کمزوری کہا جاتا ہے! یعنی تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ قدرت یا خود اللہ تعالیٰ بے حد معقولیت پسند ہے جنہوں کا یہ خیال ہے کہ اگر

لوگ اپنی سمجھ کے مطابق 'معقولیت' سے زندگی بسر کر رہے تو انہیں کوئی اندیشہ نہیں
 کسی چیز کا نہیں۔ ضمیر کا سکون و اطمینان سب سے بڑی نعمت ہے اور یہ کہ جس شخص
 کا ضمیر آیتنے کی طرح صاف ہوا اُسے کسی چیز کا ڈر نہیں۔ حتیٰ کہ اُسے بھوت پریت
 سے بھی کوئی خدشہ نہیں۔ گویا جب تک ایک معقولیت پسند خدا 'معقول' اور کچھ نا معقول
 نبروں کے معاملات کا نگران ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ٹھیک ہے 'معقول' لوگوں
 کو کئے کا پھل بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ظالموں کو موت نہیں لینے دیتی۔ غسدار
 خود کشتی کر لیتے ہیں۔ اور غاصبوں کو آخر میں ہر چیز ذروخت ہی کرنی پڑتی ہے
 جس شخص نے عمر بھر نادرات جمع کئے اور ان 'ادات' کے لالچ اور ناجائز
 قبضہ اور ہر بڑے ذریعے سے کام لیا، اس کے بیٹے یہ ذمہ سیرہ آتی مختلفوں
 اور مشکلوں سے جمع کیا ہوا یہ ذخیرہ ایک ایک چیز کے بیچ ڈالتے ہیں اور یہی
 ذمہ سیرہ بکھر کر گھر گھر پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح قانون کا جرم عیاں ہو جاتا ہے وہ
 پکڑے جاتے ہیں۔ اور ان پر فرے مردوں منظورم عورتوں کا صبر پڑتا ہے اور انکا بدلہ دیکھا
 دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی مظلوم گھبرا کر پکارا مٹھا کرتا ہے۔ شاید ناکسٹ رفتار
 کے آنکھیں نہیں (یعنی انصاف کو آنکھیں اندھی ہیں) بگریہ پکارنا ذرا دور ہی سنائی
 دیتی ہے۔

گویا، کنفیو شس اور تاؤ دونوں کے نزدیک اس فلسفے کا نتیجہ اور مقصد اعلیٰ
 یہ ٹھہرتا ہے کہ فطرت کو پوری طرح سمجھا جائے اور اس کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے
 زندگی بسر کی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے میں "معقول فطرت پرستی" کہتا ہوں۔
 ایک معقول فطرت پرست حیوانوں کے سے اطمینان

کے ساتھ اس زندگی کو بسر کرنے پر گمراہ نہ ہوتا ہے۔ وہی بات جسے ایک ان پڑھ

چینی عورت نے کہا تھا:

”ہمیں کسی نے جتنا تھا، اور ہم نے دوسروں کو جتنا دیا۔ اس کے علاوہ کیا بھی کیا

جاتا؟“

اس نعرے میں بڑی گہری راز و نیاز ہے گویا اس کے مطابق زندگی محض ایک جیا جیتی فعل ہے اور اس طرح بقا کا سارا مسئلہ ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے یہی جذبہ اس بڑھے چینی کا موتا ہے جو اپنے ننھے پوتے کا ہاتھ پکڑے بازار میں نکلتا ہے دکان میں جاتا ہے کہ پوتے کے لئے کچھ مٹھائی خریدے لیکن اس کے دل میں خیال یہ موتا ہے کیا خنجات برس بعد موت اُسے ابدی نیند ملادے گی اور وہ بھی اپنے آبا کے ساتھ خاک میں مل کر خاک ہو جاتے گا اور یہ ہے زیادہ ہمیں یہ بکھنسی چاہیے کہ ہمارے بیٹے اٹھ پوتے ایسے نہ ہوں کہ ہمیں ان کی وجہ سے شرمندگی، ٹھکانی پڑے۔

اور بس ————— چنانچہ چینی زندگی کا سارا نظام اسی ایک خیال اسی ایک تصور پر استوار کیا گیا ہے۔

۲۔ خاک کا پتلا

تو سارا مسئلہ یہ ہوا کہ: انسان زندہ رہنا چاہتا یہ مگرا سے اسی زمین پر زندہ رہنا پڑے گا اور اسے آسمانی زندگی کے سارے نیال ترک کرنے ہوں گے۔

ہندو سچ کو تخیل کے پردوں پر لٹ کر دیوتاؤں کی زندگی بستی تلاش نہیں کرنی ہوگی اور اس زمین کی ہر گز بھلائی نہیں ہوگا۔ ————— آخر تم فانی ہی آہیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے ہمیں جینے کی ایک خاص مدت (مثلاً دنیاوی طور پر ساٹھ اور سو ستر سال) دی

کئی ہے اگر ہماری روح بہت زیادہ مغز ہو جائے اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے
 تو یہ مدت خاصی کم ہے۔ لیکن اگر ہماری روح عاجزی اور غریبی کو اس لئے رکھے
 تو یہی عمر کافی طویل بھی ہے۔ زندہ خیال کیجئے کہ شہر برس کے عرصے میں زندگی کا اتنا لطف
 اٹھایا جاسکتا ہے اور کیا کچھ سیکھا جاسکتا ہے تین نسلوں کے برابر عمر اتنا طویل عرصہ
 ہے کہ اس میں انسان کی ساری حماقتیں چھٹی جاسکتی ہیں۔ اور انسانی دانش بھی حاصل
 کی جاسکتی ہے جو شخص تین نسلوں کی مدت عمر تک فلشنگ کی تبدیلیوں، صابط اخلاق
 کی تبدیلیوں اور سیاسی تبدیلیوں کو خوب دیکھتا رہا ہو اسے وقت آنے پر بڑے
 اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑے ہونا چاہیے اور اس آخری رخصت کے وقت
 بڑی خوش دلی سے کہنا چاہیے: بس، بہت ہو چکا، میں نے بہت کچھ دیکھ لیا، یہاں
 بڑا دلچسپ بڑا عملہ تھا! —

آخر ہم خاک کے تیلے میں خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور خاک ہی کے زندانی ہیں
 اور یہ کوئی تاسف کی بات نہیں۔ یہ غم فضول ہے کہ ہمیں اس حسین دنیا میں
 عارضی بہانوں کی حیثیت سے بھی کیا ہے۔ اگر یہ دنیا اتنی حسین نہ ہوتی اور محض
 ایک اندھیری کال کوٹھری ہوتی تب بھی یہاں بری بھلی بسر کرنا ہی تھی،
 لیکن اگر یہ دنیا کال کوٹھری کے بجائے ایک خوبصورت جگہ ہے اور اس میں ہمیں
 ایک صدی کا بڑا حصہ ہنسنے کی جگہ مل گئی ہے تو زندگی اچھی طرح نہ گزارنا
 سخت ناشکری ہوگی! — اکثر اوقات ہم ذرا اونچا اڑنے لگتے ہیں اور اس
 قدروں سے لٹی ہوئی مگر نہایت فراخ دل دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں پھر
 بھی اگر ہمیں روحانی سکون مطلوب ہے تو ہمیں اس دھرتی، آسمان کے لئے اپنے
 دل میں کچھ محبت اور سچا لگاؤ پیدا کرنا ہوگا جو ہماری روح اور ہمارے جسم کا گھر

لہذا ہمیں اس دنیا کو زندگی کو اسی طرح قبول کر لینا چاہیے جس طرح وہ ہے یہ سر زمین یہ گمراہی اور جنت کے مقابلے میں بڑی ٹھوس اور حقیقی چیز ہے۔ جنت آخر ایک غیر حقیقی تصور ہی تو ہے۔ انسان کی خوشی نصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ اس حقیقی دنیا اور اس غیر حقیقی جنت کے مابین پیدا کیا گیا ہے۔

گویا اعلیٰ فلسفہ وہ ہے جو شروع ہی میں یہ تسلیم کرے کہ ہم روح کے ساتھ ساتھ ایک جسم بھی رکھتے ہیں۔ اب تو ہم میں سے کسی نہ کسی 'جسرات مند' کو یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ بھائی آخر ہم میں تو حیوان ہی ہے! ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور حیاتیات کی زبردست ترقی اور کیمیائی ترقی کے پیش نظر یہ سچائی ثابت ہو چکی ہے اور اب یہ ماننا ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم حیوان ہیں! بد قسمتی سے ہمارے استاد اور ہمارے فلسفی 'تام نہاد دانشوروں' کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس طرح مروجوں کو اپنے چمڑے پر غرور ہوتا ہے۔ اسی طرح انہیں اپنی ذہانت اور عقل پر بڑا غرور ہوتا تھا۔ ہمارے روحانی پیشوا بھی روح کے بارے میں اتنے ہی مغرور تھے۔ بعض دفعہ جب 'روح' بھی اتنی راز کا چیز ثابت نہ ہوتی تھی تو ان حضرات کو تصور 'اور بر دز' اور 'جوہر مطلق' جیسے نفلوں کا سہارا لینا پڑتا تھا تاکہ ہم لوگوں پر رعب طاری ہو جائے! چنانچہ 'اسی' روحانی مشین کے ذریعے سے انسانی جسم کا گویا جوہر کھینچا گیا اور اسے 'روح' قرار دیا گیا اور پھر اس 'روح' کو مقطر کر کے اسے 'جوہر' کہا گیا۔ اور ہم غریبوں سے امید کی گئی کہ اس جوہر کا پیالہ لی لیں اور سب کچھ بھول جائیں۔ 'روح' کو اتنی اہمیت دینا بڑا ہلکا ثابت ہوا۔ اس کی بدولت ہمیں خواہ مخواہ اپنی جبلت سے رونا پڑا۔ چنانچہ مجھے سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ ان روحانیت

حسبم اور روح

کی بدولت، انسانی فطرت کو بھیرا کل نہیں پرکھا جاسکا۔ یہ نظریہ حیاتیات اور نفسیات کے نہایت قلیل علم پر مبنی تھا۔ اس نظریے کے رائج کرنے والوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارے حواس ہمارے جذبات اور جبلتیں ہماری زندگی میں کیا مقام کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ انسان گوشت پوست اور روح دونوں سے مل کر بنا ہے یہ دیکھنا فلسفے کا کام ہے کہ جسم اور روح دونوں ہم آہنگی سے پروان چڑھیں اور ان دونوں میں پورا سمجھوتا مکمل مفاہمت رہے۔

۳۔ جسم اور روح

سب سے بات جو فلسفیوں کو نظر نہیں آتی وہ یہ ہے کہ انسان جسم جس رکنتا ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما قافی انسان کی خامیوں سے تنگ آکر اور ہماری حیوانی اغلاہتوں سے اکتا کر بعض دفعہ یہ آرزو کرتے ہیں کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح ہوتا۔ مگر یہ بات انسانی سمجھ سے بلا ہے کہ یہ فوری فرشتوں کی زندگی بھلا کیا زندگی ہوتی ہوگی۔ کیا تو ہم یہ سمجھیں کہ فرشتوں کا بھی جسم ہوتا ہے اور ان کی شکل و شمائل ہم جیسی ہوتی ہے۔ صرف پردوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور پایہ کہ اس کی کوئی صورت شکل ہی نہیں ہوتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عام طور پر فرشتے کا تصور یہی ہے کہ اس کا جسم انسان کا سا ہے مگر اس کے پر بھی ہیں! میں تو یہ کہتا ہوں جسم اور پانچوں حواس رکھنا فرشتوں کے لئے فائدہ مند سودا ہے اگر میں فرشتہ ہو جاؤں تو میں چاہوں گا کہ میرا چہرہ خوشتر کیوں کا سا ہو۔ مگر جب تک جلد نہ ہوگی خوشتر کیوں کا سا چہرہ کہاں آئے گا، اور پھر فرشتہ بن کر بھی تو میں سنگترے کا ٹھنڈا شربت

پہنا چاہوں گا۔ مگر جب تک پیاس نہ ہوگی۔ اس کا کیا مزہ آئے گا؟ اور اگر بھوک ہی نہ ہو تو کھانے کا کیا مزہ ملے گا؟ آخر ایک فرشتہ انگوں کے بغیر کیا تصور کشی کرے گا؟ تو تو سماعت کے بغیر کیا بجا سکے گا؟ اور ناک کے بغیر شمیم معج سے کیا لطف اٹھائیگا اور جب کھجلی نہ ہوگی تو کھجورے میں جو مزہ ملتا ہے وہ کیسے محسوس کر سکے گا؟۔

ایسے سکھ اور ایسے اطمینان پر خاک۔ یا تو یہ کہ ہم جسم رکھتے ہوں اور جسم کی خواہش پوری ہو سکیں۔ یا پھر ہمیں محض روح ہی عطا ہوتا کہ اسے کسی سکھ یا کسی اطمینان کی ضرورت ہی نہ ہو ہر اطمینان کی تہ میں طلبتہ کا ہونا لازمی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کسی بھوت یا فرشتے کے لئے یہ کتنی بڑی سزا ہے کہ اس کے پاس جسم نہیں۔ وہ کسی ٹھنڈے چشمے کو دیکھتا ہے مگر اس میں کدو تے سے لئے اس کے پاؤں نہیں۔ اسے پانی کی خوش گوار ٹھنڈک سے کوئی خوشی کی بھر محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ بھوت یا فرشتہ بھٹی ہوئی مرغابی دیکھے گا مگر اسے چلنے کیلئے اس کے پاس زبان نہیں ہوگی۔ وہ اسے چبا نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے دانت نہیں دیتے گئے! وہ اپنے محبوب ہسر سے کچھ گا مگر وہ کچھ محسوس نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ جذبات سے عاری ہے!۔ ذرا دیکھئے یہ کتنی المناک بات ہے کہ ہم روحیں بن کر پھر اس دنیا میں آئیں اور اپنے پتوں کے کپڑوں میں چپا چپا داخل ہوں اپنے کسی پیچے کو بستر کھیتے ہوئے دیکھیں مگر ہمارے ہاتھ نہیں کہ اسے پیار کر سکیں یا زور نہیں کہ اسے گلے لگا سکیں ہمارا سینہ نہیں کہ اس کے جسم کی پیاری گرمی ایسی ہی سرامیت کر سکے شالے اور گلے کے وہ میان کوئی جسگ نہیں کہ اس کا ننھا ساسر وہاں تک سکے اور کان بھی نہیں کہ اس کی پیاری آواز بھی سن سکیں۔

یہ جواد کہ فرشتوں کا جسم ہوتا ہی نہیں، تو اس کی تشریح بڑی مبہم ہے اور پھر یہ جواز اور بھی غمیر تسلی بخش ہے! — آپ کہہ سکتے ہیں کہ "بھائی روحوں کی دنیا میں ہمیں ایسی انسانی خوشیوں اور اطمینان کی ضرورت نہیں ہوتی!" — میں کہتا ہوں "اچھا، یہی 'مگران' کی جگہ فرشتوں کی دنیا میں اور کیا ہے؟" — اس کا جواب کچھ نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری روحوں کی دنیا میں مسکمل غلابے پورا سکھ — پورا اطمینان ہے! میں پوچھتا ہوں "اس سے کیا حاصل؟"

جواب ملتا ہے "روحوں کی دنیا میں ہمیں کام نہیں کرنا پڑتا، وہاں درد و الم

منفوق ہیں!"

میں مانتا ہوں۔ اس دنیا میں مشقت کرنے والے غلاموں کے لئے تو بڑی دلکشی ہو سکتی ہے! مگر یہ ایک منفی نصب العین ہے۔ خوشی کا تصور بدھمت کے پروردگار بھکشوؤں کو تو بجا سکتا ہے اس زلنے کے انسان کے لئے اس میں کوئی کشتش نہیں۔

یہ قیاس آرائیاں بیکار ہی! — مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ "بے تو اس روح کا تصور بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ہم روز بروز یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خود کائنات بھی ایک ذی حسی موجود ہے میں سمجھتا ہوں کہ سکون کے بجائے حرکت ہی روح کی لازمی خصوصیت قرار دی جانی چاہیے۔ بے جسم کے فرشتے یا روح کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ ایک مرکز کے گرد چلے تو ۳۰ ہزار چکر فی سکنڈ کے حساب سے گھوم سکے۔ ہو سکتا ہے اس حرکت میں ہی اس روح کے لئے بے پایاں مسرت پنہاں ہو۔ اتنی مسرت جو ہمیں کسی خوبصورت جزیرے کی سیر میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ یقیناً یہ حرکت ایک قسم

کی سنسنی، ایک قسم کے احساس کے مترادف ہوگی۔ یہ نہیں تو شاید بے جسم فرشتہ اروشی کی ہر دوں کی طرح خلاؤں میں ایک لاکھ پھیلاسی ہزار میل فی سکینڈ کے حساب سے سفر کر سکے گا۔ گو یا اس طور سے فرشتے بھی کسی نہ کسی طرح کا کام کر کے مسرت پائیں گے علوی اددوہ عالی رنگوں اور صداؤں کو محسوس کر سکیں گے اور آسمانی ہوائیں ان کے بے وجود گان تھپتھپا سکیں گی۔ اگر یہ نہیں تو روح بھی بند پانی کی طرح باسی اور بڑی ہو جاتے گی اور یا آتی ٹھس محسوس کرے گی جتنی ہم آپ کسی نہایت گرم سہ پہر کو محسوس کرتے ہیں کہ جب ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی حسرت اور ترازت کو کم کرنے کے لئے میسر نہیں آتا۔ گویا زندگی کا تو مقصد یہ ہے کہ حرکت اور جذبات اور تحریک لازمی طور پر موجود ہیں چاہے ان کی شکل کچھ ہو کیونکہ زندگی مکمل سکون اور کامل بے حسی کا نام ہرگز نہیں ہے۔

۴۔ انسانیت بارے میں حیا پرانی منظر یہ

آزمیں اپنے جسم اور جسم کے اعضائی حرکتوں کا خوب علم ہو اور ہمیں اپنے روحانی افعال کا بھی علم ہو جاتے تو ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مرد ملتے ہیں۔ اس طرح ہمیں اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا سچا علم ہوتا ہے۔ اسی علم کی برزومت ہم انسانیت کے بارے میں لفظاً حیوان سن کر ہرکتے نہیں۔ کیونکہ اس طرح اس لفظ کا روایتی مفہوم اور اس مفہوم کی تلافی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مقولہ ہے کہ جس غلطی کی سمجھ آجاتے اسے معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ یہ مقولہ ہمارے روحانی اور جسمانی افعال پر بھی صادق آتا ہے۔

اپنے جسمانی افعال کو بہتر طور پر سمجھنے سے ہم ان افعال کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے، مگر ہے بالکل سچ اہم بات یہ ہمیں ہے کہ ہمارا نظام ہضم اعلیٰ چیز ہے یا ادنیٰ۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ہمیں اس نظام کو سمجھنا ہے اور یہی بات سمجھ میں آجائے اور اعلیٰ بن جاتی ہے۔ ہمارے سارے جسمانی افعال کا یہی حال ہے۔ بلکہ ہر حیاتیاتی عمل کا یہی حال ہے۔ یہ جیسا ہے جسم کے مسامروں سے پینے کا نکلنا ہو یا جسم سے فضلے کا خارج ہونا ہمارے غدد و دماغ اور اعصاب کا کوئی نفل ہو یا ہمارے جذبات و حسیات کی کوئی حرکت کوئی لڑائی۔ ہم ان کے نظام ان کی ماہیت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے گوردوں سے کوئی نفرت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم صرف یہ جانتا چاہتے ہیں کہ گوردوں کا کام کیا ہے۔ اس زمانے میں کسی خواب دان کو جسم کی عمومی کمزوری کی علامت نہیں سمجھا جاتا جو یہ منادی کرتی ہے کہ لب جسمانی توجہ کا وقت بہت گیا اب کچھ اپنی روح اپنے روحانی اعمال کی فکر کرنی چاہیے بلکہ اب خراب دانت کا احساس ہوتے ہی ہم اپنے دندان سنار کے پاس جاتے ہیں وہ اس دانت کو ٹھیک کرتا ہے تو اس دانت کی قدر ہمارے دل میں بڑھ جاتی ہے کیونکہ اب ہمیں سیمب اور مرغیاں اور گودے والی ہڈیاں چبانے میں زیادہ مزہ لگے گا۔ پرانے دانتوں کے تاکہ خیال فلسفی یہ کہتے تھے کہ انسانی دانت انسانی نہیں بلکہ شیطانی ہیں۔ پھر افلاطون آئے جو انسانی دانتوں کے وجود ہی سے انکاری تھے۔ جب میں کسی فلسفی کو دانت کے درد میں تڑپتا دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کوئی نشاٹا پسند شاعر جب بد ہضمی کے مارے کراہے تو بھی عجیب سماں ہوتا ہے میں اس وقت سوچتا ہوں یہ لوگ اب بھی شاعرانہ اور فلسفیانہ موثر گائیوں میں کیوں مشغول نہیں؟

انسانیست کے بار میں حیاتیاتی نظریہ

اور اب اپنے سوچے ہوئے کال کیوں پہلا ہے؟ یہ اسی طرح کیوں ہے چہن ہی جس طرح ایک عام مرد و ایک عام عورت جو انسانی دانتوں کو حقیقی دانت سمجھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں خوشی اور طسرب کے ترانے گانے والا یہ شاعر اب کیوں لاٹ رہا ہے؟ اب نہ ترانے کہاں گئے؟ اسے پہلے پتا نہیں تھا کہ انسان کا پیٹ اور اس کی آنتیں بھی حقیقی وجود رکھتی ہیں؟ اس وقت یہ اپنے پیٹ اور آنتوں کے فعل سے بالکل غافل ہو کر روحانی ستروں کے گیت گایا کرتا تھا۔ یہ غفلت کتنی سخت ناہنجری

ساتھ نے اگر ہمیں کچھ سکھایا ہے تو یہ کہ اس نے ہمارے دل میں ہمارے جسم کے لئے احترام کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس کی بدولت ہمارے دل میں تعجب اور سربستہ رازوں کا احساس پیدا ہوا ہے۔ سائنس نے ہمیں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ ہم کیسے وجود میں آئے۔ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارا وجود خاک سے نہیں ہوا بلکہ ہم حیوانوں کے ایک لمبے شجرے کے سرفہرست ہیں۔ گویا علم حیاتیات نے انسانی شرف کو اور بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس روز میں پر ہم سب سے شاندار مخلوق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم حیاتیات کی بدولت اب ہمیں انسانی جسم کے حسن اور اس کے اسرار کا پورا پورا احساس ہو چلا ہے۔

اب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے جسم کے اندر کیا کیا اعضا اور حصے کس کس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، ہمیں پتا چل گیا ہے کہ اتنی عجیب و غریب مشین کا اس طرح کام کرنا بے حد مشکل بلکہ محال ہونا چاہیے تھا مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سارا تال میل کس ساوگی اور کس آسانی سے

ہو رہا ہے۔ چنانچہ سائنس نے، انسان کے اندرونی کیمیاوی افعال کی تشریح کر کے انہیں ہمارے لئے آسان نہیں کیا بلکہ انہیں اور بھی تشریح طلب بنا دیا ہے۔ ادا ہے۔ یہ حال ہے کہ عام لوگ سمجھتے ہیں انسانی جسم کے اعضا کا علم اچھی طرح نہ آتا ہو وہ اس کی مشکلات کا تصور نہیں کر سکتا۔ گویا باہر کی کائنات پر اسرار کا جو پردہ پڑا ہے وہ پردگی اور سرستگی انسانی جسم کے اندرونی رازوں کے بارے میں موجود ہے!

انسانی جسم کے ماہرین ہمارے اعضا اور ہمارے جسم کے مختلف انواع کی حرکات اور افعال کی تشریح کرنے میں جتنا زہد لگاتے ہیں، جتنی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی ان کی حیرت بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض ماہرین تو کہتے ہیں کچھ وسیع خیالات ملے ہوں، رفتہ رفتہ صوفیوں کا نقطہ نظر قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال علم الاجام کے مشہور ماہر ڈاکٹر ایکس کیرل کی ہے۔ جس نے اپنا نقطہ نظر اپنی کتاب "انسان — ایک سر بستہ راز" میں واضح کیا ہے۔ ممکن ہے ہمیں ڈاکٹر مونس سے اختلاف ہو مگر انہوں نے صرف حقائق کو پیش کیا ہے۔ ان کی کوئی تشریح نہیں کی اور نہ ان کی تشریح ہو ہی سکتی تھی وہ دیکھتے ہیں۔

انسانی اعضا کو عضوی رطوبتیں اور اعصاب ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔ جسم کا ہر عضو دوسرے عضو کے ساتھ مطابقت اور موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ باہمی مطابقت کا یہ فعل ایک خاص نعمت اخلاص مقصد کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہمارے جسم کے سارے خلیے بھی اسی طرح عقل کے مالک ہیں جس طرح خود انسان ہے تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ سارے جیاتی افعال ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں آتے ہیں۔ گویا جسم انسانی کے اندر تکمیل کا وجود

ناقابل انکار بن جاتا ہے۔ ہمارے جسم کا ہر عضو یہ جانتا ہے کہ سارے جسم کی فوری ضروریات کیا ہیں اور سارے جسم کو آئندہ کیسی ضروریات درپیش ہوں گی۔ چنانچہ ہر عضو ان فوری ضرورتوں اور آئندہ ضرورتوں کے مطابق کام کرتا ہے۔ ہمارے ذہن کیلئے زمان اور مکان کی اہمیت خاص ہے۔ لیکن ہمارے خلیوں کے لئے یہ اہمیت مختلف ہے۔ ہمارا جسم، قریب کی اشیاء اور تقاضوں سے باخبر ہوتا ہے لیکن اسے مستقبل کے تقاضوں کی بھی خبر ہوتی ہے۔ گویا نزدیکی اور دوری اس کے لئے الگ الگ وجود نہیں رکھتیں! ہمیں یہ انکشاف سنکر رڑی حیرت ہوگی کہ ہماری آنتیں اپنے زخموں کو ہماری شعوری کوششوں کے بغیر مندمل کر لیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

آنتوں کا زخمی حلقہ پہلے پہل تو بے حرکت ہو جاتا ہے گویا عارضی طور پر بیکار اور مفلوج بن جاتا ہے۔ اس طور پر بٹنی معدے میں نہیں جانے پائیں۔ ساتھ ہی آنتوں کا کوئی اور حلقہ اس زخمی حلقے کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اپنی خاصیت کے مطابق اس کے ساتھ چمٹ سا جاتا ہے۔ کوئی چار پانچ گھنٹے کے اندر اس پر جسم بیل مائل ہے وہ زخم بھی چنہیں سرجن لے سوتی ہے سیاہی ان کا انداز بھی اپنی رطوبتوں کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔

آپ نے دیکھا، انسانی گوشت میں کتنی ذہانت، کتنی عقلندی پنہاں ہے؟ تو پھر ہمیں انسانی جسم کی نفرت کیوں ہے؟ فوراً دیکھیے کہ ہمیں ایسا جسم عطا کیا گیا ہے جو اپنی پرداختنا آپ کرتا ہے جو خود بخود اپنے آپ کو منظم رکھتا ہے، اپنی مرمت

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانی جسم کی مشین کو زندگی کے پہنک، اس کی
 نئے کا سچا شعور ہے۔ اس وقت کا پورا اور اکہ ہے یہ مشین محض گھنٹوں اور منٹ
 کا ہی نہیں بلکہ برسوں کے گزراہ نے کا واضح شعور رکھتی ہے۔ انسانی جسم اپنے بچپن
 اپنے بلوغ، اپنی نچنگی کو خود کنٹرول کرتا ہے۔ اس وقت پر مٹنا، پھلنا، پھولنا بند کر دیتا
 ہے۔ جب اس کی ضرورت نہ رہے اور پھر ایک عقل ڈارٹھو نکالتا ہے۔ یہ دانت
 اس وقت نکلتا ہے جب ہمیں اس کا خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ اب بھی کوئی دانت
 نکل سکے گا۔ گویا ہماری شعوری عقل میں ابھی مزید عقل کے اضافے کی گنجائش کتنی
 انسانی جسم زہر کے مناسب تریاق نہاتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ اس کامیابی اور
 ایسی خاموشی سے کرتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہ انسانی مشین کسی
 کارخانے کی طرح دنیا بھان کا شور نہیں مچاتی۔ اور پھر ہمارے نکتہ میں روحانیت۔
 پرستوں کو اتنا وقت اور اتنا سکون اور خاموشی سہیا کرتی ہے کہ وہ اپنے "جوہرات"
 اور روح لوزاں کے بارے میں جی بھر کے سوچ سکیں اور جس جسم کی بدولت
 انہیں یہ فرصت میسر آئی ہے اسے کوس سکیں۔

۵۔ حیات انسانی ایک نظم

میں سمجھتا ہوں کہ حیاتیاتی نقطہ نظر سے انسانی زندگی بالکل ایک نظم کی
 طرح ہے۔ اس کا اپنا وزن اور اپنی بھر ہے اس کے بناؤ بگاڑ کے چکر اپنے
 ہیں۔ یہ نظم معصوم بچپن سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے بعد بلوغ کا کڑھب
 نانا آتا ہے جب پختہ کل سماج کے ساتھ پنپ سکنے کی کڑھب کوششیں کی جاتی

ہیں یہ زمانہ جذباتی سرشوری اور ادانی کا ہوتا ہے۔ اس کے نصیب الحین اور انگلیں اپنی ہوتی ہیں۔ پھر یہ بلوغ، پوری جوانی میں بدلتا ہے جو گہری سرگرمی اور مصروفیت کا زمانہ ہے۔ جب تجربے سے سبق حاصل ہوتے ہیں اور انسان دوسرے انسانوں اور انسانی فطرت کے بارے میں بہت کچھ سمجھتا ہے۔ پھر ادھیڑ عمری کے دن آتے ہیں تو تناؤ میں کچھ آسودگی آجاتی ہے اور آدمی کا کردار کچھ ہوتے پھسل، یا سا لوزردہ شرب کی طرح کچھ دھیما پن، کچھ گہرائی کچھ محنگی حاصل کر لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان زیادہ روادار زیادہ حقیقت بین ہو جاتا ہے اور زندگی کے بارے میں اس کے نظریہ میں حلم اور رواداری کا پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ پھر زندگی کی شام آتی ہے اور ہمارے جوانی والے غم و اپنا کلم پھوڑ دیتے ہیں اور اگر ہمارے ساتھ لوڑھے ہونے کا کوئی صحیح نظریہ رہا ہے اور ہم نے اپنی زندگی کو اس نظریے کے مطابق بسر کیا ہے تو شام زندگی کا یہ وقت، یہ بڑھاپا، بڑے امن و سکون بڑے حفظ و امان، بڑی فسرست اور بڑے اطمینان کا زمانہ ہوتا ہے۔ پھر زندگی کا شعلہ بجھ جاتا ہے اور آدمی ابدی نیند سو جاتا ہے جس سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوگا۔

فدا زندگی کے اس آہنگ اس لئے کا حسن ملاحظہ کیجئے۔ اس میں وہی حسن آہنگ ہے جو اعلیٰ پائے کے فنموں میں ہوتا ہے۔ بالکل ان فنموں کی طرح ایک مرکزی خیال کشمکش کے تان پلٹے اور پھر اختتامیہ (سنچلری) عام انسانی زندگی میں بھی یہی جکر چلا کرتے ہیں البتہ یہاں گانے والا اور سننے والا ایک ہی ہوتا ہے۔ بعض انسانوں کے نغمے زندگی میں بے آہنگ سر زیادہ جڑتے ہیں اور یہ اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ اصل نغمہ بھی دب کر رہ جاتے۔ بعض اوقات مردانگی

حیات انسانی۔ ایک نظم

۶۱

یہ بے آہنگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ نغمہ جاری ہی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایسا شخص اپنے آپ کو گولی مارتی ہے یا دریا میں ڈوب کر خود کشی کر لیتا ہے مگر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس نے اپنے مقصد حیات و نغمہ زندگی کے اصلی خیال، پر خود اختیار کی کمی کو غلبہ پالینے دیا تھا۔ ورنہ عام انسانی زندگی ایک بادقار آہنگ کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ہم میں سے بعض دفعہ بعض لوگ بے صبرے اور جلد باز ثابت ہوتے ہیں اور چونکہ ان کی لئے اور مال صحیح نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کا نغمہ زندگی ہمارے کانون کو بھلا نہیں لگتا۔ ہمیں تو اپنے نغمہ زندگی کے لئے گنگا کا سا بادقار آہنگ چاہیے جو آہستہ آہستہ اور ازل سے لے کر آج تک خاموشی سے بہتی ہوئی سمندر میں عا ملتی ہے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زندگی، اپنے بچپن، اپنی جوانی اور اپنے بڑھاپے کے ساتھ ایک خوب صورت ضابطہ نہیں ہے۔ آخر دن کو بھی پہرا اور شام ہوتی ہے۔ ہر سان کے اپنے بدلتے موسم ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے زندگی میں کوئی چیز اچھی یا بری نہیں۔ بات اتنی ہے کہ ہر چیز اپنے وقت اور اپنے موسم کے مطابق بھی ہوتی ہے۔ اگر ہم اسی حیاتیاتی نظریے پر عمل کر کے وقت اور موسم کا لحاظ رکھیں۔ اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں تو زندگی ایک نظم کی طرح بسر کی جا سکتی ہے۔ اس سے انکار کرنا بے فائدہ یا تو کوئی خود پسند احمق ہوگا، یا کوئی کسٹر تصور پرست جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

نظم کو اپنے ایک مشہور پرائیڈ میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ اس میں اس نے زندگی کے ساتھ جتنے کئے ہیں۔ ایک چینی مصنفین نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ٹیکسٹر کو مذہب سے کوئی دلچسپی یا خاص سرکار

انسان کیا ہے؟

نہیں تھا۔ یہ اس کی عظمت ہے کہ اس نے زندگی کے حقائق پر نظر رکھی اور نظام زندگی میں اتنی ہی کم مداخلت کی جتنا کم بغل در معقولات وہ اپنے کرداروں کی تصویر کشی میں کرتا تھا۔ اصل میں شیکسپیر خود فطرت کی طرح تھا جو اسباب اور اشیاء پیش کرتی ہے۔ لیکن اپنا آپ ان کے روپ میں ظاہر نہیں کرتی۔ غالباً ایک ادیب یا ایک مفکر کی سب سے بڑی تحسین یہی کر سکتے ہیں کہ وہ فطرت کے مثل ہے گویا شیکسپیر نے زندگی بسر کی، زندگی کا مطالعہ کیا، اور پھر وقت آنے پر اس دنیا سے چپ چاپ رخصت ہو گیا۔

باب سوم

ہمارا حیوانی ورثہ

(۱) ہندروالی داستان

(۲) انسان کی تخلیق

(۳) انسان فانی ہے

(۴) ہمارا پیٹ

(۵) مضبوط جسم

(۶) ذہن انسانی

۱۔ بندروالی داستان

زندگی کا حیاتیاتی منظر یہ ہمیں زندگی کے حسن اور آہنگ کا احساس ضرور دلاتا ہے مگر ہمیں ہماری مفلحانہ نیر حد بندیوں کا شعور بھی بخشنا ہے یہ نظریہ ہمیں ہماری اصل تصویر دکھا کر بتاتا ہے کہ ہم حیوان کی حیثیت سے کیا ہیں۔ اور اس کی بدولت ہم اپنے آپ کو انسانی معاملوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں انسانی فطرت کی بہتر سمجھ بوجھ اور انسانی فطرت کے لئے زیادہ گہری ہمدردی نصیب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نظریے کی بنیاد ہماری حیوانی جبلت اور اہلیت پر ہی حیاتیاتی نظریہ ہمیں چلنے سے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہم وحشی انسانوں کے بیٹے ہیں اور یہ وحشی انسان وہ تھے جو ایک خاص قسم کے بندر کا اولاد تھے۔ چنانچہ اس شعور سے ہمیں اپنی خامیوں اور اپنی کمزوریوں پر ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی بندروں کی سی مستعدی اور چالاکی پر ناز سا بھی محسوس ہونے لگتا ہے انسانی زندگی بھی کیا عجب تماشا ہے۔ اس خیال کو کلیئر ڈے سے اپنے مقالے "بندر ما انسانوں کی دنیا" میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے بھائیوں ان استہوار پاروں ان محققوں، فائنٹسٹس کے ایڈیٹروں، نازیوں، اسمبلی کے ممبروں اور قانون بنانے والوں، آمروں، انقلابی ماہروں اور کسین الاقوامی کانفرنسیوں کے مندوبوں، غرض کہ سب ایسے لوگوں کو معاف کر سکتے ہیں جو دوسروں کے معاملات میں دخل دینا اپنا فرض گردانتے

ہیں۔ ہم ان لوگوں کو اس لئے معاف کر دیتے ہیں کہ ہم ان کی فطرت کو سمجھنے لگتے ہیں۔

ان معنی میں یہ عظیم چینی روایت اور بھی زیادہ معنی خیر بن جاتی ہے کہ انسانی عقل بندر کی ہے اور اس روایت کے لئے میرے دل میں زیادہ سے زیادہ جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نقطہ نگاہ سے انسانی ترقی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس روایت کے مطابق بندر انسانی عقل اور ذہن کی علامت ہے۔ سور ہمارے حیوانی خصلت کا نمائندہ ہے بھکشن ہمارے سوجھ بوجھ کا نمائندہ ہے اور زود ہمت دانش اور آسانی راستے کی علامت ٹہرتا ہے۔ روہت اس عجیب قافلے کے ساتھ چین سے ہندوستان گیا تھا تاکہ بدھ مت کے مقدس صحیفے حاصل کر سکے۔۔۔۔۔

انسانی ترقی کی کہانی بھی اس بے ڈھنگے قافلے کی طرح ہے۔ یہ خامکار قافلے واسطے ہر قدم پر اپنی حماقت اور اپنی شرارتوں کی وجہ سے نئے نئے خطرے مول لیتے تھے اور عجیب مشکلوں میں گھر گھر جاتے تھے چنانچہ قافلہ سالار روہت کو بار بار شرارتی بندر کو اور بندہ نفس سور کو سزا دینی پڑتی تھی۔ ان کی قدم قدم پر اصلاح کرنی پڑتی تھی۔ بندر اور سور دونوں اپنے نیم نچتہ ذہنوں اور سفلی جذبات کی وجہ سے طرح طرح کی مصیبتیں مول لیتے تھے۔ چنانچہ انسانیت اپنے کمال اور ولایت کی منزل کی طرف سفر کر رہی ہے اس میں ہر گام انسانی خامیاں مثلاً غصہ انتقام بے صبری، نفس پرستی، کینہ پروری اور سب سے بڑھ کر خود پسندی اور تکبر انسان کے قدم پکڑتی ہیں انسان کی کارکردگی بڑھتی جا رہی ہے اور اس کارکردگی کے ساتھ ساتھ تباہی بھی بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ چینی داستان کے طلسمی بندر کی طرح ہم میں یہ قوت پیدا ہوتی جا رہی ہے کہ ہم اس راہ

پر چل سکیں، ہوا میں تسلا بارہاں لگا سکیں (اسے جدید رہانے میں ہوائی مشین کہا جاتا ہے) بندوں کی سی ٹانگوں سے بال نوح نوح کر دشمنوں کو ذبح کرنے کے لئے آگے بڑھنا ڈالیں، جنت کا دروازہ کھکھٹائیں اور جنت کے داروغے رضوان کو ایک طرف بٹھا کر جنت میں داخل ہو کر دیوتاؤں کی مٹھل میں ٹھرکھینے کا حق مانگیں۔

یہ بند چالاک تو ضرور تھا مگر خود پسند بھی تھا۔ اسے یہ ترکیب تو آئی تھی کہ زبردستی جنت میں جا داخل ہو۔ لیکن اس میں اتنا تو اذن اور اتنا شعور نہیں تھا، نہ اتنی رواداری تھی کہ جنت میں آرام سے رہ بھی سکے۔ یہاں کہ وہ جنت میں اس دنیا اور اس کی فانی زندگی سے نہیں بہتر حالت میں تھا۔ مگر وہ ابھی جنت اور دیوتاؤں کی مجلس کے قابل نہیں تھا۔ اس میں ناچنگی، شرارت اور بغاوت تھی۔ سونے میں کچھ کھوٹ باقی تھا۔ چنانچہ جنت میں داخل ہوتے ہی اس نے اور موسم مچا دیا۔ اور ہر کسی کو خوف زدہ کر دیا اپنی فطری سرسپندی کی وجہ سے اس نے اس سلاٹہ دعوت کو بھی تلیٹ کر دیا جو مفسرین لکھ افلاک نے، سارے دیوتاؤں اور دیویوں اور زندہ جاوید جنسیٹیوں کی عزت میں کرکھی تھی۔ اصل میں اسے یہ پتا تھا کہ اسے اس دعوت میں کیوں نہیں مدعو کیا گیا۔ چنانچہ اس نے ایک خلائی پیغامبر کا بہروپ بھرا اور جب نیگے پاؤں والی پری نے اس سے دعوت گاہ کا پتا پوچھا تو اس نے کہا کہ دعوت گاہ تبدیل کر دی گئی ہے۔ اور اس پری کو کسی دوسری جگہ بھیج دیا۔ پھر اس نے خود نیگے پاؤں والی پری کا بہروپ بھرا اور اس کی جگہ خود دعوت گاہ کی طرف چل نکلا۔ اس طرح اس نے کسی ایک پریوں کو گمراہ کیا اور جب وہ دعوت گاہ میں پہنچا تو وہ پہلا "ہمان" تھا جو دعوت میں آیا تھا۔ ابھی وہ

کوئی مہمان نہیں پہنچا تھا۔ صرف نوکر چاکر موجود تھے جو غلام گرد شروں میں طلسمی شراب کی حفاظت پر مامور تھے۔ یہاں پہنچ کر بندر میاں ایک کپڑا بن گئے جس کے کانٹے سے طشی اور نیند طاری ہو جاتی ہے۔ کپڑا بن کر اُس نے سب خادموں کو ڈس کر انہیں بے ہوش کر دیا اور ساری طلسمی شراب پی گیا۔ نشتے میں چومہ ہو کر وہ دعوت کے بڑے ہال میں پہنچا اور سارے آسمانی پھل چمٹ کر گیا۔ باقی مہمان جب آئے تو انہوں نے دیکھا کہ سارا معاملہ ہی چوہٹ ہے۔ اس وقت بندر میاں کسی اور کارنامے کے لئے جا چکے تھے، یعنی لاؤنس کے گھر جا کر، بقا کی مقدس لوبیل کھانے کی ٹرک میں تھے۔ آخر میں نہ جنت سے رخصت ہو گئے۔ کچھ اس ڈر سے کہ نہ جانے ان سارے کارناموں کی کیا سزا ملے اور کچھ اس غصے کے مارے کہ اسے دیوتاؤں کے اس سالانہ عشاءے میں بلایا کیوں نہیں گیا۔ بندر زں کی دنیا میں واپس آ کر یہ بندر بادشاہ بن گیا اور اس نے چھوٹے بندروں کو تہت کے سارے اسرار بتائے اور آسمانی بادشاہت کے خلاف بغاوت کا بھنڈا بٹند کیا جس پر یہ الفاظ تھے: ہمدرا قطب الاقطاب ہم پایہ خدا ہے اُس خیا پچہ آسمانی فوجوں اور بندوں کی فوجوں کے درمیان خونریز لڑائیاں شروع ہو گئیں اور یہ بڑا بندر اس وقت گرفتار ہوا جب رحم کی دیوی نے اسے بادلوں میں سے پھولوں کی چھڑی ماری اور اسے بے ہوش کر دیا۔

گویا اس داستان دالے بند کی طرح ہم ہمیشہ بغاوت کرتے رہتے ہیں۔ ہم میں اس وقت تک کوئی امن کا جذبہ اور کوئی عاجزی پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک رحم کی کوئی دیوی پھولوں کی بارش کر کے ہمارے قدم دگمگماتی ہے۔ پچ تو یہ ہے کہ جب تک سائنس اس کائنات کی ساری حدود نہ پہچان لے ہم

میں فرود تھی اور انکسار پیدا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ بندر کی اسی چینی داستان میں کہا گیا ہے
 کہ جب یہ بندر پر آگیا تو اس وقت بھی وہ بائیں تھا۔ اس نے شہنشاہ و انظار سے
 مطالبہ کیا تھا کہ اُسے دو سکروں کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ اور خطاب دیا
 جائے۔ اس نے عاجزی اسی وقت اختیار کی جب وہ مہاتما بدھ یا غالباً خود خط
 سے وہ شرط ہار گیا۔ شرط یہ تھی کہ اگر وہ اپنی طلسمی طاقتوں کے بل پر زمین کے
 آخری کونے تک جانے میں کامیاب ہو گیا تو اُسے "قطب الاقطاب" یا
 خدا کا لقب دیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ ہار گیا تو پھر وہ پوری طرح ہتھیار ڈال دے گا
 چنانچہ بندر نے ہوا میں ایک زقند لگائی اور ملکوں ملکوں بھلی کی سی تیزی سے سفر
 کرتا رہا۔ آخر وہ ایک پہاڑ پر پہنچا جس کی پانچ چوٹیاں تھیں۔ اُسے یہ خیال آیا کہ شاید
 یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تک نانی مخلوق پہنچ سکی ہوگی۔ اس جگہ پہنچنے کا ثبوت
 دینے کے لئے اُس نے درمیانی چوٹی کے قدموں میں پشیا ب کر دیا اور اپنے
 کلنارے سے مطہر ہو کر واپس ہوا تاکہ مہاتما بدھ کو اس کا حال بتائے اس پر بھگوان
 بدھ نے اپنی ایک مٹھی کھولی اور کہا کہ میرے ہاتھ کی درمیانی انگلی کو جوڑ کے قریب
 اپنے اس پشیا ب کی بونگھو جو تم نے درمیانی چوٹی کے ناسن میں کیا تھا۔ بھگوان۔
 بدھ نے اُسے بتایا کہ تم تمہارا عرصہ میری اس مٹھی سے ہی باہر نہیں نکلے۔
 اس پر بندر کی سٹی گم ہو گئی اور اُس نے عاجزی اختیار کی۔ اُسے پانسو سال ایک
 چٹان کے ساتھ زنجیروں میں باندھا گیا اور آخر پر دہت نے اُسے چھڑایا اور
 اسے اپنے قافلے میں شامل کر لیا تاکہ ہندوستان سے مقدس صحیفے لاتے جائیں۔
 مگر یہ بندر جو ہمارا اپنا منظر ہے اپنی خود پسندی اور شرارت کے باوجود
 برادر کرنے کے قابل ضرور تھے ہمیں انسانیت سے اس کی تمام تزکوریوں اور خامیوں

کے بار وجود پیار کرنا چاہیے :

(۳) انسان کی تخلیق

تو گویا ہمیں انجیل مقدس کا یہ نظریہ سامنے نہیں رکھنا چاہیے کہ انسان کو خدا نے اپنی شبیہ پر پیدا کیا، بلکہ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ ہمیں بندگی شبیہ اور تمثال پر پیدا کیا گیا ہے۔ گویا ہم میں اور خدا میں اتنا ہی فرق اور بُعد ہے جتنا ہم میں اور حیوانوں میں ہے۔ ہم بڑے چالاک اور طباع ہیں اور اپنی ذہانت پر ہمیں فخر بھی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں شعور عطا کیا گیا ہے۔ مگر اس مرحلے پر ہمیں جیانا کے ماہر بناتے ہیں کہ شعور اور ذہن (نفس) ہمیں بہت بعد میں عطا ہوا اور ہم جسے نفس اخلاقی کہتے ہیں اس میں کچھ حیوانی یا بہیمی خواہشات بھی نفسِ مادہ کے ساتھ ساتھ شامل ہیں۔ انہی حیوانی یا بہیمی خواہشات کی وجہ سے ہم انفسِ ادنیٰ طود پر معاشرے کے اندر بد اخلاقیوں کرتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ یہ خواہشات بڑی قوی ہوتی ہیں۔ چنانچہ حیاتیات کی ان معلومات کی وجہ سے ہمیں انسانی ذہن کے بارے میں بہت کچھ پتا چلتا ہے۔ مثلاً ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ ذہن انسانی جس پر ہم اتنا ناز کرتے ہیں، بڑی محدود اور ناکافی چیز ہے۔ پھر انسانی کھوپڑی کی ساخت میں صدیوں پہلے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ رٹھ کی ہڈی کا ایک بڑھاپا ہوا حصہ ہے۔ اس لئے رٹھ کی ہڈی کی طرح اس کا کام بھی یہ ہے کہ خطرے کا خدشہ محسوس کرے، خارجی حالات کا سامنا کرے اور زندگی کا جو ہر محفوظ کئے دیکھا اس کا کام سونپا نہیں۔ یوں بھی غور و فکر کا کام انسانی دماغ کے بس کا رنگ نہیں

انگریز مدبر لارڈ بالفور کا یہ قول آئندہ نسلوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ "انسانی رماش بھی کھانا ڈھونڈنے کا ایسا ہی ایک عضو ہے جس طرح سگ کی کھونٹھنی ہوتی ہے! یہ کوئی تلخ بات نہیں بلکہ اس کی تہ میں تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ کفے والا انسانوں سے اچھی طرح واقف ہے!

بدیہہ سائنس کی روشنی میں اب ہمیں آہستہ آہستہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ انسان میں کتنی خامیاں موجود ہیں۔ مگر کیا کیا جاتے! خدا نے ہمیں بنایا ہی خام کھلاڑی ناممکن ہے۔ چنانچہ یہ بات بحث طلب بھی نہیں۔ آئی اصل یہ ہے کہ ہزاروں صدیوں پہلے ہمارے آباؤ اجداد زمین پر بیچتے تھے یا ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جھولتے پھرتے تھے۔ یا سنگروس کی طرح ایک ہاتھ کے سہلے یا محض دم کے سہارے کسی درخت سے بھگتے رہتے تھے۔ انسانی ارتقاء کی تاریخ کا یہ ہر نسل اپنی جگہ مکمل تھا۔ اور یہ اسے حیرت انگیز طور پر مکمل سمجھتا ہوں۔ مگر اب انسانی ارتقاء کے نئے موڑوں پر پہنچ کر ہمیں پھر سے اپنی جگہ بنانے لائنی نئی مفاہمتیں کرنے کا کٹھن کام ہر آن درپیش رہتا ہے۔

انسان جب ایک تہذیب کو جنم دیتا ہے تو وہ ترقی کے ایسے راستے پر چل نکلتا ہے جہاں ترقی کی لحاظ سے، شاید خود خالقِ اکبر کے لئے بھی حیرت انگیز ہوتا ہے۔ جہاں تک فطرت کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے اور فطرت سے کسمپورتا کر لینے کا تعلق ہے ہر جاندار کے لئے اس میں بڑا کمال رکھتی ہے کیونکہ جو مخلوق فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو سکے فطرت اسے ختم کر دیتی ہے۔ مگر یہ کام تو بولیا، اب ہمیں فطرت کے ساتھ ایک نئے نئے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے بنیادی ضرورت تو اب یہ ہے کہ ہم اپنے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ یعنی اس چیز سے مفاہمت کر سکیں

جسے ہم "تہذیب و تمدن" کہتے ہیں۔ جبلی تقاضوں کو سمجھتے۔ انہی جگہ ہر جبلت بڑی صحت مند تھی مگر آج کے تمدن معاشرے میں ہم ان فطری تقاضوں کو دنیا سے لٹا دیتے ہیں۔ لیکن جانوروں کو دیکھتے۔ ہر چوہا کچھ نہ کچھ چوری کرتا ہے مگر وہ چوری کی وجہ سے بے اخلاق یا بے اخلاق قرار نہیں پاتا کیونکہ چوری اس کی جبلت کا تقاضا ہے۔ ہر کتا بھونکتا ہے اور ہر بلی شام کو گھر واپس نہیں آتی اور جو ہاتھ آئے تو بھونکتی رہتی ہے۔ بشر خون کرتا ہے گھوڑا خطرے سے بھاگتا ہے اور کچھوا دن کا زیادہ حصہ سو کر گزارتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر چرندہ ہر شے کی دنیا والا جانور نہیں حیوان سب کے سامنے اپنے بچے جن لیتے ہیں۔ گویا ہماری تہذیب کے اعتبار سے ہر چوہا چور ٹہرا ہر کتا شوریدہ ساری کامر تکب ہوا۔ ہر بلی بے وفا ہوئی اندر شیر قاتل ہر گھوڑا بزدل ہر چھوٹا کابل قرار پایا۔ اسی طرح ہر چرندہ پرندہ بے اخلاق ہوا کیونکہ وہ اپنے ذہنی تقاضوں اور فطری کاموں کو سب کے سامنے پورا کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ہمارے جانوروں سے انسان بننے میں ساری کی ساری قدریں کیسے یک دم بدل کر رہ گئی ہیں!۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہی سوچتے رہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں اتنا عاقل اور غیر مکمل کیوں بنایا۔!

۳۔ افسانہ فانی ہے!

افسانہ جسم فانی ہے۔ مگر اس کے فانی ہونے کے نتیجے بڑے دورس ہیں پہلا نتیجہ تو یہی ہے کہ ہم فانی ہیں، سہیں، بقا نہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ہیٹ لگا ہوا ہے، ہمارے رگ چمٹے مضبوط ہیں۔ اور ہمارا ذہن محسوس اور گریہ

سے الامال ہے۔ ہماری ان خصوصیات نے ہماری تہذیب کی بیج اور نوعیت پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ باتیں بڑی عیاں ہیں۔ اسی لئے ہم نے ان کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہم جب تک انسان نامی پر غور نہیں کرتے انسان اور انسانی تہذیب کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

مجھے شبہ ہے کہ جمہوریت اور شاعری اور فلسفہ کبھی اس حقیقت پر مبنی نہیں کہتے گئے۔ کہ انسان چاہے بادشاہ ہو یا فقیر بس پانچ فٹ کے ایک پتے کا نام ہے جسے اس دنیا میں کوئی ساٹھ ستر برس زندہ رہنا ہے۔ لہذا ہمارا یہ انسانی نظام بڑا سیدھا سادہ ہے۔ قدر و قامت کے اعتبار سے انسان (جانداروں میں) نہ بہت چھوٹا ہے نہ بہت بڑا۔ کم سے کم میں تو اپنے پانچ فٹ چار انچ کے قدم سے بے حد مطمئن ہوں! پھر ساٹھ برس کی عمر میرے نزدیک بہت لمبی عمر ہے اس دوران میں دو تین نئی نسلیں پر دان چڑھ چکی ہیں۔ یہ اتہام موجود ہے کہ جب ہم پیدا ہوتے تو ہم اپنے باپ دادا کو دیکھیں جو اپنا وقت آنے پر رخصت ہو جاتے ہیں۔ وقت آنے پر ہم بھی دادا بنتے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے نواسے پوتے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نظام بڑا باقاعدہ بڑا مکمل ہے۔ اس چینی مقولے میں اصل دانش کی روح ہے کہ "ہو سکتا ہے آپ ایک ہزار ایکڑ رقبے کے واحد مالک ہوں۔ پھر بھی آپ پانچ فٹ لمبے بستر پر ہی سوئیں گے!۔ میں سمجھتا ہوں ایک بادشاہ کو بھی زیادہ سے زیادہ سات فٹ لمبے بستر کی ضرورت ہوگی جہاں وہ رات کو لمبا لیٹ کر سو سکے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں بادشاہ ہوں!۔"

یہ زندگی کی بات ہے۔ چاہے آپ کتنے امیر ہوں! انجیل مقدس کی رُود سے تو آپ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس جیئیں گے۔ کم لوگ ہی ایسے ہیں جو اس حد کو پار کرنے

ہیں۔ اور ان بزرگوں کو چینی زبان میں "ناور و قدیم" کہا جاتا ہے کیونکہ چینی کا مشہور قول ہے کہ "قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ انسان ستر برس کی عمر کے بعد کم ہی جیا کرتے ہیں۔"

یہی حال دولت کا ہے۔ اس زندگی سے ہر ایک کو کچھ حصہ ملتا ہے۔ مگر کسی کے پاس زندگی کا رہن نامہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ہم اس زندگی کو زیادہ اہم زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھتے۔ ہم اس روئے زمین پر موروٹی اور دائمی مزارعین نہیں ہیں ہم تو یہاں عارضی بہان ہیں۔ گویا اصل میں زمین دار یا مالک کا لفظ مفہوم نہیں رکھتا جو ہم سمجھتے ہیں! — یہاں گویا کوئی شخص حقیقت میں نہ کسی مکان کا مالک ہے نہ زمین کے کسی ٹکڑے کا۔ ایک چینی شاعر کہتا ہے کہ

دامن کوہ میں دیکھو یہ منہری کھیتی۔

ہم نے جو پو یا یہاں دوسرے کاٹی ہے

وہ بھی اس نخر من و حاصل پر نہ آتا اس کو

روکے ان کی جگہ جلد ہی آجائیں گے

افسوس کہ موت کی جہوریت کو کم کم ہی پہچان گیا ہے — اگر موت نہ آتی تو نپولین کے لئے بجز یہ سٹیٹ بنیاں بھی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ اور پھر نہ جانے یورپ کا کیا حال ہوتا — اگر موت نہ آئے تو دنیا میں کسی نامور شخص کسی فاتح کی سوانح حیات نہ لکھی جاتی۔ اور اگر کوئی لکھتا بھی تو انہی ہمدردی اور رعاداری سے کام نہ لیتا جو آج کے سوانح نگاروں کا معمول بن چکی ہے۔ ہم اس دنیا کے بڑے آدمیوں کو اسی لئے معاف کرتے ہیں کہ وہ مر چکے ہوتے ہیں۔ اور ان کی موت کی وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ان کا سالہ طے ہو چکا۔ سو اب انہیں معاف ہی کر دینا چاہیے

یوں سمجھتے کہ ہر جہاز سے کے ساتھ یہ جھنڈا ہوتا ہے کہ "سب انسان برابر ہیں!"

موت کی اسی تمہوریت سے انسانی زندگی کے ایک تماشا ہونے اور اس کی گہری شعوریت کا اس کے فلسفے کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص موت کی بصیرت حاصل کرے اسے انسانی زندگی کے ایک تماشا ہونے کی بصیرت بھی مل جاتی ہے اور وہ سچا شاعر بن جاتا ہے۔ شیکسپیر نے اپنے لافانی کردار ہلٹ کے منہ سے سکندر کی خاک کے بارے میں جو باتیں کہلائی ہیں ان سے شیکسپیر کی صداقت شعری پر مہر لگ جاتی ہے۔ سکندر مر اور اُسے زمین میں دفن کر دیا گیا، اس کا جسم خاک میں لکر خاک ہو گیا۔ اس منی سے ہم ایک ڈھیللا بنا لیتے ہیں اور سکندر کی خاک کاپی ڈھیللا ایک ڈاٹ کے طور پر شراب کے ٹکے کے منہ پر لگا دیا جاتا ہے! ذرا شیکسپیر کے ڈرامے رچو ڈوم کو دیکھئے۔ شاہ رچو ڈو قبروں اور کیروں اور کتبوں اور اس تاج کے نیچے کا ذکر کرتا ہے۔ جو بلا شاہ کی فانی کنپٹیوں پر دھرا رہا ہے یا پھر جب وہ ایک بہت بڑے جاگیر دار کا ذکر کرتا ہے جو اب اپنے قوانین اپنے اختیارات، مراعات اپنے جرنالوں سمیت محض خاک کا ایک ڈھیر ہے۔ فارسی حکیم شاعر عمر خیام اور اس کے چینی ساتھی جیانوشی کا یہی حال تھا۔ ان کی ساری دل لگی اور ان کے طربید احساس اور تاریخ کا مذاق اڑانے کی عادت نے اسی احساس تمام سے جنم لیا تھا۔ اور وہ یہی کہتے رہے کہ دیکھو یہ شاہوں کی قبریں ہیں جن میں اب گیدڑوں نے اپنے بھٹ بنا رکھے ہیں!۔ چینی فلسفے میں تو گہرائی اور لطافت ہی چلا گیا۔ زے کی بدولت پیدا ہوتی جس نے اپنے سارے فلسفے کی بنیاد انسانی کھوپڑی کے ذکر پر رکھی ہے۔ — ملاحظہ ہو:

بچانگ زے شہر چاڑ گیا۔ رہاں اُس نے ایک کھوکھلی اور
 پرانی کھوڑی دکھی۔ چوانگ زے نے اس کھوڑی کو اپنی چابک
 سے کورا اور پھپھا۔ تمہارا یہ حال اس لئے آؤ کہ تم عیش و نشاط
 کے بندے تھے اور تم نے زندگی بے اعتدالی سے گزاری ہے۔
 کیا تم کوئی نسراری تھے جو قانون کی زد سے بچنا چاہتا تھا؟
 یہ نہیں تو کیا تم نے کوئی ایسا کام کیا تھا جس سے تمہارے والدین
 اور تمہارے فاندان کی نیک نامی کو بڑھ لگا؟ — شاید تم قانون
 کی موت مرے؛ ہو سکتا ہے کہ تم پودے کی عمر کو پہنچ کر مرے اور تمہاری
 طبیعتی موت تھی؛ — آخوبات کیا ہے؟

ان سوالات کے بعد چوانگ زے نے کھوڑی کو اٹھا کر اپنے سر کے
 نیچے بٹور کھیر رکھ لیا اور گہری نیند سو گیا۔

جب چوانگ زے کی بڑی کا انتقال ہوا تو کوئی شخص اس کے
 پاس نہ کھیلے گیا۔ اس نے دیکھا کہ چوانگ زے فرش پر مزے
 سے بیٹھا ہے اور وہ بجا بجا کر گارہا ہے۔ اس شخص کو بڑا تعجب تھا۔
 اُس نے کہا۔ "بھائی آخر مرنے والی ایک عمر تمہارے ساتھ رہی
 وہ تمہارے بچوں کی ماں تھی۔ زیادہ سے زیادہ سنگھڑی یہ ہوتی کہ تم
 اُس کی موت پر سنسوں بہاتے۔ لیکن یہ تو حد ہو گئی کہ تم مزے سے گا
 بجا رہے ہو۔"

چوانگ زے نے جواب دیا: "سنو میاں تم غلطی پر ہو جب

ہمارا حیوانی وجود

میری بیوی مری تو پہلے پہلی تو مجھے بڑا صدمہ ہوا اور مجھ پر اس کی موت کا بڑا اثر ہوا۔ پھر میں نے سوچا، پیدا ہونے سے پہلے بھی تو اس میں کوئی زندگی نہ تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے جسم بھی نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی روح اس کا بھوت بھی نہ تھا۔ پھر وہ اس دنیا کے پتھر میں پھنسی گئی۔ پہلے اس کی روح نبی پھر اس نے جسم پالیا اور پھر وہ زندہ ہو گئی۔ اب مرنے کے بعد اس نے اپنا قالب پھر بدل لیا ہے۔ اب وہ مچھلی ہے اور مرکزہ پھر بہار و خزاں اور گرما و سرما کے ابدی چکر کے ساتھ مل گئی ہے۔ میں کاپے کو شور و شیلون کروں جب اس کا فانی جسم تو آرام سے لحد کی آغوش میں سو رہا ہے۔ اگر میں ماتم کروں گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ازل اور ابد کے چکر کو سمجھا ہی نہیں۔ اسی لئے میں نے روزنامہ موقوف کر دیا!

گویا شاعری اور فلسفہ دونوں احساسِ فنا سے شروع ہوتے اور وقت کے تینے کے احساس نے انہیں جنم دیا۔ یہی احساسِ فنا چینی شاعری کی پشت پناہ ہے۔ سچ، پوچھتے تو مغرب کی بیتر شاہری کا سراپہ بھی رہا ہے۔ یہ احساس مغربی شاعری میں بار بار ملتا ہے کہ زندگی ایک خواب ہے ہم کسی خوبصورت سر پہر کو غروبِ آفتاب کے وقت دیکھ کے دھارے پر اپنی نشی کھیٹے چلے جاتے ہیں اور یہ سوچتے رہتے ہیں کیہ پھول ہمیشہ شگفتہ نہیں رہیں گے۔ پورا چاند گھٹتے گھٹتے ایک تپلی کبیر کا رو جا تا ہے اور خود انسانی زندگی پودوں اور حیوانوں کی طرح پہلے بچپن سے پختہ عمری تک پہنچ کر ایک دن ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح بقا کے ساتھ ملکر تے آنے والوں کے لئے جگہ بناتی ہے! — اصل میں انسان نے فلسفی ہونا اس وقت

لیکھا تھا۔ جب اُسے دنیاوی زندگی کے بے حقیقت ہونے کا احساس ہوا۔ کہا جاتا ہے ایک دفعہ چینی فلسفی چوانگ زے نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تلی بن گیا ہے اس خواب میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ تلی کی طرح اپنے ننھے بچہ ہلا سکتا ہے اور ہر چیز ایسی ہے بیدار ہو کر اُس نے دیکھا کہ وہ تلی نہیں

بلکہ چوانگ زے ہے۔ پچ چوانگ زے ہے۔ اُس نے سوچنا شروع کیا کہ کونسی بات حقیقی ہے۔ کیا یہ خواب حقیقی ہے کہ وہ تلی ہے؟ یا وہ ایک تلی ہے جو یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ وہ چوانگ زے ہے؟ گویا زندگی واقعی ایک خواب ہے اور ہم فانی انسان وقت کے ابدی پوریا کے دھارے پر بہے جا رہے ہیں۔ ہم ایک خاص مقام پر کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور ایک خاص مقام پر زندگی کی کشتی سے اتر جاتے ہیں تاکہ دوسرے منظر لوگ اسی کشتی میں سوار ہو سکیں۔ اگر ہم یہ محسوس نہ کریں کہ ہمارے زندگی ایک خواب ہے یا یہ کہ ہم اس دنیا میں مسافر اور بہان ہیں یا یہ کہ ساری دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم محض اداکار ہیں جو اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں تو اس زندگی کی آدمی سے زیادہ شاعری دم گھٹ کر رہ جاتے۔ چینی عالم کیوشنگ شاہ نے اپنے دوست کو ایک خط میں یہی لکھا تھا :-

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس دنیا میں سب سے اہم اور سنجیدہ بات یہ ہے کہ ہم سرکاری افسر ہو جائیں اور سب سے معمولی بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہم کسی کھیل میں اداکاری کرنے لگیں میں سمجھتا ہوں یہ خیال بڑا احمقانہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایسے زیادہ اداکار گاتے ہیں روتے ہیں ایک دوسرے سے رٹے بھگرتے ہیں ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اتنی سنجیدگی سے کرتے

ہیں۔ گویا وہ حقیقی طور پر وہی ہیں جو وہ منظر آتے ہیں۔ مگر ڈرامے میں
 اصل چیز یہ نہیں کہ پانے پرانے کرداروں کو کس طرح ان اداکاروں
 نے پیش کیا۔ اصل چیز یہ اداکار خود ہیں۔ یہ اداکار بھی کسی کی اولاد ہوتے
 ہیں۔ کسی کے شوہر کسی کے باپ ہوتے ہیں اور یہ سب اپنے اپنے
 اہل و عیال اور ماں باپ کا ایسی طرح ناس کا کر اور اور جھگڑا کر مسخرہ
 پن کر کے پریشاں ہوتے ہیں۔ گویا جن لوگوں کا یہ کردار ادا کرتے ہیں
 وہ اصل ہیں ہی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان میں بعض ایگریٹو
 افسر کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور سچ سچ کے افسروں کی طرح وادی
 میں سچ سچا کر یوں سامنے آتے ہیں کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہ محض پارٹ
 کر رہے ہیں اور سچ سچ کے افسر نہیں ہیں۔ ان اداکاروں کو یہ
 بات ذرا بھی اہم نہیں معلوم ہوتی کہ وہ سٹیج پر افسروں کی طرح اگراڈ
 کر چل رہے ہیں اور قیدی ان کے سامنے کانپ رہے ہیں۔ اصل میں
 تو انہیں اپنے گھردلوں اور ماں باپ کا پیٹ ناس کا کر اور لڑنے
 جھگڑنے کا پارٹ ادا کر کے پانا ہے۔ انسوں تو یہ ہے کہ
 بعض لوگ اس دنیا کے ڈرامے میں ایک ہی پارٹ ادا کرتے کرتے
 ایک ہی طرح کا مکالمہ ایک ہی خاص طرز میں بولتے ہیں اس میں اتنا
 کھجالتے ہیں کہ یہ پارٹ ان کے جسم و جان (یعنی فطرت اور جذبات)
 پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور انہیں ایک موقع بھی یہ خیال نہیں آتا
 کہ اصل میں وہ محض اداکار ہیں۔“

۴۔ ہمارا پیٹ

ہمارے حیوان ہونے کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے جسم میں ایک اتھاہ لٹھا ہے۔ جبے پیٹ کہتے ہیں۔ اس حقیقت نے ہماری ساری تہذیب بر اثر ڈالا ہے۔

چین کے مشہور نشاۃ فیلسفی الی لی ڈنگ نے اسی پیٹ کی شکایت لکھی ہے۔ اس نے فن زندگی کے بارے میں لکھی ہوئی اپنی کتاب کے خوراک داے باب میں لکھا ہے:-

”میں دیکھتا ہوں کہ سارے انسانی اعضاء مثلاً کان، آنکھ، ہانگ، زبان،

اتھاہ پاؤں۔ یہ سارا جسم اپنے اپنے مقررہ کام کرتے ہیں۔ مگر وہ

عضو ایسے ہیں جو بالکل غیر ضروری ہیں اور وہ ہیں منہ اور پیٹ

۔۔۔ اپنی بروکری بدولت صدیوں سے انسان طرح طرح کی مہبتوں

میں مبتلا ہے۔ اس منہ اور اس پیٹ کی وجہ سے روزی کمانے کا سلمہ

آپیدہ ہو جاتا ہے۔ اور جب دوزی کمانا مشکل ہو جائے تو چالاکی

اور عیسیٰ بھوٹ اور بددیانتی انسانی معاملوں میں راہ پالیتی

ہے۔۔۔ انسانی معاملوں میں عیاری بھوٹ اور بددیانتی کے

آجانے سے قافلہ خود میں آجاتا ہے اور اس قانون کی بدولت

یہ حال ہو جاتا ہے کہ بادشاہ اپنے لقمہ دکرہ سے کسی کی زندگی بچا

نہیں سکتا۔ ماں باپ کی محبت بے دست و پا ہوتی ہے اور خود خدا

رحیم و رحمن کو بھی اس کی مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے

یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ خدانے جب انسانی تپلا تیار کیا

تو اس نے دوران نشیہ کی ماورا سے منہ اور پیٹ لگا دیا اور ہمارے

لئے یہ ساری مہیتیں پیدا کر دیں — ذرا پودوں کو دیکھئے، منہ پور
پیش کے بغیر کیسے مرے سے زندہ ہیں۔ چنانچہ ان در زمین دونوں
کچھ کھاتے پئے بغیر موجود ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں منہ اور پیش
دید یا گیلے یعنی دذات و عضو عطا کر دیئے گئے؟ — اور اگر

ہمیں یہ عضو دینے ہی تھے تو ہمارے لئے یہ بھی ممکن کر دیا ہوتا کہ ہم
پھلیاں اور گھونگھوں کی طرح پانی میں تیرتے تیرتے پیش بھریے
یا مڑوں اور مکڑوں کی طرح شبنم سے افزائش حاصل کر سکتے تھے
یہ مخلوق اس طرح قوت اور زندگی حاصل کرتی ہے یا نہیں؟ ہم بھی
ایسا کر سکتے تھے ہم بھی تیرتے رہتے یا اڑتے رہتے اور ادھر ادھر کودتے
بچانے بھرتے! — اگر یہ ہوتا تو اس زندگی میں کوئی تک
و دو کوئی کش مکش نہ ہوتی اور انسان کی ساری مشکلیں ساری
مہیتیں غائب ہو جاتیں — مگر ہے یہ کہ اُس نے ہمیں
نہ صرف دو عضو دیئے ہیں بلکہ قسم قسم کی استہا اور قسم قسم کی ہفت
دی ہے گویا پیش کا غار ایسا ہے کہ اتھاہ سمندر یا یا گہری کھڈ
کی طرح کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ کہ ہم زندگی بھر اپنے سارے اعضا
کی طاقت کے ساتھ سخت محنت کرتے رہتے ہیں تاکہ ہمارا یہ منہ
ہمارا یہ پیش کسی طرح مطمئن ہو سکیں اور یہ ہیں کہ کبھی ان کی طلب
پوری نہیں ہوتی۔

"ہم سے اس مسئلے پر بار بار سوچا ہے اور مجھوں کو کرا سی نتیجے
پر پہنچا ہوں کہ ہمارے خالق نے ہمارے ساتھ یہ زیادتی کی ہے۔"

ہمارا پیٹ

۸۱

میں جانتا ہوں کہ خالق کو بھی اپنی اس بھول پر ضرور پشیمانی ہوتی ہوگی مگر وہ جانتا ہے کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسانی جسم کا یہ نمونہ تو اب بن چکا اور مقرر ہو چکا ذرا سوچئے کہ کوئی قانون پاس کرتے وقت پارلیمانی ادارہ قائم کرتے وقت انسان کو کتنی احتیاط سے کام لینا چاہئے مبادا کوئی ایسی چوک ہو جائے جس پر بعد میں ہمیشہ پشیمانی ہوتی ہے۔

لیکن اب کہ ہمارے جسم میں یہ اتھاہ غار موجود ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس پیٹ نے ساری انسانی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کتھیوشس انسانی فطرت کے بارے میں بے حد وسیع النظر تھا۔ چنانچہ اس نے انسان کی صرف دو بڑی خواہشیں بیان کی ہیں یعنی نان نفقہ اور اولاد پیدا کرنا۔

سادہ نفظول میں یوں سمجھئے کہ انسان کی دو بڑی خواہشیں یا حاجتیں کھانا پینا اور عورت ہیں۔ خیر کچھ ذیلی قسم کے نعمرات نے نعمت کے بغیر بھی زندگی گزار لی ہے مگر کھانا پینا کسی سے نہیں چھوٹ سکا۔ ایسے ایسے صوفی لوگ اس دنیا میں آئے ہیں جنہوں نے ساری زندگی تیاگ اور سربانی میں بسر کر لی مگر کوئی متقی سے متقی آدمی بھی چند گھنٹے سے زیادہ کھانے کو قبول نہ سکا۔ بہر چار پانچ گھنٹے بعد ہمیں ہمیشہ یہی خیال آتا ہے کہ اب کھانا کب ملیگا؟ اور یہ واقعہ دونوں میں کم سے کم تین بار ضرور ہوتا ہے۔ پانچ گھنٹے سے زیادہ چار پانچ دفعہ بس یہ ہے اور ہم ہیں۔

بڑی بین الاقوامی کانفرنسیں بے حد نازک اور دلچسپ سیاسی مسائل پر بحث کرنے کرتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے ملتوی ہو جاتی ہیں۔ دنیا جہان کی پارلیمنٹوں کو کھانے کے اوقات کے مطابق اپنے اجلاس طے کرنے پڑنے میں اگر کسی بادشاہ یا ملکہ کی تاج پوشی کی رسم پانچ چھ گھنٹے کا طول پکڑ جاتے اور لوگ دوپہر کا کھانا کھانے

سکیں تو اس تاج پوشی کو عوام کے لئے ایک مصیبت قرار دیا جاتا ہے۔ گویا ہمارا سوچ، کھانے کے گرد گھومتا ہے۔ چنانچہ جب ہمیں کسی بزرگ کی خدمات کا اعتراف بھی کرنا ہو تو ہم اس کے اعزاز میں ایک دعوت نکادیتے ہیں!!

اس کی خاص وجہ ہے۔ دوستوں کی ملاقات اگر کھانے پر ہو تو گویا یہ ملاقات پر امن طور پر ہوتی۔ عمدہ کھانا بحث کی تندی و زور کو دیتا ہے اور اختلاف میں کوتاہی تیزی تلخی نہیں رہتی۔ دو بہترین دوست بھوک کے وقت اگر اکٹھے ہوں تو ان کی ملاقات ضرور جھگڑے پر ختم ہوگی۔ مگر عمدہ دعوت کا اثر دوچار گھنٹے ہی نہیں دنوں اور ہفتوں قائم رہتا ہے۔ یعنی قوم کو انسانی فطرت سے گہری واقفیت حاصل ہے۔ اسی لئے سارے جھگڑوں اور اختلافات کا فیصلہ عدالت کے کھانے کی میسر پر کیا جاتا ہے چینی زرخیز کا بیج ہی ایسا ہے کہ پرائے جھگڑے اور اختلاف بھی کھانے کی میسر پر طے ہوتے ہیں اور کھانے ہی پر نئے جھگڑوں کی پیش بندی کر لی جاتی ہے چین میں عام دستور ہے کہ بار بار دعوتیں کھلا کر سب کی اچھی رائے حاصل کی جائے۔ گویا یہ ایک طرح کی رٹوریک ہے جو نیک نامی کے لئے دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دعوتیں دنیا سیما میں کامیابی کا بڑا بے ضرر راستہ ہے۔ اگر کوئی شخص اعلان و شہار جمع کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ زیادتی مرتبے کی ترقی کی رفتار کا تعلق ان دعوتوں کی گنتی کے ساتھ کتنا ہے جس سے مختلف لوگوں کو دی تھیں۔

مگر ہماری تخلیق اسی طرح ہوتی ہے کہ دعوتوں کے بارے میں ہمارا رویہ یہی ہونا چاہیے۔ اور یہ کوئی چیزیں ہی سے مخصوص نہیں۔ امریکہ میں بھی کسی محکمے کا حاکم اعلیٰ آپ کی کوئی درخواست کیے رد کر دیا جب اس نے آپ کے

ہاں چھ سات بار دعوت اڑائی ہے؛ آخر امریکی بھی چینوں کی طرح انسان ہی ہیں
 فرق اتنا ہے کہ امریکیوں کو انسانی فطرت کی بصیرت حاصل نہیں اور انھوں نے
 اس بصیرت کے مطابق اپنی سیاسی زندگی کو اچھی طرح منظم نہیں کیا۔ میں سمجھتا
 ہوں، چینوں کی طرح دعوتیں کھلانا امریکہ کی سیاسی زندگی کا حصہ ہے کیونکہ
 انسانی فطرت تو ہر جگہ وہی ہے اور ہم کھال کے نیچے تو بلکہ ایک دوسرے سے
 ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً میں نے سنا ہے کہ جو لوگ کسی سرکاری عہدے کے امیدوار ہوں
 وہ اپنے نفع کے دوڑوں کے لئے کھلنے پھولتے ہیں۔ اور ان کے بچوں کو آئس کریم
 کھلا کر اور سوڈا واٹر پلا کر ماؤں کو خوش کرتے ہیں۔ اس قسم کی رشتوں کے بعد لوگوں
 کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ "بھائی وہ بڑا اچھا آدمی ہے"۔ یہی خیال بعد میں ایک
 گیت بن جاتا ہے — کوئی چار پانچ سو برس پہلے یورپ کے بڑے بڑے نواب
 اور جاگیردار اپنی شادی یا سالگرہ کے موقعوں پر اپنے تمام مزارعوں کو بہت بڑی عورت
 دیا کرتے تھے اور انہیں کھلا کھلا کر نیک نامی حاصل کرتے تھے۔

ہم پر کھلنے پھولنے کا اثر اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ بڑے بڑے انقلاب
 امن و آسائش کے دور، جلسوں، بین الاقوامی بھوتے ہماری روزمرہ کی زندگی اور ہماری
 ساری کی ساری معاشرتی زندگی اس سے بڑی طرح متاثر ہے۔ انقلاب
 فرانس کی وجہ کیا تھیں؟ کیا انقلاب فرانس اور روس اور دیگر وجہ سے
 ہوا؟ جی نہیں! اس کی وجہ صرف خوراک تھی۔ انقلاب روس اور اس انقلاب کے
 بعد ملک بھر میں اشتراکی تجربے کے اسباب کیا ہیں؟ یہی خوراک کا مسئلہ۔ درجہ تک
 جنگ کرنے کا تعلق ہے، اپولین جیسے عظیم فاتح نے اپنی گہری دانشمندی کا اس
 قول سے ثبوت دیا تھا کہ سپاہی اور فوج تو پیٹ کے بل پر لڑتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ

امن امن پکارنے سے کیا حاصل جب حلق کے نیچے پیٹ میں امن قائم رکھنے کی کوئی صورت نہیں کی جاتی۔ قوموں اور افراد دونوں کا یہی حال ہے۔ عوام جب بھوکے ہوتے ہیں تو بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے تحت رواج خاک میں مل جاتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے افراد کام نہیں کرتے ٹیپہی لڑنے سے انکاد کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے گھیک گلنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبر بھت کرنا بت کر دیتے ہیں۔ اور ملک کے صدر تک حکومت کرنے سے انکار ہی ہو جاتے ہیں۔ ذرا خیال کیجئے ایک شوہر دن بھر دفتر میں کیوں مروت نہ کرتا ہے؟ صرف اس لئے کہ شام کو گھر پر بھر بیٹ کھانا لگھاتے! — اسی لئے تو شل مشہور ہے کہ شوہر کے دل پر اس کے پیٹ کی راہ سے قبضہ کیا جاسکتا ہے! جب مرد کا جسم مطمئن ہو تو اس کا دل اس کی روح زیادہ پر سکون ہوتی ہے۔ پھر ایسے پیدا بخت کی نتوختی ہے۔ اسے بیوی زیادہ دھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ عام عورتوں کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے شوہران کے بناؤ سنگھار اور ان کے تے کپڑوں تک سے اندھے اور بے پردہ رہتے ہیں۔ انہیں نظر ہی نہیں آتا کہ بیوی نے آج نئے اور اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں مگر کسی بیوی نے کبھی یہ شکایت کی کہ میاں کو سان یا پلاؤ یا ملیٹ نظر نہیں آیا؟ — حسب الوطنی کیا ہے محض ان چیزوں کی محبت جو ہمیں بچپن میں کھانے کو ملی تھیں۔ امریکہ کے لوگ اس لئے امریکہ کے وفادار ہیں کہ وہ امریکی ردی اور امریکی پھلوں کے وفادار ہیں۔ یہی حال جرمنی کے لوگوں کا ہے! جہاں بین الاقوامی مفاہمت کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اطالوی مسوتوں نے مسوتی کی نسبت انکی کہیں زیادہ ہر دل عزیز بنایا ہے۔ بستم یہ ہے کہ باہر کے لوگوں کے دلوں میں اطالوی مسوتوں نے اعلیٰ کے لئے جو قدر پیدا کی تھی اُسے مسوتی نے

ہمارا پیٹ

۸۵

ختم کر کے دم لیا۔ تو گویا ساری بات یہ ہوئی کہ موت کی طرح کھانے کے سلسلے میں بھی سب انسان بنیادی طور پر بھاتی بھاتی ہیں۔

ہر چینی ایک اچھی دعوت سے پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ جب اسکا پیٹ بھرا ہو اور آنتیں مطمئن ہوں تو وہ کہہ اٹھے گا:۔ پز زندگی کتنی حسین اور طربناک ہے! گویا چینی کے بھرے پیٹ سے اسی روحانی خوشی کی روشنی پھوٹتی ہے جو دنیا کو جگمگا دیتی ہے۔ چینی ہمیشہ جھلتی پراعتما کرتے ہیں اور جھلتے انہیں تیار کھا ہے جب پیٹ بھرا ہو تو سب ٹھیک ہے! سترتا کا چینی نصب العین یہ ہے کہ جسم گرم ہو پیٹ بھرا ہو تو اسی تازگی ہو تو اسی نرمی ہو!۔ آخری دو صفحات کا تعلق سیر ہو کر کھانے کے بعد نرم اور گلدے سے بستر سے اسی لئے تو چینی شاعر کہتا ہے۔

بھرا پیٹ۔ بڑی چیز ہے۔ باقی سب تو عیاشی ہے۔

مگر اس ساری موشگافی کے باوجود چینی لوگ کھانے کے معاملے میں کسی بناوٹ کے قائل نہیں۔ کوئی چینی اگر اچھی بخنی کا ایک چمچہ پئے گا تو زور سے چٹخارا لے گا۔ اس کے برعکس مغربی ممالک اور بعض دوسرے ملکوں میں یہ باتمیزی سبھی جاتے گی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی آداب خوراک زہن کا تقاضہ ہے کہ سوپ بغیر آواز پیا جاتے اور کھانا اس طرح کھایا جاتے گویا مکمل مزہ انہیں آرہا کی وجہ سے مغرب میں اچھا کھانا پکانے کا آرٹ نپ نہیں سکا۔ سب سے سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی لوگ کھاتے وقت کیوں اتنی تمیز اور آہستگی سے بولتے ہیں اور میز پر اتنے گم سم بڑے باتمیز اور بڑے مغز کیوں بنے رہتے ہیں؟ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے امریکیوں کو خیال نہیں آتا کہ مرغی کی ٹانگ ہاتھ میں اٹھا کر مزے سے چبا لیں وہ بچارے

اس پر پتھری کا نٹے سے شغل فرماتے رہتے ہیں اور لمبیں سخت تنگ رہتے ہیں اگر کھانا اچھا ہو تو مزے لے کر نہ کھانا مسیر نزدیک حرم ہے۔ جہاں تک دسترخوان کے آداب کا تعلق ہے تو مسیر نزدیک سے کوزہ لگی کی مسیتوں کا احساس ہی پہلی دفعہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے ماہی کھاتے وقت چھکار لینے سے منع کرتی ہے۔ انسانی نفسیات ہی ایسی ہے کہ اگر اپنی دلی خواہش کا اظہار نہ کیا جائے تو پھر یہ خوشی خسوس بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر سچے ہلیم مانگو یا اور ضعف اعصاب جیسے لعرض گھیر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ڈائسیریا کی مثال پر چلنا چاہیے جب برا اچھا کٹھنٹ لے کر آتا ہے تو ان کے منہ سے بے اختیار واہ نکلتی ہے اور جب پہلا لقمہ منہ میں جاتا ہے تو ان کے دل کا اظہار اور خوشی ایک لمبی ہوں۔ میں بدل جاتی ہے! بھلا کھانے کا مزہ لینے میں شرم کی کیا بات ہے؛ اور اگر بھوک اچھی ہو اور معدہ صحت مند ہو تو اس میں بڑا کیا ہے؟ اسی لئے تو چینی ساری دنیا سے مختلف ہیں ہو سکتا ہے آپ کے نزدیک ان کے کھانے کے آداب اچھے نہ ہوں اور وہ بدتیسرا ہوں مگر دعوتوں اور کھاؤں کا لطف ضرور اٹھا سکتے ہیں!

میں سمجھتا ہوں چینی لوگ پودوں اور حیوانات کا علم اس لئے نہ سیکھ سکے اور اُسے ترقی دے سکے کہ کوئی چینی عالم ایک مچھلی کی طرف ٹھنڈے دل سے دیکھ رہی نہیں سمجھتا۔ مچھلی دیکھ کر اُسے فوراً یہ خیال آئے گا کہ اس مچھلی کا مزہ کیا ہوگا اور پھر اُسے یہ خیال آئے گا کہ اُسے کھانا ہی بہتر ہوگا۔ اسی وجہ سے مجھے کبھی چینی سرجنر اعظم کو نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی چینی سرجن میرا گردہ کاٹ کر اس میں سے پتھری کا لٹا چاہے تو وہ پتھری کو بھول جائے گا اور فوراً مسیرا گردہ بھوننا شروع کر دے گا

اگر کوئی چینی کسی خار پشت کو دیکھے تو اسے فوراً خیال آئے گا کہ اس کا گوشت اس ترکیب سے چاکر کھایا جائے کہ اس کا نہر جاتا رہے نہر سے احتیاط کی شرط اس لئے ہے کہ یہی اس کا عملی اور اہم پہلو ہے ورنہ اس کام میں کوئی مزہ نہیں۔

خار پشت کے گوشت کا نمبر دوسرا ہے کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوگا؟ باقی کی خبر چینی کے لئے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ مثلاً خار پشت کے خار کیسے پیدا ہوتے ہیں خار پشت کیا کام لیتا ہے؟ یہ خار اس کی کھال میں کیسے پیوست ہیں اور وہ انہیں خستہ کے موقع پر کیسے سیدھا کھڑا کرتا ہے؟ وغیرہ۔ یہ سوالات ایک چینی کے نزدیک قطعاً بیکار سوال ہیں یہی خان باقی جانوروں اور پودوں کا ہے۔ چینی کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ ان پودوں اور جانوروں وغیرہ سے کیسے اور کیا فائدہ یا خطا اٹھایا جاسکے۔ باقی رہا یہ کہ وہ خود کیا ہیں؟ اس سے چینی کو کوئی سروکار نہیں۔ گویا چینیوں کو تو صرف پرندوں کے نغصے پھول کے رنگسا کلیوں کی پنکھڑی اور مرغی کے گوشت سے غرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مشرق اور مغرب دونوں پودوں کا علم اور جانوروں کا علم پورے کے پورے سیکھنے پڑے ہیں۔ مگر مغرب بھی مشرق سے سیکھنا پڑے گا کہ درختوں، پھولوں اور پھلیوں پرندوں اور حیوانات سے کیسے خطا اٹھایا جاسکے، کیسے ان سے لطف انور ہوا جائے تاکہ ان انواع و اقسام کے موجودات کے دلائل و خطوط اور حرکات کو مختلف انسانی جنبات اور کیفیات کے ساتھ ہم ہنگام محسوس کیا جاسکے۔

تو کھانا انسانی زندگی کی چند ٹھوس متعرتوں میں سے ایک ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بھوک کی اس جلت پر وہ پابندیاں اور سماجی حدیں عائد نہیں جس طرح

ہمارا حیوانی مادہ

۸۸

دوسری جبلتوں مثلاً جنسی خواہش پر عائد ہیں۔ عام طور پر بھوک کے سلسلے میں کوئی اخلاقی قدریں بھی پیدا نہیں۔ خود ان کے بارے میں بناوٹ اور رکھ رکھاؤ بھی۔ جنس کے مقابلے میں کم ہے۔ بیڑی اچھی بات ہے کہ ناسٹنی شاعر، سوداگر اور فنکار کھانے پر جمع ہوں اور بغیر کسی شرم و چہلکے کھلے بندوں پیٹ پوجا کر سکیں۔ البتہ بعض وحشی اقوام اسی میں جھڑپوں نے کھانے کے بارے میں کچھ عجیب قسم کی شرم رائج کی ہے۔ وہ صرف اکیلے ہی کھا سکتے ہیں۔ غرض کم سے کم کھانے کی جبلت تو ایسی ہے جس پر چونکہ حدیں کم عائد ہیں اس لئے اس میں کم گسراہیاں اور کم ضبط اور کم مجسراہ افعال پیدا ہو سکتے ہیں۔ بھوک کی جبلت اور جنسی خواہش میں فرق یہ ہے کہ دونوں اپنے سماجی معنی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ بات قدرتی ہے۔ ہر کیف بھوک اسی چیز ہے جو ہماری جسمانی زندگی کو بچپیرہ نہیں بناتی۔ بلکہ انسانیت کے لئے ایک نعمت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صرف اسی جبلت کے سلسلے میں ہر انسان آزادی سے بات کرتا ہے اور کھلے بندوں صاف صاف اس کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے اظہار میں کوئی شرم لحاظ نہیں رہتا جاتا اس لئے کوئی اعصابی مرض یا کوئی بے راہ روی پیدا نہیں ہوتی جس طرح جنسی جذبوں کے سلسلے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ مانا کہ کھانا ملنے میں کتنی ایک تشکیب ہوں گی مگر جو ہنی کھانا پیٹ میں گیا۔ باقی باتیں طے ہو گئیں۔ ہم بڑی صاف دلی سے کھلے بندوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کو خود اس کا ملنی چاہیے مگر یہ بات ہم جنسی خواہش کے سلسلے میں نہیں کہہ سکتے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ بھوک مٹا کر کوئی طرفان بھی تو نہیں اٹھاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ لوگ زیادہ کھا کھا کر برا مضمی کا شکار ہو جائیں گے یا ان کی آنتوں میں سرطان ہو جائے گا یا ان کا جگر بیکار ہو جائے گا۔ چنانچہ بعض لوگ اپنی قبریں گویا اپنے

سہارا ایٹ

۸۹

سے کھودتے ہیں۔ ایسی مثالیں میرے ہمدرد چینیوں میں موجود ہیں۔ انہیں سرانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کھانے کی وجہ سے رجسٹری جنڈے کے مقابلے میں بہت کم سماجی جرائم ہوتے ہیں۔ ضابطہ فرج داری میں مثلاً غیر قانونی بڑا اخلاق یا بیو قاسم کی سنگم بندی کے لئے قانون موجود نہیں۔ مگر اس ضابطہ توجہ داری میں زنا، اطلاق عورتوں سے چھڑ بھیاڑ قسم کی باتوں کے لئے بیسیوں دفعات موجود ہیں۔ کھانے کے سلسلے میں شوہر زیادہ سے زیادہ حرکت کر سکتا ہے کہ نعمت خانی کو چھپان مارے مگر نعمت خانی کی تلاش پر کسی شخص کو سزا نہیں دی جاتی اس لئے اگر کبھی عدالت میں ایسا شخص پیش کر بھی دیا جائے تو جج مجسم رحم دکر م بن جائے۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص صاف صاف تسلیم کرتا ہے کہ میں بھوکا ہوں۔ اسی بنا پر ہم تھوڑے لوگوں پر تو ترس کرتے ہیں۔ لیکن الگ تھلگ رہنے والی رہبانوں پر توجہ نہیں دیتے

کھانے کے مضمون پر تو ہر شخص اچھی معلومات رکھتا ہے ادھر پہلے کا دد مری جہلت یعنی جنسی جذبے کا یہ حال ہے کہ لوگوں کو جنس کے بارے میں الف کے نام بے تک معلوم نہیں۔ چین میں بعض خاندان ضرور ایسے ہیں جو اپنی لڑکیوں کو جنسی معلوما سے بھی بہرہ در کرتے ہیں اور انہیں کھانا پکانا بھی سکھاتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے؛۔۔ کھانے کے مضمون پر علم کی روشنی چمک رہی ہے اور جنس کے موضوع پر کہا بوں اور دھموں کی پراسرار دھند چھپائی ہوئی ہے۔ کھانے کے مضمون جنڈیشن ہے۔ جنس کا موضوع اتنا ہی بے خدا اور انور ہے!

اگر پرندوں کی طرح چہیٹ کے بجائے ہمارا کبھی پوٹا ہوتا یا جگالی کرنے والے جانوروں کی طرح ہمارے بھی چار معدے ہوتے تو میں سمجھتا ہوں کہ انسانی معاشرہ اتنا

برل جاتا کہ صورت بھی پہچانی نہ جاتی۔ بلکہ ہم اور ہی نسل کے انسان ہوتے۔ پوسٹے یا جانوروں کے سے دوسرے والی انسانی نسل بڑی پرامن بڑی مطمئن اور بڑی پیاری ہوتی، بالکل ایسی طرح جس طرح کبوتری چوزے یا کوئی سیلے ہوتے ہیں۔ ہم اس صورت میں یا تو ایک سوچ پیدا کر لیتے جس سے ہمارا نظریہ حسن بالکل بدل جاتا۔ یا پھر تھوٹھنی کے اندر جگالی کے دانت اگایے۔ اس طرح ہمارے لئے بیخ اور پھل ہی کافی ہوتے یا کسی بیماری کی ڈھلان پر سرسبز گھاس ہمارے لئے کافی ہوتی۔ کیونکہ نظرت گھاس کے سلسلے میں بڑی فیاض ہے۔ چنانچہ ہمیں خوراک کے لئے ایک دوسرے سے لڑنا ہجرت کرنا نہ پڑتا۔ اور اپنے دشمنوں کی بوٹیاں تو تھی نہ پڑتی۔ گو یا ہم ایک ایسی جنگجو اور خوشخوار مخلوق نہ ہوتے جیسی آج کل ہیں۔

خوراک اور مزاج میں بڑا تھمرا تعلق ہے اور یہ قدرت کا قانون ہے۔ گھاس پھوس کھانے والے سارے جانور فطر تا پرامن ہوتے ہیں۔ مثلاً بھڑ بھڑاں، گھوڑا، گائے، بھینس، ہاتھی اور چڑیا، شیر، گوسائے، گوشت کھانے والے تمام حیوان لڑا کھپرتے ہیں۔ مثلاً بھیریا، شیر، چیتا، عقاب وغیرہ۔ اگر ہمارا گزارا بھی گھاس پھوس پر ہوتا تو ہماری نظرت بھی کچھ کھیل سکتا اور بھاری بھیر کم ہوتی۔ قدرت کا یہ قانون ہے کہ جہاں لڑائی کی ضرورت نہ ہو تو وہاں لڑاکا فطرت پیدا نہیں کرتی۔ آپ کہیں گھاس پھوس میں لڑتے بھی لڑتے ہیں۔ مگر مرنے آس میں زمانے دیکھ کے لئے نہیں لڑتے بلکہ مرنے کے لئے لڑتے ہیں۔ یہ جگر اتو گھاس پھوس کھانے والے انسانوں کے درمیان بھی چلے گا۔ لیکن وہ اس مارا ماری سے بہت مختلف ہو گا۔ جو آج کل سے باہر آئی ہوئی خداک کے سلسلے میں یورپ میں پیش آئی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کبھی بندر نے دوسرے بندر کو کھایا ہو۔ مگر میں جانتا ہوں

کہ آدمی کو کھاتا ہے۔ انسان کی ارتقائی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ آدم خوری رائج رہ چکی ہے۔ اور ہمارے اجداد ایک دوسرے کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔ پھر اس میں کیا تجربہ ہے کہ ہم اب بھی کئی لحاظوں پر کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے کو کھاتے ہیں، مثلاً افرادی طور پر معاشرتی طور پر یا بین الاقوامی طور پر ایک دوسرے کو فوج فوج کر ٹرپ کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تو آدم خور ہم سے بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ عموماً دوسرے کو قتل کرتے ہیں کہ اُسے کھا سکیں اور پھر وہ مرے ہوئے دشمن کے جسم کے عمدہ حصوں کا گوشت، کلیجی گردے کھا کر کچھ حاصل بھی کرتے ہیں۔ لیکن مہذب انسانوں کا حال دیکھتے ہیں آدم خوروں اور مہذب انسانوں میں فرق یہ ہے کہ آدم خور اپنے دشمن کو مار کر کھا جاتے ہیں لیکن مہذب انسان اپنے دشمن کو مار کر اُسے ذبح کر دیتا ہے۔ اس کی قبر پر ایک کتبہ لگاتا ہے اور اس کی نجاست کے لئے دعا بھی کرتا ہے۔ گویا ہم انسانی خود پسندی اور بد مزاجی میں حماقت کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ خود پسندی اور بد مزاجی کی وجہ سے ہم اپنے جیسے انسان کو جان سے مارتے ہیں۔ اُسے مار کر اُس سے زندگی چھین کر پھر اس کے لئے دعا میں مانگنا، حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ انسان تکمیل کی منزل کی طرف رداں دوہل سے اسکا مطلب صاف طور پر یہ ہوا کہ ابھی ہم بہت ناقص ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے جب تک ہم میں حلیانہ اور امن پسندانہ اوصاف پیدا نہیں ہوں گے ہم اپنے آپ کو مہذب کہہ ہی نہیں سکتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ انسانوں کی موجودہ نسل میں گوشت خور اور نباتات خور دونوں قسم کے حیوان موجود ہیں نباتات خور اپنے کام سے کام لے رہے ہیں اور

گوشت خوردوں کے کام اور معاملوں کو بھی اپنا کام سمجھتے ہیں اور ہر طرح انہیں دخل دیتے ہیں۔ یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ اسی لئے میں نے آج سے دس سال پہلے سیاسیات سے کنارہ کر لیا تھا کیونکہ میں فطرتاً گوشت خور نہیں اگرچہ میں گوشت کے کباب اب بھی رنجت سے کھاتا ہوں۔ فقیر یہ ہے کہ آدھی دنیا تو اپنا وقت کام کرنے میں صرف کرتی ہے۔ باقی کی آدھی دنیا ایسی ہے جو دوسروں سے کام کراتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کا آدھا حصہ دوسروں کے لئے کوئی ذاتی کام کرنا نا ممکن کر دیتا ہے۔ گوشت خور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے لڑنے بھڑنے سازشیں کرنے اچھا سوہیں میں مزہ آتا ہے۔ دشمن کو صل دینے اور پیش منہی کرنے میں لطف محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب بڑی گہری دلچسپی اور تحقیقی قابلیت کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک یہ خصوصیات ہرگز قابل تعریف نہیں ہیں دراصل یہ سارا معاملہ جھلت اور جلی تقاضے کا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت ہی لڑنا جھگڑنا ہو وہ اسی میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت اپنا کام اچھی طرح سرانجام دینے کی صلاحیت بہت کم پروان چڑھتی ہے۔ نباتات خوردوں کی فطرت رکھنے والے کئی پروفیسروں کو میں نے دیکھا ہے۔ جنہیں حرص اور لالچ مطلق نہیں ہوتا جن میں مقابلے کا اور دونوں کو مات دینے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا یہی لوگ قابل تعظیم ہیں میں تو یہ بھی کہوں گا کہ دنیا کے تمام تخلیقی فنکار و خوردوں کے کام میں دخل نہیں دیتے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی فطرت نباتات خوردوں کی سی ہے۔ انسانیت کا سچا ارتقا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ نباتات خوردوں کی فطرت کے پرامن انسان زیادہ ہوں۔ اور گوشت خوردوں کی فطرت کے انسانوں کی گنتی کم ہوتی جائے۔ فی الحال یہ گوشت خور فطرت کے لوگ ہی ہمارے حکمران ہیں اور

یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا مضبوط اور بھسری بھری مچھلیوں اور طاقت اور جسموں
کی بڑی معتد ہے!

۵۔ مضبوط جسم

ہم بنیادی طور پر حیوان ہیں اور ہمارے جسم فانی ہیں۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں
جان سے مارا جاسکتا ہے اور عام آدمی کو اس طرح جان سے جانا کچھ اچھا نہیں
لگتا۔ یہ ماننا کہ علم و دانش کی بڑی پیاس موجود ہے مگر علم ہی کے ساتھ منتظریوں
کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ یہی اختلاف ہے جو بحث کو جنم دیتا ہے اگر یہ دنیا
ہمیشہ زندہ رہنے والے لوگوں سے آباد ہوتی تو یہ بحث بے حاصل کبھی ختم نہ ہوتے کیونکہ
جب تک ایک غیر فانی انسان یہ زمانہ لے کہ وہ غلطی پر ہے، جھگڑا طے نہیں ہو سکے
گا۔ مگر فانی انسانوں کی مہینیا میں صورت حال ذرا مختلف ہے کسی سے اختلاف رکھنے
والا شخص اپنے حریف کی نظروں میں اتنا قابلِ نفرت ہو جاتا ہے کہ وہ حریف جتنا قابلِ
نفرت معلوم ہونے لگے، اس کی دلیلیں اتنی بجا درست ہوتی ہیں! کہ حریف اُسے
جان سے مار کر جھگڑے اور اختلاف کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر
الف ب کو ارد لے تو الف حق ہے۔ اور اگر ب، الف کو مار و لے
تو ب حق رہتا۔ ذرا خیال کیجئے کہ دھنیوں میں جھگڑا طے کرنے کے لئے یہی
قدیمی طریقہ رائج ہے اور یہی حال جاتوں کا ہے۔ چونکہ شیر سب کو مار سکتا ہے لہذا
وہی حق رہتا ہے۔

ہم کتابت انسانی معاشرے پر ایسی صادق آتی ہے کہ قدیم زمانے سے سیکر

آج تک اسی نظریے سے انسان کی ساری تاریخ کو جانچا جاسکتا ہے۔ گیلیو نے زمین کے گول ہونے اور نظام شمسی کے بارے میں کئی نئی باتیں دریافت کیں مگر کئی باتوں میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور کبھی ہونے والی باتیں بھی واپس لیں وہ اس کو وہ ایک فانی انسان تھا جسے جان سے مارا جاسکتا تھا! طرح طرح کی ایذاؤں بھی دی جاسکتی تھیں۔ اگر گیلیو کا قسم لافانی ہوتا تو اسے بحث مول لینے کی صحبت اٹھاتا پڑتی۔ آپ اسے یقین نہ دے سکتے کہ وہ بعض باتوں میں غلطی پر ہے اور یہ ایک دائمی صحبت بن جاتی مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ فانی انسان تھا اور جسمانی ایذاؤں کی کال کوٹھری شاید کئی اور پھانسی نے اسے قائل کر دیا کہ وہ غلطی پر ہے اس زمانے کے پادری اور امرادوں نے اسے گیلیو سے فیصلہ کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ چنانچہ گیلیو کو قائل ہونا پڑا کہ وہ غلطی پر ہے اسی بات نے اس زمانے کے پادریوں کو یقین دلایا کہ وہ راستی پر ہیں۔ چنانچہ یوں اس کے کا قیصلہ بخیر و خوبی ہو گیا!

جھگڑے طے کرنے کا یہ طریقہ بڑا فوری اور سہل اور عمدہ ہے۔ لوٹ مار اور غارتگری کی جنگیں اور ہی جہاد و مسلح الدین اور مسیحیوں کی کھلی جنگیں سین ہیں۔ کافروں پر احساہ اور ان کا زندہ جلایا جانا، فردن و سٹوٹی میں ڈھنڈوں اور جادو گرین کو زندہ جلانا اور پھر ہمارے زمانے میں مسلح جہانوں کی مدرسے وحشی قبائل کو عیسائی بنانا، سفید قوموں کا بزرگم خود ہر جگہ تہذیب سکھانے کا کام اور مسولینی کا جیشہ میں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے تہذیب پھیلانا یہ سب کچھ اسی حیوانی منطق کے نتیجے میں جو انسان کو درشہ میں ملی ہے۔ اگر اطالویوں کے پاس بہتر تو ہیں ہوں تو اطالوی سپاہی بہتر سپاہی ہوں اور زیادہ دشمنوں کو مار سکتے تو مسولینی جیشہ میں تہذیب

کی روشنی پھیلانے میں کامیاب ہے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر جوشہ کا بادشاہ ہیل سلاسی اٹلی میں بڑی کامیابی سے تہذیب و تمدن کا نور پہنچا سکتا ہے ہم میں جنگل کے بادشاہ شیر کی سی شاہی خصیلت بھی ہے کہ ہم بحث کو سمجھ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم سپاہی کو اتنا اونچا درجہ دیتے ہیں اس کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ کیونکہ سپاہی اختلاف کرنے والوں کا فوراً ٹھیکہ کر دیتا ہے جو شخص بحث مباحثہ کرنے اور اپنے آپ کو حق پر سمجھنے اُسے خاموش کرنے کا فوری طریقہ یہ ہے کہ اُسے پھانسی دے دیجئے۔ بس قصہ پاک ہے۔ انسان ایسی چوٹی کا جہی کرتا ہے۔ جب وہ دوسروں پر اپنا عقائد کھنوس نہیں سکتا اور انہیں پوری طرح قائل نہیں کر سکتا۔ اسکے برعکس جو لوگ عمل کے سپاہی اور انہیں کام کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ شافردار رہی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں بحث مباحثہ اور حجت بازی سے نفرت ہوتی ہے۔ آخر ہم باتیں کس لئے کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں اور اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہم دوسروں پر اثر ڈال سکتے ہیں انہیں کنہی بھی کر سکتے ہیں تو باتوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ آخر بین الاقوامی انجمنیں اور کیا کرتی ہیں۔ باتیں اور خالی مباحثے۔ مگر جھگڑوں اور اختلافات کو زبردستی اور قوت کے بل پر طے کرنے کی بھی ایک حد ہے اور اگر ذوق اور زہرہ دلی نہ ہو تو یہ طریقہ بالکل نہل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں جاپانیوں کا خیال تھا کہ وہ چینی آبادیوں پر مشین گنتوں سے گولیاں برسا کر اور بمباری کر کے ان کے دل سے جاپانیوں کی نفرت نسبت دبا دو کریں گے! — یہی وجہ ہے کہ میں ذرا مشکل سے اس بات کا قائل ہوتا ہوں کہ انسان "جو ان" عقول" بھی ہے!

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی انجمنیں جدید زبانوں کے سکھنے

کے لئے نہایت لچھے سکوں میں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ مثلاً اسی انجنوں میں پہلے کوئی نہایت فصیح مقرر نہایت عمدہ انگریزی میں ایک تقریر کرتا ہے۔ چند منٹ بعد یا ساتھ ہی ساتھ ایک نہایت قابل مترجم انگریزی کی اسی تقریر کو بڑی روانہ شدہ اور فصیح و سلیس میں ادا کرتا ہے۔ تلفظ اور لہجے کا پورا پورا خیال رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی انجنیں زبانوں کے سکولوں سے کہیں بہتر ہیں کیونکہ انہیں نہ صرف جدید باتیں سکھائی جاتی ہیں بلکہ تقریر کی کافن بھی سکھایا جاتا ہے مثلاً ایک فو میرے ایک دوست نے جو ایک بین الاقوامی انجن میں اپنے ملک کی نمائندگی کر رہا تھا مجھے بتایا کہ چھ مہینے کی تعلیم مدت میں اس نے اپنے تئیں پڑا بولیا حالانکہ اپنے ملک میں اس نے برسوں بیجا اس عیب پر قابو پالنے کی کوشش کی تھی مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بین الاقوامی انجنیں جو عام طور پر تباؤ کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اداروں میں بھی جو غرض بات چیت کے لئے قائم کئے جاتے ہیں بڑے بولنے والوں اور چھوٹے بولنے والوں کا امتیاز باقی ہے۔ بڑے بولنے والے وہ ہیں جن کے ہونٹ بڑے ہیں۔ اور چھوٹے بولنے والے وہ ہیں جن کے ہونٹ چھوٹے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر بین الاقوامی انجن اگر شخص دھوکا نہیں تو حماقت کا اڈا ضرور ہے۔ گویا چھوٹے ہونٹ والی قوم کا نام نہ جسے چھوٹا مقرر کر دیا جاتا ہے بڑے مقررن کی طرح اتنی تیز کا سے اور وضاحت سے تقریر کری نہیں سکتا! اس لیے کہوں گا کہ بڑے ہونٹ والے کی وضاحت میں یقین یا اعتماد اسی حیوانی ورثے کا ایک حصہ ہے جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے میں نے قصداً وحشی دند کا لفظ استعمال نہیں کیا حالانکہ مناسب لفظ یہی تھا)

مختصر یہ ہے کہ انسان کو باتیں بنانے کی صلاحیت بھی اسی طرح دی گئی ہے جس طرح اُسے اڑنے بھڑنے کی جہت عطا کی گئی ہے۔ انسانوں کی ارتقا کی تاریخ کے لحاظ سے ہمارا یہ عضو بڑا ہی اسی اسی اسی ہے جتنا ہمارا مگک ہے اور اتنا ہی تو یہ ہے جتنے ہمارے بازو ہیں! انسان اور حیوان کا فرق یہ ہے کہ انسان بات کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی انجمنیں، ملکی پارلیمنٹیں، یا دوسری انجمنیں، مستقل طور پر قائم رہتی ہیں تاکہ انسان مل بیٹھ کر باتیں بنا سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کا مقدر یہ ہے کہ باتیں کرتے رہیں اور یہ معلوم کرتے رہیں کہ کون حق پر ہے اور کون جھوٹا ہے باتیں کرنے میں کوئی عیب نہیں یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں انسانی خصوصیت یہ ہے کہ ہم ایک حد تک ایسا بات چیت کرتے ہیں۔ ہم گرما گرم بحث کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک فریق جس کے بازوؤں میں زیادہ طاقت ہوتی ہے، پریشیاں ہو کر غصے میں آجاتا ہے۔ جیسا کہ مشہور چینی مقولہ ہے کہ "پریشیاں قدرتی طور پر غصے کا پیش خیمہ ہوتی ہے" اور اس فریق کو جاکا ایک یہ خیال آتا ہے کہ باتیں بہت ہوئیں اب کچھ اور ہوتا چاہیے چنانچہ یہ ناراضی اور طاقت و فریقیت پر زور سے مگک مارنا ہے فریق مخالف کی گردن ناپا ہے اور اس کی خوب مدمت کرتا ہے۔ پھر پلٹ کر حاضرین سے پوچھتا ہے۔ "لوگو! بتاؤ کیا میں حق پر تھا یا یہ نامعقول سچ کہتا تھا؟" اور جواب لازمی طور پر ملتا ہے کہ "بھائی صاحب! آپ ہی سچے ہیں!" یہ صرف انسانوں کا خاصا ہے کہ اختلافی بحث کا فیصلہ یوں کرتے ہیں۔ حیوان تو اپنے اختلافات محض طاقت کے بل پر طے کرتے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے کہ اپنے اختلافات کا فیصلہ بک بک جھجک اور طاقت کے ایک عجیب آمیزے کے ساتھ کرنا ہے فرشتوں کا اعتقاد یہ ہے کہ حق، حق ہے، جانوروں کا اعتقاد صرف قوت پر ہے

یہ صرف انسان ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قوت کا دوسرا نام حق ہے! — بہر حال باتیں کرنے اور طاقت کے استعمال میں سے باتیں کرنے کی خواہش اعلیٰ تر ہے۔ شاید کوئی زمانہ ایسا آجائے کہ ہم باتیں تو کیا کریں لیکن طاقت استعمال نہ کریں۔ اسی میں انسانیت کی نجات اور فلاح ہے۔ فی الحال تو ہم میں چاہتے خالوں کی نفسیات رچی ہوئی ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں۔ اور آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔

مجھے دو دفعہ چاہتے خانوں کی جگوں سے سائبہ پڑا ہے۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ پہلوگ ایک چاہتے خانے میں بیٹھے تھے کہ ایک جھگڑا پیش ہوا اور ہمیں ثالث قرار دیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ ایک شخص نے دو سرے کی جائداد ہتھیالی ہے یہ شخص بڑا کڑیل جان تھا۔ اسی نے بحث کا آغاز کیا تھا۔ اُس نے ہمارے سامنے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں اُس نے بتایا کہ میں نے اپنے ہمسائے (فرقی مخالف) کے ساتھ بڑے مہربانوں سے گزارا کیا ہے، ہمیشہ فرانڈری کا برتاؤ کیا ہے اور بڑی بے غرضی سے اُس کی خدمت خاطر کی ہے۔ مزہ یہ ہے کہ اُس نے ہم ٹائٹوں کو بھی بحث میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور جب ہم آپس میں بحث میں الجھے ہوتے تھے تو وہ چپکے سے اٹھا اور باہر جا کر اُس زمین کے گرد بارشنگادی جس کے بارے میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ پھر اُس نے ہم سے آکر کہا: آپ لوگ خود چل کر دیکھ لیجئے کہ میں ٹھیک کہتا ہوں! نہیں ہم لوگوں نے باہر جا کر دیکھا کہ اُس وقت بھی اُس کے کاوندے نزعی رقبے کے گرد بارشنگار ہے تھے! اُس نے ہم سے پوچھا: کیوں بھائیو! حق پر میں ہوں یا یہ شخص؟ ہم تو اپنی آنکھوں اس کی بذاتی دیکھ چکے تھے۔ ہم نے فیصلہ دیا کہ تم بالکل بھولے ہو۔ — بس یہ کہنا غضب ہو گیا۔ اُس نے ہمارے فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اُس نے کہا: ساری بنچائیتا نے میری توہین کی ہے میری

غیر شامیری عزت پر حملہ کیا ہے اور میری آبرو پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ غصے میں پیر پختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور ہماری طرف مڑ کر حقارت کی منظر بھی نہیں ڈالی۔ ذرا خیال کیجئے کہ ایسے آدمی کو شکایت ہوتی کہ ہم نے اس کی توہین کی ہے۔

دوسرا واقعہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ نریقین میں سے ایک شخص (حسب سابق) بڑا طاقتور تھا۔ اسی نے اپنا جھگڑا پنچایت کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کیا اور پنچایت سے انصاف طلب کیا۔ ہماری پنچایت کو اپنی آن، اپنی عزت کا پاس تھا۔ اس لئے ہم نے منفقہ فیصلہ دیا کہ "تصویر مہرا سر تمہارا ہے۔ اور تم زبردستی اور سبوتاہی کرتے ہو۔" اس شخص نے بھی اس فیصلے کو اپنی توہین گردانا اور اس کی بھی عزت اور آبرو پر اس فیصلے نے کالک پوت دی۔ چنانچہ اس نے اپنے حلیہ کی گردن دبوچی اور کمرے سے باہر جا کر اسے قتل کر دیا۔ واسپ آکر اس نے ہم سے پوچھا: "بتاؤ میں حق پر ہوں یا نہ؟" ہم لوگوں نے یکساں زبان ہو کر کہا: "نہیں بھائی تمہیں حق پر ہو!" — وہ اس فیصلے پر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اس نے پوچھا "میں اچھا آدمی ہوں یا نہیں؟" ہم نے بھر یکساں زبان ہو کر کہا: "تم نہایت عمدہ آدمی ہو!" قائل ہم سے اپنے لئے کس طرحیے سے یہ کلمات کہلاوا رہا تھا؟

یہ واقعہ ۱۹۳۶ء میں انسانی تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ قانون اور انصاف انسانیت کی ابتدا سے اب تک ایسے کئی مراحل سے گزر چکے ہیں۔ پنچایتوں میں تو لازم یہ احتجاج کرتا ہے کہ اس کی توہین کی گئی ہے۔ مگر ہائی کورٹ میں جب الزام ثابت ہو جائے تو ملزم ایسا احتجاج نہیں کرتا۔ یہ ترقی دیر میں برسی ہے۔ تم نے پنچایتیں شروع کیں تو لگا بھگک دسا برس ہم یہ سمجھتے رہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

لیکن قدرت کو آئینہ کا حال بھی معلوم تھا قدرت جانتی تھی کہ ہمیں اس تجربے میں نہ کافی ہوگی۔ کیونکہ ابتدا میں ناکامیاں ہی انسان کا مقدر ہیں سب یہاں ہے کہ نیچا کتیتیں ختم ہو گئی ہیں اور اہلوگ پھر وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کے بال نوح رہے ہیں لڑ جانوروں کی طرح ایک دوسرے کی بوٹیاں اڑا رہے ہیں۔ مگر میں یابوس نہیں ہوں۔ شرم و حیا اچھی تھیں میں اور بھی حال باتیں کرنے کا ہے! میرے نزدیک تو اب انسان بالکل بے شرم اور بے حیا ہو چکے ہیں۔ آئیے ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم میں ابھی حیاداری باقی ہے اور باتیں بنانے میں لگے رہیں شاید اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم فرشتوں کے اعلیٰ رتبے پر پہنچ جائیں۔ جو آپس میں باتیں تو کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی تکابوٹی نہیں اڑاتے۔

۶۔ ذہن انسانی

غالباً انسانی ذہن تخلیق کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس دعوے سے اتفاق ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ حکیم آئن سٹائن اور موجد ایڈسین جیسے لوگوں کے ذہن سامنے رکھے جائیں۔ کیونکہ آئن سٹائن نے کائنات کے قوسی خلا کو حساب کے ذریعے ثابت کیا اور ایڈسین نے گرامو فون اور سینما کی مشین جیسی چیزیں ایجاد کیں۔ یہ دعوے ان ماہرین طبیعیات کے ذہنوں کے پیش نظر اور کچھ مضبوط ہو جاتا ہے جو کسی ستارے کی راہ میں رفتار ناپ لیتے ہیں۔ اہم کی ترکیب جانتے ہیں اور ایٹم سے کیا کیا کچھ بنا سکتے ہیں اور ایسے کمیرے بنا سکتے ہیں جو رنگین تصویروں کے سوا سب کو با بندروں کی بے مقصد اور فضول کردار اور

آٹ پلٹ کے منقابے میں انسانی ذہن ایک عظیم الشان چیز ہے۔ ایسی وسیع اور ارفع کہ اس میں کائنات کے رازوں کو سمجھنے کی اہلیت موجود ہے۔

مگر عام ذہن ایسے نہیں ہوتے۔ اس لئے میں ذہن انسانی کو عظیم الشان نہیں، ایک دل فریب چیز کہوں گا کیونکہ اگر سب انسانوں کے ذہن ایسے ہی اعلیٰ ہوتے تو ہر انسان معقولیت کا شکار ہوتا۔ وہ گناہوں اور کمزوریوں اور بد اخلاقی سے مستبر ہوتا اور اس طرح یہ مخلوق نہایت غیر دلچسپ ہوتی۔۔۔ میں انسان پرست

ہوں اور انسانیت کا دلدادہ ہوں۔ اسی لئے گناہوں سے پاک اولیا سے مجھے

نیادہ دلچسپی نہیں۔ مجھے تو انسان سے دلچسپی ہے کہ وہ سخت خیر منطقی، نہایت متلون ہے۔ وہ مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ بڑی دلچسپ حماقتیں کرتا ہے۔ جشن

منانکے، اودھم مچاتا ہے، اس میں سخت تعصب اور کڑبین ہے اور وہ نسیان کا

پتلا ہے۔ اگر ہمارے ذہن ایسے مکمل ہوتے تو ہمیں ہر نئے سال کے شروع

میں بے چوڑے پروگرام نہ بنانے پڑتے کہ اس سال ہم یہ کریں گے اور وہ نہیں

کہیں گے!۔ انسانی زندگی کی دلچسپی تو یہی ہے کہ انسان ہر سال نئے

نئے منصوبے باندھتا ہے۔ اور ہر سال کے آخر میں اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے

اپنے منصوبوں کا زیادہ سے زیادہ تسیرا سمجھ پورا کیا ہے۔ باقی کے دو حصوں

میں سے ایک جتنے پر تو عمل نہیں ہو سکا۔ اور ایک حصہ وہ بالکل بھول جاتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ وہ منصوبہ جس پر عمل یقینی ہو اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا ہے۔ اگر کسی

جرنل کو یہ معلوم ہو کہ اس نے ایک جنگ لڑنے کے لئے جو نقشہ بنا یا ہے۔ اس پر

عمل کرنے سے فوج کے کتنے آدمی مارے جائیں گے، کتنے زخمی ہوں گے اور

دوسرا نقصان کیا ہوگا تو اس کے لئے اس لڑائی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہے گی۔

اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ شطرنج میں آپ کے مقابل جو شخص ہے اس کا ذہن غلطی اور
 بھول چوک سے بڑا ہے تو آپ اس کے ساتھ کبھی شطرنج نہیں کھیلیں گے اگر ہمیں
 یہ معلوم ہو کہ نادلوں میں جو کردار موجود ہیں ان کا ذہن کیا سوچے گا اور نادل کا
 انجام کیا ہو گا تو نادل انسی پیش پا افتادہ چیز بن جائے کہ ہم کسی نادل کو چھو نا
 تک گوارا نہ کریں۔ ہم تو نادل اس لئے پڑھے ہیں کہ ہم ایک نامعلوم ذہن کے
 سوچ اس کام کا کھوج لگانا چاہتے ہیں۔ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایک ذہن کسی
 مقررہ وقت پر کس قسم کا فیصلہ کرے گا اور کن حالات میں کیا کچھ عمل پذیر ہو گا ساگر
 ہیں کسی کتاب میں ایسے سخت گیر باپ سے سائبہ پڑے۔ جو کسی وقت بھی اپنی سخت
 گیری چھوڑ کر ہماری طرح ایک انسان نظر نہ آئے تو ہمیں اس سے دلچسپی نہ رہے
 گی۔ اسی طرح وہ بے دفا خاوند بھی سخت غیر دلچسپ کردار بن جائے گا جو ہمیشہ
 اپنا لگا بندھا انداز اور گھڑا گھڑا یا طوری قائم رکھے۔ انسان اسی لئے دلچسپ ہے
 کہ وہ انسان ہے۔ ذرا ایک مشہور موسیقار کا خیال کیجئے۔ جو ایک حسین عورت کے
 لئے کوئی نغمہ ترتیب دینے سے ہمیشہ انکار کرتا رہا ہے اسے تپا چلتا ہے کہ اس کا
 رقیب موسیقار ایسا کرنے پر تیار ہو گیا ہے تو وہ بھی فوراً اپنا نغمہ ترتیب دینا شروع
 کر دیکھا اور اس طرح اپنے اصول کے خلاف عمل کرے گا۔ ایک سائنسدان
 کا تصور کیجئے جو اخباروں میں اپنے تحقیقی مقالے چھپوانے کی قسم کھا چکا ہے
 یا ایک وہ یہ خبر پڑھتا ہے کہ اس کا حریف اپنی تمام تحقیقات شائع کر رہا ہے۔ وہ اپنا اصول
 اٹھا کر طاق پر رکھ دے گا اور فوراً پبلشر کے گھر کا رخ کرے گا۔ یہی چیز انسانی صفات
 ہے۔ اور انسانی ذہن کی یہی خصوصیت 'سہی کمزوری' ہے۔ دلچسپ اور دل فریب
 بنائی ہے۔

گو یا انسانی ذہن اس لئے دلچسپ ہے کہ وہ کہنے لکھنا کلمات کا مارا ہوا ہے سخت
 متلون اور ضدی ہے اور کوئی اس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ اب
 وہ کیا سوچے گا اور کیا کرے گا اور اگر نفسیات نے ہم پر یہ بھی واضح نہیں کیا تو گویا ہم
 نے نفسیات سے ایک سو برس میں کچھ نہیں سیکھا۔ دوسرے لفظ
 میں انسانی ذہن اب بھی بے مقصد ٹانک ٹوسیے مارنے کی صلاحیت رکھتا ہے
 جو ہمارے اجداد 'بدر دن' کے ذہن کا خاصہ تھی۔

انسانی ذہن کے ارتقا پر ذرا غور کیجئے۔ انسانی ذہن اصل میں ایک ایسا
 عضو تھا جس کے ذریعے ہم خطرے کا احساس کرتے تھے اور اپنی زندگی کو محفوظ
 رکھتے رہتے تھے ذہن ترقی پا کر منطقی بنا اور حساب کتاب کی بارگیوں کو سمجھنے
 لگا۔ میرے نزدیک یہ ترقی 'محض اتفاقی تھی'۔ انسانی ذہن اصل میں
 اس کے لئے بنایا نہیں گیا تھا۔ اس کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ نوراک کو
 سونگھ کر تیز کر سکے، اور اب اگر حسانی قارمولوں کو "سونگھ" کر یہ ان میں
 تیز کر سکتا ہے، تو یہ مزید خوبی کی بات ہے۔ انسانی دماغ اور حیوانی دماغ کے
 بارے میں میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اس کی مثال ایک تین درجے کی طرح ہے جو
 اپنا جال پھیلاتا ہے اور پھاپیاں مڑتا رہتا ہے۔ جب کوئی حقیقت اس جال میں
 آ پھنستی ہے تو وہ اُسے کھا جاتا ہے آج بھی ہم یہ کہتے ہیں "میں محسوس" کرتا
 ہوں کہ یہ حقیقت ہے! یعنی ہم حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ اُسے صرف "محسوس"
 کرتے ہیں! گویا ہمارا دماغ ہمارے حواس اور محسوس کرنے والے اعضا کے
 قبیل کا ایک عضو ہے۔ رہا یہ کہ دماغ، حقائق کو محسوس کیے کرتا ہے، یہ ابھی
 تک طبیعات اور ریاضت نہیں کر سکی جب تک انسانی دماغ، محسوس کرنے والے اعضا

سے الگ ہو کر سوچنا شروع کرے اور اس کا سوچ غیر متعلق اور محض مجرمانہ ہو کر رہ جائے تو ولیم جیمز کے قول کے مطابق اس وقت انسانی دماغ واضح اور ظاہر حقائق سے ہٹ جاتا ہے اور نظر یا قی دنیادوں میں ٹاما سک توئے مارے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انسانی ذہن اپنی قوت کو بھینچتا ہے، غیر انسانی ہو جاتا ہے اور اپنی تمام خبریاں نائل کر دیتا ہے۔ ہلکوب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انسانی ذہن کا کام "سوچنا" ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے فلسفے میں بھی سخت گھپلے کئے جا رہے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر فلسفی کو اس وقت سخت صدمہ ہوتا ہے جب وہ انسانی ذہن کے بارے میں سوچتے سوچتے گھسرتے باہر نکل کر بازار میں جاتا ہے اور وہاں ہر قسم کے لوگوں کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہہ کرے روزِ مہ کے کاموں اور طور طریقوں سے سوچنے کا بہت ہی کم تعلق ہے! مرحوم جیمز باروسے روٹس نے اپنی کتاب "انسانی ذہن کی تشکیل" میں بتایا ہے کہ انسانی ذہن بتدریج چار بنیادی تہوں سے بنا تھا اور اب بھی یہ تعمیر جاری ہے۔ انسانی ذہن کی یہ چار بنیادیں یہ ہیں: حیوانی ذہن، وحشی ذہن، طفولیت کا ذہن اور قدیم تہذیبوں کا ذہن۔ ان تہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر موجودہ انسانی تہذیب کو اپنی بقا منظور ہے تو انسانی ذہن میں زیادہ تنقیدی صلاحیت پیدا کرنی لازمی ہے۔ میں جو بسائنس کے نقطہ نظر سے سوچوں تو جیمز ہارڈے روٹس کے ساتھ پوری طرح متفق ہوتا ہوں۔ لیکن دانشمندی کے لحاظ سے میں مجھے اس کی تعلیم پر شہید ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ذہن میں تنقیدی صلاحیتیں بڑھانے کا سطر یہ کہی ہو رہی تھیں تو ان میں باکمل ہاتھ نہیں ٹپا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ انسانی ذہن اسی طرح غیر معقول اسی طرح دلچسپ رہے! ایسی دیتا بجلا

کس کام کی جہاں ہر شخص بے حد عقل پسند اور عقولیت پرست ہو۔ آپ پوچھیں گے
 کیا میں سائنسی ترقی کے خلاف ہوں، جی نہیں، میں تو تقدس ہونے، اولیاء ہونے
 کے خلاف ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں انسانوں کو دانشور اور ذہین تر بنانے کے
 خلاف ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا جواب ہاں میں دوں یا نہیں میں۔ میں
 صرف یہ کہتا ہوں کہ مجھے انسانی زندگی سے گہری محبت ہے اور چونکہ مجھے انسانی زندگی
 سے اتنی محبت ہے لہذا میں "عقل و فراست" پر بالکل اعتبار نہیں رکھتا۔ اگر دنیا
 مجھ "عقل و فراست" ہو جائے تو جانتے ہیں کیا حال ہوگا؟ اخباروں میں کوئی
 خبر کسی کے قتل، چوری، داکے کی نہیں چھپے گی۔ ہر شخص اتنا عاقل، کامل، ایسا حاضر
 و موجود ہوگا کہ کوئی کام خراب نہیں ہو سکے گا۔ کہیں کسی گھر کو آگ نہیں لگے گی ہوائی
 جہاز کا کہیں کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ کوئی خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ نہیں
 جائے گا۔ کوئی پادری کسی سموری ریل کی کوٹھی نہیں کرے گا۔ کوئی بادشاہ محبت کی خاطر
 تخت و تاج پر لانا نہیں مارے گا۔ اور کوئی شخص اپنا ارادہ نہیں بدے گا۔ اس
 دنیا میں ہر شخص بڑی باتا عدلیگی کے ساتھ زندگی اختیار کرے گا۔ جس کا خاکہ
 ہم نے غالباً دس برس کی عمر میں تیار کیا تھا۔ اگر دنیا یہ ہو تو ہمارا تو دور سے
 سلام ہے۔ کیونکہ یہ دنیا انسانوں کی دنیا نہیں، اس میں کوئی سنسنی، کوئی خردش
 کوئی بے لگتی نہیں۔ ایسی دنیا میں کوئی ادب نہیں پیدا ہو سکتا کیونکہ اس میں
 ہر اخلاقی، انسانی کمزوری، طوفانی خواہشیں نہیں ہوں گی، تعصبات اور
 بیقاعدگیاں نہیں ہوں گی۔ اور معصیت یہ ہے کہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوگی۔ کوئی زنجار
 کوئی تیرنا نہ ہوگی۔ اس دنیا کی مثال ایسی گھر دور کی ہوگی جس میں کوئی چالیس
 پچاس ہزار تماشائیوں کو پہلے سے ہی معلوم ہوگا کہ کتنا گھر ڈا بھینے والا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسانی کمزوری ہی زندگی کی جان ہے زندگی کا آب و رنگ ہے۔
 اگر ہم سب انسان تحت منطقی اور نہایت معقول ہو جائیں تو ہماری دانشمندی میں کوئی
 اضافہ نہیں ہوگا، اسٹائم مشین بن کر رہ جائیں گے۔ ایک ایسی مشین جس کا ذہن جسم
 کی خواہشوں کو اسی طرح ظاہر کرے گا جس طرح بجلی کا میٹر بجلی کے خرچ ہوئے
 کو خود بخود ظاہر کرتا رہتا ہے!۔ یہ صورت حال سنت غیر انسانی ہے۔ اور جو پسیز
 غیر انسانی ہو وہ نہایت بُری ہے۔

میرے قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں انسانی کمزوریوں اور خامیوں کا بڑی کادش
 سے جواز پیش کر رہا ہوں اور ان خامیوں اور برائیوں کو خوبیاں بنا کر دکھانے کی کوشش
 کر رہا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے اصل یہ ہے کہ اگر ہم اپنے ذہن کو ترقی دے کر پوری
 طرح منطقی اور معقول بنالیں۔ تو ہم اپنے انداز و اطوار کو تو درست اور صحیح بنا سکیں گے
 مگر ہم زندگی کے لطف اور جینے کے مزوں سے قطعی طور پر محروم ہو جائیں
 گے۔ ————— پر صورت حال بڑی غیر دلچسپ ہوگی مگر آپ کو ایسے شوہر
 یا ایسی بیوی کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنی پڑے جو خوبیاں اور نیکیوں کا ہی مجسمہ
 ہو تو زندگی وبال ہو جاتے۔ یہ ماننا کہ ایسے مکمل اور معقول انسانوں کا ایک معاشرہ
 بننا سکتا ہے اور زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ مگر ان حالات میں زندگی کرنا بہت
 ہنگامہ سوار ثابت ہوگا۔ گویا معاشرہ ایسا ہی قائم کرنا چاہیے جو خوب منظم
 اور مربوط ہو مگر بہت زیادہ منظم اور بہت زیادہ باقاعدہ بھی نہ ہو۔ ذرا چیونٹیوں
 کا ایک قبیلہ دیکھیے جو اس دنیا میں ایک منظم اور سخت معقول معاشرے کی غالباً
 سب سے عمدہ مثال ہے۔ ان چیونٹیوں نے ایسی مثالی اشتراکی ریاست قائم کر رکھی
 ہے کہ وہ کروڑوں برس سے اسی طرح زندہ ہیں۔ اخلاق اور اطوار کی معقولیت

کا بہاں تک سوال ہے وہ ان چیونٹیوں کو ہی مبارک ہو۔ انسان کے لئے اس معاملے میں چیونٹیوں سے نچلے درجے پر تاقوت کرنا ہی بہتر ہوگا۔ چیونٹیاں پڑی مٹلتی، بڑی ہوش مند، نہایت کفایت شعار مخلوق ہیں۔ ان کا معاشرہ تنظیم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ نظم و ضبط اور ترتیب میں جو اب نہیں رکھتا۔ لیکن انسان ایسا نہیں رہیونٹیاں، وہ ان میں چودہ چودہ گھنٹے کام کرتی ہیں اور اپنے معاشرہ یا اپنی ریاست کے لئے کسی محنت سے ہرگز گریز نہیں کرتیں۔ ان میں فرائض کا احساس بدرجہہ اتم ہے۔ انہیں اپنے حقوق کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ ان میں مستقل مزاجی اور باقاعدگی ہے، تمیز اور حیوٹ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں اپنے آپ پر قابو پانے کی زبردست صلاحیت ہے۔ لیکن انسان ایسا نہیں ہے۔ وہ ان صلاحیتوں میں چیونٹیوں سے بہت پیچھے ہے۔

ذرا بتائے دو ام کے دربار کی سیر کیجئے۔ ان لوگوں کو یاد کیجئے۔ جھنڈیں ہم آپ عظیم شخصیتیں کہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہو گا کہ چیونٹیوں والی معقولیت اور اخلاق کی نعمت انہیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ یہ روماکا نامور فاتح بولس سیرز۔ عظیم جوسیس جس کی معقولیت کا حال یہ تھا کہ اس نے ایک عورت کے لئے ساری سلطنت کو پس پشت ڈال دیا۔ انٹونی کا حال اس سے بھی بدتر ہے، وہ موسیٰ ہیں جھنڈوں نے غصے میں وہ سارے سنگین صحیفے چلنا چور کر دیئے۔ جن پر انھوں نے خدا کے حضور میں کوہ سینا پر چالیس دن رات محنت کی تھی۔ وہ بھی معقولیت اور منطق سے اتنے ہی دور تھے۔ جتنی ساری اسرائیلی قوم تھی جس نے خدا کو چھوڑ کر سامری کے گوسالے کی پرستش شروع کر دی۔ یہ دو آدمی بادشاہ اور پیغمبر، ان کا حال یہ تھا کہ آج سوت ظالم ہیں اور کل نہایت رحمدل کبھی سوت یا غنیمتیں کر رہے

ہیں اور کبھی عیاشی میں غرق ہیں۔ یہ خدا کی پرستش بھی کرتے تھے مگر انہوں نے گناہ بھی کئے اور پھر تورات و انجیل کے لئے اپنے نعمات تو بہ بھی لکھے۔ — اس بقائے دوام کے دربار میں یہ حضرت سلیمانؑ ہیں جنہیں عقل و دانش کا پیکر کہا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنے بیٹے کو راہِ راست پر نہ لاسکے۔ — یہ صیتی پیغمبر کنفیو شس ہیں جنہوں نے ایک دفعہ ایک ملاقاتی سے کہا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں اور ساتھ ہی گانا بھرت کر دیا تھا کہ ملاقاتی کو یہ پتہ چل جائے کہ نہ میں گھر ہی میں! — یہ عظیم ڈرامہ نگار شکسپیر ہیں جن کی معنویت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ایک گھٹیا درجے کا پلنگ اپنی بیوی کو ترکے میں دینے کی وصیت کی تھی۔ یہ عظیم شاعر ملٹن ہیں جن کا گزرا اپنی تترہ سالہ تخیل بیوی سے نہیں ہوتا تھا، اسی لئے انہوں نے طلاق کے مسئلے پر ایک مقالہ لکھا اور جب اس مقالے پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو انہوں نے ایک کتاب میں آزادی گفتار پر زبردست خطبہ سپرد قلم کیا! — یہ جرمنی کے عظیم شاعر فنکار اور مفکر گوٹے ہیں جنہوں نے شادی اُس وقت کی جب اُس عورت سے ان کا رشتہ کا تترہ سال کا ہو چکا تھا۔ یہ سوفیٹ ہیں جو اپنی عمر اور علم اور شہرت کو بھول کر ایک بالکل نو عمر لڑکی کی لیدر سی سٹیلا کے لئے خون کے آنسو روتے تھے۔

..... یہ ناروے کے عظیم تخیل نگار آسن ہیں جو مگر یہ فہرست تو کبھی ختم نہیں ہوگی!!

کیا یہ ظاہر اور واضح نہیں کہ اس دنیا پر عقل نہیں بلکہ طوفانی غماہشوں کی حکمرانی ہے؟ اور ان عظیم شخصیتوں کو تمیز عجوب بناتی ہے، جو انہیں انسان ثابت کرتی ہے، وہ ان کی معنویت نہیں۔ ہرگز نہیں جس نے کئی بار دکھایا کہ چین میں کسی کے مرے پر جو مضمون لکھے ہیں اور جو سوانح شائع ہوئی ہیں وہ

بے حد غیر دلچسپ اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ کچھ کچھ ان میں مرے والوں کو غیر معمولی طور پر نیکو کار اور برتر انسان دکھایا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنی کتاب میرا ملک اور میرے ہم وطن شائع کی تو بھرپور چینی عالموں نے یہ اعتراض کیا کہ میں نے چینیوں کی صفات کے ساتھ ان کی کمزوریاں بھی گنوائی ہیں۔ مثلاً میرے ہم وطنوں، خاص طور پر چینی افسروں اور سرکاری ملازمین کا خیال تھا کہ اگر میں اس کتاب میں چین کو ایسی جنت ظاہر کرتا جس میں نہایت پر امن اور عمدہ قسم کے دولت مند لوگ رہتے ہیں تو میں اپنے ملک کے لئے نہایت تمیر سی پراپیگنڈہ کرتا۔ مگر میرے نزدیک سوانح حیات کی ساری دیکھی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ بڑے آدمی کے کردار کے انسانی پہلو بھی دکھائے جائیں۔ ایسے پہلو جو ہم کمزور انسانوں جیسے ہیں۔ کسی سوانحی کتاب میں کوئی غیر معقول بات اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ سوانح نگار اپنے مدد ح کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کبھی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر سن سٹریٹجی کی مشہور کتاب "عہد و ٹوریا" کے عظیم لوگ کو کمال فن سمجھا جاتا ہے۔

ایک نہایت ہوش مند ذہن کی عمرہ مثال انگریز قوم کا ذہن ہے۔ بحیثیت قوم انگریزوں کو منطق سے چنداں واسطہ نہیں بلکہ ان کا ذہن خطرے کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ اور زندگی کے تحفظ کا بھی فوراً اتہام کرتا ہے۔ انگریزوں کے قومی کردار اہل ان کی منطقی تاریخ میں مجھے کبھی کوئی معقول شے نظر نہیں آئی انکی ہوشیاری ان کا کلیسا اور دوسرے اچھے اچارے شخص اتفاقاً امور ہیں۔ مگر برطانوی سلطنت کی قوت کا راز یہ ہے کہ انگریزوں کے ذہن دوسرے کی بات کبھی نہیں اترتی۔ نندہ دوسرے کے نظریوں کو قابل قبول ہی گردان سکتے ہیں۔ انگریزوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انگریزی

طرز کار سب سے بہترین ہے اور انگریزوں نے کھانا اسی سب سے عمدہ اور سب سے مناسب خرچ کیا ہے۔ انگریزوں نے اگر کبھی منطق اور دلیل سیکھ لی تو اپنے اور اپنا اعتماد اٹھ جائے گا اور برطانوی سلطنت کے کمرے کمرے ہو جائیں گے کیونکہ کوئی ایسا شخص دنیا فتح نہیں کرتا پھر تاہم اپنے بارے میں کچھ شکوک کچھ شبہات ہوں تو ملاحظہ ہو کہ انگریز قوم کا رویہ اپنے بادشاہ کے ساتھ کیسا ہے وہ اس کے دل سے دفاوار ہوتے ہیں۔ وہ دل سے اپنے بادشاہ کو چاہتے ہیں لیکن انہوں نے خود ہی اپنے بادشاہ کو مقصر کی آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔ وہ اپنے بادشاہ سے من مانی کرتے ہیں۔ ورنہ بادشاہ کو تخت و تاج چھوڑنا پڑتا ہے۔ ملکہ الزبتھ اول کے وقت انگلستان کو سمندری طاقت اور کارکن تھے۔ وہ سپین کے خلاف اپنی سلطنت کی حفاظت کریں۔ انگلستان نے کافی تعدد میں ایسے سمندری لٹیرے پیدا کر کے اور پھر انہیں قدر و منزلت کی آخری رفتاروں پر بھی چڑھایا۔ گویا ہر زمانے میں انگلستان نے لٹیک لٹری ہے اور جس کے خلاف بھی لڑی ہے وہ واقعی دشمن تھا اس کے جو حلیف تھے وہ واقعی حلیف تھے۔ اس لڑائی کا موقع محل بھی ٹھیک تھا مگر انہوں نے اس کا نام غلط رکھا تھا۔ یہ سب کچھ منطق کا کوشمہ نہیں تھا یہ تو محض ٹھیک بات "مخسوس" کر لینے کا اعجاز تھا۔

انگریزوں کا چہرہ ہر نہایت مسرخ و سفیر ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً انگلستان کا کھرا اور کرکٹ کا کھیل ہے۔ ایسی صحت مند کھال جیسی کہ انگریزوں کی ہے، آدمی کے فکر پر ضرور اثر ڈالتی ہے یعنی ان کی زندگی بسر کرنے کے طریقے پر اپنا اہم اثر چھوڑتی ہے۔ جس طرح انگریز اپنی صحت مند کھال کے ذریعے سے سوچتے ہیں اسی طرح چینی اپنی آنٹوں کے ذریعے سے سوچتے ہیں۔ یہ چین کا بڑا پرانا رواج ہے۔ ہم چینی جانتے

ہیں کہ ہم اپنی آنتوں یعنی معدے اور پیٹ کے ذریعے سے ہر چیز پر غور و فکر کرتے ہیں۔ چینی زبان کا عام محاورہ ہے کہ فلاں شخص بھر پیٹ خیالات یا بھر پیٹ علم یا بھر پیٹ شعر و ادب کا مالک ہے۔ یا فلاں شخص بھر پیٹ غم یا غصہ یا پشیمانی یا غضب یا آرزو مندی سے دوچار ہے چینی عاشق جب مجبور سے جدا ہو جائیں تو وہ اپنے محبت ناموں میں یہ لکھیں گے۔ میری ٹھگین آنتوں میں نہرا ہاگر ہیں پرگنی ہیں یا تم سے جدا ہو کر جیسے میری آنتیں کٹ سی گئیں؟۔ جو چینی عالم سعی موصوع پر مواد اکٹھا کر لیں اور اپنے خیالات کو ترتیب دے لیں مگر انہیں کاغذ پر منتقل نہ کر پائیں ان کے بارے میں مشہور چینی محاورہ ہے کہ فلاں صاحب کے پاس فلاں مقالے کا تسکی مسودہ موجود ہے۔ گویا چینی مفکر اپنے خیالات کو اپنے منہ میں ترتیب دیتے ہیں اور اب تو نفسیات کے جدید اکتشافات نے اس کی شہادت دیدی ہے۔ مگر چینی مفکروں کو اس جدید شہادت کی کوئی حاجت نہیں۔

انسانی ذہن جب اس کائنات کے مٹھوس مظاہرے کے بارے میں غور کر لہا ہوتا ہے ہتھیانہ سمجھتے (انسانی ذہن صرف انسانی تعلقات کو سمجھنے میں ہی کچھ نیاز مند ہے) میں سائنس کی ترقی کے بارے میں بہت پر امید ہوں۔ مگر انسانی معاملات میں انسانی ذہن توازن اور تنقید اور معقولیت سے کبھی کام لے گا؟ یا انسانیت کبھی اس پر امن معاہدے کی سطح پر پہنچ جائے گی جہاں اس کی طرفانی خواہشوں کی یاخار نہ ہو سکے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ ہو سکتا ہے انفرادی طور پر انسان بڑی اونچی بلندیوں کو چھو لے مگر انسانی گردہ اور انسانی معاشرے اسی طرح درختی جذبات کے غلام ہیں، اسی طرح رجعت کی راہ پر گہرائیوں میں پھیلتا جا رہا ہے ان میں وہی درختیہ جبلتیں کا لہرنا ہیں۔ جو ہمیشہ سے ہیں۔ ان میں کبھی نہ بھی مذہبی خون

... اور گہرے تعصبات اور اجتماعی رجحان کے وہی ظن ان آتے ہیں جو ہمیشہ بنی نوع انسان میں آتے رہے ہیں۔

تو اپنی یہ انسانی کمزوریاں جانتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ اس منحوس شخص سے اور زیادہ نفرت کریں جو اپنی تعلیمات اور خطابت سے کام لے کر ہماری انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے اور ہمیں ایک نئی عالمگیر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جو نفرت کی پرورش کرتا ہے اور نفرت کا جذبہ ہم میں کافی بڑھتا ہے۔ یہ شخص فرد کی ناجائز ترقی اور فساد کی خود غرضی کو آسمان پر چڑھاتا ہے اور ان دو چیزوں کی پہلے ہی ہم میں بڑی بھرمار ہے یہ وہ شخص ہے جو ہمارے وحشیانہ تعصب اور ہمارے نسلی تعصب کی اہل کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو نوجوان کی تنظیم کے لئے انجیل کے پانچویں حکم 'تمہیں کسی کو جان سے مارنا نہیں ہوگا' کو منسوخ قرار دیتا ہے اور قتل و غارت اور خون ریزی اور جنگ کو اعلیٰ ترین کام قرار دیتا ہے۔ گو یا ہم پہلے ہی کافی جنگ اور جھگڑاؤ نہیں تھے! یہ وہ شخص ہے جو ہمارے جنونی جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ گو یا ہم پہلے ہی ان کی وجہ سے جانور نہیں تھے! ایسے شخص کا ذہن خود حیوانیت کا مظہر ہوتا ہے۔ چاہے عام معنی میں یہ شخص کتنا دانش مند، کتنا صاحب عمل اور کتنا چالاک اور مستعد ہی کیوں نہ ہو اس میں بچاؤ کی دانشمندی کی نازک پری ہمارے وجود میں ایک وحشی جانور ایک جن کے ساتھ بندھی پڑی ہے۔ یہ وحشی جانور ہمارا وہ حیوانی وراثہ ہے جو ہم تکسیدہ بنچا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دانش کی بے پرسی ایک تیلی اور پرانی سی رستی سے اس وحشی جانور کو اس جن کو مقید رکھتی ہے۔ مگر یہ قید عارضی ہوتی ہے۔ کسی وقت یہ رستی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ جن 'وہ وحشی جانور آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر یہ وحشی کھل کھیلتا ہے

اور ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہم مہذب ہوتے ہوتے بھی زندگی اور وحشت کے کتے قریب ہیں۔ اور تہذیب کا ملمع کتنا ہلکا ہے اور یہ تہذیب کتنی سطحی ہے۔ ایسے موقعوں پر ساری تہذیب دھری رہ جاتی ہے۔ عرب، عیسائیوں کے خون سے ہاتھ دھو رہے ہیں اور عیسائی عربوں کو مار رہے ہیں جیسی سفید اقوام پر حملے کرتے ہیں اور سفید قوم لوگ حبشیوں کو گولی سار رہے ہیں۔ جنگلی چوہے اپنے اپنے بلوں سے نکل کر انسانی لاشوں کی بوٹیاں فوختے ہیں اور آسمان پر گدھ اس آسمانی لاشوں کی ضیافت پر منڈلاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہمیں یہ یاد دلانا ہے کہ جانور آخر ہمارے بھائی ہیں۔ یہی وہ تجربے ہیں جو قدرت ہمارے لئے صحن میں لاتی ہے۔

تجزیہ نفسی کا طریق علاج یہ ہے کہ دماغی مرلیوں کو ان کا ماتھی یاد دلا یا جائے اور انہیں اپنی زندگی کو خارجی انداز سے دیکھنا سکھایا جائے۔ اگر انسانیت بھی اپنے ماضی پر زیادہ غور کرے تو انسان کو اپنے اوپر زیادہ قابو زیادہ اختیار حاصل ہو جاتے۔ شاید یہ احساس کہ ہم ایک حیوانی ورثے کے وارث ہیں اور حیوانیت سے اب بھی بہت زیادہ قریب ہیں، ہمیں وحشی جانوروں کی طرح برتاؤ کرنے بلکہ وحشی جانوروں سے روک سکے۔

مگر اس صورت حال کا علاج کیا ہے کہ ہمارا تنقیدی ذہن بڑا کمزور اور بے حس سا ہے۔ غور و فکر سے زیادہ امید رگانی نفسوں ہے۔ پھر معقولیت بھی کم ہی ہمارے کام آتی ہے۔ اہل میں ہمارے لئے راستہ یہ ہے کہ ہم معقولیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ہمارا لہکر ہماری سوچ بچار جذبات سے عاری نہ ہو ہمدردی اور حلم سے خارج نہ ہو۔ اس میں جبلت اور وجدان کا پورا دخل رہے۔ یہی

چیز ہے جو ہمیں اپنے اجداد کی طرح کا حیوان بننے سے بچا سکتی ہے۔ ہمیں زندگی کو اس طرح پروان چڑھانا ہے کہ وہ ہماری جبلتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ ہماری سلامتی بس اسی میں ہے! میرے نزدیک خیالات کی تہذیب و تعلیم کے بجائے ہمارے حواس اور ہمارے جذبات کی تہذیب و تعلیم کہیں زیادہ ضروری ہے۔

باب چہارم

انسانیت پرستی

- ۱۔ انسانی شرف اور وقار
- ۲۔ تجسس اور انسانی تہذیب کی ابتدا
- ۳۔ انسان کے سپنے
- ۴۔ زندگی اور شرافت
- ۵۔ مزاج کا تلون
- ۶۔ انفس اور تبت

انسانی شرف اور وقار

گزشتہ باب میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ انسان کو اپنے آباء سے کیا دہنہ ملے ہے
 حیوانوں اور انسانوں میں کیا کچھ باتیں مشترک ہیں اور ان کا انسانی تہذیب کے
 منہج اور نوعیت پر کیا اثر پڑا ہے۔ مگر یہ تصور بھی مکمل نہیں ہوئی۔ انسانی فطرت
 اور انسانی شرف کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ابھی کچھ اور باتوں کی ضرورت محسوس
 ہوتی ہے۔ شرف انسانی کیا و فریب ترکیب ہے۔ اس کی اہمیت پر زور دینا
 ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ یہ انسانی شرف ہے کیا۔ مبادا ہم ساری
 بحث اسی غلط اور مبہم بنادیں رکھیں کہ اس بیسیوں صدی میں تو یہ خطرہ بڑا واضح نظر
 آتا ہے کہ ہم اپنی انسانی عظمت اور شرف کو کیکر کھو رہے ہیں۔

آپ پوچھیں گے۔ "اگر تم انسان کو حیوان ہی سمجھنے پر مہم ہو تو کیا انسان سب سے
 زیادہ حیرتنا انگیز حیوان نہیں؟" — میں آپ سے بالکل تسفق ہوں۔ صرف
 انسان ہی وہ مخلوق ہے جس نے ایک تہذیب ایجاد کی اور یہ وہ ایجاد ہے جسے
 کسی طرح بھی غیر اہم نہیں کہا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے آدمی سے بہتر حیوان بھی اسی دنیا
 میں ہوں جن کا جسم اور جہانی ساخت انسانوں سے کہیں بہتر ہو۔ جیسے گھوڑا ہے یا انسان
 سے بہتر اور مضبوط رکس ہے اور ٹھیلیاں ہوں جس کی مثال شیر ہے۔ کتے ہیں
 انسان سے کہیں زیادہ سونگھنے کی طاقت موجود ہے اس میں وفاداری
 بھی زیادہ ہے عتاب کی آنکھیں انسان کی آنکھوں سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہیں

رُخ اور سمت کا احساس کبوتروں میں انسان سے کہیں بہتر ہے۔ چیونٹیاں انسان سے کہیں زیادہ محنتی منظم اور کفایت شعار ہوتی ہیں۔ فاختہ اور ہرن انسان سے کہیں زیادہ حلیم اور خوش مزاج ہیں۔ گائے میں انسان سے زیادہ قناعت اور صبر ہوتا ہے۔ بلبل اور دوسرے گائے پرندے انسان سے زیادہ سریلے اور خوش آواز ہوتے ہیں۔ طوطے اور مور انسان سے کہیں زیادہ خوش پوش اور خوش لباس مخلوق ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود بندہ میں کچھ ایسی بات ہے کہ میں ان جانوروں پر بندہ کو ترجیح دیتا ہوں انسان میں جو بندہ دن کی ایسی چالاکی اور مستعدی اور کردار کا جذبہ موجود ہے، اسی کی وجہ سے میں انسان ہونا پسند کرتا ہوں۔ یہ ماننا کہ چیونٹیاں بڑی منظم اور بڑی محقوریت پسند مخلوق ہیں اور انکا طرز حکومت آج کل کی کسی حکومت سے کہیں مستحکم اور پائیدار ہے۔ مگر کیا چیونٹیوں کے پاس لائبریریاں اور عجائبات گھر بھی ہیں؟ جب کبھی چیونٹیاں یا ہاتھی دنیا کی سب سے بڑی دور بین ایجاد کریں گے یا کوئی نیا اور ہر آن رنگ بدلتے والا ستارہ دریافت کریں گے یا کبھی سورج گرہن کی پیش گوئی کر سکیں گے یا جب کبھی پھلیاں ریاضی میں اتنے فارمولے ایجاد کریں گی یا جب کبھی اور بلاں کبھی نہر پانا مہ جیسی نہر نکودنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو میں اس دنیا کا نظام ان کے حوالے کر دوں گا۔ انہیں کائنات کا مالک سمجھوں گا اور انہیں ہر مخلوق سے

اشرف مخلوق قرار دوں گا!

تو لو یا انسان کو اپنے کارناموں پر فخر کرنا چاہیے۔ مگر یہ تحقیق کر لیجئے کہ ہمیں کس چیز پر اترا نا ہے، یعنی انسانی عظمت اور شرف کی روح، اسکی اصل کیا ہے؟

اس کتاب کے شروع میں میں نے عرض کیا ہے کہ انسان کی عظمت میں ایک آوارہ گرد کی فطرت کے چار عناصر شامل ہیں۔ اسی آوارہ گرد کو چینی ادیب نے آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ آوارہ گرد کے چار عناصر یہ ہیں؛ ہر دم جوان تجسس۔ خواب دیکھنے کی صلاحیت۔ زندہ دلی اور ظرافت جو ان خوابوں کی اصلاح کر سکے اور آخری عنصر یہ ہے کہ مزاج میں تلون ہو۔ کچھ تپانہ چلے کہ وہ کس موقع پر کیا کر بیٹھے گا یہ وہ عناصر ہیں جو مل کر فرد کے باسے میں چینی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انفرادیت پسندی کا اس سے بہتر کوئی بیان دنیا میں موجود نہیں جیسا کہ چینی ادیب نے آوارہ گرد کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ سہی وجہ ہے کہ خود امریکی انفرادیت پسندی کے عظیم ترین ترجمان والٹ ڈیٹن گو دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے شان دار کابل بھی کہا گیا ہے۔

۲۔ تجسس اور انسانی تہذیب کی ابتدا

آوارہ گرد انسان نے تہذیب کے زینے پر کیسے قدم رکھا؟ — ابتدا میں اُس میں اس صلاحیت کے کیا آثار نظر آئے ہوں گے، اس کی بڑھتی ہوئی ذہانت کے آثار کیا ہوں گے؟ — اس کا جواب انسان کا شروع تجسس ہے۔ اس جذبے کی بدولت انسان نے شروع شروع میں ہاتھوں سے کام لینا شروع کیا، ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا تاکہ اس کا معائنہ کیا جاسکے بالکل اسی طرح جیسے آج بھی بنیاد فرسٹ کے لمحوں میں اپنے ساتھی کی آنکھ کا پوٹا الٹ کر دیکھتا ہے یا اُس کے کان کی لومڑی کو دیکھتا ہے کہ بیٹھے جو تیس ہیں یا نہیں یا مخلص مردار سے

کی خاطر مرد مرد دیکھتا ہے۔ کسی چڑیا گھر میں جا کر بندروں کا ایک جوڑا دیکھتے ہو ایک دوسرے کے کان اٹھتے رہتے ہیں اور یونہی ہر چیز کو الٹا پلٹا کر دیکھتے ہیں۔ آپ کو فوراً کسی نیوٹن سائن کے پیدا ہونے کے آثار مل جائیں گے!

چنانچہ جب انسانی ہاتھوں سے سنبھے مقصد طور پر چیزوں کو الٹا پلٹا کر شروع کیا تو یہ بڑی اہم تبدیلی تھی۔ اور یہ ایک سائنسی حقیقت بھی ہے کیونکہ تہذیب کی بنیاد اس وقت پڑی جب انسان (بن مانس) نے چار ہاتھ پاؤں پر چلنا چھوڑا، سیدھا کھڑا ہو گیا، ڈونا لگوں والا حیوان بن گیا۔ گویا اس طرح انسان کے ہاتھ پہلی دفعہ کام کے لئے آزاد اور فارغ ہوئے۔ آج بھی ہم بلیوں میں دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے کے پنجے جب چلنے کے کام سے فارغ ہوں تو ہر چیز کو اٹھتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ تہذیب بندروں کی بجائے بلیوں سے شروع ہوتی مگر مشکل یہ تھی کہ بلیوں کے اگلے پنجے بندروں کے پنجوں کی نسبت بہت کم ترقی یافتہ ہیں۔ بندروں کے پنجے شاخیں پکڑنے اور درختوں سے بھولنے کی وجہ سے کافی ترقی یافتہ تھے۔ ان میں انگلیاں پوری طرح بن چکی تھیں۔ بلی کے پنجے، صرف پنجے ہیں جو رگ ٹھوں اور گوشت کے ایک لوتھر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

اس وقت میں یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں سنہ ۱۸۸۰ء ماہر حیاتیات نہیں ہوں۔ میں انسانی ارتقائی تاریخ کو انسانی ہاتھوں کی اس آزادی، اس "فریڈم" سے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے وہ باتیں کہنی ہیں جو ممکن ہے دوسروں نے نہ کہی ہوں، یا دوسروں نے ان کا مشاہدہ بھی نہ کیا ہو۔ غیر انسان جب بلیوں کے بل چلنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کے ہاتھ چلنے کے بجائے دوسرے

کامیوں کے لئے فارغ ہو گئے تو اس کے بڑے ڈور رس نتائج نکلے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے ہاتھوں سے اوزاروں کا استعمال سیکھا۔ اسی سے حیا اور شرم کا احساس پیدا ہوا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کو زیر کیا گیا۔ غالباً اسی کی بدولت زبانوں کا وجود ہوا۔ اسی کی بدولت انسان میں تجسس کی شوخی پیدا ہوئی اور دریافت کا مادہ پیدا ہوا۔ یہ مافی ہوتی بات ہے کہ اوزاروں کی ایجاد سے انسانی تہذیب شروع ہوتی ہے اور اوزاروں کی ایجاد اس لئے ممکن ہوئی کہ انسان ہاتھ ترقی پاتے پاتے موبودہ صورت کو پہنچ گئے تھے۔ کروڑوں برس پہلے جب آدم نما بڑا بندر درخت سے اتر کر زمین پر رہنے لگا تو غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا جسم بہت بھاری بھر کم ہو چکا تھا۔ زمین پر آکر اس کے سامنے دو راہیں تھیں کہ یا تو لنگور کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا رہے۔ اور یا بن مانس کی طرح صرف پچھلے پاؤں پر چلنا سیکھے۔ انسان کا جدِ اعلیٰ لنگور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ چھوٹا یہ ہے اور اس کے اگلے پنجے چلنے کے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بن مانس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلنا سیکھ کر اپنے سامنے دانے پٹے خار غ کر لئے تھے۔ چنانچہ بن مانس کی چال چلکر اس آدم نما بندر نے اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ سے نہیں پھل توڑنے سیکھ لئے۔ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ اس نے ایک اونچی چٹان پر ایک غار میں رہنا شروع کر دیا اور جب کبھی کسی دشمن کا خطرہ ہوتا تو وہ اس بلند سی سے پتھر لڑھکاتا اور دشمنوں پر اپنے اگلے پنجوں سے کنکروں پتھروں کی بارش کرتا۔ غالباً یہ پہلا اوزار تھا جو انسان نے استعمال کیا۔ ممکن ہے اسے بے مقصد تلاش کرتے وقت تیز دھار والے پتھر یا چٹانوں کے نوکیلے ٹکڑے مل گئے ہوں اور اس کے بارے میں کچھ لکھا ہو

یہ تیز دھال والے گول پتھروں کی نسبت دشمنوں کو مارنے کے لئے دیا وہ کارآمد ہیں
 چیزوں کو اولٹ پلٹ کرنے کے سارہ سے عمل ہے۔ مثلاً کان کی لو کو آگے پیچھے
 دونوں طرف سے دیکھنے کی لم سے) اس آدم نامبدر میں یہ ملکہ پیدا کر دیا ہوگا
 کہ وہ چیزوں کو ایک گل کی حیثیت سے تصور میں لاسکے۔ چنانچہ اس کے ذہن میں
 مکمل چیزوں کی تصویریں بڑھتی گئیں اور اسی کی بنا پر دماغ کے سامنے حصے
 وجود میں آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جنسی معاملوں میں شرم و حیا کی بنیاد بھی، انسانوں کے بھلی
 طمانگوں برکھڑے ہونے، اس سیدھے قدر کی وجہ سے ہے۔ یہ شرم و حیا جانوروں
 میں بالکل مفقود ہے۔ انسان میں اس شرم و حیا کی ایک خاص وجہ یہ نظر آتی ہے
 کہ جب آدم نامبدر چوپا تے کے بجائے دوپایہ ہو گیا تو اس کے جسم کے وہ حصے
 جو پہلے عقی تھے اب اس کے جسم کے عین درمیان میں آگے اور جو اعضا عین
 پیچھے ہوتے تھے اب وہ عین سامنے آگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بے ترتیبی
 بھی ہوئی۔ اس الٹ پھیر کا زیادہ اثر آدم پر ہوا کہ کئی کئی دفعہ اس نئی قسم کی مادہ
 کا بچہ ضائع ہو گیا اور جن جن وغیرہ بھی بے قاعدہ اور تکلیف دہ ہو گیا کیونکہ ہمارے
 رگ پٹھے، مچھلیاں، وغیرہ اس صورت میں تھے کہ ہم چوپا تے رہتے ہیں مثلاً
 سو یا کہ بیٹ ہیں اسکے جنین دیکھے جاتے، اس صورت میں ہوتے ہیں کہ جنین کی یہ تھیلی
 حاملہ کی ریڑھ کی ٹڈی سے لٹکتی رہتی ہے۔ مثال یہ ہے کہ جس طرح الگنی پر آپ
 نے کپڑے ڈال رکھے ہوں اس صورت میں وزن اور لنگر دونوں مناسب
 طریقے پر بٹے رہتے ہیں۔ انسانی ماں کو حمل کی حالت میں سیدھا کھڑا کرنا قدرت
 کی ایسی ستم ظریفی ہے گویا کپڑوں کی الگنی کو ہم نے زمین کے متوازی نہیں رکھا بلکہ

اس کا رخ آسمان کی طرف کر دیا۔ اور لطف یہ ہے کہ کپڑوں سے یہ امید بھی رہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک رکھے ہیں۔ اصل میں عورتوں کی انگلی اس لئے بنائی نہیں گئی تھی مگر ہر روز لول ہی سے دوپایے ہوتے تو اس کی یہ صورت کبھی نہ ہوتی اور یہ ہار شانوں کے ساتھ بہتر صورت میں حاصل ہوتی اور پھر سارا کام ٹھیک تھا جن حضرات کو انسانی جسم اس کے اعضا وغیرہ سے اچھی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ انسانی رحم اور انڈے دانی کتنے عجیب اعضا ہیں عقل نہیں مانتی کہ اس قسم کے اعضا اپنی جگہ رکھیں اور پھر کام بھی کر سکیں زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ رحم اور انڈے دانی کی جو پوزیشن اس وقت انسانی جسم میں ہے اس جگہ رہ کر یہ اعضا پے کہیں زیادہ گڑبڑ اور بیماریاں اور جنس کی ہزار ہا گنا زیادہ خوابیاں کیوں پیدا نہیں کرتے؟۔ اصل میں ایام کا مسئلہ ایسا ہے کہ آج جنگ پوری طرح نہ کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ اس کی وضاحت ہو پاتی ہے۔ خیر یہ ماننا کہ ایام کا آنا اس لئے ضروری ہے کہ عورت بچے پیدا کر سکے پھر بھی یہ سارا نظام کچھ بڑا طویل بڑا تکلیف دہ اور ناقص ہے اور یہ ساری خرابی اس بات کی ہے کہ ہم پہلے چوہے پائے تھے، مگر اب دو پایوں میں ڈھل گئے ہیں مردوں کے عورتوں پر غالب آنے کی تہ میں یہی چیز ہے۔ اسی وجہ سے عورتیں مغلوب ہوئیں اور غالباً اسی کی وجہ سے ہمارا معاشرہ یہ صورت پاسکا جو اس کی اس وقت ہے۔ میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر انسانی ماں دوپایے کے بجائے چوہے ہو تو کبھی خاوند سے مغلوب نہ ہوتی۔ خیر جب آدم نکلتا ہے تو دو پیروں پر چاٹنا سیکھ لیا تو بیک وقت دو بائیں ٹھوڑیوں میں اور دو بائیں انڈے معاشرے کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں

پہلی بات یہ تھی کہ اب مادہ اور نر و نون (چلتے عورت اور مرد ہی سہی) کچھ بیکار اور ننگے سے ہو گئے۔ ان میں کر یا اور تجسس بھی بڑھ گیا۔ اور انہیں بھیر چھاڑ اور چہل کا وقت بھی بلا۔ چنانچہ سارے کے جذبات نے بھی نئی نئی راہیں مڑھونڈ لیں۔ اُس وقت تک جو ماجاٹی کچھ ایسی خوش مزہ نہ تھی۔ غالباً اب دوسرے کو جو منے میں اتنی آسانی بھی نہ تھی اب بھی دیکھ لیجئے کہ آدم تا بندر کے سمبڑے آگے کونکے ہوتے ہیں اور ہونٹ کافی سخت ہوتے ہیں اور ایسے ٹھیس ہونٹوں سے چومنا کیا معنی رکھتا ہے! — مگر آگے پنجے آزاد ہو کر اب ہاتھ بن چکے تھے اور اب ان ہاتھوں نے نئی نئی اور زیادہ لطیف اور زیادہ ہلکی پھلکی حرکات کرنا سیکھ لیا تھا۔ یہ ہاتھ اب ڈالر سے تھپک سکتے تھے، سہلا سکتے تھے گدگدیاں کر سکتے تھے اور آغوش میں لے کر بھینچ سکتے تھے۔ اور یہ ساری حرکتیں ہاتھوں نے اتفاقاً ہی سیکھ لی تھیں، ورنہ شروع شروع میں تو ہاتھ ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں نکالنے میں ہی مصروف رہا کرتے تھے — میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے ان اجداد کے جسموں میں جوئیں نہ ہوتیں تو ہماری عشقیہ شاعری کبھی وجود میں نہ آتی، نہ کبھی پروان چڑھتی۔ بس ہاتھوں نے ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں نکالیں اور اسی کام کی بدولت جسموں کو سہلانا اور تھپکانا اور پیار کرنا سیکھ لیا۔ اس سے ہماری نفسانی جذبات کی ترقی میں کافی مدد ملی۔

یہ تو ایک رُخ سمجھا، دوسری بات جو اس وقت کے انسانی معاشرے میں درآئی، یہ تھی کہ دو پردوں پر چلنے والی انسانی مادہ کو حمل کی حالت میں کافی مدت تک بیکار اور قریب قریب محتاج سار سنہا پڑتا تھا۔ شروع شروع میں جب آدم تا بندر پھیلے پردوں پر کھڑا ہوا اور بھی اس صلاحیت کے حصول کو زیادہ دیر مانہ نہیں

گزر اٹھا تو حاملہ مادہ کے نئے پیٹ میں بچہ نے کمر بوجھ اٹھائے اٹھائے چلنا پھرنا، سخت دو بھر تھا۔ کیونکہ اس وقت ٹانگوں میں اتنی قوت نہ آئی تھی، نہ ٹیریاں اس طرح بنی تھیں کہ کوئی سیدھا کھڑا ہو کر چلے تو اس کا بوجھ اٹھالیں۔ پھر ٹوٹے ابھی اتنے نہیں بھرتے تھے کہ بڑھے ہوئے پیٹ کا بوجھ متوازن ہو جائے۔ چنانچہ شروع شروع کے دور میں اس دوپائے کی عایت یقیناً یہ ہوگی کہ جب کوئی نہ دیکھتا ہو تو بے چاری حاملہ مادہ شرم و حیا کی بالائے طاق رکھ کر پھر چاروں ہاتوں پاؤں پر چلی ہوگی تاکہ ریڑھ کی ہڈی کو کچھ تو سکون ملے، کچھ تو کمر کی تھکن دور ہو۔ یہ تکلیفیں اور پھر عورتوں والی دوسری تکلیفیں ذرا ذہن میں رکھئے۔ ان کی وجہ سے انسانی ماں ہمدردی اور نگرانی کی محتاج ہوئی اور اس نے ہر قسم کے چلتے کمر کے یہ چیزیں حاصل کرنی شروع کیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی حیثیت سے عورت نے اسی، ابتدائی دور میں اپنی خود مختاری، اپنی آزادی اپنے ہاتھ سے کھو دی۔ خدارا، ذرا انصاف کیجئے کہ بچے کی پیدائش کے ایام میں بھی عورت پیار بھرے ہاتھوں کے لمس ان کی تھپک کی بھونکی رہتی ہے! — ایک خرابی اور سوتی۔ سیدھا کھڑا ہو جانے سے اب اس ماں کے بوجھ پیدا ہوا اس کا پھین بھی دوسرے حیوانوں کی نسبت بہت لمبا ہو گیا کیونکہ انسانی بچے کے لئے دو ٹانگوں کے مہارے چلنا سیکھنا کافی مشکل کام تھا! — گھاسے کا بچہ اور ہاتھی کا بچہ قریب قریب پیدا ہوتے ہی چاروں پاؤں پر اچھلتا شروع کر دیتے ہیں مگر انسان کے بچے کو دو قدموں پر چلنے کے لئے کم سے کم دو تین سال چاہئیں۔ اور بھلا اس بے بسی کے زمانے میں اس بچے کی رکھوالی ماں نہ کرے تو کون کرے!

یہ انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ والدین کی نگرانی کا عرصہ بڑھتا گیا جنسی اوقام میں آج بھی چھ سات سال کا لڑکا پوری طرح مالک و مختار ہے لیکن تہذیب یافتہ ماحول میں لیک بچہ کم دیش ہاں میں روتی گمانا سیکھتا ہے اور غالباً ماسی عمر سیکھتا ہی رہتا ہے!..... (مصنف)

اب انسانی ترقی کی ایک بالکل نئی راہ نکلی — اصل میں انسانی معاشرے کی بنیادوں پر مبنی تھی کہ انسانوں کی روزمرہ کی زندگی کو مسئلہ جنس نے بالکل مختلف رنگوں میں رنگ دیا۔ حیوانوں کے مقابلے میں عورت کہیں زیادہ شعوری طور پر اور مستقل طور پر مادہ بن گئی۔ چنانچہ جنس، مادہ چھینے کے مقابلے میں اور شہزادی شیرنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ باشعور تھی۔

اس طرح مرد اور عورت میں وہ فرق، وہ نمایاں تفریق شروع ہو گئی جو اب ہماری تہذیب کا جزو ہے مثلاً جانوروں میں قدرت نے کو بناتی سنوارتی تھی اور وہ خود بھی بنتا سنورتا تھا لیکن انسانوں میں مادہ نے بنتا سنورتا شروع کیا۔ غالباً سب سے پہلے اُس نے اپنے پہرے اور اپنی چھاتی سے بال نوح نوح کر صاف کر دیئے۔ یہ سب چا پس تھیں، بقا کے لئے اور ہم روز جانوروں کو بھی یہی کچھ کرتے دیکھتے ہیں۔ مثلاً شیر حملہ اس لئے کرتا ہے کہ اپنے دشمن کے مقابلے میں وہ زندہ رہے کچھ اچھپ جاتا ہے کہ چھینا بچا رہے۔ گھوڑا خطرے سے بھاگتا ہے کہ جان بچی رہے اسی طرح عورتوں کی محبت اور حسن چلنے سب بچاؤ اور بقا کے حیلے ہیں۔ غالباً انسانی مادہ نے ابتدا ہی میں جان لیا تھا کہ مرد کے ہاتھوں میں زور زیادہ ہے اس سے رہنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لئے کیوں رشوت دو، کیوں نہ اُس کے جی کو پر چایا جائے، کیوں نہ اسے خوش رکھا جائے، آج کی تہذیب کی اصل یہی ہے۔ اور یہی آج کی تہذیب کا مقصد نظر آتا ہے کہ عورتیں مردوں کو سمجھانے پر ادھار رکھائے بیٹھی ہیں۔ کیونکہ انسانیت کی ابتدا ہی میں عورت نے جان لیا کہ مرد کو دھتکارنے اور اُس پر حملہ کرنے کے بجائے اُسے سمجھانا چاہیے اور اس کا مقصد زور اور قوت سے حاصل کرنے کے بجائے نرمی سے حاصل کرنا چاہیے۔

تہذیب کیلئے، تہذیب بھی تو نرمی ہی کا نام ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تہذیب مردوں سے نہیں عورتوں سے شروع ہوتی۔

میں تو یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ بے مقصد ٹر ٹر میں مردوں کے بجائے عورتوں نے کہیں زیادہ حصہ لیا ہے۔ یہی وہ شے ہے جسے آج کل ہم زبان کہتے ہیں! عمل تو اس میں نہیں کرنے کی عادت اتنی راسخ ہے کہ یقیناً عورتوں نے مردوں سے کہیں زیادہ انسانی زبان کو ترستی دینے میں ہاتھ بٹایا ہوگا۔ میرا خیال ہے، ابتدائی مرد کافی سنجیدہ اور خاموش سی مخلوق تھے۔ میں سمجھتا ہوں انسانی زبان اس طرح شروع ہوئی ہوگی کہ پہلے پہلے جب آدم نما نر باہر نکلے گا تو دو ہسلکیوں اپنے اپنے فاردوں یا گچھاڑوں کے درمیان پر بٹھی، یہ باتیں کرتی سمجھتی گی کہ زید عمر سے بہتر ہے یا عمر زید سے بہتر ہے۔ ایک یہ کہتی ہوگی کہ رات کو زید احتلاط میں کچھ زیادہ ہی حماقتیں کرتا رہا۔ اور پھر وہ کتنی جلدی غصے ہو جاتا ہے۔ کچھ اس طرح کی باتوں سے انسانی زبان وجود میں آئی ہوگی۔ دوسری کو یہی صورت نہیں ہو سکتی۔ اب انسانی جبرے کو لیجئے۔ شروع میں چو پاؤں کی حالت میں جبرے کو درد کام کرنے پڑتے تھے ایک تو یہ کہ... خوراک اٹھانے اور دوسرے یہ کہ خوراک چھانے۔ اب جب ہاتھوں سے منہ میں لقمہ ڈالنے کا کام شروع ہو گیا تو جبروں کو بھی محنت کرنے کی عادت ہو گئی۔ چنانچہ زنتہ زنتہ جبر اچھے ہٹتا گیا کچھ اور چھوٹا بھی ہو گیا۔ اس وجہ سے بھی انسانی زبان کے ارتقا میں مدد ملی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب ہم چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کے بجائے دو پاؤں پر سیدھے کھڑے ہو گئے تو ہاتھ فارغ ہو گئے اور ان ہاتھوں کو چیزیں الٹ پلٹ کرنے اور انہیں اندر باہر سے دیکھنے کے لئے خاصی فرصت مل گئی۔

تجسس اور انسانی تہذیب کی ابتدا

۱۲۷

اس فرصت کا اظہار شروع میں ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں بھانسنے کی صورت میں ہوتا تھا۔ جوئیں بھانسنے سے ہاتھوں کو تجسس کی عادت پڑی۔ اور پھر علم کی کھوج کی بنیاد پڑی۔ آج بھی علمی ترقی باسی کا نام ہے کہ وہ جوئیں تلاش کی جائیں جو انسانی معاشرے کو پریشان کر رہی ہوں۔ لاکھوں سال کے عرصے میں اب یہ تجسس ہماری جبلت بن چکا ہے۔ یہ جبلت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر مضمون، ہر میدان اور معاشرتی خرابی کی ٹوہ لگائے اور جس قدر بن پڑے تحقیق، تفتیش سے کام لے۔ یہ خالص ذہنی کام ہے اور اس کا روٹی کی تلاش سے کوئی واسطہ نہیں یہ خالص انسانی روح کا تقاضا ہے۔ جس طرح بند ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں اس لئے تلاش نہیں کرتے کہ انہیں کھا سکیں بلکہ اس کام میں ان کے لئے کھیل کا سلف اور مزہ ہے۔ اسی طرح یہ خصوصیت ان تمام انسانی علوم اور اس علمیت میں ہے جو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان علوم میں انسان کی دلچسپی ان کی فائز سے ہوتی ہے انسان کے دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان علوم کو جاننے، جس صورت میں بھی وہ علوم ہیں ان پر حاوی ہو جائے۔ وہ ان علوم کو اس لئے حاصل نہیں کرتے کہ ان کی بدولت براہ راست یا فوری طور پر دولت کمانے اور پیٹ پانے میں مدد ملے گی بلکہ علم حاصل کرنا اب انسان کے لئے ایک جلی سا گھسی حبشیت رکھتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ علوم کے لئے تشنگی کا انسانی شرف اور وقار کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔ علم یا علم حاصل کرنے کی کوشش ایک قسم کا کھیل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں جن سائنس دانوں اور مورخوں نے کچھ کر کے دکھایا ہے وہ علم کو ایک کھیل ایک جی بہلانا سمجھتے رہے ہیں۔ یہی حال طبی تحقیق کرنے والے ڈاکٹروں کا ہے۔ وہ انسانوں کی بہ نسبت حراثیم میں کہیں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

اعلیٰ اور جے کے ماہرین فلکیات کا بھی یہی حال ہے، وہ ایک ایسے ستارے کی گردش اور اس کی حرکات و سکنات کا صحیح نقشہ تیار کرنے میں جان لڑا رہے ہیں، جو زمین سے کروڑوں میل دور ہوتا ہے اور جس کا زمین کے باسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، نہ ہی وہ کسی طور انسانی زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے، قریب قریب سب حیوانوں، خصوصاً کھوڑی عمر والے حیوانوں میں کھیلنے کا یہ مادہ ودیعت کیا گیا، مگر یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے، کما س شورش اور تقریبی قسم کے تجسس سے کیا کیا کام لے، اور انسان ہی ہے اس جذبے کو اتنی ترقی بھی دی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر قسم کی پابندی اور احتساب سے سخت نفرت ہے، مجھے ان اداروں اور ان کی حکومتوں سے بھی دلی مرہے جو ہمارے خیالات پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتی ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ احتساب اور یہ حکومت دونوں مل کر، انسانی ذہانت کی جان لوجھ کر توڑیں گے، ہے میں اگر خیال کی آزادی کو انسانی ذہن کی سب سے اعلیٰ سرگرمی مانا جائے تو اس آزادی پر کوئی قید لگانا، انسان کی حیثیت سے ہمارے ہی سخت توہین ٹھہری، یونان کے مشہور ڈرامہ نگار یورپی ڈیز نے ایک بچے غلام کی یہ تعریف کی ہے کہ غلام وہ شخص ہے جو خیال اور رائے کی آزادی کھو چکا ہو، اس حساب سے ہر جابر مطلق العنان حکومت کو ایسا کارخانہ سمجھئے جو دن رات سانچوں میں ڈھلے ہوئے غلام تیار کرتی رہتی ہے۔ ذرا مشرق و مغرب پر نظر ڈالئے، ہمارے وقت ہر حکومتوں کی کسی کسی خوبصورت مثالیں نظروں کے سامنے آتی ہیں اور حکومتیں اس بیسویں صدی میں تہذیب و ثقافت کے کین کن گہواروں پر مسلط ہیں، جابر حکومت

چاہے کسی طرح کی ہونے لہذا اس سے سخت مہماندہ اور رحمت پسند ہوگی۔ اس کی مثال تمدن وسطیٰ کی ساری حکومتیں ہیں خصوصاً ہسپانیہ کی مذہبی عداوت تو اس کی برترین تصویر ہے جو ^{میں} اور ^{میں} نیتا پر بھی احتساب کیا کرتی تھی۔ تنگ نظر سیاست دان اور مذہبی رہنما بھی سمجھا کرتے ہیں کہ عقیدے اور خیال کی عام یکسانی امن وامان کے لئے ضروری ہوتی ہے مگر تاریخی اعتبار سے اس یکسانی کے نتیجے بڑے خراب ہوتے ہیں اور انسانی کردار اس کی وجہ سے بڑا گھٹیا ہو جاتا ہے۔ جابر حکمرانوں کے دل میں عام طور پر عام لوگوں کے لئے تحقیر کا جذبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ایک قوم کے ظاہری کردار پر ہم چلانے پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کی نیشوں اور خیالوں اور جذلوں پر بھی پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ وہ بڑے بھروسے سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی ذہن اس یکسانی، اس پابندی کو برداشت کر لے گا۔

انہیں یقین ہوتا ہے کہ عوام ہی کتاب اسی فلم اور اسی موسیقی کو اچھا سمجھیں گے جسے سرکاری ڈھنڈورہ چلی یا حکومت کا کوئی اور نمائندہ اچھا کہے گا اور اس چیز کو جلا سمجھنے لگیں گے جسے سرکاری پراپیگنڈے میں برا قرار دیا جائے گا۔ ہر جابر اور مطلق العنان حکومت نے ادب اور پراپیگنڈے کو خلط ملط کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے آرٹ کے ڈائلے سیاست سے ملاتے ہیں، انسان کے علم ارتقا کو حسب الوطنی سے جا ملا یا ہے اور مذہب کو حکم کی پرستش کا مستر اور قیود قرار دیا ہے؟

مگر یہ اندھیر کیسے ممکن ہے؛ خیالات کو کنٹرول کر کے عوام لے یہ لوگ نہیں جانتے کہ اگر وہ انسانی نظریات کے خلاف دیر تک یونہی الٹی سیدھی کرتے رہے تو وہ اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود لیں گے تو یہ یونانی فلسفی من سی اس کا

قول ہے : اگر حکمران یہ سمجھے کہ رعایا محسوس و خاشاک ہے تو رعایا بھی
 یہ سمجھے گی کہ حکمران یا تو ڈاکو ہے یا ان کا جانی دشمن ! — مہذب اس دنیا میں سب
 سے بڑا ڈاکو وہی ہے جو ہمارے خیال کی آزادی پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ اگر خیال کشی
 آزادی اہم سے چھین لی جاتے تو ہمیں چاہیے کہ ایک بار پھر چور پاتے بن جائیں اور
 دو ٹانگوں پر چلنے کے اس طویل انسانی تجربے کو ایک غلطی قرار دے کر اپنی پہلی،
 حالت میں چار ہاتھ پاؤں پر آجائیں جس طرح آج سے کم سے کم تیس ہزار سال پہلے
 ہم چلا کرتے تھے۔ ڈاکو ہمیں جتنا بوتا ہے اتنی ہی ہمیں اس سے نفرت ہوگی۔ یہی
 حال اس جابر حکمران کا ہوگا۔ انسان کو اپنے ذہنی اور اخلاقی اور مذہبی عقیدے
 بڑے عسزیز ہونا کرتے ہیں۔ یہ اس کی ذاتی دولت ہوتے ہیں۔ جو شخص اس دولت
 سے محروم کر دے اور ہمیں خیال اور عقیدے کی آزادی کا حق نہ دے، اس
 سے ہماری نفرت کا انداز کون کر سکتا ہے۔ جابر حکمران عام طور پر کوتاہ اندیش اور
 احمق ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انسانی کردار میں بڑی لچک ہے، انسان
 کا ضمیر اتنا آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ اس پر کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی چنانچہ انسانی
 کردار اور انسانی ضمیر ہمیشہ جابر کی حکومت پر پوری طاقت سے وار کرتے ہیں اور
 کامیاب ہوتے ہیں۔

انسان کے سینے

کہا جاتا ہے کہ بے اطمینانی ایک روحانی چیز ہے۔ مجھے اتنا یقین ہے کہ
 بے اطمینانی، انسان کا خاصہ ضرور ہے اور بس — اس کا نشاں میں بند پہلا،

ہم گین جاننا کہ میں نے جانوروں میں افریقہ کے بڑے منگور کے چہرے سے بڑھ کر
 رنجیدہ چہرہ کسی کا نہیں دیکھا۔ میں اُسے فلسفی بھی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تفکر اور ادا
 میں بڑی تامل کا ساتھ ہے۔ ان منگوروں کے چہروں میں کوئی پیرا سی ہوتی ہے جس
 سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا سنجیدہ منگور نہ جانے کس سوچ میں گھویا ہوا ہے۔ باقی
 جانوروں میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ گائیں کبھی سو سوتی نظر نہیں آتی۔ وہ ہمیشہ اتنی
 مطمئن نظر آتی ہیں کہ ان کے سلسلے میں کسی تفکر کا گمان نہیں کرتا۔ ہاتھیوں میں
 بڑا جوش اور قہر معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ اپنی سونڈ ہلاتے رہتے ہیں۔ گویا سونڈ
 کو بار بار جھکنے سے ان کا سارا غصہ سارے ہی بے چینی اور ہوتی رہتی ہے اور انہیں
 کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر ذرا بندر کو دیکھیے تو وہ زندگی سے
 کتنا بیزار اور اکتایا ہوا نظر آتا ہے اور اس ادا میں بندر کی عظمت ہے۔

غالباً سارا فلسفہ اکتاہٹ کے احساس سے شروع ہوا تھا کم سے کم
 انسانوں کا تو یہی حال ہے کہ ان کے دل میں کسی نہ کسی نصب العین کا مہم سائیم
 چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ یہ انسانی خاوند ہے کہ اس ٹھوس اور تحقیقی دنیا میں رہتے ہوئے
 بھی انسان کسی اور دنیا کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ غالباً انسانوں اور بندروں میں
 فرق یہ ہے کہ بندر صرف بیزار رہتے ہیں اور انسان میں اس بیزاری اور اکتاہٹ
 کے ساتھ ساتھ قوت تخیل بھی موجود ہے۔ ہر انسان کو یہ خواہش ستاتی رہتی ہے۔
 کہ وہ اپنے کو لٹھ کے چکر سے کسی طور نکلے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ جو نہیں ہے وہ بن
 سکے۔ یعنی ہر انسان دن رات خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔ سپاہی یہ خواب دیکھتا ہے
 کہ وہ جولداری ہو جائے۔ جولداری یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ وہ کپتان بن جائے اور
 کپتان مینجر یا کرنل بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ کرنل اگر کسی قابل ہو تو وہ کرنل

کو کوئی رتبہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ذرا عمدہ نطقوں میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے لئے کو
اپنے بھائی بندوں کی خدمت کا ایک موقع تصور کرتا ہے اور اصل بات بھی یہی ہے۔
جو ن کراندر دادر جے نٹا گے نر جیسی بڑی ایگر سس اپنے آپ کو دیکھو نہیں سمجھتی
جو دنیا انہیں سمجھتی ہے۔ دنیا عظیم انسانوں سے پوچھا کرتی ہے: کیا آپ بے
حد ممتاز اور عظیم نہیں ہیں؟ اور جو لوگ حقیقی معنی میں عظیم شخصیت رکھتے ہیں
جو اب یہ سوال کرتے ہیں: نہ معلوم عظمت سے آپ کی کیا مراد ہے؟

گویا ہماری آپ کی دنیا ایک ایسے ہوٹل کی مثال ہے جہاں ہر گاہک یہ سمجھتا ہے کہ اس
کے سامنے جو کھانا رکھا ہے وہ اتنا لذیذ نہیں البتہ اُسے ہر دوسرے گاہک
کے سامنے جو کھانا لایا گیا ہے وہ بے حد لذیذ اور عمدہ معلوم ہوتا ہے! انسانی
پسندیدگی کے بارے میں ایک چینی پروفیسر نے مزاحاً یہ فقرہ چرت کیا تھا کہ یورپ
تو دوسروں کی اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر تحسیر اپنی ہی دوسروں سے اچھی لگتی ہے!
اس لحاظ سے اس دنیا میں کوئی شخص مطمئن نہیں ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ کوئی
دوسرا غالب اختیار کرے اور وہ کچھ بن جائے جو کوئی دوسرا ہے لیکن فرض کیجئے
کہ وہ کچھ بن جاتا ہے۔ اب وہ کچھ اور بننے کی فکر میں رہنے لگے گا۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہماری قوتِ تخیل کی بدولت ہے ہم انسان
ہوئی تیلے بنائے اور خوابوں کے محل تعمیر کرے میں بڑے مشاق ہیں جس شخص کی
قوتِ تخیل جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی وہ اس دنیا سے غیر مطمئن ہوگا۔ اسی لئے تو جس
بچے میں قوتِ تخیل زیادہ ہوتی ہے اس کی نگہداشت اور پرورش زیادہ مشکل ہوتی
ہے وہ بند کی طرح زیادہ وقت رنجیدہ اور ملول رہتا ہے۔ گائے کی طرح خوش
خوش اور مطمئن نہیں رہتا۔ اسی بنا پر جو لوگ کسی نصب العین کے دیوانے ہوں

سکتے ہیں جو عام سیٹوں پر آتے ہی نہیں یہ دور کے پروگرام ہماری نظر میں زیادہ
 قیمتی زیادہ عزیز ہوتے ہیں کیونکہ ہر سیٹ پر انہیں نہیں سنا جاسکتا، اور ہر سیٹ
 پر ان کی خوبیاں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا مشکل ہوتا ہے۔

بچپن کے سببوں کو یاد رکھتے ہوئے اسے غیر حقیقی نہیں ہوتے جتنے ہم سمجھتے ہیں
 یہ سچے زندگی بھر کسی نہ کسی طرح ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی لئے اگر مجھے
 یہ اختیار ہوتا کہ میں جو نسا ادیب چاہتا ہوں جاتا، تو میں امریکی مصنف اینڈرسن
 کا نائب اختیار کرتا۔ اس نے 'بچوں کے لئے ایک کہانی' جلیپری لکھی تھی۔ اسی
 کہانی لکھ لیتا، یا خود جلیپری بن کر جلیپری کی سی باتیں سوچنا بہت بڑی چیز ہے
 یہ سوچنا کہ میں جب بڑی ہو جاؤں گی تو پھر تیرتی ہوئی ان گہرائیوں سے نکل کر سمندر
 کی سطح کو دیکھوں گی۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے۔ اتنی پیاری، اتنی گہری خوشی صرف
 انسان کو ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک بچہ باہر چلتے پھرتے اپنے کمرے میں چپ
 چاپ بستر پر بیٹھ جاتا، یاد دہانی کے کنارے کھیلے ہوتے ہمیشہ اپنے ہی دکھناؤ
 اور یہ سچے حقیقی ہوتے ہیں مشہور موجود ایڈمین نے بھی اپنے دیکھے تھے۔ انگریزی
 کے نامور افسانہ نویس اور ناول نگار آر۔ ایس۔ سٹیونسن نے بھی خواب دیکھے تھے۔
 اسی طرح اپنے بچپن میں 'تامور انگریزی ناول نویس سر ڈالٹر سکاٹ نے بھی اپنے دیکھے
 تھے۔ یہ سب طلسمی سچے بچپن میں دیکھے گئے تھے اور ان ... نے تانے بانے
 سے وہ لطیف اور حسین داستانیں وجود میں آئیں جو ہم نے ان سے پہلے کبھی نہیں
 سنی تھیں۔ ان سے کتر درجہ کے بچے بھی اپنی بساط کے مطابق سچے دیکھتے ہیں
 اور ان سببوں سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر بچے کی روح انجانی چیزوں کی تمنا
 رکھتی ہے اور اپنی ان معصوم تمناؤں کی آغوش میں سوتی جاتی ہے اور نئی صبح سے ہی

رکھتی ہے کہ اس کے خواب ... حقیقت بن جائیں گے یہ سنے کسی کو بتائے نہیں جاتے یا نکل ذاتی چیز ہوتے ہیں اسی لئے بچپن کے یہ سنے بچے کے پر دان چڑھتے ہوئے ضمیر اسکی روح کا ایک بن جاتے ہیں۔ بعض بچوں کے سنے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نافع ہوتے ہیں انہیں وہ وقت بھی چھپی ہوتی ہے جو انہیں لیکر حقیقت بنا دیتی ہے بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ یہ خواب ذہن سے آ رہتے ہیں اور پھر ہم زندگی بھر ہی تک دود کرتے رہتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے بچپن کے ان طلسمی سنےوں کا حال بتائیں، لیکن بعض وقت موت آتی پہلے ہی نہیں دیتی کہ یہ سنے زبان تک آسکیں۔

یہ افراد ہی کا ذکر نہیں قوموں کا بھی یہی حال ہے ہر قوم کے حافظے میں اس کے خواب محفوظ رہتے ہیں۔ اور خواب صدیوں نسل در نسل چلتے ہیں ان میں اچھے اور اعلیٰ سنے ہوتے ہیں اور برے اور گھٹیا قسم کے بھی۔ دوسری قوموں پر فتح یابی اور غلبے کے خواب اور دوسری قوموں سے سبقت لے جانے کے خواب ہمیشہ برے خواب ثابت ہوتے ہیں۔ جن قوموں کو ایسے خوابوں سے سابقہ ہوا نہیں پڑا ان سنے والی قوموں کی نسبت انہیں زیادہ مہیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اچھے خوابوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ بہتر زندگی اور بہتر دنیا کے سنے امن و سلامتی کے خواب اور قوموں کے پرامن تعاون کے خواب اچھے خواب ہیں۔ دنیا میں ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے، انصاف کا بول بالا کرنے، غربت اور محتاجی کو دور کرنے کے خواب اچھے خواب ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ انسانیت کے برے خواب اچھے خوابوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور دنیا میں ہمیشہ انہی برے اور اچھے خوابوں میں کش مکش ہوتی رہتی ہے لوگ اپنے خوابوں کے لئے بھی اسی طرح لڑتے ہیں جس طرح مادی چیزوں کے لئے دست و گریباں رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ سنے، خیالی دنیا سے نکل کر

حقیقت کی دنیا میں در آتے ہیں اور ہماری زندگی میں ایک زندہ قوت بن جاتے ہیں۔ کچھ یہی قاعدہ ہے کہ ہمارے سپنے چاہے کتنے غیر واضح، کتنے مبہم کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں چھپے رہتے ہیں اور جب تک ان خوابوں کو حقیقت نہ بنا لیا جاتا ہے ہمیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ ان کی مثال بچوں کی سی ہے جو زمین کا سینہ چیر کر روشنی اور گرمی کی تلاش میں باہر نکل آتے ہیں۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خواب بڑی حقیقی، بڑی ٹھوس چیزیں

ہیں!

البتہ ایک خدشہ ضرور ہے کہ ہمارے خواب کہاں بے حد الجھے ہوئے ہوں یا ایسے ہوں جن کا حقیقت سے کہیں دور کا واسطہ نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ سپنے فرار کی راہیں بھی ہیں اور اکثر اوقات سونوں کے رسیا، اس حقیقی دنیا سے بھاگتے ہیں بگر یہ نہیں جانتے کہ بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں۔ افسانہ فطرت یہ ہے کہ ہم جو عجیب اہل میں ہوں، اُس سے مختلف بننا چاہتے ہیں۔ افسانہ لگی بندھی رہا ہوں سے ہمیشہ دور بھاگنا چاہتا ہے۔ لہذا۔۔۔ جو چیز ذرا سی تبدیلی کا بھی امکان پیش کر دے، عام انسانوں کے لئے اس میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو جنگ اس تشاچی لگتی ہے کہ جنگ کی بدولت ایک عام کلر کہ کبھی فوج کی عمدہ دردی ڈالے، ہتھیار سجائے، مفت میں درد و راز کے سفر کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح تین چار برس کی خونریز جنگ کے بعد عارضی صلح یا امن کا امکان اس لئے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بدولت تمہارا ماندہ سپاہی گھر واپس آسکے گا۔ فوج کی بے رنگ و ردی آمار، صاف پتھرے سوڈین سکے گا اور ایک بار پھر اپنی سب سے اچھی بکٹائی بھی بانڈھ سکے گا! — ہم انسانوں کو اصل میں ایسے ہی

کسی عوش، کسی سنسنی، کسی اشتعال کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے۔ اگر اب دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ جنگ سے ہر قیمت پر پہلو بچا یا جائے تو میں بڑی بڑی حکومتوں کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ اپنے اپنے ملک میں ہر نوجوان کو جبری بھرتی کے قانون کے ماتحت فوج میں بھرتی کر لیں اور پھر ان نوجوانوں کو دوسرے ملکوں کے تعلیمی دورے پر بھیج دیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ملک اپنی فوجوں کو مسلح کرنے پر جتنی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ اس رقم سے ان ملکوں کو کھربوں فرانسیس کی سیر کر سکتا ہے۔ آپ یہ دیکھیں نہ لائیے کہ جنگ پر خرچ تو ایک ضرورت ہے اور سفر یا سیر و سیاحت عیاشی میں داخل ہے۔ میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا میں تو سیر و سیاحت کو خرچ کی ضرورت سمجھتا ہوں اور جنگ کو بہت بڑی عیاشی قرار دیتا ہوں۔

انسان کے ان سینوں کے علاوہ اور سینے بھی ہیں جن میں مثالی دنیا کے سینے اندام ہو جانے کے سینے شامل ہیں۔ زندہ جاوید ہو جانے کے خواب بکھنا عین انسانی تقاضا ہے دساری دنیا یہی خواب دکھائی دیتی ہے، مگر دوسرے انسانی سینوں کی طرح یہ بھی مبہم اور غیر واضح خواب ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ اگر ازل اور ابد کا یہ چکر مٹ جائے اور ہم واقعی امر ہو جائیں تو پھر کیا ہوگا؟ اور اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ — اصل میں زندہ جاوید ہو جانے کی خواہش خود کشی کا عین اُلٹ ہے۔ اسی لئے دونوں کی نفسیات ایک سی ہے۔ دونوں کے سلسلے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ دنیا ہمارے لئے کوئی مناسب اور اچھی جگہ نہیں — مگر کوئی پوچھے کہ آخر آپ نے اس دنیا کو کیوں ناپسند فرمایا؟ اور یہ سوال اس وقت بے حد حیرت انگیز اور صحیح معلوم ہوگا جب بہار کی کسی

سہ پہر کو آپ باہر گھنٹیوں کی سیر کرنے جا رہے ہیں اور ہر طرف ہریالی چھپاتی ہو
اور پھولوں کے تختے بچھے ہوں۔

یہی حال ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھنے والوں کا ہے۔ مثالیت پسندی
دین کی ایک ایسی حالت کا نام ہے جو موجودہ نظام سے مختلف نظام پر اعتقاد رکھتی ہو
چاہے یہ خیالی نظام کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو! جو لوگ آزاد خیال کہلاتے ہیں اور مثالیت
مپند بھی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے ملک کو بدترین ملک گردانتے ہیں اور جس معاشرے
کے وہ فرد ہوں اُسے معاشرہ کی تمام ممکن قسموں میں سے بدترین قسم سمجھا کرتے
ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جو ہوسٹل میں جا کر یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے
گائیکوں کو جو کھانا دیا گیا ہے وہ اس کے کھانے سے کہیں بہتر ہے۔ ایسے لوگ نیربالک
ٹائمز کے مزاج بنگار کے بقول یہ سمجھتے ہیں کہ روس میں دریائے نیل پر جو بند
باندھا گیا تھا ابس وہ ہے صحیح معنوں میں بند کہلانے کا مستحق کسی جمہوریت پسند
ملک نے تو کبھی کسی دریا پر کوئی بند تعمیر ہی نہیں کیا! پیر آزاد خیال لوگ کہا کرتے
ہیں کہ صرف سوویت روس میں زیر زمین ریل ٹیکالی گئی ہے۔ اس کے
برعکس زلافا شامت ملکوں کے اخبار دیکھیے۔ یہ اخبار اپنے لوگوں کو یہی بتاتے ہیں کہ
صرف اپنی کے ملک میں انسانیت نے معقول اور عملی نظام حکومت ایجاد کیا ہے
باقی کہیں اس کا وجود نہیں۔ اصل میں مثالی دنیاؤں کے خواب دیکھنے
والوں اور قاشی ملکوں کے پراسپیٹڈ انسرز کا نتیجہ ایک ہے۔ دونوں ایک ہی
مرض میں گرفتار ہیں۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اندر کسی طرح
زندہ دلی اور ذوق سلیم اور ظرافت پیدا کریں :

۴۔ زندہ دلی اور ظرافت

غالباً زندہ دلی اور ظرافت کی اہمیت ابھی تک پوری طرح سمجھی نہیں گئی۔ شاید مہذب انسان نے یہ بھی غور نہیں کیا۔ دلی اور ظرافت کے ذریعے ہماری تہذیبی زندگی کی خصوصیات تبدیل کی جاسکتی ہیں اور اس سے سیاست، علم و ادب اور عام زندگی میں کیا کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ سمجھنا ہوں، ظرافت اور زندہ دلی دونوں کا فعل طبعی نہیں، کیمیائی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ زندہ دلی سے ہمارے خیالات اور ہمارے تجربات کی ساری نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں زندہ دلی اور ظرافت بہت اہم ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت کی ایک مثال سنئے: جرمنی کے قیصر و ہلم میں یہی زندہ دلی مفقود تھی۔ اس وجہ سے جرمنوں کو ایک پوری سلطنت سے ہاتھ دھوئے پڑے یا بقول امریکیوں کے، جرمنوں کو اربوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ شاید قیصر و ہلم، اپنی پرائیویٹ زندگی میں تو ہنسنے اور ٹھٹھوں کا قائل ہو مگر پبلک زندگی میں وہ بے حد سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر آن کسی نہ کسی چیز پر غصے سے بھرا رہتا ہے۔ رہا اس کا ہنسا اور اس کی خوشی تو اس کی نوعیت بھی عجیب تھی۔ وہ صرف فتح، کامیابی یا دوسروں پر غلبہ پانے پر ہنس سکتا تھا۔ میرے نزدیک قیصر و ہلم کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کب ہنسا چاہیے اور کس موقع کس بات پر ہنسا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے خیالات پر اس کی ظرافت اسکی ہنسی نے کبھی کوئی پہرہ نہ اٹھایا تھا۔ ان خوابوں کو ذرتی سلیم اور ظرافت نے فضول اور لائیکال اور مفحکہ انگیز ثابت کیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آمرانہ حکومت پر سب سے سخت اعتراض یہاں ہے کہ
 جمہوریتوں کے صدر ہنس سکتے ہیں مگر ڈکٹیٹر ہمیشہ سخت سنجیدہ نظر آتے ہیں۔
 کسی ڈکٹیٹر کو دیکھ لیجئے بڑا ہمیشہ سختی سے بھنچا ہوا ہوگا۔ ٹھوڑی سی آگے کو نکلی
 ہوگی اور پھلا ہونٹا زور سے بند کی ہوتی تھیلی کی طرح ہوگا۔ دیکھتے ہی ایسا معلوم
 ہوگا کہ یہ بڑا اہم شخص ہے۔ جو بے حد اہم کام کرتا ہے اور دنیا صرف اسی کی کوششوں
 سے زندہ ہے ورنہ فنا ہو چکی ہوتی۔ اس کے برعکس جمہوریتوں
 کے صدر حضرات پر نگاہ ڈالئے۔ امریکی صدر پبلک جلسوں اور عام صحبتوں میں مسکاتے
 نظر آتے ہیں۔ یہ بھلا اور پ کے ڈکٹیٹروں کی مسکراہٹیں کہاں گئیں؟ کہا ان کی رعایا
 انہیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی؟ کیا ضروری ہے کہ یہ ڈکٹیٹر حضرات
 ڈرے تہے نظر آئیں یا بہت بار عجب بنتے دکھائی دیں۔ یا جوش میں بھوسے
 رہیں یا بے حد سنجیدہ نظر آئیں۔ کیا اسی صورت میں ان کی حکومت قائم رہ
 سکتی ہے؟ ان سب باتوں سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ڈکٹیٹروں
 کے لئے تہرکا۔ مجتہد نظر آنا یا انتہائی نخوت اور رعب کی تصویر بن جانا ضروری ہے
 تو پھر امریتا میں کچھ نہ کچھ بنیادی خرابی ضرور ہوگی۔ گویا اس کا مزاج اور اس کی
 سرگزشت ہی غلط ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ڈکٹیٹر لوگوں کی مسکراہٹ کا یہ تذکرہ دفع وقتی کے
 لئے کیا جا رہا ہے۔ یہ بڑی اہم اور سنجیدہ بات ہے۔ کیونکہ اگر ہمارے حکمران مسکرا
 نہ سکیں تو یہ ہم انسانوں کے لئے بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ وجہ یہ ہے حکمرانوں کے
 پاس ہی تو دنیا جہات کی قہین اور دوسرے اسلحہ... موجود ہوتے ہیں۔
 وہ اگر ہنس نہیں سکتے تو لڑائی تو کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا تصور فرمائیے کہ اگر ریاست

میں خوش طبعی اور ظرافت کو دخل ہو جائے تو کیا ہے کیا نہ ہو جائے۔ فرض کیجئے کہ کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور اس میں تدریوں کے بجائے دنیا کے چارچو بہترین ظریف اور ٹھٹھول لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اگر ان کے ملک نہیں فیصلے کے پورے اختیارات ہر قسم کی مراعات دیدیں تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی فلاح اور بقا کا راستہ کھل جائے۔ میرے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ خوش طبعی اور زندہ ولی کے ساتھ سمجھداری اور معقولیت کا لاہری رشتہ ہے۔ گویا خوش طبعی "انسانی ذہن میں یہ ملکہ بھی پیدا کرتی ہے کہ دوسروں کی تضامنیاتی غلط منطق اور عام حماقت کو بہر طور بہتر سمجھ سکے۔ یہی انسانی ذہانت کی معراج ہے۔ اگر ہر قوم بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے ظرافت نگاروں کو نمائندہ بنا کر بھیجے تو سمجھئے کہ معقول ترین اور زیرک ترین لوگ ہی ہوں گے۔ مثلاً جارج بنارڈ شا آئرلینڈ کی نمائندگی کریں۔ سٹیفن لی گاک سینٹرا کے نمائندے ہوں۔ چسٹرن فوٹ بوچکے، مگر نی جی ڈوہوس، یا آئڈس گیلے، انگلستان کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ولیم روجر اگر زندہ ہوتے تو امریکہ کے بہترین نمائندے ثابت ہوتے مگر اب ان کی جگہ ہارٹ بچلے یا ہے ڈورون فرض سرانجام دے سکتے ہیں اسی طرح اٹلی، فرانس، روس اور جرمنی کے نمائندے آئیں۔ اگر ان لوگوں کو اس وقت کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جمع کیا جائے جب ایک عالمگیر جنگ کے بادل افق پر منڈلا رہے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات ہی جان سے بھی چاہیں تو بھی جنگ شروع نہیں کر سکیں گے۔ تصور فرمائیے بین الاقوامی شہرت سے مالک یہ مزاح نگار کوئی جنگ شروع کر سکتے ہیں؟ یا کسی جنگ کے لئے سازش بھی کر سکتے ہیں؟ — یہ ان کی زندہ ولی ان کی خوش

نداتی اُن کے آرٹے آتی رہے گی اور ہمیشہ انہیں خون ریزی اور فساد سے روکتی رہے گی۔ جب ایک قوم دوسری قوم کے خلاف اعلان جنگ کرتی ہے تو وہ ہماری قوم سخت سنجیدہ بلکہ نسیم پاگل ہو جاتی ہے۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ دن اور صرف وہ حق پر ہے اور خدا کی نصرت اُسی کے شاہلِ حال ہے۔ مگر ظرافت نگار ہوں یا ٹھٹھوں لوگ، کوئی مرد معقول ہو یا محض رنزدہ دل شخص، اُسے خدا نے عقل سلیم عطا کی ہے اور وہ جانتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے۔ گویا اس کا نفرنس میں ہارج برنارڈ شا کھلے بندوں یہ کہیں گے کہ بھائیو اصل غلطی میرے ملک آئر لینڈ کی ہے۔ ادھر برلین کے ظرافت نگار یہ کہتے ہوں گے غلطی ہماری قوم کی ہے۔ امریکی سائنسدہ ہے وڈ ہرڈن اٹھ کر صاف کہے گا کہ بھائیو، میرے ملک امریکہ نے معاملات کو خالصاً بگاڑا ہے اور اُس نے کسی سے کم غلطیاں نہیں کیں! ادھر کانفرنس کے صدر سٹیفن لی کاک صاحب بڑے آرام سے اپنی صدارتی تقریر میں کہیں گے انسان کا لی اٹھ واقع ہوا ہے اور بحیثیت صدر میں انسان کی حماقتوں کی معافی چاہتا ہوں، مگر یہ بھی عرض کر دوں گا حماقت اور کوتاہی میں کوئی قوم کسی دوسری قوم سے نہ تو کمتر ہے نہ بہتر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے!

آپ ہی فرمائیے، ان حالات میں کیسے کوئی جنگ چھڑ سکتی ہے؟ جنگ کون لوگ شروع کیا کرتے ہیں؟ اس کا جواب صاف ہے وہ لوگ جو جاہ طلب لوگ ہوتے ہیں اور وہ لعزم مہلاتے ہیں، وہ لوگ جو بڑے قابل، بڑے چالاک، بڑے سازشی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو حزم و احتیاط کے پتلی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو عقل و دانش کے بجائے جہے جاتے ہیں وہ لوگ جو سخت

دیکھتے آپے میں نہیں ملتے۔ وہ لوگ جو سب اڑنی ہیں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہیں وہ لوگ جو زعم خود دنیا کی خدمت کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی قسمت بنانا چاہتے ہیں یہ دنیا کے جریڑے پراپنا "نقش چھوڑنا چاہتے ہیں وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ کبھی ان کا بھی ایک مجسمہ بنے اور شہر کے بڑے چوس میں کانسی کے گھوڑے پر سوار ان کا کانسی کا بت اپنی بے نور آنکھوں سے آنے والی نسوں اور صدیوں کو دیکھتا رہے! — یہی لوگ جنگ کا موجب بنتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ بڑے عاقل اور فرزانہ لوگ بڑے ادا لغرم اور نخوت پسند لوگ اصل میں بے صلاحیت اور بے حد بے خبر دل ہوتے ہیں یہیں وہ سمیت اور شہر نہیں ہوتا جو طرف اور زندہ دل لوگوں کا سچا ہے۔ ان میں ظریفوں کی ہی گہرائی اور فہم کی بارکی بھی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ معمولی چیزوں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ دوسری طرف طرف اور زندہ دل لوگ اپنے ذہن کی وسعت اور برائی کی بدولت بڑی چیزوں اور اونچی باتوں کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں آج کل یہ حال ہے کہ جو سیاسی مدبّر پراسرار آواز اور راز دارانہ لہجے میں باتیں نہ کرے چہرے پر خوف کے آثار پیدا نہ کرے اور ہر وقت لئے لئے نہ رہے اُسے مدبّر سمجھا ہی نہیں جانا مگر دنیا کو بچانے کے لئے ظرافت بگاڑوں کی کسی بین الاقوامی کانفرنس کی بھی چنداں ضرورت نہیں — آخر ہم سب میں خدائے خاصی مفلا میں طرانت کا ذوق یہ سوجھ بوجھ پیدا کی ہے۔ اس لئے جب جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے ہوں تو ہر ملک بڑے شوق سے کانفرنسوں میں اپنے سگے بند سیاسی مدبّرین ہی کو نمائندگی کے لئے بھیجے اور ضرور بھیجے جو بڑے بے خبر بڑے "کار آزما اور کارآمد" مشہور ہوں اور اپنی نوع انسان کی خدمت

کرنے پر ادھار کھاتے بیٹھے ہوں۔ مگر کیا یہ جانتے کہ ہر صبح سپاہی
کا نفرنس شروع ہونے سے پہلے دس منٹ تک انہیں مشہور امریکی کارکنوں تصویر
کی بلوٹ دکھائی جاتے اور اس شو میں ہر مذہب کی حاضری لازمی قرار دی جاتے
آپ دیکھیں گے اس کے لہجے جنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خوش طبعی اور زندہ دلی ظرافت اور ٹھٹھوں کا
فعل کیمیاوی ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ یہ صلاحیت ہمارے خیالات کی نوعیت ہی
کو تبدیل کر دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندہ دلی ہمارے ثقافت اور تہذیب پر
بنیادی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور ہمارے لئے کسی آنے والے دن میں
معقولیت پسندی کے دور کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ میرے نزدیک انسانیت کی
معراج ہی یہ معقولیت پسندی کا دور ہے۔ انسانیت کے لئے اہم ترین شرف
یہی ہے کہ انسانوں کی ایک ایسی نسل وجود میں آئے جس میں معقولیت پسندی کا
جوہر کوٹ کوٹ کر بھلا ہو جو نیک دلی اور حسن نیت کا پیکر ہو سادہ خیالات
امن پسندی اور تہذیبی جوہر سے مالا مال ہو۔ انسانیت کی معراج یہ نہیں کہ
ساری دنیا منطقی ہو جائے۔ کیونکہ منطقی دنیا کسی صورت بھی ایک باکمال دنیا نہیں
ہوگی۔ انسانیت کی معراج یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے عیب جلد باز جلد
سمجھ لیں اور اپنے جھگڑے معقولیت سے نکالیں۔ صاف لفظوں میں انسانیت
کے لئے یہی کچھ اہم کمال ہے۔ جس کی ہم انسانی زندگی سے توقع رکھ سکتے ہیں
معقولیت ہی کی ذیل میں کسی اور صفات بھی آجاتی ہیں جو انسانی دماغ کے لئے
باعث فخر ہیں۔ اس معقولیت پسند دنیا میں سادہ خیالی کا دور دورہ ہوگا اس
دنیا کا فلسفہ سرت اور خیریں نڈائی کا جوہر ہوگا۔ میں بڑی نازک سوچوں کو چھوہوگی۔

ان سب صفات کی بنا پر ایک نہایت معقول تہذیب وجود میں آئے گی۔ سادہ خیالی اور خوش مندانی کا فلسفہ اور سوچ بوجھ کی نزاکت 'زندہ دلی' ہی کی خصوصیات ہیں۔۔۔ اور زندہ دلی کی بدولت ہی جہنم میں آسکتی ہیں۔

ایسی معقولیت پسند دنیا کا تصور کرنا خاصا مشکل ہے کیونکہ ہماری آج کی دنیا اس سے بہت مختلف ہے۔ آج کی زندگی مجموعی طور پر بہت پھیرا ہے۔ علمیت، بھاری بھارے بھیرے کی گاہاواہ اور ڈھو چکی ہے۔ فلسفہ بہت منعموم، بہت درشت ہے۔ ہمارے خیالات بے حد الجھے ہوئے ہیں۔ یہی بھیرے کی اسی الجھاؤ اور پھیرے کی کارگاہ ہے کہ آج دنیا اتنی دکھی ہے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ سادہ زندگی اور خیالات کی سادگی، تہذیب اور ثقافت کی معراج ہے۔ جب کوئی تہذیب سادگی کا جوہر رکھتی ہے اور تکلف کی بلندیوں سے اتر کر پھر بے تکلفی اور سادگی کی سطح پر نہیں آتی۔ تو یہ تہذیب مکلفیت کا نتیجہ بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اسے زوال آجاتا ہے۔ چنانچہ انسان ان تصورات اور خیالات ان منگروں اور ان معاشرتی نظاموں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے جو کبھی اس نے خود تخلیق کئے تھے۔ انسانیت ان کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے اور ان تصورات اور معاشرت کے اس بارگراں سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ خوش قسمتی سے افسانہ گو ایک ایسا جوہر عطا ہوا ہے جس کی بدولت وہ خیالات کی بھول بھلیوں اور منگروں کے بوجھ سے اونچا بھی اٹھ سکتا ہے اور پھر ان پر سنس بھی سکتا ہے۔ یہی جوہر زندہ دلی اور خوش طبعی ہے۔ اسی کو طرافت اور بذلہ شنجی کہتے ہیں۔ چنانچہ ظریف اور بذلہ شنج لوگ اونچے خیالات اور آرزوں کو یوں ہاتھ لگاتے ہیں، انہیں اس طرح "منٹاتے" ہیں کہ ان کی ہر ہر حرکت

سے چابک دستی کا اظہار ہوتا ہے، پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ ان خیالات اور تکلیف
 وہ امنگوں کے غلام نہیں بلکہ آقا ہیں۔ اور جو شخص اپنے خیالات پر قادر ہو وہ
 ان کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ چابک دستی، مہارت اور فنی کمال کا ثبوت ہوتی
 ہے۔ اس کے برعکس سنجیدگی ہمیشہ سخت کوشش کی علامت ہے اور کوشش
 اس بات کا ثبوت ٹھہرتی ہے کہ کرنے والے کو اپنے کام پر پوری قدرت، پوری
 مہارت حاصل نہیں۔ ایک بے حد سنجیدہ اور ٹھوس قسم کے ادیب کو لیتے رہ
 ہمیشہ کچھ اکھڑا کھڑا نظر آئے گا۔ اس کی تحریر میں سبک روی نہیں ہوگی خیالات
 سے وہ گھبرایا ہوا دکھائی دے گا اور ہمیشہ کچھ تصنع، کچھ بناوٹ اس کی تحریروں
 میں جھلکتی رہے گی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ سنجیدہ ادیب
 اپنے خیالات کے سامنے ہمیشہ یکا یکا سارہتا ہے۔

سادگی، خیالات کی گہرائی کی زندہ علامت ہوا کرتی ہے۔ یہ بات لفظ پر
 عجیب معلوم ہوگی مگر حقیقت یہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں سادگی وہ چیز ہے جو علمیت
 اور تحریر میں بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ خیالات کی صفائی بڑی محال
 بات ہے۔ مگر جب تک خیالات واضح اور صاف نہ ہوں گے سادگی نہیں
 آئے گی۔ جب کبھی آپ دیکھیں کہ کوئی ادیب بار بار ایک ہی خیال کی ادھیڑ بن
 میں لگا ہے تو یہ سمجھ لیتے کہ وہ خیال اس ادیب کی جان کالا ہو گیا۔ اس کی
 ایک مثال یہ ہے کہ کالج میں ایک نیا نیا پروفیسر آتا ہے جس سے تازہ تازہ نہایت
 اصلی نمبروں پر ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے لکچر ہمیشہ اچھے
 ہوتے ہوں گے اور اصل موضوع سے ہٹے ہوئے ہوں گے۔ خیالات کی
 باقاعدہ سادگی اور اظہار کی سادگی صرف ان پروفیسروں کے لکچروں میں ہوتی

ہے جو پرانے ہوں اور کافی تجربہ کار ہوں۔

تو وہ کیا چیز ہے جس سے فنی ہاریکیاں عام فہم سادہ بیانی میں بدل جاتی ہیں؟ — میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انحصار اس کا علم کے ہضم کرنے پر ہے جو وہ حاصل ہو۔ میں اس عمل کو خدا کے تخلیل ہونے سے تشبیہ دیتا ہوں — اگر کسی عالم نے اپنے علم کو پوری طرح ہضم نہیں کیا، اور اسے زندگی کے مشاہدے سے مطابقت نہیں دی تو وہ ہمارے سامنے اپنا علم قابل فہم طریقے پر بھی نہیں پیش کر سکے گا۔ علم حاصل کرنے کی تک و دو میں ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جو سکون اور آرام کا پیغام لائیں۔ جیسے ایک لمبے سفر کے بعد شربت کا گلاس پر روح کی ماندگی کو دور کر دیا کرتا ہے۔ انہی لمحوں میں اس علم کے رسیا کو سوچنا چاہیے کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے..... اور میں کس بات پر اتنی مغز کا دی کر رہا ہوں..... میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟ — یعنی سادگی کی اولین شرط یہ ہے کہ علم کو ہضم کیا جائے اور ہماری نظر بالغ ہو۔ خیاںچہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمارے خیالات میں صفائی اور وضاحت آتی جاتی ہے۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ہر سائل کے غلط اور غیر ضروری پہلو چھٹ جاتے ہیں۔ ہم ان سے پریشیاں ہونا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ خیالات واضح صورت اختیار کرتے ہیں اور خیالات کا ایک لمبا سلسلہ رفتہ رفتہ ایک سہل سے قاعدے یا فارمولے کی شکل اختیار کرتا ہے اور ایک سچ ہم پر یہ سارے کھل جاتا ہے کہ ہم نے علم کی اصلی روح کو سمجھ لیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حقیقی معنی میں دانش کہا جاتا ہے۔ اب تک و دو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حقیقت عام فہم بن جاتی ہے کیونکہ اب حقیقت واضح تر ہو چکی ہے اور باحساس ہوتا ہے کہ خود سچائی بڑی عام فہم بڑی سادہ بڑی قدرتی چیز ہے۔

خیالات کی برجستگی اور اسلوب و اظہار کی اسی قدرتی سادگی کو چینی شاعروں اور نقادوں نے اتنا قابلِ تعریف قرار دیا ہے چینی حکماً اس عمل کو نچتہ کاری کا عمل قرار دیتے ہیں اور یہ وہ نچنگی ہے جس کے بعد ادیب کے اسلوب میں عبارت کے تکلف الفاظ کے شکوہ، تصنع اور آوردیا علمیت کا رعب چھانٹنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

قدرتی بات یہ ہے کہ زندہ دلی اور خوش طبعی خیالات کی سادگی کو پرانے چڑھانی ہیں۔ عام طور پر ظریف و حقائق سے لگاؤ رکھتا ہے۔ لیکن نظریات کے ریاضیاتی تقصیرات میں کھوئے رہتے ہیں خیالات میں اچھا لکھ کر بالکل کھوجا ہے ہیں۔ ظریف محض عملی سوچ بوجھ اور مزاج کی چمک سے سروکار رکھتا ہے۔ وہ بجلی کی تیزی سے ہم پر ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارے خیالات حقائق سے کتنے مختلف یا ان کے برعکس ہیں۔ گو یا وہ سارے الجھاؤ کو پل جھکتے میں سلجھا کر رکھ دیتا ہے۔ حقائق سے مسلسل تعلق، اس کی طبیعت میں اچھا ایک نوع کا ہلکا پھلکا پن اور نزاکت احساس پیدا کرتا ہے ہر قسم کے تصنع اور تباہی یا بہرہ پرستی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ عقل کی دھمکیوں اور معاشے کی فضولیات سے کوسوں دور رہتا ہے۔ گو یا زندہ دلی اور خوش طبعی سے انسان نکتہ رس اور خوش گفتار بن جاتا ہے ہر چیز اس پر واضح ہو جاتی ہے ہر بات سادہ اور آسان بن جاتی ہے

اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر معقولیت پسندی اور سادہ زندگی اور سادہ خیالی حاصل کرنا ہو تو اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مزاجہ خیالات اور طراقت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔

۵۔ مزاج کاتلون

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آوارہ گردی جو کبھی انسان کا سب سے بڑا کام تھی اور
 بیرے خیال میں انسانیت کی معراج تھی، اب اس کی جگہ سپر گری نے لے لی ہے
 اب آوارہ گرد کے بجائے سپاہی کو مثالی آدمی سمجھا جا رہا ہے۔ گویا اب مثالی
 انسان وہ نہیں جس کا کچھ ٹھیک نہ ہو اور جو آزادہ رو اور آزاد نش ہو بلکہ اب
 تو اس آزادہ رو کی جگہ منطق کے غلام، نظم و ضبط کے پابند قاعدوں ضابطوں
 کے رسیا، باوردی قلبیوں کا دھندلہ دورہ ہو گیا ہے۔۔۔ یہ لوگ اس حد تک منظم
 ہو سکتے ہیں کہ اب پانچ پانچ چھ چھ کر در انسانوں کی ایک پوری قوم کی قوم ایک
 عقیدے اور ایک خیال پر ایمان رکھ سکتی ہے اور منظم انسانوں کا یہ جم غفیر انما
 پابند بنایا جا سکتا ہے کہ سب کے سب ایک ہی قسم کے کھانے کو بھی مرغوب سمجھیں۔
 ظاہر ہے کہ ان دو آدمیوں، آوارہ گرد اور سپاہی میں کوئی بات مشترک نہیں انسان
 کی عظمت کے بلکہ میں دو ہی خیال ہو سکتے ہیں۔ یا تو آپ آزادہ رو اور آزاد نش آدمی
 کو انسانیت کا نصب العین سمجھیں، یا نظم و ضبط کے پسندیدہ سپاہی کو مثالی
 انسان تصور کریں۔ پہلی صورت میں آپ کا منظر یہ ہو گا جو شخص اپنی آزادی اور
 انفرادیت قائم رکھتا ہے وہی اصل معنی میں عظیم انسان ہے۔ دوسری صورت
 میں آپ کا اعتقاد یہ ہو گا کہ جس شخص سے رائے اور فیصلے کی آزادی کھوری ہے
 اور شخصی معتقدات کا حق تیج دیا ہے اور اب وہ اپنے حکمران یا اپنی حکومت کے
 نظریے اور فیصلوں کا سختی سے پابند ہے وہی بہترین انسان ہے۔ ان

افسانیت پرستی

دونوں نظریوں کی حمایت میں کافی کافی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ آزاد نشی اور انفسرادیت کی حمایت میں عقل سلیم و سلیس رائے کی اور سپاہی کے حق میں منطلق بہت کچھ کہہ سکتی ہے۔

منطق کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ ایسے مشینی انسانوں کی حمایت میں دلیلوں کے انبار لگا دے۔ جو فرد کو تو کچھ نہیں، لیکن ریاست کو سب کچھ سمجھیں۔ منطق ایسے لوگوں کو مثالی شہری ثابت کر سکتی ہے۔ منطق یہ ثابت کر سکتی ہے کہ یہ افراد ایک خارجی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بڑے مفید ہیں یہ خارجی مقصد کیا ہے؟ اپنی ریاست اور اپنے ملک کا استحکام۔ مگر یہ استحکام بجائے خود تو کوئی مقصد نہیں اس کا وجود بھی تو ایک اور مقصد کے لئے ہوتا ہے۔ اپنی ریاست کی قوت اور استحکام دوسرے ملکوں پر غلبہ حاصل کرنے کی ایک راہ ہوتی ہے۔ منطق یہ سب کچھ بڑی آسانی سے ثابت کر سکتی ہے اور یہ منطق اتنی سبھی سادہ کامیابی کے ہر اہم اسی کا کلہ پڑھے گا۔ مزہ یہ ہے کہ کافی "بہذب" اور "روشن خیالی" لوگوں میں بھی اس نظریے کو جھنڈے پر پڑھایا گیا ہے۔ مشینی انسانوں یا تقویٰ منطلق ان "مثالی شہریوں" کو بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ قسم اول میں وہ بہتر قسم کے شہری آتے ہیں جنہیں حکومت یا بادشاہ دوسروں سے بہتر سمجھتا ہو۔ یہی لوگ وہ ہیں کہ جب انہیں کسی جگہ جنگ کرنے کے لئے بھیجا جائے تو وہ بڑے خوش ہوتے ہیں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انہیں بڑا گرم کر کے عین اس جگہ بھیجا جہاں رٹا سی کا زور بندھ رہا ہے اور جہاں وہ اپنے ملک کے لئے جائیں وہے سکتے ہیں۔ قسم دوم میں ایسے افراد آتے ہیں کہ جب انہیں محاذ جنگ پر بھیجا جائے تو ان کے دلوں میں از خود کچھ ناراضی پیدا

ہوتی ہے وہ اس طرح ہانکے جانے پر برا مانتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی خفیہ ناراضی یہ انسانی انحراف اور سرتابی یہ ہٹیلین ہی انسانی وقار کی علامت ہے۔ یہی وہ امید کی کرن ہے جس سے ہمت بندھتی ہے کہ آئندہ کسی ہند ب ترونیامیں انسان ریادہ شائستگی اور تیز سے زندگی بسر کر سکے گا۔

اب یہ واضح ہو گیا کہ منطق کی ساری ویلیوں کے باوجود، میں آزاد منش آدمی ہی کو پسندیدہ انسان سمجھتا ہوں۔ انسان کی مخالفت پسندی اس کا اصل جوہر ہے۔ اور غالباً ہندیب دشمن اس کی بدولت فنا ہونے سے بچ سکیں گے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ انسان کے اجداد بندر تھے، گائیں بھینسیں نہیں تھیں جو قناعت کی تصویر ہیں۔ انسان کی حیثیت سے میں یہی چاہتا ہوں کہ گائیں بھینسیں اسی طرح قناعت اور مزاج کی نرمی پکیر رہیں تاکہ انسان انہیں اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے چرا گا ہیں چرنے کو بھیج دے اور جب چاہے انہیں مزاج میں ذبح ہونے کے لئے بھیج سکے۔ اور خدا کی یہ قانع مخلوق اپنے مالک کی مرضی پر ایک سی زاہد اور رضا سے اپنے آپ کو قربان کر دے! انسان کی حیثیت سے میں یہ بھی چاہتا ہوں انسانیت کا گلابوں بھینڈو کا گلہ بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان اپنے اجداد یعنی بند کی طرح باغی اور چڑچڑ اور غیر مطمئن رہے۔ کیونکہ اگر کبھی گائیں بھینسیں اپنے مالک کے خلاف سرتابی کریں گی تو میں انہیں گائیں بھینسیں نہیں انسان سمجھنے لگوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر قسم کی آمرانہ حکومت کے خلاف ہوں۔ کیونکہ یہ انسانی تخلیق کے اصول کے خلاف ہے۔ ڈکٹیٹر لوگ صرف گایوں بھینڈوں کے ریور کے ساتھ اچھی طرح بنا کر رکھتے ہیں۔ ان کا گزارہ ہندوں کے ساتھ ممکن نہیں کیونکہ بے چینی اور سرتابی تو بندوں کے خمیر ہیں

سچی بات یہ ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد سے مغربی تہذیب کے لئے میرے
 دل میں جو عزت اور وقعت تھی وہ کافی حد تک کم ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے مجھے
 چینی تہذیب پر شرم آتی تھی اور میں مغرب اور اسکی تہذیب کو بڑا واقعہ جانتا تھا
 میں سمجھتا ہوں کہ چینی تہذیب کا یہ پہلو بڑا شرمناک ہے کہ چین میں کبھی کوئی آئینہ لگا
 نہ ہو سکا اور نہ شہری حقوق کبھی فروغ پاسکے۔ میرا اعتقاد اسوقت یہ تھا کہ ایک
 آئینی حکومت چاہے اس کا سربراہ صدر کہلاتا ہو یا بادشاہ، انسانی تہذیب
 کی ترقی کی دلیل ہے۔ مگر اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ اب میں مغربی تہذیب
 کے گہوارے میں رہتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ انسانی حقوق اور انسانی
 آزادی کو مغربی تہذیب نے کتنا پامال کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہوتی ہے کہ
 مغربی تہذیب نے انسان کو عقیدہ کی آزادی نہیں بخشی، حالانکہ میرے ملک چین
 میں عقیدے کی آزادی ہمیشہ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر بھی اطمینان سا ہوتا ہے کہ
 آئینی حکومت کو مغرب میں کوئی اعلیٰ قسم کی حکومت نہیں سمجھا جاتا اس لیے بھی جاسا ہوں کہ چین کو
 یورپ میں گروڈلن ایسے انسان بتے ہیں جو یونانی فلسفہ نگار یوری سٹیزن کی تعریف کے
 مطابق گھٹیا ترین غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں، غلاموں کی اتنی بڑی تعداد تو
 جاگیر دار چین میں بھی نہیں تھی!۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ کسی ایک مغربی تو میں
 محض منطق کے بل پر جی رہی ہیں۔ مگر وہ سوچو بوجھو اور عقل سلیم کے معاملے میں ہم
 چینیوں سے بہت سہٹی ہیں۔ اس لئے تو میں اس جرارت سے چینی فلسفے کا مثالی
 آدمی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ مثالی انسان، خوش باش، بے فکر اور
 آزادہ ردا، آزادہ گرد ہے۔ اسی کو چینی فلسفے کے مطابق، انسانی تہذیب کا

سب اعلیٰ پیکر سمجھا جاتا ہے۔ کیا مغرب اس کے مقابلے میں کوئی مثالی انسان
پیش کر سکتا ہے؟ جب باوردی قلبوں اور مشینی انسانوں کو مثالی انسان سمجھنے کا یہ
نیشن ختم ہو جاتے گا تو کیا مغرب یہ ثابت کر سکے گا کہ شخصی آزادی اور شہری حقوق
کے نظریے واقعی اہل مغرب کے دلوں میں جڑ پکڑ چکے ہیں اور مغرب ان پر واقعی
اعتقاد رکھتا ہے؟ — اگرچہ مجھے شک ہے کہ شاید یہ وقت کبھی نہیں آئے
گا مگر میں پھر بھی اس وقت کا منتظر ہوں!

یورپ نے شخصی آزادی کی روایت کیوں طاق پراٹھا رکھی ہے؟ اس کے
دو بڑے سبب ہیں پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اتحادیت کے لئے جو اقتصاد
تحریک چلی ہے اس کی وجہ سے اقتصادی آزادی کو بھلا دیا گیا ہے۔ دوسرا سبب
یہ ہے کہ ملکہ ڈکٹوریہ کے زمانے میں صنعتی انقلاب نے جو انسان کی آزادی کو مشین
کا غلام بنا کر شروع کیا تھا تو وہ روایت ابھی تک چل رہی ہے۔ — ہمارا
آپ کا زمانہ اجتماعیت کا ہے۔ معاشرتی اقتصادی اور سیاسی طور پر بھی اجتماعیت کے
نئے ہر طرف سے تحریک کی جا رہی ہے۔ اسی لئے انسان سے یہ حق چھین رہا ہے
کہ اسے کسی بات سے ناراض ہونے کی کسی بات پر ممانعت، کسی چیز سے غیر مطمئن
ہونے کا نظری حق حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت فرسرد کے دتار اور شرف
کو بھولتی جا رہی ہے۔ آج کل کے زمانے میں اقتصادی مسائل اچھے جاتے ہیں اور
اقتصادی معاملوں پر سوچنے اور ان میں اچھے رہنے میں انسان کا زیادہ وقت صرف
بچا ہے۔ باقی ہر قسم کا خورد نمکرا ب اقتصادی سوچ بچار کے بوجھ میں دبا جا رہا
ہے۔ اسی لئے لوگ ان علوم سے بے بہرہ رہتے ہیں جو انسانیت سے قریب
تر ہیں۔ ہم اس فلسفے سے بھی آنکھیں بند کر رہتے ہیں جو انسانیت کا فلسفہ

ہے۔ جو ایک فرد کی زندگی کے معاملوں سے تعلق رکھتا ہے۔ چاہے یہ غفلت بالکل قدرتی ہے۔ جس شخص کے پیٹ میں پھوڑا ہو اس کے سارے خیالات اپنے پیٹ پر مرکوز رہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ بھی ایسا ہی سماج ہے۔ جن کی معاشیات بیمار اور درد سے بے حال ہے۔ اسی لئے ہمارا معاشرہ ہمہ وقت اسی معاشیات کے پھوڑے میں الجھا رہتا ہے اور ایک انسان ایک فرد کے انفرادی مسائل سے بالکل بے توجہی برتنا ہے۔ ہمارا معاشرہ غالباً یہ بھول چکا ہے کہ انسان، بحیثیت ایک فرد کے بھی آج کل کی دنیا میں زندہ ہے!۔ پہلے کبھی یہ دور تھا کہ انسان چاہے کچھ ہو وہ ایک فرد کی حیثیت سے ہی جانا پہچانا جاتا تھا۔ لیکن اب اکیلے فرد کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا اب اسے مشین سمجھا جاتا ہے۔ اب وہ اقتصادی تقادیر اور مادی توانین کا غلام ہے اور بس۔ اب ہم آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے اسے مشین کا ایک پرزہ سمجھتے ہیں اسے ایک یونین یا ایک طبقے کا رکن سمجھتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو بورژوا ہے، فلاں سرمایہ دار ہے۔ اور یہ دونوں طبقے مزدور ہیں! ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص انسان نہیں، مزدور ہے، اسی لئے ہماری عزت اور ہمارے احترام کا سچا سچا دشمن ہے!۔

گویا کسی انسان پر بورژوا یا سرمایہ دار یا مزدور کا لیبل لگا کر اس سے نفرت کرنا یا اسے اچھا سمجھنا آسان تر ہو گیا ہے۔ اب ہم افراد..... یا انسان نہیں رہے اب ہم صرف طبقے کی صورت میں زندہ ہیں۔ مگر یہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی آسان صورت حال ہے! اب آزادش انسان، مثالی آدمی کی حیثیت سے اس دنیا سے عنایت ہو چکا ہے۔ اب کوئی شخص خارجی حالات کے سلسلے میں اپنے خیالات اپنے رد عمل کا آپ مالک نہیں رہا۔ اب خیالات، فانی پسند

ناپسند اور مزاج کے سنک کا نمانہ لے گیا، اب ہم نظریات کے غلام ہیں، طبیعتی روایت کے پابند ہیں۔ اب ہم میں کوئی شخصیت یا انفسرادیت "باقی نہیں رہتی۔ اندھی طاقت باقی رہ گئی ہے۔ اب انسان کے کاموں اور اس کے مستقبل میں انسان کا کوئی دخل نہیں رہا بلکہ صرف کارل مارکس کی سکھائی ہوئی جدی منطق ہی انسان کے تمام افعال اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی مناسب پیشگوئی کر سکتی ہوگی۔۔۔۔۔ گو باب انسان بڑے باقاعدہ طریقے سے اور بڑی رغبت سے چیونٹوں کے اجتماعی نمونے پر زندگی بسر کرنے کی طرف آتا جا رہا ہے

میں جانتا ہوں کتاب میرے خیالات کو پرانے نیشن کی جمہوری انفسرادیت پسندی، قرار دیں گے مگر میں یہ عرض کروں کہ خود کارل مارکس، جو آج کی اجتماعیات کا پیغمبر سمجھا جاتا ہے، اپنے سے ایک صدی پہلے فلسفی سیگل اور دکور یہ کے زمانے کے انگریزی ماہرین اقتصادیات کے ملاپ کی پیداوار تھا! — آج کی دنیا میں سیگل کی منطق اور دکورین کے عہد اقتصادسی نظریے بھی پرانی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ چینی نقطہ نظر سے تو یہ سب کے سب بے حد مشکوک اور کافی حد تک سراسر غلط باتیں ہیں اور ان کا عقل سلیم سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مشینی سائنس اپنے کل ناموں، اپنی قدرت اپنے غلبے پر ناز کر رہی تھی تو میں اسی وقت انسان کے بارے میں مشینی نظریہ دھود میں آیا۔ اصل میں یہ مشینی منطق سائنس سے چھالی گئی اور اس مشینی منطق کو انسانی سماج پر چسپاں کر کے دکھیا گیا۔ چنانچہ اسے انسانی مسائل کے ان طالب علموں نے "فلائین" نظرت "کاروبار" نام لے کر جھنڈے پر چڑھایا۔ یہ نظریہ لاج کیا گیا کہ "انسان" انسان سے زیادہ بڑا ہے اور انسانی شخصیت کو حساب کی رقموں میں ڈھال کر ہر مسئلے کا حل تلاش

ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے معاشیات کے اعتبار سے یہ کوئی اچھی اور مفید بات ہو۔ مگر حیاتیات کی رُو سے یہ بالکل فصول ہے۔ حیاتیات تو یہ کہتی ہے۔ کہ زندگی کے ارتقاء میں حتماً ہاتھ خاڑھی ماحول کا ہے اتنا ہی فرد کے ذاتی رد عمل کا ہے۔ نفس فظوں میں یوں سمجھتے کہ ہر اچھا طبیب یہ مانتا ہے کہ مرض پر غلبہ پانے کے سلسلے میں مریض کی ذہنیت اور اس کے ذاتی رد عمل کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور یہ نہایت اہم بات ہے۔ چنانچہ کئی ایسے مریض ہوتے ہیں کہ منطقی طور پر انہیں مر جانا چاہیے اور ان سے پیشتر اسی مرض سے انہی حالات میں کئی لوگ جان سے جا چکے ہوتے ہیں، مگر یہ مریض نہیں مرتے اور ڈاکٹر ان کے لئے سخت حیرت کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اسی لئے جو ڈاکٹر دو مریضوں کو ایک ہی مرض کے لئے ایک ہی دوا بلا کسی تبدیلی مقدار کے دیدے، اُسے سماج کا دشمن قرار دینا چاہیے۔ اسی قسم کے سماج دشمن اور معاشرتی فلسفی ہیں جو انراؤ کو پھیلا دیتے ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر فرد یکساں حالات میں بھی دیکر فرد سے مختلف رد عمل ظاہر کرے گا جو اس بات سے قطع نظر کر لیتے ہیں کہ انسان عام طور پر تون کا پتلا ہے۔ اُس کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں اور تپا نہیں کہ کن حالات میں وہ کیا کر بیٹھے۔

آپ کہہ سکتے ہیں معاشیات کی سمجھ نہیں۔۔۔۔۔ میں عرض کر دوں گا کہ معاشیات نے بھی مجھے۔۔۔ ایک فرد کو۔۔۔ بالکل نہیں سمجھا اپنی اس نا سمجھی کی وجہ سے معاشیات ابھی تک بھٹک رہی ہے اور ایک سائنس کی حیثیت سے ذرا بھی وسیع نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اگر معاشیات اعضاء اشیا تک محدود ہو جاتے تو وہ سائنس نہیں کہلا سکتی اور اگر بچاری اشیا سے آگے بڑھ کر انسان کی نیت

تک پہنچ جائے اور اعداد و شمار کا سہارا لے کر نقشے اور جدولیں بنائے۔ تب بھی یہ سائنس نہیں بنتی۔ معاشیات نے انسانی ذہن کا جائزہ لینے کے لئے کوئی طریقہ وضع نہیں کیا۔ مگر یہ ریاضی کی میٹر ہی لگا کر انسانی اعمال کا جائزہ دینے کی کوشش کرتی ہے اور اس میں اپنے اعداد و شمار کی پخت لگاتی ہے تو اس کا بے راہ ہو جانا اللہ بھی یقینی ہے۔ اسی وجہ سے جب کبھی کوئی اہم اقتصادی اقدام کیا جائے والا ہو تو دو ماہرین، دو بالکل الٹ مشورے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ خیر معاشیات بھی تو انسانی مزاج اور طبیعت کے خاصے پر اپنی بنیاد رکھے گی۔ لیکن ماہرین کو ان دونوں سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا ماہرین کی کچھ نہ پوچھئے ایک ماہر اقتصادیات کا خیال تھا کہ اگر انگلستان نے اپنی کرنسی کا معیار سونا نہ رہنے دیا تو انگلستان تباہ ہو جائے گا۔ دوسرے صاحب کہتے تھے کہ انگلستان پچ ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ اس کی کرنسی سونے کے معیار سے گرا دی جائے۔۔۔۔۔ یہ تو خیر ذرا مسئلہ تھا عام خرابی و فزوح کا یہ حال ہے کہ اقتصادی ماہرین اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ لوگ کب اشیا خریدتے ہیں اور کب بچتے ہیں؟ اس کے بارے میں کوئی اقتصادی ماہر قابل تہوں پیش گوئی نہیں کر پاتا۔ اسی کی بدولت سٹارٹ اور ٹاک ایکسچینج کے تمام بین دین ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے اقتصادی اعداد و شمار اگر اکٹھے کر لئے جائیں تو یہ بتانا مشکل ہو گا کہ کب سونے کا بھاد پڑ جائے گا اور کب چاندی کا بھاد ڈٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اس طرح کے اندازے ہو سکیں گے جس طرح موسمیات کا دفتر، اگلے چوبیس گھنٹوں کے موسم کے بارے میں "پیش گوئیاں" کیا کرتا ہے!۔ اس کی وجہ سیدھی یہ ہے کہ دنیا کے ہر کاروبار میں انسان کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ ہر جگہ بشریت کے تقاضے کار فرما ہیں۔ اگر بہت

سے لوگ کس کمپنی کے جتنے جتنا شروع کر دیں تو چند ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسے
 جتنے خریدنا شروع کر دیں گے۔ گو یا انسانی ذہن کی لچک اور انسان کے مزاج کی
 بے یقینی یہاں بھی کام کرنا شروع کرے گی۔ ہر بچنے والا اپنے دل میں یہ سمجھ کر بچے
 گا کہ اب خریدنے والا کوئی اجنبی ہی ہوگا۔ اور ہر خریدار یہ سوچ کر خریدے گا کہ مجھ
 اہم لوگ ہیں جو اتنے اچھے جتنے بیچ رہے ہیں۔ آذان کی حماقت سے فائدہ
 اٹھائیں !

یہ انسانی مزاج کے تون کی ایک مثال ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہو، انسان کا کچھ
 ٹھیک نہیں۔ انسانی تون کا رد بار ایسے ٹھوس کام میں بھی اتنا ہی دخل ہے اور
 انسان کی طبیعت کی یہ بے یقینی یہی "انسانی نفسیات" تاریخ کے دھارے کو بدل
 دیتی ہے۔ انسان کی اسی نفسیات نے اخلاق، رسم و رواج، اور معاشرتی اصلاحات
 کے بارے میں انسانی رد عمل کو ہمیشہ ایک متاثر بنا کر رکھا ہے۔ کچھ پتہ نہیں
 کہ کس چیز کے بارے میں انسان کا رد عمل کیا ہوگا۔ اور وہ کس نتیجے
 پر کیا کر بیٹھے گا

۶۔ انفرادیت

آج کی دنیا میں انسان چاہے کسی جمہوری ملک کا باشندہ ہو جہاں کوئی
 معاشرتی انقلاب آنے والا ہو چاہے کسی انٹرا کی ملک کا شہری ہو جو رفتہ رفتہ جمہوریت
 کی طرف واپس آ رہا ہو۔ چاہے کسی آمرانہ حکومت کی رعایا ہو جو شاید اس کے جیتے
 جی ختم ہو جاتے۔ ہر حال اس کی ذاتی زندگی اب بھی ایک سالم اور مکمل وحدت ہے

زندگی کی رفتار سے ایک خاص صورت ضرور بخش دی ہے۔ مگر اس کی انفرادیت
جوں کی توں قائم ہے۔

فلسفہ فرد کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ
فرد ہی زندگی کا حاصل ہے۔ فرد اپنی ذات میں مکمل ہے۔ فرد ہی زندگی کی منزل
ہے۔ اور اسے کسی مقصد کا ذریعہ اور سبب نہیں بنایا جائے گا۔ دنیا کی بڑی بڑی
سلطنتیں، مثلاً برطانوی دولت مشترکہ کا وجود اس لئے ہے کہ انگلستان کے کسی کو
میں رہنے والا کوئی بھی انگریز آرام اور آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ یہ فلسفے
کا صحیح رخ ہے۔ غلط رخ یہ ہے کہ انگلستان کے اس کو لئے میں رہنے والا وہ نگریز
اس لئے زندہ ہے کہ برطانوی دولت مشترکہ زندہ رہ سکے!

سماجی فلسفے کے اچھے سے اچھے نظریے یہی دعوے کرتے ہیں کہ ان کے
مطابق ایک فرد فلاں فلاں قسم کی حکومت کے زیر اثر بہتر قسم کی زندگی بسر کر سکے گا
جو سماجی نظریے کہتے ہیں کہ انفرادی زندگی کی خوشحالی، تہذیب کا آخری
مقصد اور اس کی منزل نہیں ہے وہ سب تا سب غلط ہیں اور ان لوگوں کے
ذہن کی پیداوار ہیں جو بیمار بھی تھے اور دماغی توازن سے بھی محروم تھے۔
اب ثقافت کو لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسپرٹی یہ ہے کہ اس ثقافت
یہ کس قسم کے مرد و عورت پیدا کئے ہیں!۔ امریکہ کے زندہ جاوید شاعر اور
دانشور والٹ دینن نے بھی اپنے مضمون "جمہوری راہیں" میں انفرادیت ہی
کو تہذیب کی آخری منزل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ذرا سوچئے" خود تہذیب کی بنیاد کس چیز پر ہے، تہذیب جو
اپنے مفروض عقیدے، اپنے فنون، اپنے سکولوں، ہسپتالوں اور

انسانیت کھتی

کاجوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ آخر کیا مقصد رکھتی ہے؟ تہذیب کی بنیاد
 اور تہذیب کا مقصد ایک بھر پور و درجہ صفت انفرادیت کے سوا کچھ
 نہیں۔ ہر چیز اسی انفرادیت کی تابع ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتی
 ہے۔ چونکہ صرف جمہوریت ہی بڑے پیمانے پر اس انفرادیت کو
 پیدا کر سکتی ہے لہذا جمہوریت کا حق سب پر فائق ہے۔ جمہوریت
 قدرت کی طرح بڑے لا محدود پیمانے پر انسانی ذہن کی تخیروں کو
 اس انفرادیت کا بیج بونی ہے اور اس کے پھلنے پھوٹنے اور پروان
 چڑھنے کا انتظام کرتی ہے۔ کسی ملک کا ادب اس کے گہیت اس
 کا ذوقی جمال، اس کے نمون و غیرہ بڑے اہم ہوتے ہیں۔ کیونکہ
 انہی سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس ملک کے مردوں اور عورتوں کی شخصیت
 کیسی ہے اور کہا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے اس ملک کا ذہن
 اپنے اظہار کے موثر یا میں ڈھونڈتا ہے؟

ڈاکٹر ڈیٹن "انفرادیت کو آخری حقیقت مانتے ہیں وہ کہتے ہیں:-
 ہم عقل کے لیے ہیں ہمارے ہستی میں ایک شعور جاگتا ہے ایک
 خیال سر اٹھاتا ہے۔ سب سے الگ بالکل خود مختار بار بار جگتے
 تامل کی طرح زندہ جاوید خیال۔ یہ خیال اپنی ہستی کا ہے آپ کے بارے میں
 ہیں کا اپنا خیال ہے آپ کچھ بھی ہوں۔ سیرے بارے میں میرا خیال ہے
 میں کچھ بھی ہوں۔ اپنی ہستی کا یہ خیال سب سے بڑا اعجاز ہے۔ بیان سے بالاتر
 اس دنیا کے مبہم ترین خوابوں میں سے ایک نہایت انجانا اور لطیف
 خواب مگر یہی سب سے کھوس سب سے بنیادی حقیقت ہے۔ یہ وہ

انفرادیت

حقیقت ہے جو باقی تمام حقیقتوں کے لئے دروازے کی حیثیت رکھتی ہے
 ان لمحوں میں زمین و آسمان کے عجائبات کے درمیان یہ عجائبات
 بھی اس لئے اہم ہیں کہ "میں" ان کے درمیان ہوں! سارے عقیدے
 اور سارے رسم و رواج و ہند کی طرح چھٹ جاتے ہیں۔ اور صرف اپنی ذات
 کا شعور اپنا خیال "یہی باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی ضیا ہر شے پر چھا جاتی ہے
 اور ہماری ہستی کو اپنی منور گو دینے لیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ننھا سا خیال
 آزادی اور وسعت پاتا ہے اور گویا ساری زمین پر چھا جاتا ہے، آسمانوں
 تک پہنچ جاتا ہے۔"

"انفرادیت کی عظمت پر اسی امر کی مفکر نے کچھ اور بھی کہہ رکھا ہے۔ اس میں سے
 بھی کوئی اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ والٹ وٹمین انفرادیت کے بارے
 میں اپنے فصیح خیالات کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:-

"خلاصہ یا نتیجہ یا سیدھی سچی بات یہ ہے کہ انسانیت ہی کو انسانوں
 کے لئے آخری اور سب سے اچھا ہمارا ہونا چاہئے۔ اور انسانیت ہی کی پوشیدہ
 ترقی یافتہ اور بنیادی خوبیوں پر انسانوں کا پھروسا ہونا چاہئے۔ ایسا
 پھروسا جس میں وہم و گمان کی لاگ نہ ہو۔"

جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ ہر قسم کے رد و بدل کے رد و بدل کے
 باوجود تضخیم کچ بھٹی اور نا کامی — غرض ہر قیمت پر دنیا کو دکھا دے کہ انسان کو
 معقولیت اور آزادی کی فضا میں تربیت حاصل کر کے اپنے لئے خود قابو
 بن جانا چاہئے۔ اس طرح انسان اس درجے پر پہنچ سکتا ہے جس درجے
 پر پہنچنا اس کے لئے ضروری ہے!"

انسانیت پرستی

انسان کا ماحول اتنا اہم نہیں ہوتا۔ جتنی اہم بات یہ ہے کہ ماحول کے بارے میں انسان کا ردِ عمل کیا ہے؛ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکہ یہ سب ممالک مشینی تہذیب میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر ان ملکوں کے زندگی بسر کرنے کے طریقے اور زندگی کی بوجاس ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ یہ ممالک مختلف طریقوں سے اپنے اپنے سیاسی مسئلے حل کرتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ مشینی دور میں انسانوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ چوٹیوں کی سی منظم زندگی بسر کریں، اس امر حقاقت ہے۔ انسانی فطرت میں بڑی رنگارنگی ہے۔ مشینیں یا تنظیمی ادارے انسان کو قید نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر ایک باپ کو لہجے جس کے دو بیٹے ہیں۔ وہ دونوں لڑکوں کی ایک جیسی تربیت کرتا ہے، انہیں ایک سی تعلیم دیتا ہے اور ایک ہی پٹھے میں دونوں کو کام پر لگاتا ہے۔ اس تمام یکسانیت کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ دونوں لڑکے رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کے پوشیدہ توانیوں کے مطابق اپنی اپنی زندگی ایک دوسرے سے مختلف بنا لیں گے۔ فرض کیجئے کہ وہ دونوں لڑکے دو بینکوں کے منیجر ہو جاتے ہیں جن کا سرمایہ اور کاروبار بالکل ایک سا ہے۔ ان ماویٰ برابری کے باوجود زندگی کے ہر اہم شعبے میں ان کی زندگی مختلف ہوگی۔ ان کی باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔ دونوں مختلف چیزوں کو اہم گردانیں گے۔ ان کی طبیعتیں مختلف ہوں گی۔ وہ مختلف طریقوں سے کاروباری مسائل حل کریں گے۔ ان کی پالیسی ایک دوسرے سے ملتی جلتی نہیں ہوگی۔ ان کا سلوک اپنے ماتحتوں سے ایک سا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے ایک بھائی ماتحتوں سے سختی کا سلوک کرتا ہو اور دوسرا بہت زیادہ نرمی سے کام نکالتا ہو۔ ممکن ہے ایک بھائی کو اس کے ماتحت دل سے پیار کرتے ہوں اور دوسرے بھائی کے ماتحت اس کی درستی

انفرادیت

سے خائف ہوں۔ دونوں بھائی مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کریں گے۔ خرچ کرنے کے طریقے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ ان کی ذاتی زندگی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ ان کے مشاغل، ان کے دوست، ان کے کلب، ان کے پڑھنے کی کتابیں، یہ سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ ممکن ہے دونوں کا اپنی اپنی بیویوں سے سلوک بھی ایک جیسا نہ ہو! — گویا ایک سے ماحول میں، بھی زندگی اتنی رنگارنگ ہوتی ہے — کسی اخبار کا مافیہ کامل اٹھا کر دیکھئے ایک ہی تاریخ میں کتنے لوگ اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ مگر ایک ہی دن مرنے والے ان لوگوں کی زندگی ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ آج کی تاریخ میں مرنے والوں میں کچھ ایسے ہوں گے جو عمر بھر ایک ہی کام پوری تندہی سے کرتے رہے اور اسی میں ان کی مسرت کا راز بھی پنہاں تھا۔ ان کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے دو چار دس بیس کاموں میں ہاتھ ڈالا، ہمیشہ نئی نئی چیزیں کی اور اسی میں ان کے دن گٹ گٹے پھر گئے۔ پھر کچھ لوگوں کو اگر نئی چیزیں ایجاد کرنے کا خط تھا تو کچھ نئی سرزمینوں کی دریافت کے متوالے تھے۔ کچھ زندہ دل اور خوش باش تھے تو کچھ اتنے منقطع اور سنجیدہ کہ زندہ دلی سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ ایک ہی دن میں مرنے والوں کی اس صف میں کچھ ایسے لوگ تھے جنہیں شہرت نے آسمان پر پہنچایا اور دولت نے ان کے قدم چومے مگر وہ گمنامی اور محتاجی کی موت مرے۔ کچھ وہ تھے جو عمر بھر چھوٹا موٹا بیوپار کرتے رہے۔ مگر ان کے پاس گھروں کے تہ خانوں میں سونے چاندی کی اینٹیں دفن تھیں اور دولت کی اسی ہوس نے کسی ڈاکو کی چھری سے انہیں ہلاک کر دیا۔

اسی لئے ہیں تو کہتا ہوں کہ اس صنعتی دور میں بھی انسانی زندگی بڑی عجیب

انسانیت پرستی

بڑی ہمہ گیر ہے اور جب تک انسان، انسان رہے گا یہ رنگارنگی، یہ تنوع، یہ زندگی کی رونق، اس کا آب و رنگ باقی رہیں گے!

انسانی معاملات حل کرنے کے لئے سائچے کام نہیں دے سکتے۔ خواہ یہ معاملات سیاسی ہوں یا معاشرتی جو لوگ صاحبِ ذوا اور اہل نظر بنتے ہیں اور نت نئی اصلاحات اور نظریے گھڑتے رہتے ہیں اکثر ان کے سارے اندازوں اور اعداد و شمار پر پانی پھر جایا کرتا ہے۔ ان کے اندازے غلط نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی بشریت کو کبھی سامنے نہیں رکھتے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے قانون پاس کرنے والے، نئے نئے ادارے کھولنے والے اور سماج سدھار کے چارک مار کھا جاتے ہیں۔ شادی اور طلاق کے بارے میں کوئی قانون اتنا اہم نہیں جتنی یہ چیز اہم ہے کہ دو لہما، دو لہن فی الحال کس ڈھکے لوگ ہیں۔ اور آئندہ کسی قسم کے لوگ بنیں گے۔ اسی طرح امن عامہ کے تمام ضابطوں اور قواعدوں سے بڑھ کر وہ لوگ اہم ہیں جو ان قوانین پر لوگوں سے عمل درآمد کرتے ہیں اور انکے محافظ ہیں۔

گویا فرد کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ ساری تہذیب کام کرنا اور مقصد انفرادی زندگی ٹھہرتی ہے۔ مگر فرد کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی، سیاسی زندگی اور بین الاقوامی تعلقات کی بہتری کا سارا دار و مدار ان افراد کے کارناموں اور ان کی طبیعت پر ہے جن سے کوئی قوم بنتی ہے۔ گویا ایک قوم کے مجموعی کام اور اس کی مجموعی طبیعت اصل میں ایک ایک فرد کے کام اور طبیعت سے مرکب ہوئی ہے۔ کسی قوم کی سیاست اور کسی ملک کے ایک دور سے نکل کر، دوسرے دور میں داخل ہونے کا سارا دار و مدار اس قوم کے کردار اس کی طبیعت پر ہے۔

انفرادیت

کسی قوم کی صنعتی ترقی سے کہیں اونچا درجہ اس بات کو حاصل ہے کہ وہ قوم اپنے مسائل کس طرح حل کرتی ہے اور اپنے کام کاج کس طرح کرتی ہے۔ فرانسیسی، مفکر روسو کے ذہن میں انقلاب فرانس کا نقشہ اور انقلاب فرانس کے بعد چوبیس جیسے شہنشاہ کا عروج ہرگز نہیں آیا تھا۔ اسی طرح اشتراکیت کے پہلے نکتہ دان، کارل مارکس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کے اشتیاقی نظریے، حقیقت کی دنیا میں کیا روپ دھاریں گے۔ اور کوئی اتالیق اس کے نظریوں کی کیا تعبیر دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ فرانس کے انقلاب کی روش اور رفتار کو آزادی، مساوات اور اخوت کے نعرے نے معین نہیں کیا تھا بلکہ اس انقلاب نے جو صورت اختیار کی اس میں انسانی کردار کی بعض خصوصیات اور فرانسیسی لوگوں کی طبیعت کا ہاتھ تھا، کارل مارکس نے اشتراکی انقلاب کے بارے میں جو کچھ پیشگوئیاں کی تھیں، وہ بری طرح غلط ثابت ہوئی ہیں اور اس کی جدلی منطق اس کے کسی کام نہیں آئی۔ کارل مارکس کی پیشگوئی کے مطابق منطقی طور پر سب سے پہلے ان ملکوں میں مزدوروں کا انقلاب برپا ہونا چاہیے تھا جہاں صنعتی تہذیب اپنے اوج پر ہو یعنی سب سے پہلے انگلستان، پھر امریکہ اور پھر جرمنی میں یہ انقلاب آنا چاہیے تھے۔ کیونکہ انہی ملکوں میں مزدوروں کا ایک مضبوط اور بڑا طبقہ موجود تھا۔ مگر ہوا یہ کہ اشتراکیت کا تجربہ روس جیسے زراعتی ملک میں ہوا۔ جہاں صنعتی مزدوروں کا کوئی بڑا اور مضبوط طبقہ سرے سے موجود نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کارل مارکس نے انگلستان اور امریکہ جیسے ملکوں میں بسنے والے لوگوں کو اپنے اندازوں میں شامل نہیں کیا، وہ بھول گیا کہ انگریز اور امریکی اپنی اپنی طبیعت کے مطابق اپنے مسئلے حل کریں گے اور اپنے کردار کے مطابق ہر کام کاج کریں گے

انسانیت پرستی

ہر قسم کی نیم پخت معاشیات میں یہی بات بھلا دی جاتی ہے کہ قومی کاموں میں انفرادی کردار کتنی بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریز کو لیجئے۔ انگریز کو طبعی طور پر لغروں اور نظریوں سے نفرت ہے۔ انگریز ان چیزوں کو فطری طور پر بے اعتنائی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انگریز کا کردار یہ ہے کہ وہ بڑے اعتماد سے ہر کام کو اٹا سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اپنا راستہ ہمیشہ نکال لیتا ہے۔ انفرادی آزادی انگریز کے خیر میں ہے۔ انگریز عزت نفس، سوجھ بوجھ اور پابندی اور باقاعدگی کا بڑا رسیا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو انگلستان (اور امریکہ) کے لئے حالات اور واقعات کی روشن معین کرتی ہیں۔ اس مقام پر کسی کارل مارکس کی منطق کام نہیں آتی تو گویا کسی قوم کے مسائل کا تعین اس ملک کی سماجی اور سیاسی ترقی کی بنیاد اصل میں ان خیالات پر ہے۔ جو اس قوم کے افراد پر حکمرانی کرتے ہیں۔ کسی قوم کا قومی کردار اچھے ہم نظری طور پر اس قوم کا ذہن اس کی قابلیت، کہتے ہیں، کیا چیز ہے؟ یہ اس قوم کے افراد کے کردار کا مجموعہ ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ قومی قابلیت کوئی فرضی چیز ہوتی ہے۔ یہ محض الفاظ کی ترکیب نہیں، ہے۔ قومی قابلیت کسی قوم کے کردار کا آئینہ ہوتی ہے۔ قومی قابلیت ہی وہ جو وہ وہ روش ہے جس کی بدولت کوئی قوم اپنے مسائل سلجھاتی ہے اور کرنے کے سب کام ایک مخصوص طریقے پر کرتی ہے۔ یہ قومی قابلیت عمل کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا وجود فرضی نہیں حقیقی ہے، یہ قومی قابلیت امتحان اور مصدیت کے وقت ٹھوس صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت پنا چلتا ہے کہ کوئی قوم اپنے کردار اور اپنی قابلیت کے جوہر کی بدولت کیا راستہ اپنے لئے منتخب کرتی ہے اور کن کن باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی اور کن کن باتوں

انفرادیت

کو دوسری باتوں پر ترجیح دیتی ہے اور کن چیزوں کو دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو امتحان یا آزمائش کے وقت کسی قوم کے پروگرام، اس کے لائحہ عمل کو معین کرتی ہیں۔

پرانے چال کے تاریخ دان، جرمن فلسفی ہیگل کی طرح یہ کہیں گے کہ ایک قوم کی تاریخ محض ایک ایسے تصور کے ارتقا کا نام ہوتا ہے جسے ماحول کی ضرورت معین کرتی ہیں۔ مگر تاریخ کا حقیقت پسندانہ اور وسیع تر نظریہ یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ زیادہ موقع ملنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات تھی۔ مثلاً ایک خاص نازک دور میں ایک قوم نے ایک خاص راستہ اختیار کیا۔ اس کی بدولت اسے متصادم قوتوں اور جذباتوں کی کش مکش سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر اس موقع پر کسی مخصوص قسم کے جذبات کا پلڑا اذرا بھاری ہو جاتا اور کسی دوسری قسم کے تصور کا پلڑا اذرا ہلکا ہوتا تو سارا پانساہی پلٹ جاتا۔ گویا اس امتحان میں اس قوم کی قابلیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس قوم نے ایک خاص فیصلہ کیا کہ یہ کچھ کرنا ہے یا فلان بات سے بچنا ہے؛ کیونکہ قوموں نے وہی کچھ کیا ہے جسے وہ پسند کرتی تھیں، یا ان کے جذبات جن کاموں سے آسودہ ہونے لگے۔ اسی طرح ہر قوم نے وہ کام کھی نہیں کیا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا قوموں کا یہ انتخاب اور یہ فیصلہ کسی تصور، کسی خیال کی تحریک پر مبنی تھا اور اس میں اس قوم کی اخلاقی قدریں اور سماجی تعصبات، دونوں برابر کے شریک تھے۔

ایک مثال۔ انگریز قوم کے اس امتحان کا وقت ہے جس کے نتیجے میں اس نے اپنے بادشاہ ایڈورڈ، کاسٹم کو تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس امتحان میں انگریزوں کا قومی کردار عین عمل کے وقت نظر آتا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ

انسانیت پرستی

انگریز کس چیز کو پسندیدہ سمجھتے ہیں اور انہیں کون سی بات بحیثیت قوم ناپسند ہے اور اس قوم کے دماغ میں کیا کیا باتیں اور کیا مقاصد پنہاں ہیں۔ ظاہری اسباب یہ تھے کہ ہر انگریز ذاتی طور پر اپنے ہر دل عزیز بادشاہ (ایڈورڈ ہشتم) کا وفا دار تھا۔ لیکن انگلستان کا کلیسا اس بارے میں بڑا متعصب ہے کہ کوئی شخص (بادشاہ) طلاق شدہ عورت کے ساتھ شادی کرے۔ پھر انگلستان میں بادشاہیت کا ڈیڑھ تو بھی اس سارے جھگڑے میں کارفرما تھا۔ یہ سوال اہم تھا کہ بادشاہ کے پرائیویٹ معاملات پرائیویٹ ہوتے ہیں یا نہیں۔ یا بادشاہ کے ذاتی معاملات ہونے بھی چاہئیں یا نہیں۔ یہ بات بلکہ حقیقت تھی اس آزمائش کی نتہ میں پنہاں تھی کہ شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بٹ؛ اور آیا بادشاہ کو اس مٹی کے بت کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے یا نہیں؛ یا کسی بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ اس کی ہمدردیاں، لیمپ پارٹی کے ساتھ ہوں۔ اگر ان جذبات، ان خیالات اور ان تعصبات میں کوئی اور بات شامل ہو جاتی تو سارا نقشہ ہی پلٹ جاتا اور اس مسئلے کا کوئی نتیجہ بالکل مختلف نکلتا۔

آج کی ساری تاریخ کا یہی حال ہے۔ چاہے روس میں زینو ولف کا مے نفت اور پیا نو کوف جیسے انقلابیوں کو قتل کر دیا جائے اور ایک کو قید میں ڈال دیا جائے اور روس کے ڈکٹیٹر کے خلاف "انقلاب دشمن" عناصر کی سازشیں، اتنی ہی وسیع اور اتنی ہی عام ہوں جتنی بتائی جاتی ہیں۔ چاہے جرمنی کے نازی حکمران، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ گرجوں کو اپنے حلاف سمجھتے پھر میں چاہے انگلستان، "قدامت پسندی" چھوڑ کر واقعی مزدور پارٹی کے پروگرام پر جی جان سے چلنا شروع کر دے یا امریکی پور پارٹی زیادہ ہر عزیز ہو جائے یا اسے بھی کم ہر عزیز ہو۔ الغرض ہر واقعہ ان ملکوں کے افراد کے ذاتی کردار

انفرادیت

خیالات اور جذبات سے معین ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ کے اس متحرک فلم میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ انسان نے ہمیشہ اپنے تلون سے کام لیا۔ سچی ہوئی راہ کو پسند نہیں کیا۔ تبدیلی اور تنوع کو پسند کیا اور اپنے اسی کردار کی بدولت انسانی تاریخ کو وہ صورت دی جو ہمارے سامنے ہے

اسی لئے کنفیوشس نے عالمگیر امن کے سوال کو افرادی ذاتی زندگی کی تربیت سے وابستہ کیا تھا۔ سونگ خاندان کے وقت سے آج تک کنفیوشس خیالات کے علما اور استاد بچوں کو جو پہلا سبق پڑھاتے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل فقرے آتے ہیں اور بچے کو یہ سبق حفظ کرایا جاتا ہے

”قدم لوگوں کا دستور تھا کہ اگر دنیا میں اخلاقی ہم آہنگی کی نمنا کرتے تو یہ کہتے کہ سب سے پہلے ہمیں خود اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرنی چاہیے۔ قومی زندگی کی تنظیم کرنے والے سب سے پہلے گھریلو زندگی کو باقاعدہ بناتے۔ جو لوگ گھریلو زندگی کو منظم بنانا چاہتے۔ وہ سب سے پہلے ذاتی زندگی کی تربیت اور تہذیب پر توجہ دیتے۔ اور جو لوگ ذاتی زندگی کی تربیت و تہذیب چاہتے۔ وہ سب سے پہلے اپنے دلوں کو پاک صاف کرتے۔ دلوں کو پاک صاف کرنے کی خواہش کرنے والے سب سے پہلے نیتوں کو مضبوط بناتے نیتوں کو مخلص بنانے والے سب سے پہلے سمجھ اور مفاہمت پیدا کرتے اور سمجھ اشیاء کے علم کی چھان بین سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اشیاء کا علم حاصل ہو جائے تب سمجھ پیدا ہوتی ہے اور سمجھ پیدا ہو جائے تو نیت اور ارادہ مخلص ہو جاتا ہے۔ اور جب نیت کھاف اور ارادہ مخلص ہو جائے

انسانیت پرستی

تو دل صاف ہو جاتا ہے۔ جب دل صاف ہو جائے تو ذاتی زندگی کی تہذیب اور تربیت پوری ہو جاتی ہے۔ ذاتی زندگی کی تربیت اور تہذیب ہو جائے تو گھر کی زندگی منظم اور باقاعدہ ہو جائے گی۔ اور جب گھر کی زندگی منظم ہوگی تو قومی زندگی بھی منظم ہو جائے گی۔ اور جب قومی زندگی منظم ہو تو دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ گویا تہذیب سے لے کر ایک عام آدمی تک ہر چیز کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ذاتی زندگی کی تربیت اور تہذیب کی چٹانے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بنیاد باقاعدہ اور ٹھیک نہ ہو تو ساری عمارت ٹھیک اور باقاعدہ ہو۔ دنیا میں ایسا کوئی درخت موجود نہیں جس کا تنہ تو کمزور اور نازک ہو اور اس کی اوپر کی ٹہنیاں بے حد بھاری بھر کم اور مضبوط ہوں۔ اس کائنات کی ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت موجود ہے اور ہر چیز کا دوسری کے ساتھ تعلق اسل ہے۔ اسی طرح انسانی معاملوں میں بھی ابتدا اور انتہا دونوں موجود ہیں۔ لیکن ان درجوں کا جانتا، ان کی تقدیم اور تاخیر کا علم حاصل کرنا۔ یہی دانش مندی کی ابتدا، اس کی دہلیز ہے۔

باب پنجم

زندگی سے کون زیادہ حظ اٹھا سکتا ہے؟

- ۱۔ اپنی تلاش
- ۲۔ جذبہ
- ۳۔ لاؤٹنزے کی تعلیم
- ۴۔ سی سی کی تعلیم
- ۵۔ زندگی کا شہدائی

۱۔ اپنی تلاش: چونکہ نے

آج کی دنیا میں اگر کسی شخص کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی ہے اور اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تو وہ فلسفی ہے۔ اصل میں آج کل کسی کو "فلسفی" قرار دینا گویا اسے عزت کا ایک لقب دینا ہے۔ آج کل جو شخص اینڈی اینڈی باتیں کرے اور اس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں اسے بھی "فلسفی" کے لقب سے نوازا جاتا ہے بھر جو شخص حال سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور خیالات میں ڈوبا رہے اسے بھی "فلسفی" کہا جاتا ہے۔ ویسے یہ آخری بات کوئی ایسی حیلان حقیقت بھی نہیں۔ ایک معنی میں فلسفہ یہی ہے کہ زندگی اور اس دنیا کے بارے میں ایک ہمہ وقت حاضر و ناظر سا نقطہ نظر قائم رکھا جائے۔ ان معنی میں ہر شخص کا کوئی نہ کوئی اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو روزمرہ کی حقیقتوں کو ان کی ظاہر حیثیت میں تسلیم نہ کرے اور اخباروں میں جو باتیں ہر روز چھپتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بات پر یقین نہ کرے اسے بھی کھم ویش فلسفی کہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ ایسا شخص ہے جو دھوکا کھانے سے انکار کر رہا ہے:

فلسفی زندگی کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح کوئی آرٹسٹ، کسی قدرتی منظر کو کسی خاص رنگ میں ڈوبا ہوا یا کھرے یا دھند میں لپٹا ہوا دیکھتا ہے۔ گویا اس طرح زندگی کی کھرتی تفصیلات کا کھر دراپن باقی رہتا اور ہمیں یہ دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے کہ ان تفصیلات کا اصل مطلب اور معنی کیا ہے۔ اس صورت میں فلسفی ٹھوس حقیقت پسندوں کے عین الٹ ہے حقیقت پسند اپنے روزمرہ کے کاروبار میں

اپنی تلاش

کھو کر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کامیابی اور ناکامی، اس کے نقصانات اور اس کا نفع، حقیقی اور قطعی چیزیں ہیں۔ ایسے شخص کا کوئی علاج نہیں کیونکہ اس کے دل میں تو یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود کیا چیرا؟ کنفیوٹنس نے کہا ہے: اگر کوئی شخص اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ اب کیا کروں... اب کیا ہوگا، تو اس شخص کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص کیا کرے گا۔ اس کا کیا ہوگا۔

میں اس باب میں آپ کے سامنے جلیے کی ایک مخصوص روش کے بارے میں کچھ چینی فلسفیوں کے خیالات پیش کروں گا۔ ان کا آپس میں جتنا اختلاف ہے اتنا ہی زیادہ اتفاق بھی ہے۔ سب کا اتفاق اس بات پر ہے کہ انسان کو زیادہ دانشمند ہونا چاہیے، اور اسے مسرت بھری زندگی بسر کرنے سے ڈرنا نہیں، چاہئے۔ ایک فلسفی کا بڑا مثبت نقطہ نظر، دوسرے فلسفی کے نہایت امن پسندانہ فلسفے سے ٹکراتا ہے اور اس ٹکراؤ سے یہ نظریہ نکلتا ہے کہ زندگی میں کشمکش اور امن پسندی، دونوں کا حصہ برابر برابر ہونا چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں عام چینی کا مذہب یہی ہے۔ عمل اور بے عملی میں یہ تضادم ایک سمجھوتے پر ختم ہوتا ہے۔ اس سمجھوتے کو قناعت بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں کسی صورت جنت بن سکے، بے شک وہ نامکمل اور ادھوری ہی ہو اسی سمجھوتے سے وہ دانائی اور وہ مسرت فلسفہ پیدا ہوتا ہے جو تاؤ یوان منگ جیسے لوگوں کی زندگی بن گیا تھا۔ جسے میں چین کا سب سے بڑا شاعر اور سب سے متوازن شخصیت سمجھتا ہوں۔

سارے چینی فلسفیوں نے کم و بیش غیر شعوری طور پر یہ سوال حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

زندگی سے کون زیادہ

ہمیں زندگی سے کیسے لطف اٹھانا چاہیے اور زندگی سے کون شخص زیادہ سے زیادہ حظ اٹھا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں چینی فلسفیوں نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ انسان ناقص ہے اور اسے "مکمل" بنانے کی ضرورت ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے پیچھے دوڑنا چاہئے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ جس کے بارے میں کچھ علم نہیں اس کا علم حاصل کرو۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت جو کچھ ہے سو ہے۔ ہمیں اسی فطرت کے پیش نظر کس طرح زندگی کی تہذیب کرنی چاہیے کہ ہم امن و آسائش سے کام کر سکیں، ہر مقصدیت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکیں اور خوشی خوشی زندگی گزار سکیں؟

اس مسئلے کو دیکھ کر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم "کون ہیں؟ ہم" سے مراد کیا ہے؟ — اس کا جواب دنیا فریب فریب نامن سا ہے — پھر کبھی اس بات پر سب کو اتفاق ہو گا کہ ہمارا یہ نفس جو دنیا کے رورمہ کے کاموں میں الجھا رہتا ہے، ہمارا نفس اصلی نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے صرف زندگی بسر کرنے کی تنگ و دد میں ہی کچھ نہ کچھ ضرور کھو دیا ہے۔ کسی شخص کا خیال کتھے جو کسی میدان میں کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈتا ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی ہم سے یہ سوال کرے، ذرا بتائیے اس کی چیز کھو گئی ہے؟ — اس پر عجیب و غریب قیاس آرائی شروع ہو جاتے گی۔ ایک کہے گا، اس شخص کی گھڑی تھو گئی ہے دوسرا کہے گا، بہرے کی انگوٹھی ہوگی... تیسرا کہے گا اور کہے گا — یہ سب قیاس غلط ہوں گے۔ چنانچہ سب سے آخر میں وہ شخص جو سبے دانش مند ہو گا یہ کہے گا: میں یہ تو نہیں جانتا کہ اس شخص نے کیا کھو یا ہے۔ اتنا ضرور ظاہر ہے کہ اپنا

اپنی تلاش

وقت فہول کھو رہا ہے۔ اور حقیقت ہے کہ ہم زندگی کی تگ و دو میں کھو کر اپنا نفس اصلی، اپنی حقیقی ذات کھو بیٹھتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے کوئی پرندہ کسی کیرے کوڑے کو پکڑنے کی تگ و دو میں یہ بھول جاتا ہے کہ خود اسے کوئی خطرہ لاحق ہے اور یہ کیرا اپنے شکاری تلاش میں اپنے شکاری سے غافل ہو جاتا ہے۔ چونکہ فہول نے اس چیز کو بڑی خوبصورت کہانی سے واضح کیا ہے۔

جب چونگ زے ایک باغ میں گھوم پھر رہا تھا تو اس نے ایک عجیب پرندہ دیکھا جو جنوب کی طرف سے آیا تھا۔ اس کے پر سیاہ فٹ لمبے تھے۔ اور اس کی آنکھیں ایک ایک انچ بڑی تھیں۔ یہ پرندہ چونگ کے سر کے قریب سے اڑتا ہوا ایک پٹر پر جا بیٹھا۔

چونگ زے نے حیرت میں کہا: یہ کیا پرندہ ہے کہ اتنے مضبوط اور بڑے پردوں کے ساتھ دوڑتک اڑ نہیں سکتا، نہ اتنی بڑی آنکھوں سے دور یہ دیکھ سکتا ہے کہ ایک انسان قریب ہی کمان لئے کھڑا ہے اور یہی وقت بھی اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔

چنانچہ چونگ نے مگر کس لی، لبا دے کے دامن سمیٹے اور تیز کمان لے کر اس کے قریب پہنچا کہ اسے نشانہ بنائے۔ عین اسی وقت چونگ زے نے پٹر کے سائے میں ایک ٹڈے کو دیکھا جو عقلت کی تیز سوٹا تھا۔ عین اسی وقت ایک بڑے سے کیرے نے اس ٹڈے کو لپک کر پکڑ لیا اور پٹر کو گویا فوراً اس بڑے پرندے نے اس کیرے کو دلپوچا اور کھا گیا۔ گویا اس کیرے کے لیونجھنے پرندے کو سب کچھ بھول جانے پر مجبور کیا تھا۔

زندگی سے کون زیادہ.....

چونگ زے نے ایک آہ بھر کر کہا۔ افسوس، ایک مخلوق دوسری کو کس طرح ستاتی ہے اور نفع کی امید کیسے کیسے نقصانات کا پیش خیمہ بنتی ہے!

اس نے اپنی کمان رکھ دی اور گھر کی طرف چل دیا۔ کیونکہ باغ کے رکھوالے نے اسے اپنے باغ میں بے مقصد پھرتے دیکھ کر ڈانٹا تھا۔ اس واقعے کے تین ماہ بعد تک چونگ نے گھر سے نہیں نکلا۔ آخر لین شو نے اس سے پوچھا "حضرت آپ کب تک باہر نہیں نکلیں گے؟"

چونگ نے کہا: "بھئی! اس ظاہری جسم کی قید میں، میں اپنے آپ کو بھول چلا تھا، اپنی حقیقی ذات سے غافل ہو گیا تھا۔ گدے پانیوں کے نظارے نے میری آنکھوں سے گہرائیوں کو اوجھل کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے مرشد نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جب دنیا میں رہو تو اس کے رسم و رواج کی پابندی بھی کرو۔ مگر جب میں باغ میں پھر رہا تھا تو میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ میرے سر سے اڑ کر جو عجیب سا پرندہ درخت پر بیٹھا تھا وہ بھی اپنی فطرت کو بھول گیا۔ باغ کے رکھوالے نے مجھے چور سمجھا اور مجھے باہر نکال دیا۔ اسی لئے میں گھر سے پھر باہر نہیں نکلا۔"

چونگ نے لاؤنرے کا پکارا دت مند تھا۔ وہ مین سی، اس کا ہم عصر تھا جو کنفیوشس کا پیرو تھا۔ مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان نے کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے اور یہ کام فلسفے کا ہے کہ اس کھوئی ہوئی چیز کا سراغ لگائے اور اسے انسان کو پھر عنایت فرمائے۔ اس کھوئی ہوئی دولت کو چونگ زے نے نفسِ اصلی یا حقیقی ذات فرار دیا تھا۔ مین سی اس سے دل معصوم فرار دیتا ہے

اپنی تلاش

اور یہ کہتا ہے: "بڑا آدمی وہ ہے جس نے اپنے بچے کے سٹل 'مصنوم' دل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔" وہ کہتا ہے کہ تہذیب کی مصنوعی زندگی کا اثر ایک نوجوان دل پر وہی ہوتا ہے جو پہاڑوں پر سے جنگلات کاٹ دینے سے ان پہاڑوں پر ہوتا ہے۔

"کوئی وقت تھا کہ نیاؤ پہاڑ کے گھنے جنگل بڑے خوبصورت تھے۔ اب ان پہاڑوں کو کون بصورت کہہ سکتا ہے۔ یہ پہاڑ اور اس کے جنگل ایک بڑے شہر کے قریب تھے۔ اور اب لکڑہاروں نے جنگل کاٹ کاٹ کر نابود کر دئے ہیں۔ کبھی ان جنگلوں کی پرداخت خود رات اور دن کیا کرتے تھے۔ بارش اور نشتر انہیں سینچا کرتی تھیں، اور اس سرزمین سے ہر آن زندگی کی نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی تھیں۔ پھر مویشیوں اور بھڑکریوں نے یہاں چرنا شروع کیا۔ اب پہاڑ کی ساری ڈھلان تنگی ہو چکی ہے اور اب لوگ یہی سوچتے ہیں کہ پہاڑ کی یہ ڈھلان ہمیشہ ایسی سبز اور تنگی تھی۔ یہاں درخت بھلا کہاں ہوں گے؟ میں چھٹا ہوں، کیا پہاڑوں کی اصلی فطرت یہی ہے، کیا انسان کا دل فطری طور پر پھر سبز اور محبت سے معمور نہیں، مگر فطرت کب خوبصورت رہ سکتی ہے، کیونکہ ہر روز تو اس پر اسی طرح کلہاڑا چلتا ہے جس طرح نیاؤ پہاڑ کے نشاداب جنگلوں پر چلتا ہے۔ انسانی فطرت پر دن اور رات پھاہار کھتے ہیں، نیم سحری اس کے پھلنے پھولنے کا پیغام لاتی ہے مگر نیم سحری کے لمحات مختصر ہوتے ہیں۔ اور اس کا کیا دھرا، ان کامیوں اور ان باتوں سے نسبت و نابود ہو جاتا ہے جو انسان دن بھر کرتا ہے۔"

زندگی سے کون زیادہ.....

رات پھر میں انسانی روح کو جلتی تازگی اور بحالی نصیب ہوتی ہے وہ دن بھر کی کوفت سے برابر کم ہوتی رہتی ہے۔ انسانی روح کی اس مسلسل کائنات چھانٹ سے رفتہ رفتہ وہ وقت آجاتا ہے کہ انسان اپنے مرتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ حیوانوں کی طرح ہوجکا ہے اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس میں کوئی کردار تھا ہی نہیں۔ ویسے ہی جیسے نیا و پھاڑ کی ٹھیل ڈھلانوں کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ یہاں کبھی سبزہ تھا ہی نہیں۔ مگر کیا انسانی فطرت کے بارے میں یہ تصور صحیح ہوگا؟

۲۔ جذبہ دانش اور جرأت

میں سی اس

فلسفی میں سی اس کا خیال ہے کہ زندگی سے حظ اٹھانے کے لئے موزوں ترین شخص وہ ہے جس میں جذبے کی گرمی ہو، جو بے باک ہو، اور جسے کسی چیز کا ڈرنہ ہو۔ اس کے نزدیک مثالی انسان کی پختہ خوبیاں تین ہیں اور وہ ہیں — دانش رجمدلی اور جرأت — میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہوں اور بڑے آدمی کی یہ تین خوبیاں قرار دیتا ہوں۔ یعنی 'جذبہ' دانش اور جرأت — جذبے کی بنیاد شہوانی خواہشات ہی اگر جذبے کا لفظ خوش قسمتی سے بہت وسیع معنی کا حاصل بھی ہے۔ ایک جذباتی شخص ہمیشہ عورتوں کا شیدائی ہوتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو عورتوں کا شیدائی ہو وہ جذباتی ضرور ہو! یہ چانک چاؤ کا قول ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شہوانی جذبات، اس کائنات کی وہی اور داعی جو ہر اس کائنات کی چھت ہے۔ گویا اگر جذبات نہ ہوں تو زندگی کا سفر

جذبہ دانش اور جرات

مشرق نہیں ہوگا۔ جذبات زندگی کی روح رواں ہیں، تاروں کی روشنی ہیں، موسیقی کا بحر ہیں۔ شعر کا جادو ہے۔ پھولوں کا حسن، پندوں کی خوبصورتی، عورتوں کی دلکشئی ہیں۔ اور اپنی کے دم سے علمیت میں آب و رنگ اور جان ہے۔ جذبات ہی انسانی دل میں وہ گرمی اور وہ سہمت پیدا کرتے ہیں جن کی بدولت ہم زندگی کا سامنا کرتے ہیں۔ میں نے "جذبات" کا لفظ جوش اور ولولہ اور اتہائے شوق اور ہیجان کے معنی میں استعمال کیا ہے، احساسات کا لفظ غالباً بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں جذب و شوق کا ہیجان شامل نہیں ہوتا۔ احساسات نسبتاً نازک تر اور لطیف ہوتے ہیں انہیں طوفانی کیفیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ چینی مزاج میں ہم ایسے "جذبات" کی کمی پاتے ہیں جو فوراً شوق سے پر ہوں۔ جن میں ایسی شدت اور ایسی طوفانی کیفیت ہو جیسی ہمیں مغربی ادب کے بڑے بڑے المیہ ڈراموں میں ملتی ہے۔ اسی لئے یونانی معنی میں المیہ ڈرامے، چینی ادب میں سے موجود نہیں۔ چینی ڈراموں کا کلاسیکی دور یہ ہے کہ ان کے مرکزی کردار (المیہ ہیرو) المیہ کے وقت رو پڑتے ہیں یا اپنی محبوبہ دشمنوں کے حوالے کر دیتے ہیں یا پہلے اپنی محبوبہ کے سینے میں چھری مارنے ہیں اور پھر خودکشی کر لیتے ہیں۔ مغربی معیار اور مغربی تنقید کی رو سے یہ اونچے پایے کا المیہ بنتا ہی نہیں۔ مغرب کے لوگ ایسے چینی ڈرامے اسٹیج پر دیکھیں تو وہ ان کے انجام سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ مگر چینی زندگی مغرب کی زندگی سے بہت مختلف ہے۔ اور چینی زندگی ہے جو ایسا ہی اس کا ادب ہے۔ چینی مزاج کا خاصہ اس سلسلے میں بالکل مختلف ہے۔ چینی مزاج کہتا ہے کہ انسان تقدیر سے ٹکر لیتا ہے اور مار کھاتا ہے۔ چنانچہ المیہ اس انجام کے بعد شروع ہوتا ہے، المیہ یادوں کا وہ دل دوزہجوم ہے جو انجام کا رول پر چھپا جاتی ہیں۔ المیہ

زندگی سے کون زیادہ

اس بے کار پشیمانی اور تاسف کا نام ہے جو ہارنے والے کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس سوز کا نام ہے کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا!" المیہ کے اس چینی تصور کی خوبصورت مثال شہنشاہ منگ ہوانگ کی کہانی ہے۔ اس نے اپنے باغی لشکر کو خوش کرنے کے لئے یہ اجازت دیدی تھی کہ اس کی محبوب ملکہ خودکشی کر کے، اس دنیا سے اٹھ جائے تاکہ باغی لشکر کو ملکہ سے جو شکایات تھیں وہ ختم ہو جائیں۔ اس واقعے کے بعد شہنشاہ اپنی ساری عمر اسی محبوب ملکہ کی یادوں کی دنیا میں بسر کرتا ہے۔ گویا المیہ محبوب کی موت نہیں، بلکہ المیہ اس واقعے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ المیہ دکھوں کے ہر آن بڑھتے ہوئے انبار سے بنتا ہے اور یہ المیہ ڈرامے کے زیادہ حصے پر چھایا ہوا ہے شہنشاہ جلاوطن ہو جاتا ہے۔ جلاوطنی میں وہ سرگرواں، جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتا ہے برسات کی ایک رات وہ ایک پہاڑی کے دامن میں دور سے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سنتا ہے اور اپنی محبوب کی یاد میں ہرکھارین کا گیت "لکھتا ہے۔ ہر چیز اور ہر بات اسے کھوئی ہوئی محبوب کی یاد لاتی ہے۔ اس کا تنہا سا رومال جس میں ابھی تک خوشبوئے دلبری باقی ہے۔ اس کی بوڑھی خادمہ، مقتول ملکہ کی دوسری چیزیں، سب کچھ یادوں کا سہارا بنتی رہتی ہیں اور انجام کار جلاوطن شہنشاہ، پر وہنتوں اور پیروں کی دستگیری سے اپنی محبوب کی روح کو ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے۔

گویا چینی المیہ میں روحانی احساس، اور لطافت دو اصل چیزیں ہیں اور اگر ہمارے ہاں "و نور شوق" اور "جوش جذبات" کی اجازت ہے تو میں یہیں تک ہے۔ اسی لئے چینی فلسفی، انسان کی خواہشات "کو تو اچھا نہیں گروا" اتنے مگر وہ جذبات اور احساسات کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انہی کو انسان کی عام زندگی کی بنیاد

جذبہ دانش اور جرأت

قرار دیتے ہیں چینی فلسفی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تمہاری بی بی کے درمیان جو شہوانی خواہشات کا رشتہ ہوتا ہے، وہی رشتہ روزمرہ کی عام زندگی کی بنیاد ہے۔

بد قسمتی سے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جذبات ہر انسان کے حصے میں نہیں آتے۔ جس طرح انسان کو اپنے ماں باپ چھنے کا اختیار قدرت نے نہیں بخشا، اسی طرح یہ بات بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے کہ ہم جذباتی لحاظ سے گرم جوش یا سرد مہر پیدا ہوں۔ مگر شاید سے کی بات یہ ہے کہ کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے سرد مہر پیدا نہیں ہوتا۔ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دل کی گرم جوشی کم ہوتی جاتی ہے اور ہماری روح کی گرمی بھی اسی نسبت سے گھٹتی جاتی ہے۔ بلوغت کے زمانے میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ماحول کی بے رحمی کی بدولت ہماری جذباتی زندگی ہمیشہ کے لئے مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، یا یہ بالکل سرد ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں ماحول سے زیادہ تو ہمارا اپنا قصور ہوتا ہے کہ ہم اسے زندہ نہ رکھ سکے، ایسے ماحول سے وامن نہ بچا سکے جو اس کے لئے سخت مہلک تھا۔

دنیا جس چیز کو "زندگی کا تجربہ" کہتی ہے، اسے حاصل کرنے میں ہماری اصلی نطرت کے ساتھ بڑی بڑی زیادتیاں ہوتی ہیں۔ ہم کچھ کے کچھ بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو "سخت" بنانا سیکھتے ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے کام لینا سیکھتے ہیں۔ سرد مہر اور سنگ دل، بلکہ ظالم بننا سیکھتے ہیں۔ دل میں یہ فخر ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی کا بہت "تجربہ" حاصل کیا مگر اصل میں ہوتا یہ ہے کہ اس سارے زمانے میں ہمارے اعصاب بے حس ہو جاتے ہیں۔ ان میں لچک اور زندگی کی لہر بھنڈی پڑتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ زندگی کے ہر میدان، خصوصاً "تجارت اور سیاست میں تو آپ کے سامنے ہے۔ یہ اسی عمل، اسی "تجربے کے حصول" کا نتیجہ ہے کہ ہم میں ایسے آدمی پیدا ہوتے

زندگی سے کون زیادہ.....

ہیں جو آیا دھانی سے سب کچھ اپنے قبضے میں کر لینے کی فکر میں رہتے ہیں جو ہر جائز ناجائز طریقے سے زندگی میں کامیابی حاصل کر کے رہتے ہیں اور جو شخص انکی راہ میں حائل ہوتا ہے اسے ختم کر کے چیت کر کے دم لیتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم میں وہ آدمی پیدا ہوتے ہیں جنہیں فولادی عزم کے انسان، کہا جاتا ہے۔ جن میں جذبات کی رمت تک باقی نہیں رہتی جو جذبات کو فضول اور بے معنی سمجھتے ہیں۔ یہی اشخاص ہیں جن سے نفرت کرنا بھی شریف آدمی کی توہین ہے مگر دنیا میں ایسے سخت دل حضرات کی کمی نہیں۔ کئی مہذب ملکوں میں یہ تحریک چلی ہے کہ جو لوگ لوٹے اپنا بیج اور کوڑھی ہوں یا جسمانی لحاظ سے کسی ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوں انہیں ختم کر دیا جائے تاکہ قوم کی نئی نسل اچھی پیدا ہو۔ میرا خیال ہے اگر کوئی ملک اسے قانون بنا لے تو اسے سب سے پہلے ان لوگوں کو تولید کے ناقابل کر دینا چاہیے جو اخلاقی لحاظ سے بے حس ہوں جن میں فنوں لطیفہ کا احساس مردہ ہو چکا ہو جن کا دل سخت ہو چکا ہو جو کامیابی کے لئے ہر سخت گیری اور ظلم روا سمجھیں اور رکھیں جو اپنے ارادے کی سنگینی کے آگے کسی چیز کی کوئی حقیقت نہ سمجھیں۔ گویا ہر شخص کو اس صفت میں شامل کرنا ہو گا جو زندگی سے لطف اٹھانا بھول چکا ہے جس کے لئے زندگی کا ہلکا بھلکا پہلو زندگی کی لطافت اور نیکی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تپ وق اور کوڑھ کے مریضوں یا پاگل لوگوں کو اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنانے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان مردہ دلوں کو باہر بننے کے شرف سے محروم کر دیا جائے۔ کیونکہ ایک زیادہ جذباتی آدمی تو زیادہ سے زیادہ چند حماقتیں کرے گا، اور بس۔ مگر جذبات و احساسات سے جو شخص سراسر کور ہو وہ تو انسان ہی نہیں۔ وہ انسانیت کا چلتا پھرتا مذاق، جتیا جاگتا کارٹون ہے

وہ ایک کڑا ہے، ایک مشین ہے۔ اس کا وجود انسانیت کے لئے ننگ ہے۔
 میں سمجھتا ہوں بہت سی طوائفوں کی زندگی جذبات سے عاری بڑے بڑے تاجروں
 کی زندگی سے کہیں ارفع اور اعلیٰ ہے۔ — طوائفیں زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ
 گناہ کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن طوائفوں میں محبت کرنے کی صلاحیت تو ہے اور
 یہ ہر مقرر کتاب میں ارشاد ہے کہ جو لوگ محبت کر سکتے ہیں، ان کے لئے عفو
 کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں! جذبات اور احساسات بھاری غلطیاں بھی
 سرزد کراتے ہیں۔ اور ان غلطیوں کی ہمیں بعض دفعہ بڑی کڑی سزا بھی ملتی ہے پھر
 بھی محبت کی فراوانی اور جذبات کا وفور ان غلطیوں کو دھو ڈالتا ہے۔ کئی ماٹیں دنیا
 میں ایسی ہوں گی جنہوں نے محبت کی خاطر گھر بار کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر بھی یہ
 ماٹیں پوڑھی ہو کر یہ محسوس کیا کرتی ہیں کہ ان کی زندگی سطلین اور بھرپور گزری۔ انہیں
 کسی بات کا افسوس اور کسی چیز کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ ان ماٹوں سے کہیں،
 زیادہ اچھا بڑھا پاگزارتی ہیں۔ جو عمر بھرتے ہوئے رسیوں پر چلتی رہیں۔ اور سخت گیری
 کو جنہوں نے اپنا شعار بنائے رکھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک خاتون
 کا ذکر سنایا۔ اس معمر خاتون نے میرے دوست سے کہا تھا: "دیکھو صاحب! میری عمر
 ۷۸ برس کی ہے، اپنی زندگی میں مجھ سے کئی گناہ سرزد ہوئے ہیں، مگر مجھے ان گناہوں
 پر سزا نہیں ہوتی۔ ہاں جب مجھے خیال آتا ہے کہ ان ۷۸ برسوں میں کئی بار میں نے
 بڑی بے وقوفی سے کام لیا تھا تو اپنی حماقتوں پر مجھے بڑا رنج ہوتا ہے اور میں
 اس عمر میں بھی اپنی گزشتہ حماقتوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔!"

آپ کہیں گے یہ زندگی تو بڑی سخت چیز ہے اور جو شخص دل کا نرم طبیعت
 کا کئی اور جذبات کا سچا ہوا، اسے اس دنیا کے عقل مند بڑی جلدی بیوقوف بناتے

زندگی سے کون زیادہ.....

ہیں۔ فراخ دل لوگ اپنی فراخ دلی کی بدولت بڑی غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو دشمن نہیں سمجھتے اور اپنے دوستوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں! یہ بھی ہوا ہے کہ فراخ دل لوگوں کو بڑی تلخی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اپنے دل کی تلخی مٹانے کے لئے انہوں نے جل جہنم کو بڑی تیز تلخ نظم لکھ دی ہے چینی ادیب میں اس کی ایک مثال، مشہور چائے فروش چانگ تائی کی ہے۔ اس نے اپنی دولت، فیاضی اور فراخ دلی کے باعث دونوں میں اڑادی اور اس کے دلی دوستوں اور عزیزوں نے سخت دھوکا دیا۔ اس شاعر نے اپنے دلی تلخی کا اظہار بارہ نظموں میں کیا ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک یہ دنیا کے تلخ ترین اشعار ہیں پھر بھی میں جانتا ہوں کہ شاعر چانگ تائی اپنی فراخ دلی سے ہانچا نہیں کھینچ سکا۔ وہ عمر بھر ویسا ہی فراخ دل، فیاض اور سیرستہ رہا۔ اور سخت محتاجی بلکہ فاقوں تک نو بہت پہنچنے کے باوجود اس میں یہ وصف قائم رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تلخی کا طوفان جو اس کے دل میں اٹھا تھا وہ بہت جا بھٹ گیا ہوگا۔ اور اس نے باقی زندگی ہنس بول کر گزار دی تھی۔

چنانچہ یہ لازم ہوا کہ انسان کو اپنی فراخ دلی کی حفاظت کرنی چاہیے تاکہ زندگی کی تلخی اس پر چھان نہ جائے۔ اس کے لئے ایک اصولی ایک فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کے سنگس حقائق کا سامنے کرنے کے لئے محض دل گرم کافی نہیں۔ اسی لئے جذبات کی شدت کے ساتھ دانش اور جرأت دونوں کا سہارا ضروری ہوگا۔ میرے نزدیک دانش اور جرأت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ جرات زندگی کو سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے جو شخص زندگی کو مکمل طور پر سمجھتا ہے۔ اسی کے لئے بہادر ہی مملکت ہے۔ زندگی سے ناواقف لوگ کبھی بہادر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی

جذبہ دانش اور جرات

یاد رکھئے کہ جو دانش اور کجھ آپ کو بہادری نہیں سکھاتی وہ کسی کام کی نہیں۔ دانش اس لئے بھی بہادری کا دروازہ ہے کہ دانش ہماری احمقانہ انگلوں اور ارادوں پر کڑا اپہار رکھتی ہے۔ انہیں جسے بڑھتے نہیں دیتی، نہ معیار سے گرنے دیتی ہے۔ دانش ہی ہمیں اس دنیا کے تکلف اور تصنع کی فضولیات سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ اس لئے دانش ہی ہم میں جرات اور حوصلہ پیدا کر سکتی ہے۔

جہاں تک فضولیات کا تعلق ہے اس زندگی میں فضولیات کی کمی نہیں۔ چین کے بو دھ عالموں نے زندگی کی ان بے شمار چھوٹی چھوٹی فضولیات کو دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا ہے یعنی شہرت اور دولت۔ چین کی ایک کہانی یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شہنشاہ جنوبی چین کا دورہ کرنے گیا۔ سمندر کے ساحل کے قریب ایک بہاڑی تھی جس پر چڑھ کر شہنشاہ نے دیکھا کہ بحر چین میں ہزاروں چھوٹے بڑے جہاز کشتیاں اور بجرے اودھ اُدھر آ جا رہے ہیں۔ شہنشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا، یہ اتنے سارے جہاز کشتیاں بجرے کیوں اتنی پریشانی اور تیزی سے سمندر میں دوڑتے پھرتے ہیں؟ اور ان میں ہزاروں آدمی ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کے وزیر نے جواب دیا: جہاں پناہ مجھے تو صرف دو جہاز نظر آتے ہیں ایک کا نام شہرت ہے اور دوسرے کا دولت اور حقیقت بھی یہی ہے۔ دولت کی ہوس سے تو بہت سے باذوق لوگ دامن بچا سکے ہیں۔ مگر "شہرت" کی ہوس سے بچنے کے لئے بہت زیادہ عظیم انسان ہونا ضروری ہے! ایک پر وہت اپنے چیلوں کو شہرت اور دولت کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، اس نے اپنے وعظ کے دوران میں بڑے کام کی بات کہی ہے: "دولت اور شہرت۔ دنیاوی تکلیفوں کے دو بڑے سرچھے ہیں۔"

زندگی سے کون زیادہ.....

دولت کی ہوس سے نجات پانا آسان ہے۔ مگر شہرت کی ہوس کو تھم دینا بہت ہی مشکل ہے اوروں کا ذکر تو چھوڑ بیئے، پروہت، علما اور پروہت بھکشتو تک یہ، چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے حلقے میں شہرت کے مالک ہوں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے عقیدت مندوں کا گردہ بہت بڑا ہو، اور وہ پرچوم جلسہ عام میں وعظ و تلقین کریں۔ وہ نہیں چاہتے کہ جب چاہ کسی چھوٹی سی خانقاہ میں حجرہ نشین، ہو جائیں۔ اور صرف ایک شاگرد کو پڑھانے پر اکتفا کریں۔ اس پر شاگرد نے کہا: "میرے مشفق آپ ہی شاید اس دنیا میں تنہا شخص ہیں کہ شہرت کی ہوس پر بھی غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے ہیں....." اس پر استاد مسکرا دیا۔

بدھمت کے ان رشیوں نے زندگی کی فضولیات کو جن دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ وہ میرے نزدیک مکمل نہیں۔ میرا یہ دعویٰ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے دھوکے اور فضولیات دو کے بجائے تین عنوانوں میں آتے ہیں۔ یعنی شہرت، دولت اور حکومت یا اختیار..... امریکہ میں ایک ہی لفظ ان تینوں کے معانی پر حاوی ہوتا ہے اور اسے زندگی کا سب سے بڑا دھوکا سمجھنے یہ ہے کامیابی۔ مگر ایک بات ظاہر ہے۔ دانشمند لوگ جانتے ہیں کہ کامیابی، شہرت اور دولت کی خواہش اصل میں ناکامی، مخناچی اور گناہی کے ڈر کا دوسرا روپ ہوتی ہے۔ اور ناکامی کا ڈر، غربت کا ڈر اور گناہی کا ڈر، انسانوں کی زندگی پر نسل و نسل چھائے رہتے ہیں بہت لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو شہرت اور دولت دونوں چیزوں کے مالک ہیں پھر بھی وہ دوسروں پر حکومت کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی اپنے ملک کی خدمت کے لئے "وقف" کر دیتے ہیں۔ مگر اس کی قیمت بڑی بھاری ہے۔ کوئی

جدید دانش اور جرأت

دانش مند شخص اس بات پر ہرگز تیار نہیں ہوگا کہ اسے دن میں سات سات دفعہ تقریر کرنی پڑے اور پبلک جلسوں میں بار بار بولنا پڑے۔ آپ اسے جمہوری حکومت کی صدارت بھی دیدیں پھر بھی وہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ ملک کی "خدمت" ہی سے انکار کر دے گا۔ امریکی جیس برائے نے کہا تھا کہ امریکہ میں جس قسم کا جمہوری نظام حکومت رائج ہے، وہ اس قسم کا ہے کہ ملک کے بہترین لوگ سیاسیات میں آنے سے ہمیشہ کتراتے ہیں!۔ میں سمجھتا ہوں، امریکہ میں صدارتی انتخاب کے لئے جن ووروں، تقریروں اور انتخابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اتنے کٹھن ہیں کہ امریکہ کے دانش مند لوگ ان کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر پبلک عہدوں کی ایک مصیبت اور بھی ہے جمہوری ملک کے ان وزراء یا صدر کو بعض بعض دفعہ ایک ہفتے میں چھ سات سات دفعہ پبلک دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ محض اس لئے کہ یہ لوگ اپنی زندگی ملک کی "خدمت" کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ بھلا مانس "قوم کا حناوم" اپنی زندگی، اپنے گھر کے کھانے اور اپنے گھر کے سیدھے ساوے مگر آرام دہ، بستر کے لئے کیوں وقف نہیں کرتا؟۔ مگر حضرت انسان کی ہوس زالی ہے ہونا یہ ہے کہ شہرت اور اختیار کے دھوکے میں پھنسنے کے بعد آدمی خواہ مخواہ دوسری فضولیات میں بھی جا پھنستا ہے۔ کیونکہ یہ کام ہی ایسا ہے شہرت اور اختیار کے بعد انسان کو شیطان یہ انگلی دکھاتا ہے کہ "اسے سماج سدھار کرنا چاہیے چنانچہ اب اس پر معاشرتی اصلاح کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے اخلاق بلند تر کرنے کی پڑ جاتی ہے۔" دین کی حفاظت "بدی اور گناہ کی بیخ کنی" کا سوا سر میں سماتا ہے۔ انسان بہت جلد ایسے پروگرام بنانے لگتا ہے جن پر اس کے

زندگی سے کون زیادہ.....

خیال کے مطابق دوسروں کو عمل کرنا چاہیے۔ لیکن دوسروں کے بنائے ہوئے پروگراموں میں وہ اب ہر ممکن رکاوٹ ڈالے گا۔ وہ کمیٹیوں اور سالانہ کانفرنسوں میں لمبی چوڑی رپورٹیں پڑھے گا کہ اس نے اور اس کے ماتحت دوسروں نے اس کے دورِ حاکمیت میں لوگوں کے لئے کیا کچھ کام کیا۔ وہ عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھتا پھرے گا۔ اور پاگل خانوں تک کا افتتاح کرے گا اور اڈھٹائی ملاحظہ ہو گویا وہ دوسروں کی زندگی میں بے جا دخل دیتا ہی رہے گا۔ وہ بہت جلد یہ بھول جائے گا کہ اس نے خواہ مخواہ جو دنیا بھر کی ذمہ داری سنبھال لی ہے، دوسروں کی اصلاح کا بڑا اٹھا لیا ہے، اپنی سکیموں پر عمل درآمد کرانے اور اپنے مخالفین کی سکیموں کو تلیٹ کرنے کی جو لم نکالی ہے وہ سب فضول ہے۔ اصل میں یہ پیر اس کے دماغ میں بائبل کی پیداوار ہے۔ پہلے سے نگر نہیں تھی، غالباً ان باتوں کا پہلے اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ لیکن اب وہ اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھنے لگا ہے جیسے ونیا کا کاروبار اسی کے دم سے ہے!! — آپ کسی انتخاب میں ہارے ہوئے فرار تے یا صدارتی امیدوار کو دیکھتے۔ ناکامی کے دو ہفتے بعد ہی ملک کے بڑے بڑے مسائل مزدوروں کے معاملات، بے روزگاری کا مسئلہ، محصلوں اور ٹیکسوں کا مسئلہ، گویا ہر چیز اس کے ذہن سے بائبل نکل جاتی ہے۔ دو ہفتے پہلے ہی چیزیں اس کے ذہن پر سوار تھیں۔ اور وہ اپنے آپ کو ان مسائل کا حل کرنے والا واحد شخص سمجھ رہا تھا۔

ہارنے کے بعد وہ سوچتا ہے، میں کون ہوں کہ اوروں کی اصلاح کا بڑا اٹھاؤں؟ ان کے اخلاق سدھارنے کا ٹھیکہ لے لوں اور پھر جو اشخاص بد قسمتی سے پورے حواس میں نہیں اور ونیا انہیں پاگل کہتی ہے۔ انہیں پاگل خانے

بھیجتا پھروں؟

اس کے برعکس اگر یہی شخص ایکشن میں کامیاب ہو جاتا تو یہی چھوٹی چھوٹی بے کار باتیں دوسروں کی زندگی میں ہی دخل اندازی اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی۔ اسے یہ خیال ہو جاتا کہ وہ بہت اہم شخصیت ہے۔ اور واقعی کوئی اہم کام کر رہا ہے!

اس کے علاوہ ایک اور صفت کی دروسری ہے۔ جو ہماری معاشرتی زندگی کے لئے بڑی مصیبت ہے۔ اسے فیشن کہتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی طرح کی بناوٹ کے بغیر اپنے اصلی روپ میں نظر آنا بڑا مشکل ہے اور اس کے لئے بڑے دل گر دے کی ضرورت ہے۔ یونانی فلسفی ڈیموکریٹس (جو جمہوری نظریوں کا بانی کہا جاتا ہے) نے اپنے خیال میں بہت بڑا کام یہ کیا تھا کہ اس نے انسان کو دو بنیاد و خدشوں سے نجات دلوائی تھی۔ ایک تو خدا کا ڈر اور دوسرے موت کا ڈر۔ مگر یہ دونوں ڈر دل سے نکال بھی دئے جائیں تو مسئلہ حل نہیں ہوتا اور انسان ایک بہت بڑے عالمگیر خون کا پھر بھی غلام رہتا ہے۔ یہ اپنے ہم چھپوں، اپنے ساتھیوں، اپنے ہم سیالوں کا ڈر ہے۔ اول تو بہت ہی کم لوگ خدا کے ڈر اور موت کے ڈر کو اپنے دل سے نکال سکے ہیں۔ اور جو یہ کر بھی گزرے ہیں وہ بھی انسان سے بہت بڑے ڈر تے ہیں۔ اسی لئے ہر شخص کو زندگی بھر ایک مفسر کر دار، ایک لگا بندھا پارٹ ادا کرتے رہنا پڑتا ہے۔ اور یہ کر دار یہ پارٹ ایسا ہوتا ہے جسے وہ خود نہیں بلکہ دوسرے پسند اور معین کرتے ہیں۔

انسان میں اداکاری کا فطری جوہر ہوتا ہے۔ انسان نقل کا مادہ بھی دو بعت کیا گیا ہے۔ اداکاری اور نقل کا آپس میں بڑا تعلق ہے کیونکہ نقل

زندگی سے گون زیادہ ...

اداکاری ہی کا ایک حصہ ہے بہ جتنی خاصہ ہمارے ان اجراء سے ہم تک پہنچا ہے جو بندرتھے۔ تماشا اداکاری اور بناوٹ کے کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ تو تماشائیوں کی داد ہے۔ مگر یہ نہ بھولنے کہ تماشائیوں کی داد جتنی زیادہ ہے اتنی ہی ایسٹج کے پیچھے اداکاروں کا دل دھڑکے گا، تماشا دکھانے کے خیال سے اتنے ہی زیادہ پسینے چھوٹیں گے۔ بہر حال اداکاری ایسا جوہر ہے جس سے انسان روزی بھی کما سکتا ہے۔ اس لئے تماشائیوں کے کہنے پر اگر آپ ان کا پسندیدہ پارٹ ادا کرتے رہیں تو آپ کو کوئی الزام نہیں دے گا۔ فیشن یہی چیز ہے۔ یہ تماشائیوں، آپ کے دیکھنے والوں کا پسند کر وہ کر دے جو آپ کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس میں ایک اعتراض کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ بیشک یہ پارٹ بنا رہے رہتے۔ مگر ایسا نہ ہو کہ آپ محض اداکار ہو کر رہ جائیں اور اداکاری آپ کی حقیقی ذات پر بری طرح چھا جائے۔ کیونکہ اداکاری چیز ہی ایسی ہے دنیا میں وہ لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو اپنے بلند مرتبے اور شہرت کے باوجود انسان پہلے ہیں اور پھر کچھ اور ہیں۔ ہر کوئی اس طرح آپے میں نہیں رہ سکتا۔ یہ گنے چنے لوگ ہر وقت یاد رکھتے ہیں کہ وہ محض ایک پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ رتبے جاتا د اور دولت یا خطاب کی چمک ان کی آنکھیں اندھی نہیں کرتی، نہ ان کے دل پر فتنے کی طرح چھاتی ہے۔ رتبے کی بلندی اور دولت کی فراوانی اگر انہیں حاصل ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو بھول نہیں جاتے۔ وہ بے نیازی کی شان سے ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں بھولنے کہ وہ ایک معمولی انسان ہیں اور بس۔ یہی لوگ صحیح معنی میں عظیم انسان ہوتے ہیں۔ وہ عمر بھر اپنی سادہ مزاجی اور سادہ دلی

جذبہ دانش اور جرات

کو قائم رکھتے ہیں۔ طنطنہ اور طمطراق ان کے نزدیک نہیں ٹھیکتے۔ اسی لئے سادگی، صحیح معنی میں عظیم انسانوں کی ہمیشہ سے لازمی خصوصیت مانی جاتی ہے۔ — چھوٹے آدمیوں کی پہچان ہی ان کی کم ظرفی ہے۔ ذرا معمولی سے بھی سرکاری اہل کار کو دیکھتے جسے اپنے اختیار اور ستے کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ شخص ظرف کا ہا کا ہے۔ کسی نو دولت کو دیکھئے کہ وہ کس شان سے اپنے زرجواہر کی نمائش کرتا ہے۔ کسی نو آموز اور گھٹیا تم کے ادیب کو دیکھئے۔ وہ ہمیشہ ہی ظاہر کرے گا کہ چونکہ وہ زندہ جاوید عظیم آدمیوں کی صف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ عام لوگوں سے کوئی الگ مخلوق ہے۔ یہ لوگ سادگی اور فطری پن سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور ان کی بناوٹ، ان کا تصنع ہی ان کے گھٹیا پن کی دلیل ہوتا ہے۔

انسان میں اداکاری کی یہ جبلت اتنی گہری اور شدید ہے کہ وہ اکثر اوقات یہ بھول جاتا ہے کہ جو پارٹ وہ ادا کر رہا ہے اس کے علاوہ بھی اس کی کوئی حقیقی زندگی، کوئی اصلی روپ ہے۔ بس اس "پارٹ" کی خاطر ہم انسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور زندگی پھر اس طرح جیتے ہیں جس طرح سماج ہمیں جیتنے کو کہتا ہے۔ ہم اس طرح زندگی بسر نہیں کرتے جس طرح ہمارا نفس اصلی ہمیں زندگی بسر کرنے کو کہتا ہے۔ — ایک مشہور چینی مقولہ ہے کہ "خود تو بہکم صاحبہ اس امید میں بوڑھی ہو گئیں کہ کسی مرد سے شادی ہو جائے مگر نہ ہو سکی۔ اور اب بے چاری دن رات محنت کر کے دوسری عورتوں کے لئے سہاگ کے جوڑے تیار کر رہی ہیں!!"

یہی حال ہمارا ہے

زندگی سے کون زیادہ.....

۳۔ لاؤٹزے کی تعلیم : — "کلبیت، نادانی اور فریب نظر"

چینی فلسفی لاؤٹزے کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی کو "پرانا پالی" بننا چاہئے۔ یہ نظریہ بظاہر شرافت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہی فلسفہ 'امن'، رواداری، سادگی اور قناعت کی مثال بن جاتا ہے۔ اس کی تعلیم میں یہ کہا گیا ہے کہ نادانی میں بڑی دانش مندی پہناں ہے۔ اصلی بات کو چھپائے رکھنے اور ایسے کچھ دکھانے میں بڑا فائدہ ہے۔ کمزوری میں بڑی طاقت ہے۔ اور تکلف اور تصنع کی انتہا میں بڑی سادگی ہوتی ہے۔ — فلسفہ چینی مزاج کی جان ہے خود چینی آرٹ، اس فلسفے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ چینی آرٹ میں شاعرانہ نظر فریبی، بنیادی چیز ہے اور اس کے علاوہ چینی آرٹ میں لکڑہارے اور پتھر کی سادہ زندگی کو ہمیشہ معراج کمال سمجھا جاتا ہے۔ چینی امن پسندی کی تہ میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ زندگی کے عارضی نقصانات کو صبر سے برداشت کیا جائے اور مناسب وقت اور موقع کا انتظار کیا جائے۔ اس امن پسندی کی تہ میں یہ شعور بھی پہناں ہے کہ قدرت کا کارخانہ عمل اور رد عمل کے اٹل قانون پر چلتا ہے۔ اس لئے دنیا میں کسی کو زکوٰۃ ہمیشہ کے لئے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ کوئی شخص ہمیشہ کے لئے "احمق اور نادان" ہوا کرتا ہے۔ مشہور قول ہے کہ:

"دانش کے بہت بڑے نکات، سراسر نادانی کی باتیں نظر آتے ہیں

اور فصاحت کی معراج، لگنت معلوم ہوا کرتی ہے۔ حرکت، سروی پر غالب آتی ہے، مگر سکون، گرمی پر غالب آتا ہے۔ اسی لئے وہ (ذات باری) اپنے صاف اور واضح سکون سے ہر چیز کو اس کائنات میں صحیح اور درست

رکھتا ہے —

گو یا قدرت کا قانون یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسروں پر نہ تو کوئی مستقل ترجیح حاصل ہے نہ اسے دوسروں کے مقابلے میں مستقل طور پر فائدے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح قدرت کا قانون یہ بھی ہے کہ کوئی شخص دنیا میں سراسر ادرہ بہ وقت ابلہ اور نادان نہیں۔ اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ لڑتا جھگڑتا بے کار ہے لائوتزرے کا قول ہے: "دانا لوگ کبھی کسی سے جھگڑتے نہیں، نہ مقابلہ کرتے ہیں لہذا اس کل کائنات میں کوئی شخص ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا!" ایک حکم یہی فلسفی کہتا ہے: "تشدد سے کام لینا کسی ایک شخص کا نام لیجئے جس کا انجام ٹھیک ہوا، ہو — میں اس کو اپنا مرشد اپنا استاد ماننے کو تیار ہو جاؤں گا۔"

آج کل کا فلسفی اس قول کو یوں بھی پیش کر سکتا ہے: کسی ایک ڈکٹیٹر کا نام لیجئے جو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے خفیہ پولیس سے کام نہ لیتا ہو۔ یا وہ خفیہ پولیس کی خدمات سے بے نیاز رہ سکتا ہو۔ اس ڈکٹیٹر کا سب سے پر جوش حامی بن جاؤں گا! یہی وجہ ہے کہ لائوتزرے نے کہا تھا: "جب تاؤ اور اصطلاح مستقیم سچائی، قانون و فطرت مذہب وغیرہ..... بے اثر ہو کر رہ جائے، تو دنیا گھوڑوں کو لڑائی کے لئے سدھانا شروع کر دیتی ہے اور جب تاؤ کا اثر، اقتدار قائم ہو تو گھوڑوں سے صرف گاڑیاں کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے! ملاحظہ ہو۔"

"بہترین سوار وہ ہیں جو سرپٹ گھوڑا اڑاتے ہوئے اندھا دھند نہیں جاتے
بہترین جنگجو وہ ہیں جو اپنے غصے اور غیظ و غضب کا مظاہرہ نہیں کرنے
بہترین فاتح وہ ہیں جو جھگڑے میں پڑنے کے بغیر جیت جاتے ہیں۔ بہترین
لیڈر وہ ہے جو اپنے لوگوں سے اس طرح کام لیتا ہے گویا وہ ان سے

زندگی سے کون زیادہ

بہتر نہیں کمتر ہے — یہی وہ چیز ہے جو طاقت ہے جو لڑائی جھگڑے

مناقشے، اور مقابلے سے دامن بچانے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بدولت ایک شخص دوسروں سے جو کام چاہے

کے سکتا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان قایم زمانے کی طرح

ایک بار پھر آسمانی نور سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔

قدرت میں عمل اور رد عمل کا جو قانون کارفرما ہے، اس کی بدولت تشدد وجود میں آتا ہے

اور تشدد سے تشدد ہی پیدا ہوتا ہے

”جو شخص سچائی اور قانون فطرت (تاؤ) کے ذریعے سے کسی بادشاہ کی مدد

کرے گا وہ ہتھیاروں اور فوجی طاقت کے بل پرہر جنگ اور سرقت کی مخالفت

کرے گا۔ کیونکہ جنگ سے جنگ ہی پیدا ہوتی ہے اور جہاں کہیں فوجیں لگی

وہاں اناج نہیں اُگ سکتا، صرف کانٹے اور چھاڑیاں اُگ سکتی ہیں۔

بہت بڑی فوج جمع کرنے سے ملک میں ہمیشہ فحط سالی ہوگی

اسی لئے اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا کام کرے اور پھر وہیں رک جائے

وہ اپنی فتح سے مزید فائدہ حاصل نہیں کرے گا۔

اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام کو

جھنڈے پر نہیں چڑھاتا۔

اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام کی

ڈینگ نہیں مارتا۔

اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام پر

غور نہیں کرتا۔

لاؤتزرے کی تعلیم

اچھا جو نیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ صرف اس لئے
کہ ایسا اقدام ناگزیر تھا، اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔

اچھا جو نیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ مگر تشدد کے
بغیر حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ جو چیز ایک وقت میں دوسروں پر چھا جائے گی
اس کے انخفا کا بھی وقت آئے گا، دوسروں پر چھا جانا قانونِ فطرت
[تاؤ] کے خلاف ہے۔

اور جو چیز تاؤ کے خلاف ہے وہ بہت جلد مٹ جائے گی۔

مجھے لاؤتزرے کے اس فلسفے پر اتنا یقین ہے کہ میرے خیال میں اگر وہ پہلی جنگ
عظیم کے بعد صلح کی ورسائی کانفرنس کا صدر ہوتا تو دنیا میں ہٹلر کبھی وجود میں نہ آتا۔
ہٹلر کا دعویٰ یہ تھا کہ ان پر اور اس کے کام پر خدا کی "خاص رحمت" کا سایہ ہے
اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ تھا کہ اسے جو اقتدار حاصل ہے وہ ایک معجزے
سے کم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ہٹلر بچا رہے پر خدا کی رحمت تو کیا ہوگی۔ البتہ فرانسسی
وزیر اعظم کلمے میں شو کی دعائیں ضرور اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اس نے ورسائی کی
صلح کانفرنس میں جو کچھ کیا، جرمنی میں اسی کی وجہ سے ہٹلر جیسا شخص عروج حاصل کر سکا
مگر چین کی صلح پسندی اور امن جوئی "انسانیت" کے اصول پر مبنی نہیں۔ چین کی صلح
پسندی کی تہ میں "عالمگیر محبت" کا جذبہ کار فرما نہیں۔ اس کی تہ میں تو لطیف قسم کی دانائی
کا سرا ہے۔ وہ دانائی جو ہر چیز کے جاننے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ دانائی
جو اس زمانے میں "پرانے پاپیوں" کا حصہ ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:-

"آخر میں جس چیز کو سیکرٹا ہوا، اسے پہلے کھینچ کر بڑھانا پڑے گا۔
جس چیز کو کمنڈر کرنا ہوا، اسے پہلے مضبوط بنانا ہوگا۔"

زندگی سے کون زیادہ.....

جس چیز کو ختم کرنا ہو، اسے پہلے قائم کرنا ہوگا
 جو شخص کچھ لینا چاہے، اسے پہلے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔
 جو یہ نہیں جانتا سمجھے کہ اس کی روشنی بصیرت کم ہو گئی
 چنانچہ اسی وجہ سے نرم چیز، سخت چیز پر غالب آجاتی ہے اور کمزوری
 طاقت پر غلبہ پاتی ہے

اسی وجہ سے مچھلیوں کو وہیں رہنے دیجئے جہاں وہ ہیں اور ملک کے
 اسلحہ کو وہاں رکھئے جہاں کسی کی نظر اس پر نہ پڑے!

کمزوری کی بے پناہ قوت، صلح جوئی کی فتح یابی اور خاکساری کے فوائد پر کسی اور
 فلسفی نے اتنی موثر تعلیم نہیں دی ان باتوں میں لاؤٹنزے حرف آخر ہے۔
 اور وہ بار بار پانی کی مثال دیتا ہے۔ وہ اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ پانی کے استعارے
 سے اپنی بات ثابت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی اس کائنات میں کمزور کی طاقتور
 کا بہترین مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی کا ایک ایک قطرہ بڑی بڑی آہستگی
 سے ٹپکتا رہتا ہے اور چٹان جیسی سخت چیز میں سوراخ کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے
 کہ پانی میں وہ دانائی ہے جو تاؤ کی دانش سے بھرپور ہے۔ کیونکہ پانی ہمیشہ نشیب
 اور نیچے سطح تلاش کرتا ہے۔ لاؤٹنزے کا قول ہے:

”بڑے بڑے دریاؤں اور اتھاہ سمندروں نے سیکڑوں چھوٹے

چھوٹے ندی نالوں پر یہ سرداری، یہ بادشاہت کیسے حاصل کی؟

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بڑے بڑے دریاؤں اور اتھاہ سمندروں

نے چھوٹے ندی نالوں کی نسبت زیادہ نشیب، زیادہ نیچے جگہ ڈھونڈی۔

اور یہی ان کی سرداری کا راز ہے۔“

لاؤتزرے کی تعلیم

لاؤتزرے کے اقوال میں "وادی" کی علامت اور مثال کو بہت جگہ ملتی ہے۔ وادی سے اس کی مراد خالی اور گہری جگہ اور ماں کا رحم ہے۔ اسے چینی میں یین یعنی عورت یا مادہ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"وادی کی روح کبھی مر نہیں سکتی۔ یہ وہ جذبہ ہے جسے پر اسرار عورت بھی کہا جاتا ہے۔ پر اسرار عورت کے 'دردازے' ہی سے زمین و آسمان پیدا ہوئے۔ یہ جذبہ ہماری ہستی میں ہر وقت موجود ہے اس سے جتنا چاہو کام لو، یہ سرچشمہ کبھی خشک نہیں ہوگا، نہ کبھی اس میں کوئی کمی واقع ہوگی!"

اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی تہذیب، نسوانی اصول کی مظہر ہے اور مغربی تہذیب مذکر کی نمائندہ ہے۔ چین کی قوت سر اسرار الفعالی ہے، فاعلی نہیں اور یہ الفعالی قوت، وادی اور رحم مادر سے بے حد مشابہ ہے۔ پیاروں کے درمیان ایک گہری وادی (یارم) ہر وہ آسمانی نعمت جمع کر لیتی ہے، جو اس میں سما سکے، اور چونکہ یہ وادی ہے اس لئے زمین پر اس کی اپنی قوت ہے جو اس کے وجود کے لئے ہر لحاظ سے کافی ہے۔

لاؤتزرے نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ "دنیا میں سب اشرف اور ممتاز انسان

کبھی نہ بنو۔ شہرت اور امتیاز کے خطرات پر چونگ زے نے بڑی خوبصورت چیز لکھی ہے۔ جو اصل میں سینئر کنفیوشس اور ان کے مظاہرہ علمیت کی سچو ہے۔ چونگ زے کی کتابوں میں کنفیوشس کے خلاف ایسی بہت سی توہیں آہتر نظر میں ملتی ہیں۔ کیونکہ چونگ زے سے پہلے ہی کنفیوشس کا انتقال ہو چکا تھا اور ویسے چین میں ہتک عزت کے بارے میں کوئی قانون بھی نہیں اور وہاں

زندگی سے کون زیادہ.....

ازالہ حیثیت عرفی کوئی چیز نہیں۔ چونکہ زے لکھتا ہے :-
"ایک دفعہ کنفیوشس نے سات دن کا روزہ رکھا کیونکہ وہ ایک
کش مکش میں گرفتار تھا

اس پر وزیر چین اس کی عیادت کے لئے گیا اور بولا "حضرت
آپ تو بالکل موت کے منہ میں تھے

کنفیوشس نے کہا: ہاں ایسی ہی بات ہے۔"

وزیر نے پوچھا۔ کیا آپ موت سے خائف ہیں؟

کنفیوشس نے جواب دیا۔ ہاں میاں، موت سے میں خائف

ہوں۔

وزیر نے کہا، تو سنئے، میں آپ کو وہ طریقہ سمجھاتا ہوں کہ آپ کبھی
نہیں ڈر سکتے۔ بات یہ ہے کہ مشرقی سمندروں کی طرف ایک خاص قسم
کا پرندہ ملتا ہے۔ یہ پرندہ بڑا سیدھا، بڑا بھولا بھالا اور سادہ ہوتا ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پرندے میں ذہانت نام کو نہیں تیز می اور چالکی
سرے سے نہیں۔ ان پرندوں کا غول ہمیشہ ایک وقت میں اڑتا ہے اور
ایک وقت میں کسی جگہ بسیر کرتا ہے۔ اڑنے وقت غول میں کوئی دوسرے
سے آگے نہیں بڑھتا۔ پرواز سے واپسی پر کوئی پرندہ دوسرے سے پیچھے
نہیں رہتا۔ کھاتے وقت کوئی پرندہ اپنے ساتھیوں سے پہلے کھانا
شروع نہیں کرتا۔ بلکہ اچھا ہی سمجھتا ہے کہ دوسرے ساتھیوں کے چھوڑ
ہوئے دانے کھائے۔ اس لئے یہ پرندے آپس میں بڑے امن دوستی
سے رہتے ہیں۔ اور باہر کی دنیا انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی اسی

لاؤتزرے کی تعلیم

وجہ سے ان پر آج تک کوئی مصیبت نہیں آئی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سیدھے اور تناور درخت دوسروں سے پہلے کاٹے جاتے ہیں۔ لیکن پانی کے کنوؤں میں سے پانی پہلے ختم ہوتا ہے۔ مگر آپ ہیں کہ احمقوں کو حیرت کے مارے بھونچکا کرنے کیلئے اسی علمیت کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ آپ ہیں کہ اوروں کی ذلت کے مقابلے میں اپنی تہذیب اور اپنی رفعت میں مصروف ہیں اور آپ بزرگ خود زندگی کی راہوں پر اس طرح روشنی پھیلاتے جا رہے ہیں گویا سورج اور چاند دونوں آپ کی بغل میں ہیں۔ اسی لئے دنیا جہان کی مصیبتیں اور زحمتیں آپ کو درپیش رہتی ہیں، آپ ان سے بچھا نہیں چھڑا سکتے۔۔۔۔۔

ساری بات سن کر کنفیوشس نے کہا: "واقعی میاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور کنفیوشس نے فوراً اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا، اپنے شاگردوں کو چھٹی دیدی اور جنگلوں میں چلا گیا۔ ان ہیا بانوں میں جانوروں کی کھالوں سے اپنا تن بدن ڈھانپتا اور پھل پھول کھا کر گزارا کرتا۔ پرندے اور دوسرے جنگلی جانور اس کے آس پاس سے گزرتے اور اسے بالکل کچھ نہ کہتے۔ اس سے کوئی تعرض نہ کرتے؛"

گویا یہ ثابت ہوا کہ تاؤ قانون فطرت یا ازلی سچائی کی رو سے نادانی میں بڑی دانائی مضمر ہے۔ کم رفتاری، بانگین کا نام ہے، حماقت میں بڑی دور رس پنہاں ہے اور خاکساری میں بڑا فائدہ ہے۔

لاؤتزرے نے یہ بھی کہا ہے کہ "نادان اور ناتواں لوگوں پر خدا کی رحمت ہے کیونکہ وہ دنیا میں سب سے مسرور لوگ ہیں۔" لائوتزرے کی تعلیمات کا اثر

زندگی سے کوں زیادہ.....

یہ ہے کہ ہر صدی کے چینی مفکروں نے اسی کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی اپنی باتیں کہی ہیں اور ان کی باتوں میں اسی کا فلسفہ بھلکنا ہے۔ تاوانی اور سادگی کی تعریف میں چینی ادب کے ہر دور میں سیکڑوں تحریریں مل جاتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں چنگ پیناؤ نے یہ مشہور فقرہ کہا تھا: ہو تو فہنا مشکل ہے۔ چالاک ہونا بھی مشکل ہے۔ لیکن چالاک سے ترقی کرتے کرتے ہو فوئی تک پہنچا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ چونگ زے نے کہا تھا: چالاک تھوک دو۔ غرض ہر صاحب فکر چینی نے انسانی عقل اور عقل کی برائی اور چالاک کو ہمیشہ مشکوک سمجھا ہے۔ اور ہمیشہ اس شخص کو "وانا کے راز" قرار دیا ہے۔ جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ میں سخت احمق ہوں! گو یا چینی ثقافت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہانت اور ذہن کی برائی پر شک کرتی ہے اور تاوانی اور کچھ نہ جاننے کے عقیدے کو ایک اعلیٰ درجہ دی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قرار دیتی ہے کہ اصلی روپ کو بہ روپ میں چھپانا، زندگی کی لڑائی میں فتح پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ احمق لوگ بڑے ہر دلعزیز ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے ہر ملک میں اس شخص سے بڑی نفرت کی جاتی ہے۔ جو دوسرے انسانوں کے ساتھ سخت چالاک سے برتاؤ کرے اور اپنا کام نکالے۔ چینی ادیب یو آن چنگ لانگ نے ایک پورا مقالہ یہ بتانے کے لئے لکھا تھا کہ اس کے بھائیوں نے باقی لوگوں کو چھوڑ کر چار بے حد احمق اشخاص کو نوکری کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ احمق نوکر حماقت اور ذوق داری دونوں باتوں میں بے مثال تھے۔ اس سے قطع نظر آپ خود اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو ذہن میں لائے ہمارے پسندیدہ لوگ وہ نہیں جن کی ہم اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے عزت کرتے ہیں۔

لاڈلز کی تعلیم

اور جن لوگوں کی ہم قابلیت کی وجہ سے عزت کرتے ہیں۔ انہیں ہم دل سے پسند نہیں کرتے۔ گو یا ہم آپ کو بھی لوگ، احمق نوکروں کو ہی پسند کر سکتے ہیں، کیونکہ ایسے نوکروں پر ہمیں اعتماد ہوتا ہے۔ اور ان کے سامنے ہمیں اپنی برتری جتانے کے لئے قسم قسم کے جیلوں سے کام نہیں لینا پڑتا۔ اسی وجہ سے اکثر و نامرد و رفیق زندگی کے طور پر زیادہ بانکی، سیکھی عورت کو منتخب نہیں کریں گے۔ اسی طرح عقلمند عورتیں بہت زیادہ چالاک مردوں سے شادی کرنا ہرگز پسند نہیں کرتیں۔

چین کی تاریخ میں چند مشہور احمق گزرے ہیں۔ ان کی نادانی حقیقی تھی یا محض وہ بنتے تھے۔ یہ کون جان سکتا ہے مگر یہ سب بڑے ہر و بعزیز تھے۔ ان میں ایک سوئنگ شہنشاہوں کے دور کا مشہور مصوری فانی ہے۔ جسے باؤلا کہا جاتا تھا او باؤلے کا لقب اسے یوں ملا کہ ایک دفعہ وہ پوجا کے لباس میں ایک چٹان کے پاس بیٹھا اور یہ کہہ کر اس کی پرستش شروع کر دی کہ یہ چٹان نہیں میرا خسر ہے! فانی کو صفائی کا بھی بڑا ضبط تھا۔ اور گردوغبار سے اسے سخت الجھن ہوتی تھی یہی حال یوآن دور کے مشہور مصورنی یون لین کا تھا۔ اسی طرح کا ایک دیوانہ ہان شان تھا جو پجاری اور مشہور شاعر تھا۔ اس نے کئی خاتقا ہوں میں باورچی کا کام کیا، دوسروں کا پچا کھا کھا کر بے گزاری اور خاتقا ہوں اور ان خاتقا ہوں کے باورچی خانوں کی دیواروں پر اپنے زندہ جاوید شعر بکھتا رہا۔ ان کے علاوہ سب سے بڑا باؤلا جس نے چین کے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنایا، وہ پجاری جی تھا۔ اس کی شخصیت کے گرد ایک لمبی چوڑی کہانی بن وی گئی ہے۔ اس کہانی کی ساری فضیلتیں پجاری جی، اس کہانی کے مطابق طلسمات اور طبی معجزوں، بد معاشی اور شراب خوری کی رسیا دنیا میں رہتا ہے۔ اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک ہی دن میں وہ ایسے ایسے

زندگی سے کون زیادہ.....

شہروں میں آموجو رہتا ہے۔ جن میں سیکڑوں میل کا فاصلہ ہے۔ اس کی یاد میں ایک
مندر بھی بنا گیا ہے۔ یہ مندر بانگ چاؤ کی معزنی پھیل کے پاس ہو پاؤ کے شہر میں اب
تک موجود ہے۔

چین میں سوٹھویں اور سترھویں صدی میں یہ دستور تھا کہ اس زمانے کے اعلیٰ
ترین دماغ کے مالک، اپنی سادگی اور اپنے بڑے بڑے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کرتے
تھے گویا ان کا دماغ ٹھیک نہیں۔ اور عقل، دانش اور جذبات کا وہ اعلیٰ
معیار انہیں چھو بھی نہیں گیا۔ جس کے وہ اصل میں مالک تھے۔

۳۔ سسی کی تعلیم ————— توازن اور اعتدال

میں جانتا ہوں کہ جو فلسفہ خوش باشی اور غیر ذمہ دار زندگی کی تعلیم دیتا
ہے اس کی وجہ سے ہمیں مصروفیت کی زندگی اور زندگی کی زیادہ ذمہ داریاں
سنجھانے سے نفور ہوگا۔ اور اس فلسفے کی بدولت ہم میں عمل کی خواہش کم ہو جائے
گی۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کی بے حد مصروف دنیا کو اس فلسفے کی
ضرورت ہے کہ آخر کام کر کے آپ کیا لیں گے؟ عمل کے فلسفے نے آج کی مصروف
دنیا کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اس کی بدولت انسان ہزار ہا قسم کے بے کار
اور لالیعی کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ لہذا عمل کی بے مائیگی کے فلسفے نے دنیا
کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا عمل کی اہمیت اور حد سے بڑھی ہوئی اہمیت نے
ہمارے لئے مصیبتیں پیدا کی ہیں۔ عمل کی بے مائیگی کا فلسفہ اس لئے بھی نقصان
دہ نہیں کہ انسان میں عمل کی جسمانی تخلیق موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ چینی، آزادہ روی

سی سی کی تعلیم

اور بے کاری کے فلسفے کے قائل ہوتے ہوئے بھی بے حد محنتی اور جفاکش قوم ہیں۔
 لہذا خاطر جمع رکھنے عمل کی بے باکی کا یہ کلی فلسفہ کبھی اتنا ہر دلعزیز نہیں
 ہو سکتا کہ ایک زمانہ اسی پر عامل ہو جائے۔ خود چین سیاہی کو دیکھ لھیسے۔ تاؤ کے
 قانون فطرت کے لئے ہر چینی کے دل میں فطری طور پر جگہ ہے۔ یہ فلسفہ چین میں ہزاروں
 برس سے نفوذ کر رہا ہے۔ چینی ادب و شعر کے لفظ لفظ سے اس فلسفے کی جو تین نکلتی
 ہیں۔ چینی تصویروں کے ہر رنگ سے اس کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ پھر بھی چین میں
 ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دولت شہرت اور حکومت کے بھوکے ہیں اور جنہیں یہ
 ضبط بھی ہے کہ اپنے ملک کی ضرورت خدمت کریں یعنی دوسروں کی زندگی اور معاملوں
 میں ضرور دخل انداز ہوں! — اگر یہ رنگارنگی اور تضاد نہ ہوتا تو انسانی
 زندگی چل سکتی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ چینی لوگ، کلی فلسفے کے اس وقت
 قائل ہوتے ہیں اور شاعری بھی اسی وقت کرتے ہیں، جب انہیں نا کامی کامی
 دیکھنا پڑے۔ تاؤ کے قانون فطرت نے ان پر صرف یہ اثر کیا ہے کہ زندگی کی رفتار
 چین میں دھیمی ہے، اعصاب کا تناؤ کم ہے۔ اور جب چینی لوگوں کو آسمانی مصیبتوں
 اور انسانی بد انتظامی سے واسطہ پڑتا ہے تو قانون فطرت، عمل اور رد عمل کے
 اٹل قانون پر ان کا اعتماد پختہ تر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق آخر انصاف
 کابول بالما ہو کر رہتا ہے۔

یہ خیال پھیلا فصل میں بیان کیا جا چکا ہے۔ چین میں اس کے عین الٹ
 ایک اور بکتب فکر بھی ملتا ہے جو خوشباشی اور آزاد روی کے اس فلسفے کا جواب
 ہے۔ پہلی قسم کا فلسفہ، فطری انسان کو مثالی بنا کر پیش کرتا ہے۔ دوسرے خیال کے مطابق
 مجلسی انسان مثالی قرار دیا گیا ہے گویا پہلا فلسفہ اگر تاؤ (قانون فطرت) مستقیم

زندگی سے کون زیادہ.....

ازلی سچائی کا برہا کرتا ہے تو دوسرا فلسفہ کنفیوشس سے تعلق رکھتا ہے اگر تاؤ کے فلسفے اور کنفیوشس کے فلسفے کو محض زندگی کے بارے میں منفی اور مثبت نقطہ

نظر سمجھا جائے تو ان کا تعلق صرف حین سے نہیں، ساری انسانیت سے ہے ہر انسان، اسی مثبت اور منفی فلسفوں کا میل ہوتا ہے مگر جو شخص تاؤ کے فلسفے پر پوری طرح عامل ہو اس کے لئے لازم ہے کہ دنیا کو چھوڑ کر کسی بہار کی چوٹی پر غار میں بسیرا کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے لکڑیاں لے کر یا باہی گیر کی سادہ زندگی کی مثال سامنے رکھے۔ وہ اپنے ارد گرد نگاہ ڈورائے اور دیکھے کہ لکڑیاں لے اور باہی گیر بہاری ہلال اور ندیوں پر کس خوشی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور پہاڑیوں کے جنگل اور پہاڑوں کے ندی نلے ان کے وجود سے کس قدر بے نیاز رہتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ تاؤ کے عامل، فلسفی اور تارک، انہی خیالات اور انہی نظاروں سے دل کا سلون، روح کی ستائش اور آئندہ حاصل کرتے ہیں

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جو فلسفہ ہمیں انسانی معاشرے سے دور بھاگنے کی تعلیم دے، وہ کیا فلسفہ ہوا؟ چنانچہ اس رہبانیت سے ایک عظیم تر فلسفہ وجود میں آیا جس کا نام فلسفہ انسانیت ہے۔ اس کے مطابق چینی فکر کا نصب العین یہ ٹھہرتا ہے کہ انسانی معاشرت سے دور رہنے کی کوشش نہ کی جائے۔ انسانی زندگی سے گریز کی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے مطابق تارک کھٹیا قسم کے لوگ ہیں جو دنیا چھوڑ کر ویرانہ میں پناہ لیتے ہیں تاکہ اپنی چھوٹی موٹی روح کا جو ہر قائم رکھ سکیں۔ اصلی درویش وہ ہے جو شہر میں رہتا ہوا کیونکہ یہی وہ شخص ہے۔ جسے اپنے آپ پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے ماحول، اپنے گرد و پیش سے خائف نہیں ہوتا۔ چنانچہ سب سے بڑا درویش وہ ہے جو انسانی معاشرے میں رہنے

سی سی کی تعلیم

کے لئے لوٹ آتا ہے۔ جو سب کچھ کھاتا پیتا ہے۔ عورتوں کی محفل سے بھی لطف اٹھاتا ہے۔ مگر اس کی روح ملوث نہیں ہوتے پاتی۔

گویا مندرجہ بالا دو فلسفوں کو آپس میں ملا دینے کی کافی گنجائش ہے۔ یہ دونوں فلسفے، ناوازم اور کنفیوشس کا فلسفہ، انتہا کے دو متقابل نقطوں ... دو متضاد راہوں کو ظاہر کرنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان اعتدال اور توازن کے کسی راستے موجود ہیں، بیچ کئی اس کھلی ہیں۔

خشک مزاجی بھی حد کے اندر ہی اچھی لگتی ہے۔ اسباب عیش سے سرسبز فطرت بھی نہیں ہونی چاہئے۔ اسی طرح اگر آپ نوع انسان کی نیکی کے منکر ہیں تو آپ کو حد کے اندر ہی رہنا چاہئے کیونکہ زندگی کا اعلیٰ اصول یہی ہے کہ انسان معقولیت کی حد میں زندگی بسر کرے۔ کنفیوشس کے پونے سی سی نے اسی بات کو اپنی کتاب "اعتدال کے نہری راستے" میں پیش کیا ہے۔ انسانی زندگی کے کسی ایک قدیم یا جدید فلسفے نے اتنی بڑی حقیقت کو پیش نہیں کیا کہ اچھی زندگی، دو انتہاؤں کے درمیان راستے پر چلنے کا نام ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جسے توازن نصف و نصف کا کانسٹا کہا گیا ہے۔ گویا معقولیت کی مدد سے ہمیں عمل اور بے عملی کے درمیان مکمل توازن کا مقام ایسا مانا ہوگا۔ اس لحاظ سے مثالی آدمی وہ ہے جو نیم شہرت اور نیم گناہی میں زندگی گزارے۔ جو نیم کاہلی سے رہتا ہو اور نیم مصروفیت سے کاہل رہ کر وقت گزارے۔ جو اتنا عزیز بھی نہ ہو کہ گھر کا کر ایہ تک ادا نہ کر سکے اتنا امیر بھی نہ ہو کہ اسے ہاتھ پاؤں ہلانے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ پیارہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہی نہ ہو کہ کاش میری پاس اور روپیہ ہوتا تاکہ میں اسے دوستوں کی مدد کے لئے صرف کر سکتا۔ اگر وہ گانے کا شوقین ہو تو صرف ایسا گانا

زندگی سے کون زیادہ

سکتا ہو کہ اس کے دوست اس کا گانا سن کر خوش ہو جائیں اور وہ خود بھی اپنا جی بہلا سکے۔ اگر اسے عمدہ چیزیں جمع کرنے کا شوق ہو۔ تو صرف اپنی چیزیں جمع کرے جو دیوان خانے کی انگلی پھیلا کر آسکے۔ اگر وہ پڑھتا ہو تو اتنا کہ کام چل سکے، وہ دنیا سے بہت زیادہ کام کی باتیں سیکھے۔ مگر کسی کام یا علم یا فن کا ماہر نہ بن جائے۔ اگر کھتا ہو تو ایسا کہ ادھی چیزیں پھلتی ہوں اور باقی کی ادھی واپس کر دی جاتی ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ چینی قوم نے عام زندگی کا یہ معقول ترین نصب العین مقرر کیا ہے۔ اس نصب العین کو چینی شاعر علی می آن نے اپنے گیت "نصف اور نصف کا توازن" میں خوب ظاہر کیا ہے :-

عمر ادھی سے زیادہ گزری!

"نصف" کا لفظ بھی کیا چیز ہے،

معنی کے طلسمات نہاں ہیں اس میں!

"نصف" کا لفظ ہے اک دعوت نہاں گویا

"نصف" کا لفظ اشارہ ہے کہ جو دیکھا نہیں ہے، دیکھو

"نصف" کا لفظ یہ کہتا ہے کہ جو چکھا نہیں ہے چکھو،

"نصف" کا لفظ بھی کیا چیز ہے!

معنی کے طلسمات نہاں ہیں اس میں!

زیست کا ادھا سفر طے کر کے

زیست کے سب سے حسین دور کا آغاز ہوا کرتا ہے،

سی ہی کی تعلیم

نرم سیر، اور سبک رو بھی ہوئی جاتی ہے رفتار حیات! —

عوش اور فرس کے مابین ہی مل سکتی ہیں

وسعتیں کون و مکاں، عالم امکاں کی یہاں!

شہر و دیہات سے ہو قربت و دوری میں برابر جو مقام

اس جگہ رہئے، — وہی کھیت ہیں سب سے بہتر

ندیوں اور پہاڑوں کے جو مابین ملتیں!

نیم عالم بنو، اور نیم امیر اور تجارت بھی کرو،

کچھ امارت سے، تو کچھ عام طریقے سے بھی جینا سیکھو،

نیم سادہ بھی ہو اور نیم امیرانہ بھی، رہنے کا مکان۔

نیم آراستہ بھی، خالی بھی!

وہ لباس اچھے ہیں جو آدھے نئے، آدھے پرانے ہو جائیں،

کھانا وہ اچھا ہے جو نیم ریلیسا نہ بھی ہو، نیم غریبانہ بھی۔

خادم اچھے ہیں وہی، جو نہ ہوں چالاک تو احمق بھی نہ ہوں،

بیوی اچھی ہے وہی، جو نہ ہو طرار، تو سادہ بھی نہ ہو

میں بھی ہوں دل میں جو کچھ بدھ کے تو کچھ تاؤ کے انداز لئے

نصف میرا ہے، سپرد خالق

نصف باقی ہے مرے بچوں کی میراث — یہی سوچتا ہوں

اپنے بچوں کے لئے، کیا کروں اور کیا نہ کروں!

زندگی سے کون زیادہ.....

یہ بھی ہے فکر — کہ خالق کو بھی دینا ہے جو اب!

نیم مستی ہے سہانی مستی

ادھ کھلے پھولوں کا جو بن نہیں دیکھا جاتا

جس کے پاس ادھ سے تھوڑا سا زیادہ ہو — وہ اندیشے

جس کے پاس ادھ سے تھوڑا سا بھی کم ہو — ہے وہی گرم عمل

زندگی، تلخی و شیرینی کا آمیزہ ہے۔

جو اسے نصف ہی چکھ کر چھوڑے

اسے دانا کہئے!

اس گیت میں تناؤ کے فلسفے کا لالہ ابالی بن بے نیازی اور مزاج کا استغنا بھی ہے۔ اور کٹھنوشس کی تعلیمات کا عملی پہلو بھی سمجھایا گیا ہے۔ گویا ان دو متضاد نظریوں کو آپس میں ملا کر ایک نیا فلسفہ زندگی کے بارے میں ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے جو "نصف و نصف" کا فلسفہ ہے۔ میں جانتا ہوں یہ نظریہ مغربی ذہنوں کو پسند نہیں آئے گا۔ کیونکہ مغرب کے لوگ عمل اور جدوجہد کے ضرورت سے زیادہ ہی قابل ہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ زندگی کا بہترین فلسفہ ہے کیونکہ اس میں انسانی پہلو بہت زیادہ ہے۔ یہ مانا کہ قوموں کو غیر معمولی اخاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ قومیں چاہتی ہیں کہ ان میں بڑے بڑے سپاہ، بڑے بڑے فارتح پیدا ہوں تو میں چاہتی ہیں کہ اس کے اخاد بڑے بڑے سائنس دان اور موجد ہوں۔ قومیں عظیم قسم کے لیڈر پیدا کرنے کی خواہش کرتی ہیں۔ ایسے جلیل اور عظیم ذہن چاہتی ہیں جو تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رکھ دیں — مگر یہ ظاہر ہے کہ مسرت

سی سی کی تعلیم

سے بھر پور زندگی، درمیانے درجے کے ایک آدمی کی ہوگی۔ ایک ایسے شخص کی زندگی جس نے معاشی اعتبار سے کچھ فارغ البالی حاصل کر لی ہو جس نے عام انسانوں کے لئے یہی تصور اساکام، تھوڑی سی خدمت کی ہو۔ جو اپنے ہم حتمیوں میں تھوڑا سا ممتاز ہو مگر زیادہ ممتاز نہ ہو۔ اس نیم شہرت، نیم گناہی، ہلکی سی فارغ البالی اور تھوڑی سی عسرت میں ہی زندگی، دکھوں سے کافی حد تک آزاد رہتی ہے۔ مگر ان کے مشکل سے بالکل آزاد بھی نہیں ہوتی۔ یہی ماحول ہے جس میں انسان کی روح کو بالیدگی ملتی ہے اور انسان اپنی زندگی کو کامیاب بناتا ہے۔ زندگی ہر حال میں بسر کرنی لازم ہے۔ اور اگر اچھی زندگی بسر کرنی ہے تو ہمیں فلسفے کو آسمانی بلندیوں سے کھینچ کر زمین پر لانا ہوگا۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے جو اوپر عرض ہوا ہے۔

۵۔ زندگی کا تیشائی

یو آن ہینگ

پھلی فصل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ زندگی کے بارے میں مثبت اور منفی نظریوں کو بڑی آسانی سے آمیز کیا جاسکتا ہے اور ان کے ملانے ہی سے توازن کا فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو عمل اور بے عملی کے درمیان اعتدال کا راستہ سمجھاتا ہے۔ اسی کے مطابق ہم زندگی کو بالکل مجبور ہو کر اور اپنی مجبوری کی بنا پر دنیا سے فرار اختیار کر سکتے ہیں، نہ دن رات سخت محنت ہی اور محنت کے غلام ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ فلسفہ ہمیں سخت محنت اور دنیا کو تھوڑے دینے کے درمیان کار راستہ بتاتا ہے۔ اگر دنیا بھر کے فلسفیوں کی چھان چھک کی جائے تو ہمیں توازن یا اعتدال اسی میں نظر آئے گا۔ اور یہی توازن اس دنیا میں انسان کی زندگی کو معقول زندگی اور

زندگی سے کون زیادہ.....

مسترت بھری زندگی بنا سکتا ہے۔ ایک ادبیات بھی اہم ہے۔ توازن اور اعتدال کے اسی فلسفے کے مطابق انسانی شخصیت کے متضاد عناصر ہم آہنگی اور باہم ربط پانے ہیں۔ اور ہم آہنگی مستوازن شخصیت پیدا کرنا ہی دنیا جہان کے کلچر اور تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ زندگی کا لطف اٹھانا اور زندگی کو ایک نعمت سمجھنا ایک ہم آہنگ شخصیت ایک متوازن شخص کے لئے ہی ممکن ہے۔ کیونکہ جس شخص کی زندگی میں توازن اور ہم آہنگی نہ ہوگی وہ زندگی سے نہ لطف اٹھائے گا، نہ اسے اچھا سمجھ سکے گا۔

زندگی سے محبت رکھنے اور زندگی کو نعمت سمجھنے کا مفہوم کیا ہے ؟

اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ — میں سمجھتا ہوں زندگی کے ایک سچے شیدائی کی کہانی آپ کو سنانے سے یہ مفہوم واضح ہو سکتا ہے۔ اس سے آپ کو پناہ مل جائے گا کہ زندگی کے اس شیدائی نے اپنی زندگی کس طرح گزاری ! — یہ کہانی چین کے سب سے بڑے شاعر یوآن منگ کی کہانی ہے۔ اس کی شخصیت چینی کلچر کی سب سے متوازن شخصیت ہے۔ میرے اس انتخاب پر چین میں کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ یوآن منگ چین کی ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ ہم آہنگ شخصیت سب سے بھرپور کردار مانا جاتا ہے۔ اس نے کوئی بڑا سرکاری رتبہ حاصل نہیں کیا، اس نے زندگی میں کوئی نمایاں کارنامے سرانجام نہیں دیے، کوئی بڑی ادبی یادگار نہیں چھوڑی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ نظموں کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے اور تین چار مضامین ہیں۔ اس کے باوجود صدیوں سے اس کی شخصیت متعل راہ کی حیثیت رکھتی رہے اور ہر صدی کے چھوٹے بڑے شاعر اور ادیب اسی کی سستی کو انسانی کردار کی عظمت کی زندہ دیا پندہ مثال سمجھتے رہے ہیں۔ اس کی زندگی

زندگی کا شیدائی

سادگی کا اعجاز ہے جو اس کے ادبی اسلوب میں ہے۔ اور یہ سادگی اتنی پر عظمت اتنی بلند ہے کہ تکلیف اور نصنع کا ادج کمال اس کے سامنے بانکل ہیچ اور بے مایہ نظر آتا ہے۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی وہ ہمیں زندگی کے ایک سچے شیدائی کی حیثیت سے مثالی شخص نظر آتا ہے۔ کیونکہ ونبوی جو اہشتات کے خلاف اس کے دل میں جو نفرت کا جذبہ تھا اس کی بدولت اس نے دنیا سے مکمل ذرا اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اس نے جو اس اور شعور کی زندگی کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے چین کے ادب پر دو سو سال تک روحانی تحریک چھائی رہی۔ چین کی عام زندگی پر ان دو سو برسوں میں تاؤ فلسفہ کی بے عملی اور تساہل کی تعلیم کا غلبہ رہا۔ اس تعلیم نے جب کنفیوشس کے فلسفے کے ساتھ ناتا جوڑا تو یوان منگ ایسی متوازن اور مکمل طور پر ہم آہنگ شخصیت وجود میں آئی۔ گویا اس کی شخصیت زندگی کے نہایت عملی فلسفے اور زندگی کو سچ، کار دنیا کو فضول سمجھنے کے فلسفے کا سنگم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عملی فلسفے کی خود پسندی سے چھوٹی نہیں گئی اور کار دنیا کو سچ سمجھنے کی تلخی اس کے پاس تک نہیں چھٹکی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی شخصیت میں انسانی دانائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور رواداری اور مہربانی کا بڑا نادر مزاج ملتا ہے۔

یوان منگ کی ہستی میں چینی کلچر کی ایک عجیب خصوصیت نظر آتی ہے یعنی وہ بیک وقت جسم اور جسمانی خواہشات کا بزرہ بھی ہے اور روحانیت کی عظمت کا قائل بھی ہے۔ یہ روحانیت ایسی ہے جس میں ترک دنیا اور سخت یا ضنوں کا کوئی دخل نہیں۔ ادھر جسمانی خواہشات کی قبولیت میں شہوانیت کا شائبہ نہیں۔ گویا جو اس اور روح دونوں پوری ہم آہنگی پورے اعتدال پورے توازن کے

زندگی سے کون زیادہ.....

ساتھ اس کی شخصیت میں سمائے تھے۔ یعنی اصل فلسفی اور صاحب نظر وہ ہے جو عورتوں کے حسن اور ان کی دل کشی اور دلبری کا قائل ہو۔ مگر عامیانا اور گھٹیا نہ ہو جائے۔ جو زندگی سے محبت رکھتا ہو مگر اس لگاؤ میں ضبط سے کام لے جو عمل کی متوالی و دنیا کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہو اور جانتا ہو کہ یہ سب کچھ بے حقیقت ہے۔ سب بایا کا کھیل ہے۔ اس لئے وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ مگر اس کا مخالف اور دشمن نہ ہو جائے۔ یوآن مینگ نے روحانی ارتقا کی یہ اعلیٰ منزل حاصل کر لی تھی۔ اس لئے اس کی زندگی، روح اور نفس کی کشمکش سے بالکل منزہ تھی۔ اس کی زندگی بڑی فطری اور بڑی سادہ، بے حسد برہنہ تھی۔ اسی طرح فطری اور برہنہ تھی جس طرح اس کی شاعری تھی

یوآن مینگ کی زندگی کا خاکہ یہ ہے کہ وہ چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس کا واداہت بڑا عالم اور بڑا صاحب رزق شخص تھا (کچھ کرتے رہنے کی دھن ہیں، یہ حضرت، صبح کو انیٹوں کا ایک ڈھیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے، اور شام کو پھر اسی جگہ ساری انیٹیں پہنچا دیتے تھے۔) یوآن مینگ نے اپنی نوجوانی میں معمولی سی سرکاری ملازمت کر لی تھی تاکہ بوڑھے ماں باپ کے لئے روزی کمائی جاسکے۔ مگر بہت جلد اس نے اس نوکری سے استعفا دے دیا اور گاؤں چلا گیا۔ جہاں اس نے کسانوں کی طرح خود کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اس کی وجہ سے اسے ایک مرض بھی لاحق ہو گیا۔ ایک روز اس نے اپنے عزیزوں سے کہا: کیا خیال ہے، میں اپنے باغ کا خرچہ پورا کرنے کے لئے بھات کے طور پر گاؤں گاؤں نہ پھر لیا کروں؟ — اس پر اس کے چند دو سنوں نے اسے ایک علاقے کے مجسٹریٹ کا عہدہ دلوا دیا۔ یوآن مینگ شراب کا پراشائق

زندگی کا شیدائی

تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے علاقے میں پہنچ کر یہ حکم دیدیا کہ ساری زمینوں میں صرف ایسے چادول بوئے جائیں جن سے شراب تیار کی جاسکے۔ مگر اس کی بھوی نے بڑا سخت احتجاج کیا اور اس نے اپنے حکم میں یہ ترمیم کی کہ کل رتبے کے چھٹے حصے میں عام قسم کے دھان کی کاشت بھی کرنی جائے تو مضائقہ نہیں۔

ایک دفعہ کوئی بہت بڑا سرکاری افسر دورے پر اس علاقے میں آیا۔ یوان منگ کے سکرٹری نے اسے بتایا کہ آپ کو اپنے منصب کا پورا لباس پہن کر اور مٹی فلتے سے آراستہ ہو کر اس افسر کا استقبال کرنا چاہیے۔ یوان منگ نے تھمڈی سانس لے کر کہا: یہ مشکل ہے۔ میں آٹھ دس من چادولوں کی خاطر اس طرح جھکنے اور کورنش بجالانے سے رہا! چنانچہ اس نے پھر استعفا دیدیا اور اپنی مشہور نظم "سوئے وطن جاتا ہوں میں" لکھی۔ اس کے بعد اس نے تمام عمر کھیتی باڑی میں گزار دی۔ اور جب بھی اسے کوئی سرکاری عہدہ پیش کیا گیا اس نے ہمیشہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی زندگی غربت میں بسر ہوئی۔ اس کے ساتھی بھی 'غریب لوگ تھے۔ اپنے بیٹوں کے نام ایک خط میں اس نے افسوس ظاہر کیا کہ میرے بچوں کو ایسے بڑے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اور عام مزدوروں والا کام کرنا پڑتا ہے مگر ایک دفعہ جب اس نے ایک کسان لڑکے کو اپنے لڑکوں کے پاس بھیجا کہ کنوئیں سے پانی نکالنے اور ایندھن جمع کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائے تو اپنے لڑکوں کو خالص طور پر یہ ہدایت کی: اس بچے سے سیکھو اچھا سلوک کرنا کیونکہ یہ بھی کسی کا بیٹا ہے!

یہ وہ قول ہے جسے چینی سب سے عظیم ضرب العمل سمجھتے ہیں!

یوان منگ کی واحد کمزوری یہ تھی کہ اسے شراب سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ اس کی زندگی گوشہ نشینی میں گزری اور مجلس کے تہنگاموں سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پھر بھی جب شراب کا دور ہو تو وہ محفل میں بھی نظر آسکتا تھا، چاہے

زندگی سے کون زیادہ

صاحب خانہ سے اس کی ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگرچہ خود صاحب خانہ ہو اور سب سے پہلے نشے اور سرور کی کیفیت اس پر چھا جائے تو وہ شرکائے محفل سے صاف صاف کہہ دیتا تھا: بھائیو! میں نشے میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ سو جاؤں۔ آپ حضرات تشریف لے جائیں!

وہ بڑا منکسر اور ساوہ مزاج آدمی تھا۔ اس کا بڑا جوہر اس کی خود مختاری تھی۔ شناسائی کرنے اور مجلسی زندگی کے بارے میں وہ سخت محتاط تھا۔ ایک مجسٹریٹ جس کا نام دانگ تھا۔ ایک بار اسے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا بڑا مداح بھی تھا۔ مگر کسی عنوان ملاقات نہیں ہوتی تھی کیونکہ یوآن منگ کا جواب یہ ہوتا تھا: میں مجلسی آدمی نہیں، اسی لئے میں تنہائی پسند ہوں۔ گھر میں بند رہتا ہوں کہ بیمار ہوں۔ اس لئے ملاقات مشکل ہے۔ مگر اشارۃً یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ مگر مجسٹریٹ دانگ کو تو اپنے محبوب شاعر سے ملاقات کی دھن تھی۔ اس نے ایک چال چلی۔ اس نے اس کے ایک دوست سے کہا کہ یوآن منگ کو ایک دعوت میں بلائے، وہاں اتفاقی طور پر ملاقات کا بندوبست ہو جائے گا۔ یوآن منگ بصد مشکل اپنے دوست کی دعوت میں شرکت کے لئے گھر سے نکلا۔ راستے میں ایک جگہ دم لینے کے لئے رکا تو کسی نے شراب کا ایک جام پیش کیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ: میں شراب پینے بیٹھ گیا۔ مجسٹریٹ دانگ پاس ہی چھپا تھا وہ فوراً نکل آیا اور دونوں کی ملاقات ہوئی۔ باتیں شروع ہوئیں تو سارا دن وہیں گزر گیا اور اس و دوست کی دعوت رکھی رہ گئی۔ ملاقات کی یہ صورت بعد میں بھی قائم رہی۔ جب کبھی دانگ، یوآن منگ سے ملنا چاہتا، تو جنگل یا جھیل کے کنارے انتظار کرتا رہتا کہ شاید وہ گھومنے نکلے تو ملاقات

زندگی کا شیدائی

ہو جائے۔ ساوگی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ دوستوں کی محفل میں شراب چھاننے کے لئے کپڑا نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے یوآن منگ کی نہایت عمدہ پگڑی سے شراب چھاتا شروع کر دی۔ جب کام ختم ہو گیا تو اس نے ہڑے آرام سے پھر وہی پگڑی سر پہ باندھ لی۔

لوشان کے پیاروں کے دامن میں شاعر یوآن منگ کا گھر تھا۔ ان پیاروں میں ایک خانقاہ تھی جس میں بدھ مت کی مشہور مجلس قائم تھی۔ اس کے صدر نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح شاعر یوآن منگ اس کنول سبھا کارکن بن جائے۔ چنانچہ جب اسے ایک جلسے میں بلا لیا گیا تو اس نے شرط پیش کی کہ میں اگر وہاں آکر شراب پی سکوں، تو آؤں گا۔ بڑی مشکل سے بدھ پر وہتوں نے اپنا بندھی اصول نوٹ کر اسے اپنے سامنے شراب نوشی کی بھی اجازت دی۔ مگر جب مجلس کی رکنیت کا سوال آیا تو فوراً وہن جھار کر اٹھ پھرا ہوا اور منہ لٹکائے چپ چاپ پھر چلا آیا۔ خیال ہے کہ یہ مجلس کوئی معمولی نہ تھی، سانی لنگ یوں، جیسے عظیم شاعر کو زندگی بھر یہ خواہش رہی کہ کنولی سبھا کی رکنیت کا اعزاز مل جائے مگر یہ اعزاز اسے حاصل نہ ہو سکا۔ یوآن منگ کے انکار کے باوجود صدر پر وہت اس کی نوشی پر فخر کرتا رہا اور اسے اپنے ہاں بلاتا رہا اور خود شراب پلاتا رہا۔

گویا یوآن منگ نے ایک خوش باش، آزاد منش، صاف دل انسان کی زندگی بسر کی اس نے عسرت اور تنگ دستی میں دن گزارے۔ کسان رہ کر شاعری کی نہایت معمولی مگر دانشمندی سے لبریز اور مسرت سننے بھر پور زندگی گزاری۔ اپنی یادگار نظموں کی ایک نہایت مختصر کتاب چھوڑی جس میں زیادہ تر نظمیں شراب پینے اور دیہاتی زندگی پر ہیں۔ نین چار مختصر سے ادھورے سے مقالے ہیں۔ اپنے بیٹوں کے

زندگی سے کون زیادہ.....

نام ایک خط ہے اور دونین دعائیں ہیں۔ بس یہی اس کی کل کائنات ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ یا کچھ اقوال ہیں جو سینہ بسینہ ہم تک آئے ہیں۔ مگر ان نظموں و مقالوں اور اقوال سے متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی ایک بے مثال تصویر سامنے آتی ہے ایک ایسی زندگی ان سے جھلکتی ہے جو اعتدال اور خوش آہنگی کی معراج ہے۔ سادگی اور حسن نعت کا ایسا مرقع تھی۔ جو آج تک اپنی نظیر یہاں نہیں کر سکا۔ زندگی سے محبت اور زندگی کو نعمت سمجھنے کا یہی اعجاز ہے اور اسی جینے کے گہرے لگاؤ کو اس نے اپنی کمال نظم (سوئے وطن جانا ہوں میں) میں ظاہر کیا ہے۔ جو اس نے نومبر ۱۹۰۵ء میں مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفاء دینے پر لکھی تھی۔ یہ نظم فیک صنف میں لکھی گئی ہے، یہ تضاد کی صنعت کہلاتی ہے۔ کبھی اس میں قوائی آتے ہیں کبھی نہیں آتے۔ اس میں آہنگ ہی آہنگ ہوتا ہے وزن نہیں ہوتا۔

اب سوئے وطن جانا ہوں میں... میری کھنتی ہے اجاڑ، میری پھلوا ری
 بھی ہے دیراں، کیوں نہ میں اپنے وطن جاؤں؟ میں نے خود اپنی روح کو اپنے
 جسم کا چاکر بنایا تھا، اب پشیمانی ہو کیوں؟ اور ماتم ہو تو کیسا؟
 ہرچہ باد اباد۔ گزری بات پر پشیمانی کا کیا فائدہ؟ — اب تو میں سفر
 پررداں ہوں۔ اپنی منزل کی طرف رواں ہوں۔ — سیدھے راستے سے
 میں زیادہ نہیں بھٹکا۔ اور اگر کل میں غلط راستے پر تھا بھی تو میں جاتا
 ہوں کہ آج میں باسکل ٹھیک راستے پر چل رہا ہوں —
 کشتی بڑی زم روی سے پانی پر بہتی جا رہی ہے۔ اور میرے دامنوں کو
 ہوا بڑی سبک رفتاری سے تھپکتی ہے۔ میں ایک فرسے راستے پر چھتا ہوں۔

دردگی کا شیدائی

اور پریشان بھی ہوں کہ صبح اتنی دھندلی کیوں ہے اور پھر مجھے اپنے گھر کی
جانی پہچانی چھت دور سے نظر آئے گی میرے قدم خوشی سے اور بھی تیز ہو
جائیں گے۔ گھر کے دروازے میرے ملازمین اور میرے بچے میرے انتظار میں
چشم براہ ہوں گے۔

شاید اب تک میرے باغوں میں گھاس پھوس آگ آئی ہوگی۔ راستے
کافی میں چھپ گئے ہوں گے۔ اور کچھ ہونہ ہو گل واؤدی نوضرڈ کھلے ہونگے
اور میں اپنے سب سے چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں داخل ہوں گا۔ جہاں سامنے
میز پر شراب کا لبریز جام رکھا ہوگا!

جام ہاتھ میں لے کر میں دو گھونٹ پیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ سامنے باغ
میں پیڑوں کی ٹہنیاں اسی حسن و خوبی سے جھکی ہوئی ہیں جس طرح کبھی ہوا کرتی
تھیں اور میں جنونی دیوچے میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔ دل میں اطمینان محسوس ہوتا
رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرا چھوٹا سا گھر بڑا آرام دہ اور عمدہ ہے

اپنے باغ میں روز سیر کرتا ہوں۔ باغ جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ میری
دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا ہوا، جو میرا بند دروازہ کوئی کھٹکھٹانے والا نہیں
آتا ہے میں ہاتھ میں چھڑی لئے باغ میں چل کر رہتا ہوں اور نیلے آسمان کو
گکھی گکھی زگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں۔

نیلے آسمان پر بادل اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل نکل کر بے مقصد
پھرتے ہیں۔ اور پرندے، پرندے سے تھک کر آشیانوں کو چھنے کی سوچتے ہیں
شام کے سائے بڑھتے آتے ہیں۔ میں گھر لوٹنے کی سوچتا ہوں پھر چڑھوں
اور دیواروں کی متوالی خوشبوؤں میں کچھ اور گھومتا ہوں۔

زندگی سے کون زیادہ

ہاں! میں سوئے وطن جانا ہوں آج سے میں تنہا زندگی بسر کرنا سیکھوں

گا۔ یہ دنیا اور میں، ہمالیا آپس میں نباہ نہیں ہوتا۔ پھر کمیوں مارا مارا پھروں؟
کیوں اس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہوں۔ جو ملے گی نہیں؟

ہاں میں اپنے عزیزوں کی بات چیت سے دل پہلاؤں گا۔ اور وقت
گزارنے کے لئے کتابیں اور موسیقی لیا کم ہیں؟ — اور تمہارے سنائی لکسان
میرے پاس آئیں گے اور بتائیں گے کہ اب تو بہار کا موسم آگیا، مغربی کھیتوں
عے کی بوائی شروع کرنی چاہیے

کچھ لوگ سفر کے لئے عمدہ گھیاں لینے ہیں، کچھ کشتیوں میں جاتے ہیں۔
ہمارا زندگی ہی ہے۔ ہم انسان کبھی تو گہرے، انجانے پانیوں کی تھاہ لگاتے
ہیں اور کبھی دشوار گزار گھاٹیوں پر چڑھتے ہیں۔

یہاں سرسبز سڑوں کے جھنڈ ہیں جو نشا و ابی اور طراوت میں جھومتے ہیں
اور صاف چشمے، ڈھلوانوں سے پھوٹتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا
میں موسموں کی رعایت سے کیا کیا چیزیں پھلتی پھولتی ہیں، پروان چڑھتی ہیں۔
میں جانتا ہوں کہ اسی طرح میری زندگی کا بھی ایک سفر مقرر کیا جا چکا ہے۔
اب بہت ہو چکی! — یہ زندگی کب تک، یہ فانی جسم کہاں تک سہا سہا

دے گا؟ زندگی جس طرح ہے، اور زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسی طرح
ہوگا۔ پھر ایک ہر کار سے کی طرح یہ دوڑ دھوپ کیسی؟

میری آرزو یہ نہیں کہ مجھے حکومت اور دولت ملے۔ باقی رہی خدائی
تو وہ میرے بس کی نہیں۔ اسی لئے میں ایک دن چپ چاپ گھر سے نکل
جاؤں گا۔ باغ کو جھاڑ جھنکار سے صاف کروں گا، اپنے کھیت میں ہل

زندگی کا شیدا کی

چلاؤں گا۔

یا چتے کے کنارے بیٹھ کر نظم لکھوں گا۔ یا کہیں سفر پر نکل کھڑا ہوں گا
بس میں اسی طرح جینا چاہتا ہوں، اور میری آرزو ہے کہ اسی قناعت اور
گوشہ نشینی میں مجھے موت کا پیغام آئے اور میں منسی خوشی اپنی جان موت کے
ذرتے کے حوالے کر دوں۔

شاید اس سے آپ یہ سمجھیں کہ شاعر یوآن ہنگ کی ذہنیت فراری تھی، وہ
دنیا سے بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ سیاسیات سے بھاگتا تھا،
زندگی سے نہیں۔ اگر وہ منطقی ہوتا تو وہ زندگی سے مکمل طور پر بھاگ جاتا اور کسی خانقاہ
میں جا کر پودھ بھکشو بن جاتا۔ مگر وہ زندگی کا بڑا شیدا ہی تھا۔ وہ بھلا زندگی سے
پوری طرح راہ فرار کیسے اختیار کرتا؟ اس کے بیوی بچے اس کے لئے ایک
زندہ حقیقت تھے۔ اسے اپنا باغ عزیز تھا۔ باغ کی سلیس اور چتر کے درخت اس
کے لئے بہت زیادہ دل کشی رکھتے تھے۔ وہ منطقی آدمی نہ ہی، معقول آدمی ضرور،
تھا۔ اس لئے اس نے یہ سب کچھ تہ نہی دیا۔ بلکہ وہ اپنے بیوی بچوں، اپنے باغ،
اپنے محبوب بیٹروں کے پاس رہا۔ زندگی کیلئے ہی محبت تھی جو اس کے دل میں
موجزن تھی۔ زندگی کے بارے میں اس کے خیالات معقول اور اس کا رویہ عملی
تھا۔ اسی لئے اس کی شخصیت زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئی اور یہ اس
کے مہذب ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ زندگی کے ساتھ اس ہم آہنگی کی بدولت
چینی زبان کی عظیم ترین شاعری وجود میں آئی۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس خاک دان
سے ہیں اور اسی کے لئے ہیں۔ اس لئے اس خاک دان سے بھاگنا کیا معنی ہے

اسی لئے اس نے کہا تھا آہیں ایک جھکیلی صبح کو چھڑی ہاتھ میں لے کر باغ میں جا
نکلوں گا اور پی چاہا تو چھڑی میں گاڑ کر باغ کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنا شروع
کردوں گا یا زمین میں ہل جلانے لگوں گا؟ — اسی لئے یوآن منگ نوکری چھوڑ کر
اپنے بیوی بچوں اور اپنے کھتیوں کو واپس آ گیا۔ یہ ہم آہنگی اور توازن کھتا
بغاوت نہیں تھی۔

باب ششم زندگی کی نعمتیں

- ۱۔ خوش رہنے کا مسئلہ
- ۲۔ انسانی مسرت
- ۳۔ مسرت کے طور پر لہجہ
- ۴۔ ماؤں پرستی۔ چند غلط فہمیاں
- ۵۔ ذہنی یا روحانی مسرت

۱۔ خوش رہنے کا مسئلہ

زندگی سے لطف اٹھانے میں بہت سی باتیں شامل ہیں، اپنے آپ سے خوش رہنا، گھر بلیو زندگی سے خوش رہنا، درختوں اور پھولوں، بادلوں اور ندیوں سے خطا اٹھانا، گرتے آبتناروں کا لطف لینا، غرض قدرت کے ہزار ہا مظاہر سے مسرت حاصل کرنا۔ اسی میں شامل ہے پھر شعر اور آرت، غور و فکر، دوستی، گفتگو اور مطالعے سے لطف اٹھانا بھی اسی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ یہ سب باتیں ہماری روح کی تزجانی کرتی ہیں، گویا زندگی کا لطف کچھ تو ایسی چیزوں میں ہے جو ظاہر ہیں، مثلاً کھانے پینے کا لطف اور دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کی خوشی وغیرہ۔ اور کچھ ایسی باتیں ہیں جو اتنی عیاں نہیں ان میں شعر و سخن، اور فنون لطیفہ، اور سوچنے کے مزے شامل ہیں۔ زندگی کے ان مزوں کو میں گھڑے گھڑائے دو حصوں میں نہیں بانٹ سکا۔ میں کیسے کہوں کہ زندگی کے مزے مادی ہیں اور کچھ ذہنی یا روحانی ہیں۔ اول تو یہ کہ میں اس کی تقسیم کا فائل نہیں کیونکہ یہ تقسیم میری سمجھ میں کبھی نہیں آتی۔ مثلاً ایک پک نیک کے موقع پر میں دیکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سبھی جمع ہیں اور منس بول کر وقت گزار رہے ہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ ان کی خوشی کا کون سا حصہ مادی سے اور کونسا ذہنی اور روحانی ہے؟ اس پک نیک میں ہر شخص اپنے حال میں خوش نظر آتا ہے۔ ایک بچہ نرم گھاس پر دوڑتا پھرتا ہے، دوسرا بچہ پھول چن رہا ہے۔ ماں تو اس کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لئے ہے

خوش رہنے کا مسئلہ

چچا، ایک بڑا سا سرخ سیب بڑے اطمینان سے کھا رہا ہے۔ باپ، گھاس پر دراز نیلے آسمان پر بادلوں کے گھومتے ٹکڑوں کو تنگ رہا ہے۔ دادا، بڑے اطمینان سے پائپ پی رہا ہے۔ ایک طرف کوئی گراموفون بجا رہا ہے۔ ریکارڈ کی موسیقی، دریا کی لہروں کے شور کے ساتھ کالوں میں آرہی ہے۔ ان خوشیوں، ان مزدوں میں کس کو یاد کہا جائے؟ ان میں کون سی خوشی، کونسا لطف روحانی اور ذہنی کہلائے گا، سیب یا تو س کھانے سے جو مزہ ملتا ہے اسے اس پاس کے منظر کے لطف کسی طرح اٹکایا جائے گا، اور منظر کا یہی لطف، یہی لطیف احساس وہ چیز ہے جسے ہم شاعری کہتے ہیں، کیا موسیقی سے لطف اٹھانے کو (اور یہ آرٹ کہلاتا ہے) ہم پائپ پینے کے لطف سے اعلیٰ قسم کی خوشی قرار دیں گے۔ کیونکہ پائپ پینا اور پائپ پینے سے لطف اٹھانا، ایک مادی خوشی ہے؟ — اسی لئے مادی خوشیوں، اور روحانی لطف کی یہ تمیز میرے نزدیک بے معنی اور مصنوعی ہے۔ میں سمجھتا ہوں روحانی اور مادی خوشیوں کا یہ امتیاز ایک جھوٹے فلسفے کی پیداوار ہے۔ جس کے مطابق روح کو جسم سے الگ ایک چیز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تقسیم، انسان کی حقیقی مسرتوں کے گہرائے اور سچے مطالعے پر مبنی نہیں ہے۔

ممکن ہے میرا نظریہ ٹھیک نہ ہو۔ اور پھر آپ یہ پوچھ بیٹھیں کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے؟ — میں زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی سے صحیح طور پر لطف اٹھایا جائے۔ اس کی وجہ نہ پوچھئے گا۔ یہ مقصد اس لئے زندگی کا مقصد اور چینی کا مدعا ہے کہ بس ہے اب "مقصد" اور "مدعا" کے لفظ بھی، شاید ٹھیک نہیں ہیں کیونکہ "مقصد" ایک شعوری چیز ہوتی ہے، حالانکہ میرا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے سلسلے میں یہ ہمارا، آپ کا "قدتی رویہ" ہونا چاہئے کہ

زندگی کی نعمتیں

زندگی سے لطف اٹھایا جائے۔ مقصد کا لفظ بڑی منصوبہ بندی اور بڑی جدوجہد ظاہر کرتا ہے۔ اور اس دنیا میں جو شخص پیدا ہوتا ہے اس کے سامنے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہوتا کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے کوشش شروع کر دے۔ اس کے سامنے تو یہ سوال ہوتا ہے کہ اسے پچاس ساٹھ برس کی جو زندگی ملی ہے۔ اس میں وہ کیا کرے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ایسی ترتیب و تہذیب کرے کہ اسے زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں نصیب ہو سکیں۔ یہ اپنی جگہ ایک عملی مسئلہ ہے یہ اس طرح کا کوئی ما بعد الطبیعیاتی سوال نہیں کہ اس کائنات میں انسانی زندگی کا روحانی مقصد کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں جو فلسفی زندگی کے مقصد کا مسئلہ حل کرنے کیلئے ہیں وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی کا واقعی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ مغربی فلسفیوں نے اس سوال کو دنیا بھر کے ذہن پر سوار کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ محض دنیا سے ہوتا ہے کہ ہم زندگی کے لئے ایک مقصد اور لائحہ عمل فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ہم ہمیشہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس میں الجھنے رہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے ہیں لیکن اسے سمجھنے سے عاری رہتے ہیں۔ اسی سے متا چلتا ہے کہ یہ سوال فضول ہے اور بالکل بے مصرف بھی۔ اگر زندگی کا کوئی مقصد ہوتا تو اسے سمجھنا، اس کا پتا چلانا اور اس کا یقین کرنا، اتنا مشکل نہ ہوتا۔ یہ مقصد اتنا مبہم اور غیر لفظی ہرگز نہ ہوتا۔

یہ سوال دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ کیا خدا نے کوئی روحانی مقصد انسانیت کے لئے قرار دیا ہے؟ یا کیا انسانیت کو خود اپنے لئے کوئی مقصد معین؟

خوش رہنے کا مسئلہ

کرنا چاہتے ہیں، جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔ کیوں کہ اول تو یہ سوال اپنی نوعیت کے لحاظ سے ٹھیک نہیں، اور اس معاملے میں ہم جو کچھ خود سوچنے میں۔ اسے خدا کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے لئے یہ ممکن نہیں کہ خدائی ذہن کو سمجھ سکے۔ اس قسم کی دلیل بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کو بھی اتنا تنگ نظر بنا دکھاتے ہیں جتنے ہم خود میں ہم قرار دے لیتے ہیں کہ خدا نے صرف ہمارے لئے فلاں مقصد قرار دیا ہے۔ اس قسم کا مقصد بھلا ہمارا خدا، باقی دنیا کے لئے کیوں قرار دے گا۔ کیونکہ وہ تمہارا خدا ہے! —

اب اس سوال کے دوسرے حصے کو لیجئے — سوال کی صورت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے، یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے! اس سوال کے قالب میں ہر شخص اپنے نظریے اور اپنی تدریس ڈھالتا رہتا ہے۔ چونکہ ہماری تدریس ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے اس سوال پر لڑائی جھگڑا پیدا ہوتے ہیں۔ میں اس سوال کا صرف عملی پہلو پیش کرتا ہوں۔ اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ ضروری نہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد اور مفہوم ہو۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین کہتا ہے کہ جو کچھ میں ہوں اور جس طرح ہوں، ٹھیک ہوں! — میں عرض کروں گا کہ یہی کافی ہے کہ میں زندہ ہوں، اور غالباً میں تمیں برس اور جیوں گا۔ یہی کافی ہے کہ انسانی زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر پیش نظریہ حقیقت ہو تو انسانی زندگی کے مقصد کا سارا سوال بڑا سادہ بن جاتا ہے۔ اور اس کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ زندگی سے پوری طرح لطف اٹھایا جائے! اور کوئی جواب ممکن ہی نہیں! —

زندگی کی نعمتیں

عجیب بات یہ ہے کہ انسان کی خوشی اور غمی کے سوال پر غیر مسیحی مفکرین تو صدیوں سوچتے رہے ہیں مگر مسیحی مفکرین نے اس سوال سے ہمیشہ پہلو تہی کی ہے۔
مسیحی مفکرین

یعنی دنیاویات کے عالموں کو انسانی مسرت کے سوال

سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ وہ انسان کی "نجات" کے بارے میں سوچا کرتے ہیں اور "نجات" میرے نزدیک بڑا المناک لفظ ہے۔ گویا اس دنیا سے صحیح سالم اٹھنے کا سوال تو ان کے نزدیک اہم ہے یہ سوال ہرگز اہم نہیں کہ اس دنیا میں زندہ کیسے رہا جائے۔ مگر "نجات" کی فکر اسے ہوتی چاہیے جو یہ جانتا ہو کہ بتا ہی اور بر باد ہی اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ چنانچہ دنیاویات کے یہ ماہر انسان کے مستقبل کے بارے میں صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ نجات پانے کی صورت میں وہ جنت میں جائے گا۔ یہ جنت کیسی ہوگی؟ کوئی واضح طور پر نہیں بتا سکا۔ اس جنت میں انسان کیا کرے گا؟ وہاں اس کا جی کیسے بیلے گا اور وہ کیسے خوش رہ سکے گا؟ اس کے بارے میں اور بھی حکم اور گول باتیں ہیں کہ دن رات ہر جنتی حمد گایا کرے گا اور اسے پہننے کو سفید ہشتی چلے ملیں گے۔ جیسا تہوں کے برعکس مسلمانوں میں کم سے کم جنت کا ایک واضح تصور ضرور ملتا ہے کہ اس میں شراب ظہور ہوگی، میوے ہوں گے، اور حوریں ہوں گی۔ یہ باتیں ہم عام آدمی آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں۔ گویا جب تک جنت اور مرنے کے بعد کی زندگی کی تصویر بڑی واضح طور پر پیش نہ کی جائے، ہمیں وہاں جانے کی کوشش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور نہ یہ خیال پایا ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کی اچھی بھلی زندگی کو چھوڑ کر ایک نامعلوم جنت میں جانے کی کوشش کرتے پھریں۔ کسی نے کہا ہے کہ آج ایک انڈیا جانا غلط ہے، کل کی مرنی

خوش رہنے کا مسد

کا انتظار کون کرے گا! — پھر جنت کی زندگی کے بارے میں دل میں طرح طرح کے
 سوال پیدا ہوتے ہیں: کیا ہمیں جنت میں جدوجہد اور کوشش کی زندگی بسر کرنی
 پڑے گی؟ مگر ہم تو پہلے ہی کامل انسان بن چکے ہوں گے، پھر جدوجہد کر کے ترقی
 کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو پھر کیا جنت کی زندگی محض بے کاری اور
 مکمل فارغ البالی کی زندگی ہے؟ — اگر واقعی یہ بات ہے تو پھر ہمیں اپنی ابدی
 زندگی کے لئے ہمیں اسی زندگی میں بے کار رہنا اور کامل بننا بھی سیکھنا چاہئے؟
 کائنات کے بارے میں اگر کچھ سوچنا ہی مقصود ہے تو آئیے، ہم اپنے آپ کو
 بھول جائیں اور کائنات کو انسانی زندگی تک محدود نہ سمجھیں، کائنات کے تصور
 میں ذرا وسعت پیدا کریں اور کائنات میں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز کے مقصد پر غور
 کریں۔ ان میں پہاڑ، پتھر، درخت اور جانور، کبھی آجائیں گے، ہیں سمجھتا ہوں۔ ساری
 مخلوقات میں ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی مقام مخصوص ہے۔ اس مقام کے
 تعین کے بعد ہم ساری تخلیق کا مدعا سمجھ سکتے ہیں اور اس کائنات میں اپنے مقام کو
 بھی جان سکتے ہیں۔ فطرت کے بارے میں یہ نقطہ نظر اور فطرت میں اپنے مقام کا تعین
 دونوں فطرت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جیتے جی ہم اس فطرت کا لازمی حصہ ہوتے
 ہیں اور مگر ہم اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ فطرت کے بارے میں نقطہ نظر قائم کرنے میں
 فلکیات، طبقات، الارض کا علم، حیاتیات اور تاریخ ہماری کافی مدد کرتی ہیں۔
 ہمیں صرف یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ بڑھ بڑھ کر ہانک نہ ماریں اور غلط سلسلے نتیجے نہ
 نکالیں۔ اگر تخلیق کائنات کے اس اندازے میں انسان کا مقام کچھ کم نظر آتا ہو تو کوئی
 فکر کی بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کائنات میں اس کا کوئی اپنا مقام تو ہے
 اور اگر وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے زندگی بسر کرے گا۔

زندگی کی نعمتیں

تو وہ انسانی زندگی کے بارے میں بھی ایک قابل عمل اور قابل قبول نظریہ قائم کر سکے گا۔

۲۔ انسانی مسرت

انسان کی ساری خوشیاں جسمانی ہیں۔ یہ بات بالکل سائنسی ہے۔ وضاحت کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ انسانی مسرتیں انسان کے حواس سے تعلق رکھتی ہیں۔ ممکن ہے روحانیت کے علم بردار میرا مطلب غلط سمجھیں کیونکہ مادہ پرست اور روحانیت کے علم بردار ہمیشہ سے ایک دوسرے کی بات کا غلط مطلب سمجھتے رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کے الفاظ و کنایات میں بڑا فرق ہے۔ اگر وہ ایک ہی ذخیرہ الفاظ سے کام لیں تو کبھی مطلب مختلف ہوتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم روحانیت کے علم برداروں کی باتوں میں آجائیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ اصلی خوشی، روحانی خوشی کا نام ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ انسانی خوشی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان کا ہاضمہ ٹھیک کام کرتا رہے۔ اس موقع پر میں اپنی سند میں ایک مشہور امریکی کالج کے فاضل پریڈیڈنٹ کا قول پیش کرتا ہوں۔ وہ نئے طلبہ کی ہر جماعت سے کہا کرتے تھے: آپ لوگوں کو دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو آپ کو انجیل کی باتاعدہ تلاوت کرنی چاہیے اور دوسرا اپنا پیٹ صاف رکھنا چاہیے۔ یہ قول بڑی دانش مندی پر مبنی ہے۔ اس میں بڑا تجربہ اور بڑی زندہ دلی جھلکتی ہے۔ اگر پیٹ ٹھیک کام کرتا رہے تو آدمی خوش رہتا ہے اور اگر ہاضمہ کا فعل درست نہ رہے تو زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ بس سو باتوں کی

انسانی مسرت

ایک بات یہی ہے۔

آئیے، خالی باتوں اور نظری بھٹ کو چھوڑ کر، حقائق سے کام لیں اور یہ جائزہ لیں کہ ہم اپنی زندگی کے کن لمحات کو پر مسرت لمحات کہتے ہیں۔ ہماری دنیا ایسی ہے کہ خوشی بڑی حد تک ایک منفی چیز ہے۔ یعنی اگر عزم نہ ہو تو سمجھئے خوشی نہیں پشیمانی یا خلش نہ ہو تو سمجھئے خوشی نہیں۔ کوئی جسمانی بیماری نہ ہو تو سمجھئے خوشی نہیں۔

مگر مسرت منفی کے بجائے ٹھوس اور مثبت چیز بھی ہو سکتی ہے۔ مسرت کی اس صورت کو ہم عیش کا نام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے نزدیک، زندگی کے پر مسرت لمحات یہ ہیں: میں صبح کو رات بھر کی گہری اور صحت مند نیند کے بعد اٹھ سکوں۔ صبح کی ہلکی، عطر بیز ہوا سونگھوں، اس سے پھلپھلپھلے میں تو انانی آتی محسوس ہو اور جی چاہے کہ خوب سینہ پھللا کر، لمبے لمبے سانس لوں۔ ان لمبے سانسوں سے سینے کے رگ پھٹوں اور کھال میں عجیب طرح کی سنسنی محسوس ہوتی ہے اور کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا خوشی کے لمحات وہ ہیں جب میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی کرسی پر رکھ لیتا ہوں اور اپنا پائپ عہہ تمباکو سے بھر کر پینا شروع کر دیتا ہوں۔ اور تمباکو آہستہ آہستہ جلتا جاتا ہے۔ وہ لمحہ بھی خوشی کا لمحہ ہے کہ میں گریبا کی سخت دوپہر میں سفر کر رہا ہوں اور حلق میں پیاس کے مارے کانٹے پڑ گئے ہیں، بیکایک میں کھنڈے پانی کا ایک چشمہ دیکھتا ہوں، اس کی لہروں کا شور میرے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ قریب پہنچ کر میں بوٹ بھرا ہوا اتار کر اس پانی میں اپنے پاؤں لٹکا دیتا ہوں۔ میرے لئے خوشی کا لمحہ وہ بھی ہے جب میں رات کا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہوں۔ کوئی ناپسندیدہ شخص میرے پاس نہیں ہوتا۔ ادھر ادھر کی گپ شپ شروع ہوتی ہے اور باتیں، نامعلوم منزل کی طرف ہی چلی جاتی ہیں۔

زندگی کی نعمتیں

میرے لئے وہ لمحات بھی مسرت کے لمحات ہوتے ہیں جو گرما کی سہ پہر کو کالے
کالے بادل افق پر امنڈتے دیکھتا ہوں اور مجھے پتا ہوتا ہے کہ بس اب کوئی دیر
چھاچوں پانی برسنے لگے گا۔ میں غوراً گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں اور گھر سے دور جا کر
کھیتوں میں بارش کا استقبال کرتا ہوں۔ پھر میں خوب بھیگ کر گھر لوٹتا ہوں، اور گھر
والوں سے کہتا ہوں، کیا کروں چھانا لینا بھول گیا تھا۔ راستے میں بارش نے
آ لیا۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا اتنی ہی دشوار ہے کہ مجھے اپنے بچوں سے جسمانی طور
پر محبت ہے یا روحانی طور پر۔ یہ محبت ان کی ننھی ننھی آوازوں، بھولی بھالی باتوں
کی بدولت ہے یا ان کے نازک اور صحت مند جسموں کی بدولت میرے دل میں موجزن
ہے۔ میں اس طرح یہ امتیاز بھی نہیں کر سکا کہ ذہنی مسرتیں کونسی ہیں اور جسمانی کونسی۔
رض کیجئے آپ کسی حسین لڑکی کو چاہتے ہیں کیا آپ اس کی خوبوں، اس کے محاسن،
کا تجزیہ کر سکیں گے؟ کیا آپ..... کہہ سکیں گے کہ آپ کو اس کے تبسم کی ادائند
ہے یا آپ اس کی ہنسی پر مرتے ہیں یا اس کے سر کو جھکنے کی ادا آپ کے دل میں
کھب گئی ہے؟ یا یہ کہ دنیا کی ہر چیز کے بارے میں وہ لڑکی ایک خاص نقطہ نظر
رکھتی ہے جو آپ کو دل سے پسند ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ تجزیہ اور امتیاز ناممکن ہے
ایک مثال اور نیچے ہر لڑکی اچھے اچھے کپڑے پہن کر خوش ہوتی ہے۔ ہونٹوں اور
گالوں پر سرخی لگا کر اسے گونہ اطمینان ہوتا ہے اور اس احساس سے اس کے
دل میں اعتماد بھری مسرت جاگتی ہے کہ میں اچھے لباس میں ملبوس ہوں۔ یہ خوشی،
اور یہ اطمینان، ایک لڑکی کے لئے بڑی قطعی اور حقیقی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ
اس مسرت کے بارے میں روحانیت پرستوں کو کچھ پتا نہیں ہوتا۔ فانی انسانوں کی

انسانی مسرت

وجود گوشت پوست سے ہے۔ اس لئے جسم اور روح کے درمیان امتیاز کا پردہ
 بڑا اہلکا اور لطیف ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روح کی دنیا لطیف جذبات اور
 صن کے احساس کی دنیا ہے۔ مگر اس دنیا کے دروازے ہمارے حواس ہیں۔ ہم
 اپنے حواس کے ذریعے سے ہی روح کی دنیا تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہماری زندگی میں
 چھوٹے، سننے اور دیکھنے کے حواس کی اپنی مستقل جگہ ہے۔ حواس اور اخلاق یا
 بداخلاقیت میں باہم کوئی رشتہ نہیں۔ جب ہمارے حواس کند ہو جاتے ہیں، یا ہم پوری
 طرح ان سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں تو زندگی کے مزے اٹھانے کی صلاحیت بھی
 ہم میں کم ہو جاتی ہے۔

ذرا مشرق و مغرب کے ان لوگوں پر نظر ڈالئے جو زندگی کے شیدائی تھے۔
 اور جنہوں نے زندگی کے مزے اٹھائے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہ لمحات بھی موجود
 ہیں جو ان کی زندگی کے پر مسرت لمحات تھے۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مسرت کے
 یہ لمحات، سننے، سونگھنے اور دیکھنے کے حواس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ امریکی
 ناول نگار، تھوریو کی ایک تحریر سب سے پہلے پیش کرتا ہوں۔ مسرت کا یہ لمحہ، جھینگروں
 اور پیمپوں کے نغمے سن کر تھوریو کی زندگی میں آیا تھا۔

”پہلے جھینگروں کی ہلکی سیٹیاں سننے جو چٹانوں میں سے آرہی ہیں۔
 مجھے اکیلے جھینگرا کا نغمہ زیادہ پسند ہے۔ اس سے کچھ ایسا پتا چلتا ہے کہ
 بہت وقت گزر چکا ہے، اس سے کچھ ایسا پتا چلتا ہے کہ وقت ابدیت
 سے ہم کنار ہو گیا ہے۔ اس سے پختگی پختگی ہے۔ وہ پختگی جو دانش منی
 پیدا ہوتی ہے، جو دنیاوی کردہات سے بلند ہے۔ جو زمانے کے بدلنے
 سے ماورا ہے۔ اس نغمے میں وہی پختگی ہے۔ جو خزاں میں ہوتی ہے کبوتر

زندگی کی نعمتیں

خزاں میں نہ تو بہار کی چلبلاہٹ ہوتی ہے نہ گرمیوں کی گرم بازاری
 جھینگروں کا نغمہ پرندوں سے گویا یہ کہتا ہے "تم یوں بولتے ہو جیسے
 جذباتی بچے بولتے ہیں۔ قدرت تمہارے لہجوں کے ذریعے سے پنا اظہار
 کرتی ہے۔ مگر ہم جھینگروں کا علم اور ہماری دانش پختہ تر ہے۔ موسم کا
 تلون ہمارے لئے کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ موسموں کو ہم اپنی بوریوں سے سلالتے
 ہیں۔ اسی لئے یہ جھینگر، سدا گھاس کی چڑوں میں چھپے چھپے اپنا نغمہ
 الاپتے رہتے ہیں جہاں وہ ہیں، جنت وہیں ہے۔ گرمیوں، سردیوں، کیا نہیں
 کیا اکتوبر نومبر میں، ان کی نغمہ سرائی کا یہی عالم رہتا ہے۔ ان کا نغمہ سیر ہے
 اس میں نثر کی سی پختہ مقامی اور سلامت روی ہے۔ یہ جھینگر صرف ششمنجم کا ہاؤ
 پی کو مد ہوش ہوتے ہیں۔ محض موسم کی امنگ انہیں گانے پر مجبور نہیں کرتی نہ
 موسم کا تقاضا ان کے دلوں میں محبت کا جوش پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ان کا نغمہ
 تو جس خدائے برتر کی حمد ہے، اس کا شکر ادا ہے۔ وہ موسم کے انقلاب سے
 الگ رہتے ہیں۔ ان کا نغمہ اتنا ہی ابدی اور تبدیلوں سے اتنا ہی بلند
 ہے جتنی سچائی اور اذنی حقیقت ہر تبدیلی سے بلند ہوتی ہے۔ اسی
 لئے انسان صرف گیان کے طحوں میں ہی، جھینگروں کا نغمہ سنتا ہے۔
 یہ کانوں میں رس گھلنے کی ایک جھلک تھی۔ اب ذرا سو گھننے اور دیکھنے کے
 حواس کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔ یہ امریکہ کا مشہور آزادہ شاعر والٹ وٹمین ہے۔ ذرا
 ملاحظہ ہو کہ شامہ اور دید نے روحانی لطافتوں میں کیا حصہ لیا ہے

صبح کو برفباری کا طوفان آیا۔ یہ طوفان دن بھر جاری رہا۔ مگر میں
 دو گھنٹے اپنی راہوں اور اپنی درختوں کے جھنڈ میں حسبِ سابق گھومتا رہا۔

انسانی مسرت

اور برف گرتی رہی۔ برفباری کے وقت نہوا بند تھی، مگر چیرٹ کے بلند جھنڈوں کی
سرلی گنگناہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ نقشہ بار سرگوشیاں بڑی واضح اور عجیب
سی تھیں، جیسے چھوٹے چھوٹے آبشار کبھی گرنے لگیں کبھی دم بخود ہو کر رک جائیں؛
سارے حواس پر آسودگی چھائی ہوئی تھی۔ دیدہ شامہ، سامعہ لطافتوں میں
ڈوبے ہوئے تھے۔ برف کے گالے جہاں گرتے تھے وہیں سو جاتے تھے
کبھی سدا بہار جھاڑیوں پر اور کبھی گھاس پر۔ ان گنت پتے اور شاخیں
مفید برف کے مرغوبوں سے لد گئی تھیں، جن کی جدولوں پر ترمویں جاتے
تھے۔ سنہری پتھریلوں والے سیدھے اونچے چیرٹ کے درخت ستونوں کی مانند کھڑے
تھے۔ ہوا میں برف کی باس کے ساتھ چیرٹوں اور دیو دار کی خوشبو رچی ہوئی تھی،
(دنیا کی ہر چیز کی باس اپنی ہے، برف کی بھی اپنی باس ہوتی ہے، اگر آپ
اُسے پہچان سکیں، ہر جگہ کی خوشبو اپنی ہوتی ہے۔ دو گھڑیوں کی خوشبو بھی
مختلف ہوگی، دوپہر کی باس، آدھی رات کی باس سے مختلف ہوگی، سردی
کی خوشبو، گرمی کی خوشبو سے الگ ہوگی۔ آندھیوں کی ایک گھڑی کی باس
ایک سنان طے کی بوباس سے بہت زیادہ مختلف ہوگی؟)

ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو سرما اور گرما، دوپہر اور آدھی رات اور پر شور اور سناں
لمحوں کی بوباس میں یہ امتیاز کر پاتے گے؟ یہی وجہ ہے کہ انسان کھلی فضا کی بہ نسبت
شہروں میں زیادہ ناخوش رہتا ہے۔ کیونکہ شہروں میں دیدہ شامہ کے یہ امتیازات اتنے
 واضح نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا امتیاز شہر کے سنگین در دیوار اور سمنیٹ کی سڑکوں کی بدو
 بڑی حد تک مٹ جاتا ہے۔

خوشی کے لمحات کی خصوصیات کے سلسلے میں چینی اور امریکی ذہنوں میں بڑی

زندگی کی نعمتیں

مماثلت پانی جاتی ہے۔ میں آپ کے سامنے پہلے تو امریکی شاعر والٹ وٹمین سے ایک اور اقتباس پیش کرتا ہوں، اس کے بعد میں ایک چینی دانشور کے بتائے ہوئے خوشی کے ۳۲ لمحات بیان کروں گا۔ ان سے آپ کو امریکی اور چینی طبائع کی یکسانیت کا اندازہ ہوگا۔ پہلے والٹ وٹمین کا ارشاد ملاحظہ ہو:

مطلع صاف ہے اور موسم بڑا اچھا بڑا کرارا ہے۔ آکسین سے لہری ہوئی خشک اور نرم رو ہوائیں چل رہی ہیں۔ میرے گرد قدرت کا اعجاز پھیلا ہوا ہے۔ یہ اعجاز میرے رگ و پے میں رچا جا رہا ہے، مجھ پر پھیلا جا رہا ہے۔ یہ درختوں اور پانی، گھاس اور سورج کی روشنی اور ہلکی سی کہر کا اعجاز ہے۔ مگر آج میں دن بھر زیادہ تر قدرت کے سب سے بڑے اعجاز، آسمان کو تکتا رہا ہوں۔ آسمان کی رنگت بڑی ہلکی بڑی شفاف نیلا ہٹ لٹے ہے جو صرف خزاں میں نظر آتی ہے کہیں کہیں ابر کے چھوٹے بڑے سفید ٹکڑے ہیں۔ جو آسمان کی عظیم قوس پر اپنی خاموش اور لطیف حرکت کا عکس چھوڑتے ہیں۔ دن کے پہلے حصے میں کوئی سات بجے سے اچھے تک، آسمان کی نیلا ہٹ بڑی خالص اور اچلی تھی۔ دوپہر ہونے کے ساتھ رنگت ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور کوئی دو تین گھنٹے تک کافی اچلی کئی تھی ہے۔ کافی سفید نظر آتی ہے۔ پھر سورج کے غروب تک آسمان کا رنگ پیلا سا پڑ جاتا ہے اور غروب آفتاب کو اب میں درخت کے ایک جھنڈ میں سے دیکھتا ہوں۔ درختوں کی شاخوں میں سے غروب آفتاب کی روشنی چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔ اس میں آگ کے شعلے ہیں، ہلکے پیلے رنگ کا گلزار کھلا ہے، خون کی ترمزی دھاریاں ہیں اور پانی پر، چاندی کی سیال چمک بچھ گئی ہے۔ سائے

انسانی مسرت

شفاف ہیں، روشنی کی برچھیاں چمک رہی ہیں، اُجلیے اور گہرے رنگوں کا ایک ایسا طلسم سامنے ہے، جو آج تک کسی تصویر میں کسی حدود میں گرفتار نہیں ہو سکا۔

میں نہیں جانتا کہ کیوں اور کس طرح یہ سکون میری زندگی میں در آیا لیکن خیال ہے کہ انہی آسمانوں کی وجہ سے (کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ آسمان کو میں ہر روز دیکھتا ہوں۔ پھر بھی یوں لگتا ہے کہ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں!) اس خزاں کے موسم میں بڑے سکون پر ورلے میں نے گزارے ہیں۔ ان لمحات کو میں مسرتوں سے بھر پور لمحات کہوں گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مشہور ڈانی شاعر لارڈ بارن نے اپنی موت سے پہلے ایک دوست سے کہا تھا کہ میں نے ساری زندگی میں خوشی کے صرف تین لمحے دیکھے ہیں۔ جب جنگل میں پیڑوں کے جھنڈ میں سے میں نے غروب آفتاب کا منظر دیکھا تو مجھے بارن کا خیال آیا۔ پھر یکا یک یہ خیال میرے دماغ میں اگوندے کی طرح لپکا کر میری زندگی کا یہ لمحہ مسرت سے کتنا بھر پور ہے! میں اپنے اچھے لمحات کو کبھی تحریر میں نہیں لاتا، میں سوچتا ہوں ان لمحات کا جاودہ قلم اٹھانے کی بڑبڑاٹ لٹ جائے گا۔ میں اپنے آپ کو مسرت کی لہر کے جوالے کر دیتا ہوں میں خوشی کی موجوں پر بیٹا ہوتا ہوں۔ جہاں چاہیں وہ موجیں مجھے لے جائیں! تو پھر مسرت ہے کیا؟ کیا یہ ایسا ہی ایک لمحہ ہے؟ کیا ایسے ہی لمحے مسرت کے لمحے کہلاتے ہیں؟ یہ لمحے جو پلک بھیکتے ہیں ایک برق پاکفیت کے ساتھ گذر بھی جاتے ہیں؟ — میں نہیں جانتا میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں کہہ سکتا، اس لئے میں بے یقینی اور شبہ کا فائدہ اٹھاتا ہوں

ترندگی کی نعمتیں

اور ان نیلے آسمانوں سے پوچھتا ہوں — کیا تمہاری نیلی گہرائیاں مجھ ایسے
 بیمار کے ہر درد کا درماں بن سکتی ہیں؟ (ہائے پہلے نین برس میں میرا جسم اور
 میری روح کن مہیبتوں کے بھنور میں رہے ہیں) اور کیا تمہاری نیلی
 گہرائیاں میرے درد کا درماں لطیف ہواؤں کے قالب سے امرت اس
 کی طرح مجھ پر چمکائے جا رہی ہیں؟

والطوبیٰ

۳۔ مسرت کے مسلمات

اور اب میں آپ کے سامنے ان مسلمات کا بیان پیش کرتا ہوں جو ایک چینی فلسفی
 کے پر مسرت مسلمات ہیں۔ ان مسلمات کا تعین 'چن تنگ تان' نے کیا ہے چن ستر صویں ،
 صدی میں چینی ادب کا مشہور اثر پرست نقا و مانا جاتا ہے۔ مسرت کی ان گھڑیوں کا
 بیان اس نے ڈمارہ "معزنی گھر" کی تفسیر میں کیا ہے۔ یہ لمحے اس نے ایک دفعہ اپنے
 ایک دوست کے ساتھ بیٹھ کر معین کئے تھے۔ جب چن اور اس کا دوست
 دونوں سخت برسات کی وجہ سے ایک مندر میں دس دن تک پناہ لینے پر مجبور ہو گئے
 تھے — خوشی کی یہ ۳۳ گھڑیاں وہ ہیں۔ جن میں انسان کی روح 'اس کے حواس کے
 ساتھ پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ ہوتی ہے۔

۵۔ جون کا ایک گرم دن ہے سورج گویا سوانیزے پر چمک رہا
 ہے۔ ہوا کا کہیں ایک جھونکا تک نہیں اور تاحہ نظر بادلوں کا کوئی نام نشان
 نہیں۔ گھروں کے آنگن بھٹی کی طرح تپ رہے ہیں۔ اور پتے آسمان

انسانی مسرت

پر کوئی پروندہ تک نظر نہیں آتا۔ میرا سارا بدن پیچھے میں دوڑا ہوا ہے میرے سامنے دو پہر کا کھانا رکھا ہے۔ مگر مارے گرمی کے تھم نہیں اٹھایا جاتا میں زمین پر ایک چٹائی بچھا کر لیٹ جاتا ہوں۔ مگر بہت جلد چٹائی پسینے سے تہتر ہو جاتی ہے۔ لکھیاں تنگ کرنے لگتی ہیں۔ وہ میری ناک پر بار بار ٹھٹھتی ہیں اور اڑائے نہیں اڑتیں۔ میں گرمی کے مارے بے میں ہو رہا ہوں۔ یکایک رعد کا کڑکا ہوتا ہے اور سارے آسمان پر کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ ابر سیاہ یوں گھر کر آتا ہے۔ جیسے شکر لڑائی کے تھے ہڈے آتے ہوں۔ پھر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ سلاخوں کا رینہ کے جھلے برسنے لگتے ہیں۔ پسینے رک جاتے ہیں، زمین کی چھپا ہٹ دور ہو جاتی ہے۔ ساری لکھیاں بھاگ کر کہیں چھپ جاتی ہیں اور میں اٹھ کر کھانا (چاول) کھاتا ہوں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔ ایک دوست سے دس برس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یکایک وہ ایک شام کو میرے گھر آ جاتا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں اور اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ نہیں پوچھتا کہ بھیا تم کشتی سے آئے یا خشکی کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے۔ میں اسے یہ بھی نہیں کہتا کہ پلنگ پر ٹھجھو یا آرام کر سہی پر نیم دراز ہو جاؤ۔ میں کچھ کہے سنے بغیر فوراً اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی سے بڑی لجاجت سے کہتا ہوں: ایک گیلن شراب کی ضرورت ہے! وہ چپ چاپ اپنی سونے کی جڑاؤ پن مجھے دیدیتی ہے۔ تاکہ میں اسے بیچ کر شراب لے آؤں۔ اور میں دل ہی دل میں حساب لگانا ہوں کہ اس پن کی بیچ کر جو رقم ملے گی، وہ میں تک چل جائے گی۔ کیا یہ مسرت

کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ میں ایک خالی کمرے میں تنہا بیٹھا ہوں میرے ہاتھ کے سرھانے دوسرے کمرے میں کوئی چوہا کتر کتر کر رہا ہے۔ میں ہنچھلا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں یہ کھڑا کیسی ہے؟ یہ چوہا میری کوئی چیز کو کترے ڈالتا ہے؟ کوئی کتار کتر رہا ہے؟ میری سب ان سخت نصیب میں ہے۔ کچھ کتے بن نہیں پڑتا۔ ایک بڑی توخواری نظر آتی ہے جو دم ہلاتی ہوئی ایک طرف نظریں جھارتی ہے۔ میں اپنی سانس تک روک لیتا ہوں اور چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں۔ یکایک ایک ہلکی سی چیخ کے بعد چوہے کی آواز ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو جاتی ہے؟ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ میں نے اپنے مطالعے کے کمرے کے سامنے آگے ہونے دو بجار پٹر اکھاڑ دئے ہیں۔ ان کی جگہ میں نے کیلے کے پندہ سیس لہلہاتے پودے لگا دئے ہیں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ بہار کی ایک رات میں اپنے رومانی مزاج کے ایک دوست کے ساتھ لب جو تبار بیٹھا پی رہا ہوں۔ نقشہ زیادہ نہیں، نہ کہ سے نیم خموی کا عالم ہے۔ پیانا بن بھی نہیں ہو سکتا اور پیتے جانا بھی مشکل ہے۔ میرا ایک بھہراؤ کر فوراً اس سے پیٹا ختم لانا ہے۔ میں پیٹا چھوڑ کر، پیٹا ختم شروع کر دیتا ہوں۔ گندھک کی تیز بو میرے تھنوں میں گھستی ہے اور دماغ میں پتھر پھانسی ہے۔ سا با بدن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اور عجیب سی راحت محسوس ہوتی ہے کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ میں بازار میں جا رہا ہوں۔ دو آدمیوں کو دیکھتا ہوں کہ

انسانی مسرت

لال پیلی ہو کر ایک دوسرے سے اٹھے پڑتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں غصے کی چمک لہرا رہی ہے گویا وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ وہ گالی گلوچ سے تو کام نہیں لے رہے، لیکن تمیز داری اور آپ جناب کرتے کرتے ایک دوسرے کو کیوں اور کیسے کے پھر میں ڈال رہی ہیں۔ لفظوں کا ایک دریا ہے کہ اندھا آٹا ہے۔ یکایک ایک طرف سے ایک پہلو ان نما شخص آتا ہے اور دونوں کو بڑے طنطنے سے کہتا ہے: "جانے ہو یا لگاؤں دو دو"۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ اپنے بچوں کو ادب کے شر پارے بڑی روانی سے پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ ان کی تھی آواز میں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے ایک صراحی سے برابر پانی نکل رہا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ کھانا کھانے کے بعد فارغ وقت میں میں دکانوں کی سیر کرتا ہوں، پیریں دیکھتا ہوں۔ کوئی تھپی سی چیز مجھے بہت پسند آجاتی ہے۔ دکاندار سے مول تول پر تکرار ہوتی ہے قیمت کی معمولی سی کمی پیشی پر بحث ہوتی ہے۔ مگر دکاندار قیمت کم کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ پھر میں اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی چیز نکالتا ہوں جو قیمت کے فرق کے برابر ہوتی ہے اور اسے دکاندار کو پیش کرتا ہوں۔ دکاندار مسکرا دیتا ہے اور آداب بجا لاکر کہتا ہے: "آپ تو یہی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟"

۵ کھانا کھانے کے بعد فارغ وقت میں میں اپنا ٹرنک کھولتا ہوں اور پرانی چیزیں الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ چند کاغذ کے پرزے ایک کونے میں ہیں۔ یہ کچھ پر و نوٹ ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند

زندگی کی نعمتیں

لوگ میرے خاندان کے مفروض ہیں۔ ان مفروض لوگوں میں سے کچھ مر چکے ہیں، کچھ زندہ ہیں۔ مگر کوئی ایسا نہیں جو ہمارا دوسرا دوسرا لوٹا دے گا۔ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں میں ان کا غم کو جمع کر کے آگ دکھا دیتا ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ ڈھیر چل جاتا ہے اور اس کا دھواں بھی ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ باقی نہیں رہتا۔
کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ بھری گرمیوں کا ایک دن ہے۔ میں بنگے پاؤں بنگے سر باہر نکلتا ہوں کہ رہٹ چلائے والوں کا لوک گیت سنوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ رہٹ کے چکر پر ٹھنڈا پانی، سیال چاندی کی طرح گھلتی ہوئی برف کی طرح گھوم رہا ہے اور نوجوان گیت گارہے ہیں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ صبح اٹھتا ہوں تو گھر میں کسی کو آہیں بھرتے اور یہ کہتے سنتا ہوں کہ کوئی مر گیا ہے۔ میں جلدی سے پوچھتا ہوں کہ کون مر گیا؟ دل بیت ڈر ہوتا ہے کہ اپنا ہی کوئی عزیز وفات نہ پا گیا ہو۔ پتا چلتا ہے کہ فلاں عالم فاضل فوت ہو گیا ہے۔ جی کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ صبح سویرے اٹھتا ہوں اور دیکھتا ہوں گرمیوں کی اس صبح کو کچھ لوگ ایک چھپرے کے نیچے ایک لمبے بانس کو چیر کر اس سے پانی کا پائپ بنا رہے ہیں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ ایک رات ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں کسی کو اپنی یاد کرتے

سن رہا ہوں۔ اگلے دن میں اس دوست سے ملنے جانا ہوں۔ مگرے میں داخل ہو کر میں دیکھتا ہوں کہ میرا دوست میز پر بیٹھا جنوب کی طرف منہ کئے ایک دستاویز کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ سر ہلا کر سلام کرتا ہے اور میری

انسانی ستر

استین کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیتا ہے پھر کتاب ہے: اب آگے ہو تو یہ دیکھو۔
 ہم دونوں ہنس پڑتے ہیں پھر باتیں شروع ہوتی ہیں
 باتیں جاری رہتی ہیں حتیٰ کہ دیواروں پر سے سائے جاتے رہتے ہیں وہ
 بھوک محسوس کرتا ہے اور چیکے کی گچ سے پوچھتا ہے: کیوں کچھ کھاؤ گے؟
 — کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟ —

۵ — سارا مہینہ بارش ہوتی رہی ہے۔ صبح ہونے کو آتی ہے۔
 میں بستر میں یوں لیٹا ہوں جیسے پی رطوبت ہے یا بیمار ہوں۔ اٹھنے کو جی نہیں
 چاہتا۔ یکایک پرندے چھپانے لگتے ہیں۔ مطلع ضرور صاف ہو گیا ہو گا کہ
 پر وہ کھینچ کر کھڑکی کھول دیتا ہوں جو بے صورت دھوپ ہر طرف چمک رہی ہے۔
 جنگل بنایا دھویا کھڑا ہے — کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — میرا مکان بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر اتفاق ہوا
 کہ غیر متوقع طور پر ایک جگہ سے کچھ رقم میرے ہاتھ آئی۔ اور میں نے نکالنی
 تعمیر شروع کر دی۔ اس دن کے بعد سے ہر صبح اور ہر شام مجھے کہا جاتا تھا
 کہ مجھے مزید عمارتی لکڑی اور پتھر اور اینٹیں اور چونا اور کیل کا نٹا خریدنا ہے
 ورنہ عمارت مکمل نہیں ہوگی۔ مجھے روپیے کی مزید ضرورت تھی۔ میں نے اس
 مکان کی خاطر ہر جگہ سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار تو میں،
 ہمت ہا بیٹھا کہ شاید یہ گھر کبھی نہیں بن سکے گا۔ مگر ایک دن یہ مکان مکمل ہو جاتا
 ہے، دیواروں پر سفیدی پھر جاتی ہے، زرش دھل دھلا کر صاف تھکرے ہو
 جاتے ہیں اور دیواروں پر رنگین تصویروں لٹکا دی جاتی ہیں۔ سائے عمارت مزید
 جا چکے ہیں اور پھر میرے دوست آتے ہیں اور اس نئے گھر میں بیٹھ جاتے

زندگی کی نعمتیں

ہیں — کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — سرماکی ایک رات میں پی رہا ہوں۔ بیکایک محسوس ہوتا ہے کہ رات بے حد سرد ہو گئی ہے، کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں کہ برف گر رہی ہے اور تین چار اونچ برف زمین پر پڑی ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — میں گرماکی ایک پتی ہوئی سپر کو ایک بڑا شہیدی تر بوتل بڑے تیز چاقو سے کٹا کٹ کاٹ رہا ہوں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — مدت سے آرزو ہے کہ بھکشو بن جاؤں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بھکشو کو گوشت کھانے کی ممانعت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے مجھے بھکشو بننے کی اجازت مل گئی ہے؛ اور میں سب کے سامنے گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔ اب میں فوراً گرم پانی کا ایک تسلا لے کر بیٹھ گیا ہوں اور گرما کے ایک مہینے میں میں نے اپنا سر خود نیز استرے سے موٹا ڈالا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — مجھے پرانے بٹنک یا الماری کے کونے میں کسی دوست

کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط مل جاتا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — جسم کے پوشیدہ حصے پر ایگزیمیا کے چند دھبے ہیں۔ کبھی

کبھی انہیں چھیل دیا جاتا ہے اور پھر غسل خانے میں بند ہو کر انہیں دھو ڈھا کر

دوانگادھی جاتی ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵ — — ایک غریب یا ادیب یا عالم مجھ سے قرض مانگنے آتا ہے۔

مگر مانگتے ہوئے چکچکاتا ہے۔ اس لئے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں

دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ مضطرب سا ہے۔ میں اسے انگ ہو کر پوچھتا ہوں: کیوں

انسانی مسرت

بھائی کتنے روپے چاہئیں آپ کو، اور پھر میں اس کی مطلوبہ رقم اسے دیدیتا ہوں اور کہتا ہوں: اتنی جلدی گھر جا کر بھی کیا کیجئے گا، کچھ پی لیجئے۔ کیا یہ مسرت کا لہو نہیں؟

۵۔ میں ایک چھوٹی ٹی کی کشتی میں بیٹھا ہوں۔ ہوا کا رخ ہمارے موافق ہے۔ مگر ہماری کشتی میں کوئی بادبان نہیں۔ اس لئے تیز نہیں چل سکتی۔ یکایک ایک بڑی بادبانی کشتی نمودار ہوتی ہے جو ہواؤں کے رخ پر برف کی تیزی سے چلی جا رہی ہے۔ میں اپنا رسا پھینکتا ہوں کہ اس بڑی کشتی سے اپنی چھوٹی کشتی باندھ لوں۔ رستے کا ہک غیر متوقع طور پر بڑی کشتی کے لنگر کے ساتھ پھنس جاتا ہے اور چلاری کشتی اس بڑی کشتی کے ساتھ بندرہ جاتی ہے اور تیز تیز کھینچنے لگتی ہے۔ میں خوشی کے مارے، ملاحوں کا ایک گیت گانے لگتا ہوں۔ اور سب لوگ خوشی سے تمٹمانے لگتے ہیں۔ کیا یہ مسرت

کا لہو نہیں؟

۵۔ مجھے مکان کی تلاش ہے، مگر کوئی مناسب مکان نہیں ملتا۔ پھر ایک دن ایک شخص آکر بتاتا ہے کہ فلاں جگہ ایک مکان خالی ہے جس میں کوئی درجن بھر کمرے ہیں۔ مکان بلب دریا واقع ہے اور اس کے اوگرو چاروں طرف سرسبز و رخت ہیں۔ میں اسے کہتا ہوں کہ کھانا کھا کر مکان دیکھتے چلیں گے۔ مکان کے پاس پہنچ کر میں دیکھتا ہوں کہ مکان بڑا خوبصورت ہے اور چاروں طرف کافی زمین خالی پڑی ہے۔ جہاں سبزی، ترکاری اور ترپوہ فروزے اگائے جاسکتے ہیں! میں کہتا ہوں! اچھا مکان کے ساتھ آئندہ سبزیوں کی بچھا کوئی وقت نہ ہوگی۔ کیا یہ مسرت کا لہو نہیں؟

زندگی کی نعمتیں

۵۔ ایک مسافر بے سفر کے بعد وطن لوٹتا ہے۔ شہر کے دروازے

پر پہنچ کر وہ اپنے شہر کے مانوس چہرے، عورتیں اور بچے دیکھتا ہے۔ ان عورتوں، مردوں اور بچوں کو اپنی زبان میں باتیں کرتے ہوئے سنا ہے کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔ چینی کا کوئی خوبصورت برتن ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے

مرمت کرنے اور جوڑنے کی کوئی صورت نہیں۔ اسے دیکھ دیکھ کر اذرا فیک ہوتا ہے کہ اتنا اچھا برتن ضائع ہو گیا۔ آخر میں سوچتا ہوں کہ جب یہ برتن اب ٹھیک نہیں ہو سکتا تو اس کے بارے میں یہ روز کا دکھ کیوں ہوں۔ میں یہ ٹوٹا ہوا برتن باورچی کے حوالے کرتا ہوں اور کہتا ہوں یہ برتن پھر میرے سامنے کبھی نہ آئے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔ میں دلی نہیں، اس لئے مجھ سے گناہ بھی سرزد ہوتے ہیں

رات کو کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ میں صبح اٹھ کر سخت بے چین اور فرسند محسوس کرتا ہوں۔ بیکار ایک مجھے بدھمت کی تعلیم یاد آتی ہے کہ گناہوں کی پردہ پوشی نہ کرنا بھی تو بہ کے برابر ہے۔ میں فوراً اپنے ہم صحبت لوگوں کو اپنے گناہ کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ اس میں دوست اور اجنبی کا فرق نہیں کرتا۔ میرا دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔ میں ایک خوش ذہن کو ایک فسطونے حروف کھنڈے دیکھ

رہا ہوں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔ کھڑکی کھول کر میں نے ایک پھڑک کو کرے سے باہر نکال

دیا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

زندگی کی نعمتیں

۵۔۔۔ شہر کا حاکم منادی کر دیتا ہے کہ آج ہر شہری خوشی کے شادیاں بچائے گا اور جشن عام میں حصہ لے گا۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ پتنگ اڑ رہے ہیں۔ آپ نے کسی کا پتنگ کاٹ دیا ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ دور کسی جنگل میں آگ لگی ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ آپ اپنے تمام قرض اتار کر سبک دوش ہو گئے ہیں۔

کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

۵۔۔۔ آپ اس شخص کی کہانی سن رہے ہیں جس نے دو حجرت

کرنے والوں کے سلاپ کی راہ نکالی۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

مسرت کے ان ۲۲ لمحوں کا اندازہ کیجئے اور پچھارے شاعر بارن کا خیال کیجئے جس کی زندگی میں مسرت کے صرف نین لمحے آتے تھے۔ میرا خیال ہے یا تو وہ بے حد بیمار ذہن کا آدمی تھا یا پھر اس زمانے کے فیشن کے مطابق خواہ مخواہ عملگین اور افسردہ بنتا تھا۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ کم سے کم اپنی زندگی کے تین ایسے موقعوں کا اقرار کرتا۔ جو مسرت اور طمانیت سے بھرپور تھے۔

مسرت کے مندرجہ بالا موقعوں سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زندگی واقعی ایک جنت کا نام ہے جو ہمارے لطف اور مزوں کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ یہ مسرتیں صرف انسانی حواس کے ذریعے سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اور اس لئے ہمیں یہ موقع بھی حاصل ہونا ہے کہ ہم ان مسرتوں کے بارے میں واضح طور پر اقرار کر لیں۔ — مجھے یہ

زندگی کی نعمتیں

شک ہے کہ ہم اس دنیا کی مسترتوں سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دنیا جو اس کی لذتوں کا نام ہے اور ہمارے روحانیت پرستوں نے ہمیں جو اس کی مسترتوں کا لطف اٹھانے سے بہت زیادہ ڈرا رکھا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک اعلیٰ قسم کا فلسفہ ہمیں اپنے جسم کی لذت انگیز صلاحیتوں سے پھر روشناس کرائے، ان صلاحیتوں پر ہمارا اعتقاد اور اعتماد پختہ کرے اور جو اس کے ذروں کی ہم حقارت کی نظروں سے نہ دیکھیں، ان سے ڈرنا بھی چھوڑ دیں۔ دردِ تیاگ کے مبلغوں کو چاہئے کہ ہمیں مادہ پرستی کا عنصر فنا کر کے ہمارے جسموں کو محض روح بنا دیں۔ ہمارے جسم کے اعصاب، ذائقہ، اور شامہ کی حیثیت باقی نہ رہنے دیں۔ بنگوں کا انہیاز کرنے سے ہماری آنکھیں اندھی ہو جائیں، حرکت اور لمس سے ہمارے جسموں کو کوئی واسطہ نہ رہے۔ اور پھر ہم بھی ہندو سیراگیوں کی طرح اپنے جسم کو عذاب دے دے کر اسے مار سکیں۔ مگر یہ کہاں ممکن ہے؟ اس لئے یہ نہیں تو پھر ہم جو کچھ ہیں اس طرح رہنا ہمارے لئے بہتر ہے۔ کیونکہ صرف وہی فلسفہ ہمیں سچی خوشی کی راہ سمجھا سکتا ہے جو حقائق سے واسطہ رکھتا ہو۔ کیونکہ صرف حقائق سے واسطہ رکھنے والا فلسفہ ہی صحت من اور معقول فلسفہ ہوا کرتا ہے۔

۳۔ مادہ پرستی — چند غلط فہمیاں

پہلی فصل میں زندگی کے پرسترت لمحات کا بیان آپ نے دیکھ لیا۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ حقیقی زندگی میں ذہنی اور جسمانی خوشیاں ایک دوسرے سے گہرے طور پر منسلک ہوتی ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہے۔ ذہنی

مادہ پرستی

یا روحانی خوشیاں صرف اسی صورت میں حقیقی خوشیاں ہوتی ہیں۔ جب انہیں جسم کے ذریعے سے محسوس کیا جاسکے۔ میں تو اخلاقی مسرتوں کو بھی انہی میں شامل کروں گا۔ کیونکہ یہ بھی جسم کے ذریعے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک بات نکل آئی ہے۔ جو شخص کسی عقیدے یا نقطہ نظر کی تعلیم دے، اسے اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ لوگ اس کی باتوں کا غلط مطلب سمجھیں گے۔ عیش پرستی کا فلسفہ کبھی یونانیوں میں مقبول تھا، مگر اس کا بھی مطلب لوگوں نے غلط سمجھا، یہی حال رواتی فلسفے کا تھا۔ جس میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ نیکی کی جانے اور راحت یا الم دونوں کے احساس پر قابو پایا جائے۔ رواتی فلسفے کا تو مطلب یہ لیا گیا کہ دل کو پتھر بنا لیا جائے (حالانکہ اس فلسفے کی بنیاد دلی نیکی پر تھی!) اسی طرح ابی قورس کے نظریات سے جو دانش اور اختیار کا پتھر تھے۔ مگر عام لوگوں نے یہی سمجھا کہ بس، جی کھول کر داد عیش دینا ہی، زندگی کا مقصد ہے۔ یہی حال غالباً میرا ہوگا۔ کہ میں نے زندگی کے بارے میں بڑا مادی نظر پیش کیا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ اس نظریے میں سماجی ذمہ داری کا نام نشان نہیں۔ اور یہ کہ میں نے یہ تلقین کی ہے کہ اپنی ذات کو سب سے مقدم سمجھو اور چین کرو۔ یہ اعتراضات ناگہانی پر مبنی ہیں۔ معتبر ضمیمہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ الم اور راحت کی ہرچ سبھنے والے کا دل بھی بڑا نرم ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ زندگی کے شدیدائی کا مزاج کتنا نرم اور کتنا اچھا ہونا چاہئے! وہ نہیں جانتے کہ سارے انسانوں سے محبت کرنے کی تعلیم دینے کے لئے اگر ویلیس وینی پٹریں، اگر اسے ایک عقیدہ اور مذہبی فریضہ بنا دیا جائے تو ساری بات بیکار ہو جاتی ہے جس محبت کو ویلیوں کا سہارا لینا پڑے وہ کبھی مخلصانہ اور سچی نہیں ہو سکتی! محبت تو بالکل قدرتی ہونی چاہئے۔ یہ اتنا ہی فطری

زندگی کی نعمتیں

جذبہ ہونا چاہیے۔ جس طرح پرتے اقدار کی طور پر ہی پر داز کیلئے اپنے پر پھر پھرتے ہیں۔ انسانیت کی محبت کا جذبہ ایک سیدھا سادہ صحت مند جذبہ ہونا چاہئے جو اپنے آپ سے اپنے آپ صحت مند انسان کے دل سے پھوٹ پڑے۔ جو شخص ہرے بھرے پڑوں سے محبت رکھتا ہو وہ کبھی جانوروں یا اپنے بھائی انسانوں پر ظلم نہیں کر سکتا کیونکہ قدرت کے ساتھ ہم آہنگی ہم کو یہی سکھاتی ہے۔ ایک صحت مند روح جسے زندگی اور انسان کے بارے میں ٹھیک اور مناسب باتیں معلوم ہوں اور جو قدرت کے فیصلوں سے واقف ہو، ہمیشہ رحم سے بھر پور ہوگی کیونکہ لطف و کرم اس کا قدرتی حصہ ہوگا۔ روح کو ان الطاف و عنایات کے لئے کسی تعلیم یا مذہبی عقیدے یا فلسفے کی ضرورت نہیں۔ جس شخص کی روح جسمانی حواس کے ذریعے سے مناسب تربیت اور تہذیب پاتی ہے اور جو شخص مصنوعی زندگی اور انسانی سماج کے مصنوعی علم سے کچھ کچھ الگ تھلگ رہے صرف وہی شخص ذہنی اور اخلاقی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔ مادہ پرستی کو بڑا غلط سمجھا گیا ہے۔ بہت زیادہ غلط سمجھا گیا ہے۔ میں اس سلسلے میں موجودہ دور کے زبردست فلسفی جارج سنٹیانا کو اپنا ترجمان بنانا ہوں۔ جو اپنے آپ کو مادہ پرست کہتے ہیں۔ اور یہ فرار دیتے ہیں کہ شاید اس دنیا میں آخری مادہ پرست زندہ رہ گیا ہوں!۔ مگر ایک زمانہ جاتا ہے کہ جارج سنٹیانا اور حاضر کی خوبصورت ترین شخصیت ہیں۔ ان کا کہنا ہے: "ماویت کے فلسفے کے خلاف ہمارے دل میں جتنے تعصبات ہیں، وہ سب اوپری ہیں۔ اصل میں ماویت میں ہمیں کچھ ایسی خامیاں نظر آتی ہیں جو ہمارے پرانے عقائد کی رو سے زیادہ بری معلوم ہوتی ہیں اور ان خامیوں کو دیکھ کر ہمیں بڑا سخت دھکا لگتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ کسی نئے عقیدے، یا ملک یا مذہب کو باہر سے دیکھ کر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ان

سے پوری واقفیت حاصل کر کے اور ان کی روح سے ہم آہنگ ہو کر ہی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیا عقیدہ یا نیا ملک یا نیا مذہب کیسا ہے اور کیا ہے۔ میرے نزدیک مادیت میں خوشی کا عنصر مضمحل ہے۔ ایک ایسی بھرپور کیفیت شامل ہے۔ جسے ہم ظاہری طور پر نہیں دیکھ سکتے جو شخص حقیقت میں مادہ پرست ہو گا وہ زندہ دلی اور مسرت کا پیکر ہو گا۔ صرف وہی لوگ مادہ پرستی کے نقائص دیکھتے ہیں جنہیں مارے باندھے مادیت پر اعتقاد رکھنا پڑتا ہے۔ جنہیں اپنی زندگی تو بڑی خود غرضی اور اندھی مادہ پرستی میں گزارنی پڑتی ہے۔ مگر ان کا دل غیر حقیقی روحانیت کے خواب دکھتا رہتا ہے۔

جارج سنٹیانا لکھتے ہیں

”جو شخص حقیقت میں مادہ پرست ہے یعنی جس کا خمیر ہی اس عقائد سے آمٹھا یا گیا ہے۔ اور جسے طوعاً و کرہاً اس طرز زندگی کو اپنانا نہیں چاہی اور شخص فلسفی ڈیموکریٹس کے سے اعلیٰ مقام کا حقدار ہے۔ وہ مسرت اور نشاط کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ مادیت جس حسن و خوبی سے ہزاروں طلبہ تاشکیلیں اختیار کرتی ہے۔ اور جس دفور و شدت سے ہزاروں لوگوں کو جذبوں کو فروغ دیتی ہے وہ بے مثال ہیں۔ ان شکلوں کو دیکھ کر ویسی ہی ذہنی آسودگی حاصل ہونی چاہئے۔ جیسی حیاتیات کے ایک عجائب خانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جس میں ان گنت تسلیاں شیشے کے بکسوں میں رکھی گئی ہوں۔ اور جھینگا مچھلی سے لے کر گوریلا بندر بانگ کے پیکر جہاں محفوظ رکھے گئے ہوں مادیت ایک صحت مند جسم میں عمل اور عزم کے جذبات بیدار کرتی ہے۔ ان جذبات میں خود غرضی نہیں ہوتی بلکہ خود غرضی کی انگلیں حقارت اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔“

ماریتہ کے ساتھ جو اخلاقی نظام وابستہ ہے وہ ذہنی روح خلوق کی حقیقی مصیبتوں اور دکھوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ بلکہ دوسرے عمدہ اخلاقی نظاموں کی طرح یہ نظام بھی انسانی دکھ درد پر اٹک فٹاں ہے۔ غم کی تحقیر صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو دنیا پسندی کو یوتا بنا کر اسے پوجتے رہتے ہیں۔ انسان کی خود پسندی اور خود پختا سے کئی ایک خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسان اپنی لفاظی کی بدولت اپنے آپکو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ کل کائنات کا مرکز اور محور وہی ہے۔ اس خود پرستی کا علاج صرف یہ ہے کہ اس پر مہنسا چلے۔ مہنسی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی ہمدردی اور مفاہمت کا بڑا رنگ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی حاکمتوں پر ہم مہنس سکتے ہیں ان کی نیتوں یا ان کے افعال کا ہم مذاق نہیں اڑاتے۔ اس لئے اس مشرت حاصل کرنے کا راز یہ ہے کہ اسے معقولیت کی حد میں حاصل کیا جائے۔

(جارج سنٹیانا نااز "ایک مادہ پرست کے جذبات")

تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذہنی زندگی یا روحانی زندگی کیا چیز ہے جسے ہم اتنے ثنا خواں رہتے ہیں۔ اور جسے ہم حواس سے بھر پور زندگی پر ترجیح دینے کے عادی ہیں۔ آج کل حیاتیات کا علم بہت کچھ ترقی کر چکا ہے۔ اور حیاتیات میں بتاتی ہے کہ روح۔ جسم کے رگ پٹھوں کچھ رطوبتوں اور کچھ اعصاب کا ایک مجموعہ ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ رہائیت ہمارے اعصاب کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ تو پھر یہ ذہنی زندگی کہاں سے بھوٹتی ہے؟ اس کا وجود کس چیز سے ہے۔ اور اس کی غذا کیا ہے؟

فلسفیوں کا ایک مدت سے یہ خیال رہا ہے کہ سارا انسانی علم جو اس کے تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اگر لمس اور دیکھنے اور سننے کے حواس نہ ہوں تو اسے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیسے کوئی کیمرا محض بٹری سے اور فلم کے بغیر تصویر لے ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ کسی تیز فہم شخص اور کنز ذہن شخص میں یہ فرق ہوتا ہے کہ تیز فہم شخص کے وجود میں زیادہ طاقت کے محض بٹری لگے ہیں اور دیکھنے اور امتیاز کے عکس کو محفوظ کرنے کا سامان بہتر نوعیت کا ہے۔ اسی لئے اشیاء کا عکس اس کے دماغ میں بہتر طور پر آتا ہے۔ اور تا دیر قائم رہتا ہے۔ یہ تجربے اور مشاہدے کا ذکر تھا۔ اب کتابی علم کو لیجئے۔ جب کتابی علم کو زندگی کے علم کے ساتھ مطابقت دیکھنے لگے گی۔ تو اس وقت صرف غور و فکر یا تطابق ہی کا نام نہیں آسکتا۔ زندگی میں ہمیں اپنا راستہ ٹھول ٹھول کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ماحول کو اسی صورت میں دیکھنا پڑتا ہے۔ جس صورت میں وہ ہے۔ زندگی میں جو ان گنت باتیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ملتی ہیں ان کے بارے میں ایک صحیح اندازہ ذہن میں قائم کرنا پڑتا ہے۔ انسانی زندگی اور انسان کی فطرت کے حقائق کو الگ الگ غیر مربوط طور پر نہیں بلکہ کل کی حیثیت سے ان کا ایک خاکہ اور جائزہ لینا پڑتا ہے۔ گویا زندگی کے بارے میں ایک اندازہ اور جائزہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور زندگی کا تجربہ کرنے میں ہمارے تمام حواس ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرتے ہیں۔ حواس کے اسی تعاون اور دل کے ساتھ دماغ کے مل کر کام کرنے سے ہی ہم میں ذہنی گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی گرمی زندگی کی دلیل ہے۔ اسی طرح انسان میں زندگی کی دلیل یہی ہے۔ جس طرح پودوں کی زندگی کی دلیل ان کی سرسبزی ہے۔ کسی ایسے پودے کو دیکھتے ہیں پر شروع ہی میں کوئی آفت آگئی۔ اب اس کے پھلنے پھولنے کا اندازہ اسی بات

سے کیا جلے گا کہ اس کے پتوں اور نئی کوئی نپوں میں جنری کا نشان ملتے ہیں یا نہیں اس کی چھال اور شاخیں سبز ہی اور نم سے بہ رہی ہیں یا نہیں۔ یہی حال ہمارے خیالات کا ہے۔ اگر ان میں گرمی اور سچائی ہے تو ہم زندہ ہیں ورنہ نہیں۔

۵ ذہنی یا روحانی مسرت

آئیے اب ذہن اور روح کی مفروضہ مسرتوں پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ مسرتیں کس حد تک ہمارے حواس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور ان کا ہمارے ذہن سے کتنا۔ اور کیا واسطہ ہے؟

وہ اعلیٰ روحانی خوشیاں کیا ہیں۔ جنہیں ہم اپنے حواس کی ادنیٰ قسم کی مسرتوں سے الگ قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ بھی حواس کی مسرتوں کا ہی ایک حصہ نہیں؟ کیا یہ روحانی مسرتیں حواس کی مسرتوں سے نہیں پھوٹتی۔ اور کیا ان کا منہ ہوتا انسانی حواس نہیں؟ کیا یہ روحانی مسرتیں حواس سے الگ کی بھی جاسکتی ہیں؟

انسانی ذہن کی اعلیٰ مسرتیں عام طور پر آدب۔ آرٹ۔ موسیقی۔ مذہب اور فلسفہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسرتوں کی پیدائش میں ذہن انسانی کا اتنا ہاتھ نہیں۔ ان کا تمام تر واسطہ انسان کے حواس اور انسان کے جذبات سے ہے۔ آرٹ کو لیجئے۔ تصویر آخر کیا ہے؟ یہی نا کہ کسی قدرتی تھارے یا کسی شبیہ کا نام تصویر ہے۔ اور یہ تصویر کسی سچے سچے قدرتی منظر یا کسی حسین چہرے کی یاد ہمارے لئے تازہ کر دیتی ہے۔ اور ادب کیا ہے ادب بھی ہر کچھ زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ زندگی کا ماحول۔ آب و ہوا۔

وادی کی خوشبو یا شہر کی تیز بو لفظوں میں ہمارے لئے محفوظ کرتا ہے۔ ہم نے خود یہ معیار قائم کیا ہے۔ ہم خود کہتے ہیں کہ اچھا ناول وہی ہے جو حقیقی کردار اور حقیقی جذبات کی عکاسی کرے۔ یہ عکاسی جس قدر واقعیت کے قریب ہوگی اتنا ہی وہ ناول عمدہ سمجھا جائے گا۔ جو کتاب ہمیں انسانی زندگی سے دور لے جائے یا بڑی سردہری سے کسی واقعے کا تجزیہ پیش کر دے۔ وہ ادبی کارنامہ نہیں کہلاتی۔ جو کتاب انسانی لحاظ سے سچی ہوگی۔ واقعیت سے قریب تر ہوگی صرف اسی کو ہم اچھا ادب پارہ کہیں گے۔ جو ناول کرداروں کے بے جان اور سرد تجربے پر اکتفا کریگا جس میں زندگی کا آپ درنگ نہیں ہوگا۔ اُسے کون پڑھے گا۔

باقی ذہنی مسرتوں کو لیجئے تو شاعری سب سے پہلے آتی ہے۔ شاعری ایک ایسی حقیقت ہے جسے جذبات کا رنگ دیا جاتا ہے۔ موسیقی بے لفظ جذبات کا نام ہے اور مذہب ایسی دانش و حکمت کا نام ہے جسے تخیلی رنگ میں پیش کیا جائے۔ تصویروں کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ انسان دیکھ سکتا ہے۔ اور رنگوں میں تمیز کر سکی صلاحیت رکھتا ہے۔ شعر کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان آوازوں میں تمیز کر سکتا ہے اور آہنگ اور لہ کا احساس رکھتا ہے۔ جذباتی سچائی اس کے علاوہ ہے جو اسے انسان کے لئے مرغوب بناتی ہے۔ موسیقی کا حال یہ ہے کہ موسیقی خالص جذبہ ہی جذبہ ہے جسے زبان اور الفاظ کی ضرورت قطعی طور پر نہیں۔ اور الفاظ اور زبان کا تعلق صرف ذہن سے ہوتا ہے گویا سوتلی پر ذہن کا اختیار ہی نہیں۔ موسیقی میں یہ قدرت ہے کہ ہمارے لئے پرندوں کا نغمہ پھیلی منڈی کا بے ہنگم شور با۔ میدان جنگ کا روح فرسا غوغا۔ جو چاہے پیش کر دے۔ بلکہ موسیقی تو بھولوں کی نزاکت۔ موبوں کی آہستہ خرامی اور چاندنی رات کا سن بھی سروں میں ظاہر کر سکتی ہے۔ گویا موسیقی کا اول و آخر جو اس انسانی ہیں۔ اور وہ موسیقی

جو اس کی حدود سے نکل کر کسی فلسفیانہ خیال کو ظاہر کرنے کا ٹیرا اٹھائے گی تو سمجھ لیجئے کہ موسیقی نہیں رہی۔ بلکہ ایک زوال پذیر ذہن کا گھٹیا تجربہ بن کر رہ گئی۔ اور بس۔

اب مذہب کی طرف آئیے۔ مذہب میں خرابیوں اور زوال کا آغاز اسی دن سے ہوا۔ جب سے انسانی منطق نے مذہب میں دخل دیا۔ جارج سنٹیانا نے کہا ہے۔ مذہب کے زوال کا باعث یہ ہے کہ مذہبی مطالبوں میں بہت زیادہ منطقی دلیل ماری شروع کر دی گئی۔ چنانچہ مذہب دانش و حکمت کی بلندیوں سے اتر کر محض ادغام کا ایسا مجموعہ بن گیا جس میں ہر طرف دلیلوں کا بھر مار تھی۔ اصل میں مذہب کے زوال کا باعث یہ ہے کہ نظریہ پرستی نے مذہب کی آڑ لی۔ کسی قسم کی فرقہ بندیوں پر تیس عقائد اور رسوم کا زور ہوا۔ اصول اور احکام کا انبیا جمع ہو گیا۔ اور ہر بات کا جواز اور عذر گھڑا جانے لگا۔ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ انسان جوں جوں اپنے عقیدوں کو عقل کا تابع بناتا ہے اور ان کے لئے عقلی جواز تراشتا ہے۔ اس میں تقویٰ و پرہیزگاری اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ دلیلوں کے چکر میں گھنسیں کر اپنے آپ کو حق پر سمجھنے لگتا ہے اسی خود بینی کی بنا پر کوئی مذہب مذہب نہیں رہتا۔ بلکہ ایک تنگ نظر فرقہ پرستی بن جاتا ہے۔ جس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ سچائی صرف اسی نے منکشف کی ہے۔ باقی سب کی راہ غلط ہے۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ہم اپنے عقیدوں کے لئے جس قدر جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتنے ہی تنگ نظر اور کوتاہ اندیش ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب عام طور پر سخت گریں تنگ خیالی اور انفرادی زندگی میں شدید خود غرضی کا قالب اختیار کرتا ہے۔ گویا ایسا مذہب انسان کی خود غرضی کو بہرہ ران پر مانتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے دل میں وہ ضرورتوں

کئی وقت کوئی جگہ نہیں رہنے دیتا۔ تعصب کی بنا پر اس شخص کے دل میں رحمت نہیں رہتی۔ مذہب اس صورت میں فرد اور خدا کے مابین ذاتی سووے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ذاتی قسم کے سووے میں ایک فریق (خدا) کو دوسرا فریق (فرد) عظمت کی بلندیوں پر چڑھاتا ہے۔ اس کی حد کے ترانے گاتا ہے اور ہر ممکن موقع پر اس کا نام لیتا ہے۔ اس کے جواب میں پہلا فریق (خدا) دوسرے فریق (فرد) کو اوروں کے مقابلے میں برکت و سعادت بخشتا ہے۔ دوسروں کے خاندانوں کے مقابلے میں اس فرد کے خاندان کو زیادہ سرفراز کرتا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس چیز کو عرف عام میں مذہب کہا جاتا ہے۔ وہ خود غرضی کا ایک قالب ہے۔ اور جو لوگ بڑے دیندار بنتے ہیں خود غرضی انکی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ یہ نام نہاد مذہب انسان میں اپنے آپ کو راہ حق پر ثابت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ہر انسان سمجھتا ہے کہ صرف میں نے ہی کمالی کا حقیقی راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ باقی سب لوگ گمراہ ہیں۔ اس جذبہ کی بدولت انسان کے سارے لطیف جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل میں مذہب کی آرا انسان کے اعلیٰ اور لطیف جذبات پر ہوا کرتی ہے۔

✓ میرے نزدیک آرٹ شاعری اور مذہب کا وجود محض اس لئے ہوتا ہے کہ یہ انسان میں بصیرت پیدا کریں۔ اس کے جذبات میں حُسن پیدا کریں۔ اور اس میں زندگی کا صحیح جذبہ پیدا کریں۔ عمر زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے خواہش شعور اور احساسات ہر رفتہ رفتہ بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ ہمارے جذبات دکھوں اور بے انصافی اور ظالم کے سلسلے میں بے درد اور بے پردہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مکروہات کی بدولت زندگی کے بارے میں ہماری بصیرت باندھتی

جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے درمیان کچھ شاعر اور کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جن کے احساس کو زندگی کند نہیں کر سکتی۔ جن کے جذبات مردہ نہیں ہوتے جن کی بصیرت اور ادراک ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا یہ فرض ہے کہ ہمارے ضمیر کی آواز بن جائیں۔ ہمارے شعور و ادراک کو آئینہ دکھائیں۔ ہمارے کند اھباب کی تازگی کا سامان کریں۔ گویا آرٹ کو یہ چاہئے کہ وہ ہمارے مفلوج جذبات ہمارے نیم مردہ خیالات اور ہماری مصنوعی زندگی کے خلاف ہمیں متنبہ کرے۔ انکا مذاق اڑائے ان کی زندہ ہجو بن جائے۔ آرٹ ہمیں تصنع و تکلف سے دبی ہوئی دنیا میں بے تکلفی اور آرازدہ روی سکھاتا ہے۔ آرٹ کا یہ فرض ہے کہ ہماری زندگی میں صحت مندی اور معقولیت پیدا کرے۔ اور حد سے بڑھی ہوئی ذہنی اور دماغی سرگرمیوں نے ہمیں جس بنجار اور نہ بیان سے دوچار کر رکھا ہے اس سے ہمیں نجات دلوائے۔ آرٹ کا یہ فرض ہے کہ ہمارے احساسات کی دہار کو تیز کرے، ہماری عقل اور ہماری نظرت کے درمیان توازن کا نانا پھر سے قائم کرے اور ہماری بکھری ہوئی منتشر زندگی کے برباد حصوں کو جمع کر کے ایک بار پھر اس زندگی کو مکمل صورت دے۔ آرٹ کا یہ فرض ہے کہ انسان کی اصلی فطرت سے اسے بھرپور نشان کرے۔ آرٹ کے بغیر تو ہماری دنیا کا حال یہ ہے کہ علم کا ماتا سمجھ بوجھ اور عرفان سے ٹوٹ چکا ہے۔ تنقید نہ تو صحیح اندازہ سے کوئی واسطہ رکھتی ہے نہ بصیرت سے جس موجود ہے مگر محبت عنقا ہے سچائی سامنے ہے مگر جذبات کی گہرائی اور شدت کا کہیں تپہ نہیں نیکی کا رحم سے کوئی تعلق نہیں تمیز داری موجود ہے۔ مگر دل کے خلوص کا نشان نہیں ملتا۔ آپ ہی الفاظ کہئے کہ کیا دنیا ہے۔ اب تک مذہب۔ شاعری اور آرٹ پر بات ہو رہی تھی۔ اب میں یا راج کی سرگرمیوں کی آخری منزل آتی ہے۔ جسے فلسفہ کہا جاتا ہے۔ فلسفہ دہن نشانی

کی سب سے ادنیٰ سرگرمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر فلسفہ کے سلسلہ میں اس بات کا بہت زیادہ
 خطرہ ہے کہ خشک بحثوں میں الجھ کر فلسفے والے زندگی سے دور ہو جاتے ہیں۔ مسلمان
 کہتا ہوں کہ ممکن ہے یہ ویسی ہی مسرت ہو جو ریاضی کے کسی مشکل سوال کو حل کرنے کے بعد
 یا کائنات میں کسی نظام کی کار فرمائی کا احساس کر کے محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ ذہنی
 مسرت کچھ ایسی دقیق نہیں۔ اصل میں اس قسم کی ذہنی مسرت ہماری دماغی مصروفیت
 کا ایک شاخا نہ ہے۔ اور بس۔ اس کا مزہ اس لئے آتا ہے۔ کہ اس پر کچھ خرچ نہیں آتا
 یہ صفت ہی میں ہاتھ آتی ہے۔ یہ مسرت دوسرے ضروری کاموں کی اہم حیثیت
 نہیں رکھتی۔ یہ اسی قسم کی آسودگی اور اطمینان کی ایک اہم ہے جو ہمیں ایک سحر حل کرنے
 کے بعد محسوس ہوا کرتی ہے۔ اس میں ایک اور بھی خطرہ ہے۔ اس قسم کی ذہنی مسرتوں
 میں بڑے فلسفی لوگ ذہنی اڑانوں کے قائل بن جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ
 چونکہ ہم نے کائنات میں ایک نظام کے وجود کا کھوج لگا لیا ہے۔ لہذا اس کائنات
 میں منطقی طور پر بڑی تکمیل اور ترتیب ہونی چاہئے۔ حالانکہ حقیقت اس کے عین برعکس
 ہوا کرتی ہے۔ یہ ذہنی اڑانیں حقیقت کا ایک جھوٹا عکس ہیں۔ ہم لوگ ستاروں
 کی تصویر بناتے وقت پانچ کونے والی ایک شکل بنا دیا کرتے ہیں۔ یہ عین بعین
 دیا ہی ایک فارمولا۔ اور ویسی ہی ایک مصنوعی ترکیب ہے کہ حقائق کو تصنیع کا تابع
 بنا دیا جائے۔ یہ ماننا کہ تکمیل کے اس احساس کو اگر حد سے نہ بڑھنے دیا جائے۔ تو اس
 میں بڑی آسودگی ملتی ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ لاکھوں کروڑوں انسان کائنات کے
 اس فرضی نظام سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور پھر بھی ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔ تو یا اگر
 اس نظام کائنات کا شعور نہ بھی ہو تو بھی زندگی کٹ سکتی ہے۔ اسی لئے میں کسی ریاضی
 والے بات کر کے اتنا خوش نہیں ہوتا لیکن ایک معمولی خادمہ سے بات کر کے میری

طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اس سیدھی سادھی خامدہ کی باتیں زیادہ فطری ہوتی ہیں اس کے الفاظ میں زیادہ جان ہوتی ہے۔ اس کے تہمتوں میں زندگی کی حرارت زیادہ ملتی ہے۔ اسی لئے اس سے باتیں کر کے مجھے انسانی فطرت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اسی لئے میں مادہ پرست ہوں اور شعر کی یہ نسبت مجھے ہوتے گوشت کو ترجیح دیتا ہوں۔ فلسفہ کے مقابلے میں چٹپٹی چاٹ کو زیادہ مرغوب جانتا ہوں۔

فلسفہ نے زندگی میں جو باہمی پن پیدا کیا ہے اس سے نجات اسی صورت میں ممکن ہے کہ جیسے کو سوچنے پر زیادہ ترجیح دی جائے۔ صرف اسی صورت میں ہم وہ تازگی وہ فطری انداز اور وہ بصیرت ایک بار پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ میں نظر آتی ہے بچے کو دیکھ کر ہر وہ شخص جو سچا فلسفی ہے کچھ شرمسار ہو جاتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بچہ کی فلسفی اگر شیر کے بچے کو بچرے میں دیکھے تو اسے نادم ہونا چاہئے۔ قدرت نے اس بچے کو کتنا کامل بنایا ہے۔ اس کے پنچے اس کے رگ بیٹھے۔ اس کی خوبصورت کھال قدرت کے کمال کا کتنا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس کے نکیلے کان۔ اس کی چمکدار گول گول آنکھیں کس قدر خوبصورت ہیں۔ اور اس میں زندگی کا مزہ لینے کی کتنی زبردست صلاحیت موجود ہے۔ فلسفی کے لئے یہ جہانے نہایت ہے کہ خدا نے ہمیں جس حسن اور کمال طریقے پر پیدا کیا تھا۔ ہم نے اسے کس قدر نامکمل ادھورا اور ادنیٰ کر دیا ہے۔ خدا نے ہمیں ہاتھ پاؤں اور نظام جسمانی کی ایک کامل نمونہ بنایا تھا۔ اور ہم نے اپنے آپ کو کتنا گرا دیا ہے۔ کہ اب یہی فلسفی ہے کانوں سے ادنیٰ مستحکم ہے۔ آنکھوں پر مرٹے شیشوں کی عینکیں لگاتا ہے۔ اس کا ہاتھ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ اس کا دل اور ذہن دونوں ماؤن ہو چکے ہیں۔ اور اس نے زندگی کی نعمتوں اور

جینے کے لطف کا کوئی احساس ہی نہیں رہا۔ ہمیں اس قسم کے فلسفی سے کوئی کام
کی بات حال نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ تو محض تخیل اور منطق کے اندھیروں میں ٹامک
ٹوٹے مارتا رہتا ہے۔ ہمارے لئے تو وہی فلسفہ کام کا فلسفہ ہے جو شعری
سے سننے کھیلے ہم آہنگ ہو جائے۔ اور ہم میں مظاہر فطرت اور انسانی فطرت
دونوں کو سمجھے کی بصیرت اور شعور پیدا کرے۔

زندگی کے لئے مناسب وہی ہے۔ جو ہماری جبلتوں کے متوازی ہو۔
جو فلسفی مثالیت پسند ہو گا۔ بہت جلد قدرت اسکی مانگ کھینچے گی چین کے کئی
فلسفیوں کے نزدیک انسانی شرف کا تصور یہ ہے۔ کہ انسان فطرت کے ساتھ ہم آہنگی
کی زندگی گزارتا ہوا کائنات کے سب سے اونچے درجہ پر پہنچ جائے۔ وہ درجہ جو آسمان
اور زمین کے درجہ کے برابر ہے۔ چنانچہ کنفیوشس کے پوتے نے اسی درجے کو اپنے
مقالے۔ "اعتدال و توازن کا زریں راستہ" میں یوں واضح کیا ہے

"خدا نے ہمیں جو کچھ دیا اسے فطرت کہتے ہیں۔ فطرت کے بتائے ہوئے

راستہ پر چلنا تاؤ (صراطِ مستقیم) کہلاتا ہے۔ اور اس سلامت روی

کو پروان چڑھانا تقاضا ہے۔ خوشی۔ غصہ۔ غم۔ اطمینان جیتک

اظہار نہیں پاتے انسان کا نفس اصلی کہلاتے ہیں۔ جب خوشی۔ غصہ

غم اطمینان کا مناسب حد تک اظہار کیا جائے تو اسے ہم آہنگی اور

توازن کہا جاتا ہے۔ یہی نفس اصلی زندگی کی صحیح بنیاد ہے۔ اور یہی

ہم آہنگی اور توازن زندگی کا زریں راستہ ہے۔ انسان جب اپنے

نفس اصلی اور توازن کو پالیتا ہے تو زمین و آسمان۔ کائنات کی

ہر چیز میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کی نمو اور افزائش کھیلنے

راستہ کھل جاتا ہے۔ اپنے نفسِ اصلی سے آگے نکل کر سچی سمجھ بوجھ کی منزل تک پہنچنا
 فطرت کا ادراک کہلاتا ہے۔ اور سمجھ بوجھ کے راستہ سے اپنے نفسِ اصلی کا شعور حاصل
 کرنا ثقافت کہلاتا ہے۔ اسلئے جو شخص اپنے نفسِ اصلی کو پالیتا ہے وہی عرفان حاصل
 کرتا ہے۔ اور جسے عرفان حاصل ہوا وہی اپنے نفسِ اصلی کو پاسکے گا۔ جو لوگ اپنے
 نفسِ اصلی یا خودی کو پالتے ہیں صرف وہی اس دنیا میں اپنی فطرت کے تقاضوں
 کا پوری طرح حق ادا کرتے ہیں۔ اس کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اور جو اپنی فطرت کی تکمیل
 کرتے ہیں۔ وہی دوسرے انسانوں کی فطرت کو مکمل بنا سکتے ہیں۔ اور جو دوسروں
 کی فطرت کی تکمیل کر سکتے ہیں وہی عالمِ اشیاء کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور جو عالمِ اشیاء
 کی تکمیل کرتے ہیں وہی مادرِ فطرت کی مدد کر سکتے ہیں۔ کہ وہ زندگی کی نمو اور
 افزائش کرے۔ اور جو لوگ زندگی کی نمو اور افزائش میں مادرِ فطرت کا ہاتھ
 بنانے کے قابل ہیں۔ وہ ربے میں پیدا آسمان کے برابر ہیں۔»

باب ہفتم
فراغت کے منزے

- ۱ - کائنات کا دارالحدیث کن جاندار
- ۲ - فراغت کا چینی نقطہ
- ۳ - بیکاری کا ایک مسلک
- ۴ - دنیا ہی اک بہشت ہے
- ۵ - قسمت کیا ہے؟
- ۶ - تین امر کی عیوب

۱۔ کائنات کا واحد کارکن جاندار

آپ دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کی نعمتوں کا وسیع دسترخوان ہمارے سامنے پھیلا پڑا ہے۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ان نعمتوں کا مزہ چکھنے کے لئے ہم میں اشتہا اور صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اصل چیز یہی اشتہا ہے۔ نعمتوں کا نمبر اس کے بعد ہے کیونکہ انسان کے بارے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اسے کام کرنے کا بڑا جنون ہے۔ اس نے آپ پر کاموں کا بہت بڑا انبار لا کر رکھا ہے یا غالباً کاموں کا یہ انبار تہذیب نے انسان کے سپرد کر رکھا ہے انسان کے برعکس راہِ نظرت پر نظر دوڑائیے تو یہ معلوم ہو گا کہ جانداروں کی اس کائنات میں ہر چیز زراعت کے مزے لیتی ہے۔ کسی کو کچھ کام نہیں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے زندگی بسر کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی ناقابلِ فہم حد تک پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ انسان کے فرائض اور ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ڈر اور نفسیاتی دباؤ کے موقع پر زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ انگلیں اور تمناؤں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ نظرت کی بدولت نہیں انسانی معاشرے کی بدولت ہے۔ — میں یہ سطور میز پر بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ لیکن ایک کبوتر گرجے کے مینار کی برابر چکر لگا رہا ہے۔ اُسے بالکل یہ فکر نہیں کہ دوپہر کو کیا کھانے گا۔ مگر میرے لئے دوپہر کا کھانا بڑی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دوپہر کے کھانے پر جو دو چار چیزیں میں کھاؤں گا

کائنات کا واحد کارکن جاندار

۲۶۳

ان کے لئے ہزاروں آدمیوں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لئے کسی کسان سیتی باہری کے بڑے پیچیدہ طریقوں سے کام کر چکے ہوں گے۔ ہزاروں آدمیوں کو نین دین اور میو پار کرنا پڑا ہوگا۔ ہزاروں آدمیوں کو حمل و نقل میں مصروف ہونا پڑا ہوگا۔ میو گھر پر یہ چیزیں پہنچاتی پڑی ہوں گی۔ اور پھر کہیں یہ کھانا تیار ہوا ہوگا۔ اسی لئے جانوروں کی بہ نسبت انسان کے لئے خوراک حاصل کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ اس کے باوجود اگر جنگل کے کسی وحشی جانور کو شہر میں چھوڑ دیا جائے۔ اور اسے انسان کی مصروف زندگی کا اصل راز معلوم ہو جائے کہ انسان محض کھانا حاصل کرنے کے لئے اتنی مصیبت کرتا ہے تو جنگل کا یہ وحشی بھی انسانی سماج کے بارے میں بہت مشکوک رائے قائم کرے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسان اتنی تک و دو آخر کیوں کرتا ہے۔

✓ چنانچہ جنگل کے اس وحشی جانور کو سب سے پہلے یہ خیال آئے گا کہ جانداروں میں صرف انسان ہی ایسا جاندار ہے جو کام کا غلام ہے۔ چند لد و ٹھوڑوں یا سیلوں کو چھوڑ دیجئے۔ باقی پالتو جانوروں کو بھی کچھ کم کام نہیں کرنا پڑتا لیکن ملکوں میں پولیس جو کتے رکھتی ہے۔ انہیں بھی شاذ و نادر ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ پالتو کتے سے گھر کی رکھوائی کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر یہ پالتو کتا رکھوائی کی بجائے زیادہ وقت کھیل کود میں صرف کرتا ہے۔ صبح کو اگر موسم ٹھیک ہو تو یہ ضرور سوتا ہے۔ اور بلی کا تو کہا گیا ہے۔ بلی کا مزاج بھی رتیسا دہ ہے۔ اسے روٹی کے لئے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلی کو اپنی پابندی کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا قدرت نے اسکے جسم میں ایسی لچک اور طراری بھری ہے کہ اسکے لئے ہمسایہ کی دیوار پھاندا کچھ بات نہیں چنانچہ بلی جہاں چاہے گھر متی پھرتی ہے۔ اور اسے کوئی بو چھتا نہیں۔ گویا کام کی غلامی صرف انسانیت ہے جو پتھرے میں بندھی ہے اور جسے پالتو بھی بنایا گیا ہے۔ مگر جسے

مفت کا کھانا نہیں ملتا۔ بلکہ تہذیب اور معاشرے کے نہایت پیچیدہ ضابطوں نے اسے مجبور کر رکھا ہے کہ وہ پیٹ بھرنے کے لئے کام کرے اور کام کے لئے بھرگڑا رہے۔

میں مانتا ہوں کہ انسانیت کو جو فائدے حاصل ہیں وہ دوسرے جانداروں کو نہیں۔ انسان کے لئے علم کی خوشی اور باتوں کا لطف اور تحمل کی رنگا رنگی اور دید و شنید کے ہزاروں مزے موجود ہیں جو دوسرے جانداروں کو حاصل نہیں۔ پھر بھی یہ یقیناً اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ انسانی زندگی بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے اور بھٹس پیٹ بھرنے کے لئے جو کچھ انسان کو کرنا پڑتا ہے وہ انسانی سرگرمیوں کا کم و بیش نوے فیصدی حصہ ہے۔ تہذیب زیادہ تر روٹی کی تلاش کا نام ہے۔ اور ترقی یہ ہے کہ روٹی حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر انسان کے لئے روٹی حاصل کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا تو انسانیت کو اتنی سخت محنت کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی مشکل یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ ہنڈ بھونگے ہیں۔ اور اب اس مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں کہ روٹی حاصل کرنے کے لئے اس قدر محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس محنت کی وجہ سے روٹی کی اشتها بھی مرجاتی ہے۔ یہاں وہ چیز ہے کہ جنگل کے وحشی جانور اور فلسفی دونوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بات ہی کچھ سی ہے۔۔۔۔۔ جب کبھی میں کوئی شہر دیکھتا ہوں تو بھلی ہوتی چھتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دیکھ کر مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ ہر شہر کا شلگ بھگ ایک سا ہوتا ہے۔ ہر شہر کا فضائی منظر بھی ایک سا نظر آتا ہے۔ وہی شہر کے وسط دریا کی دو چار بلند ٹینکیاں کچھ گنبد۔ کچھ سیار اور چاروں طرف بھلی ہوتی چھتیں ہی چھتیں کوئی بلند کوئی پست۔ کوئی ٹیراھی بیٹھڈی۔ کہیں کہیں دو چار غلیظ سی

فیکٹریوں کی چھنیاں - نگروں کی چھتوں پر چھوٹے بڑے ریڈیو کے
ایریل کے تار ————— کہیں کہیں کپڑے سکھانے کی بڑی چھوٹی
انگلیاں اور بس۔

نیچے بازار میں دکھیں تو ہر طرف سرخ سرخ اینٹوں کی سوکھی ماری دیواریں
نظر آئیں گی۔ ہر دیوار میں ایک سی چند کھڑکیاں ہوں گی جن کے کچھ پٹ کھلے ہونگے
کچھ بند ہونگے۔ کہیں کہیں کھڑکیوں کی دہلیزوں پر سوکھے مارے پھولوں کے گٹلے
رکھے ہوں گے۔ کہیں کوئی بچہ چھت پر اٹکے گا۔ اور اگر دھوپ ہوتی تو تھوڑی
دیر آرام سے تاپتا رہے گا۔ ہر شہر اسی طرح چھتوں اور دیواروں اور کھڑکیوں کا
ایک انبار ہوگا۔ اور یہی وہ جگہیں ہیں جہاں انسان بستے ہیں۔ ہر خاندان انہی دو تین
کھڑکیوں کے پیچھے زندگی بسر کرتا ہے۔ کیسے؟ اور روٹی کمانے کے لئے یہ ان گنت
خاندان کیا کرتے ہیں۔ ہر دوسری تیسری کھڑکی کے پیچھے ہر رات مہیاں بیوی خواہگاہ
میں سولے کو جاتے ہیں۔ جس طرح ہر شام کبوتروں کا جوڑا کابک میں گھس جاتا ہے۔
صبح کو یہ جوڑا اٹھتا ہے۔ ناشتہ کرتا ہے۔ خاوند گھر سے باہر روٹی تلاش کرنے نکل جاتا
ہے۔ بی بی گھر کی صفائی میں جٹ جاتی ہے۔ چار پانچ بچے جا کر ذرا فراغت
ہوتی تو ہمسایوں سے دو باتیں کر لیں۔ اور تازہ ہوا کا کچھ مزہ لے لیا۔ ورنہ کچھ نہیں
بھر رات آجاتی ہے۔ اور مہیاں بیوی دونوں تھک جاتے ہیں اور ایک بار بھر سو جاتا
ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی ہے۔

یہ ایک عام جوڑے کی زندگی ہے۔ اس سے ذرا بہتر حال کے لوگوں کو دیکھئے یہ ذرا بہتر قسم کے
مکانوں میں رہتے ہیں۔ ان مکانوں کے کمرے نسبتاً سچے سجائے رہتے ہیں زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں
ان میں گنجائش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے انسانوں کے نزدیک رات کرنا کا مکان کرنا یہ پریشانی

عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد زندگی بھی مسرتوں سے بھر پور ہو گئی۔ یہ ماننا کہ اس طبقہ کو مالی پریشانیاں کم ہوں گی۔ ان پر قرضوں کا بار بھی کم ہو گا لیکن اس طبقے کو کہیں زیادہ جذباتی پیچیدگیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں اتنا زیادہ ہوگی۔ زیادہ بے وفا خاوند ملیں گے جو راتوں کو گھر نہیں آئیں گے۔ اس طبقے میں بہت سے جوڑے ایسے ملیں گے جو راتوں کو گھومتے پھریں گے تاکہ کوئی نہ کوئی عیاشی کسی نہ کسی لہو و لعب میں دقت گزاریں۔ اور اس عیاشی کی تلاش کو دل بہلا دکھا جائے گا۔ گویا انہیں گھردوں کی دیواروں اور کمروں سے فرش کی یکسانیت سے بیزاری ہو چکی ہے اور وہ اس بیزاری اور آکٹاہٹ کو دور کرتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ یہ جوڑے قسم قسم کے ہوٹلوں اور کلبوں میں جائیں گے۔ اور سنگی عورتوں کو دیکھیں گے۔ اس ساری فضیلت کا نتیجہ کیا ہو گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اس طبقہ میں اعصاب کی کمزوری کی شکایتیں زیادہ پیدا ہوں گی۔ زیادہ سے زیادہ اسپرین کھانی جائے گی۔ ایسی بیماریاں ملیں گی جن کا علاج بڑا مہنگا ہو گا۔ اسی طبقہ میں زیادہ لوگ قولنج اور کالی آنت کے درم اور معدہ میں مبتلا ہونگے۔ انہی لوگوں میں دماغ کمزور ہو گا۔ جگر خراب ہونگے۔ راتوں میں ناسور پیدا ہوں گے۔ معدوں کو کبھی آرام نہیں ملے گا۔ گردوں پر ناسور کا بوجھ رہے گا۔ مثانے سوزش سے ماؤف ہو جائیں گے۔ کلی بڑھ جائے گی دل پھیل جائیں گے اور اعصاب مارے تھکن اور بوجھ کے تباہ ہو جائیں گے۔ اسی طبقہ میں سینے سپاٹ ہونگے۔ خون کے دباؤ کا ہر کوئی مریض ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ ذیابیطس کی شکایتیں سنی جائیں گی۔ عرق النساء گھٹیا۔ بے خوابی کے عارضے زیادہ ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ اینڈے سائیٹس صنعہ گردہ کے مریض ہونگے۔ بواریر میں پیش۔ پرانے قبض ناسور اور دنبل کے مرض عام ہوں گے بھوک کسی کو نہیں ملے گی زندگی

سے ہر کوئی نالاں ہوگا۔ ہر کوئی مرنے کا آرزو مند ہوگا۔ اور یہ تصویر یوں مکمل ہوگی کہ اسی بد نصیب طبقہ کے لوگوں کے یہاں بچے تو کم ہوں گے۔ لیکن کتے زیادہ ملیں گے۔ گویا مسرت کا دار و مدار محض ان عورتوں اور مردوں کی طبیعتوں پر ہے۔ جو ایسے اچھے اچھے اور فلٹین ریل گھروں میں رہتے ہیں۔ ان میں بعض کی زندگی رچی خاصی گزرتی ہے لیکن بعض کا جینا اجیرن ہوتا ہے۔ مجموعی لحاظ سے یہ لوگ محنت کش لوگوں کی بنسبت کم شادماں اور خوش باش ہوتے ہیں۔ انہی کو زیادہ بیزاری اور کٹھن سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے پاس موٹریں ہوتی ہیں۔ اور کئی ایک کے پاس تو کھلے دیہات میں مکان بھی ہوتے ہیں۔ اور دیہات کے یہ مکان اکثر ان کے سکون اور مخلصی کے ماں بن جاتے ہیں۔ یہ چکر بھی کتنا خوبصورت ہے کہ انسان پہلے دیہات سے شہروں میں آتا ہے۔ تاکہ زیادہ روپیہ کمائے۔ اور زیادہ روپیہ کھا کر پھر دیہات میں واپس آجاتا ہے۔

کسی شہر میں آپ گھومنے پھرنے آپ دیکھیں گے کہ سب سے بڑے بازار میں تو آرائش حسن کی دکانیں ہیں۔ پھول والوں کے اسٹال ہیں۔ اور بڑی بڑی جہازوں کی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ اس بازار کے عقب میں ایک اور بازار ہوتا ہے جس میں بساطی کے سامان کی دکانیں۔ مہری فروش۔ ہیر کٹنگ سیلون۔ لائڈریاں سستے ہوٹل اور اخبار فروشوں کے اسٹال ہوتے ہیں۔ آپ ایک گھنٹہ تک گھومئے۔ اگر یہ شہر بڑا ہے تو بھی ہر جگہ ہی چیزیں آپ کو ملیں گی۔ صرف بازار مختلف ہونگے۔ ہر جگہ وہی دواؤں اور بساطی کی دکانیں۔ وہی باربر شاپ وہی لائڈریاں۔ لوہے کے سامان کی دکانیں سستے ہوٹل اور وہی اخبار فروشوں کے اسٹال۔ آپ کے دل میں یہ سوال چکیاں لے گا کہ یہ لوگ روزی کیسے کماتے ہیں۔ اس کا جواب بڑا آسان ہے لائڈری والی

باربر اور ہونوٹوں کے بیرون خالص ماؤں کے کپڑے دھوتے ہیں۔ ہوٹل کے پیرے باربر اور لانڈری والوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور باربر ان سب کے بال تراشتا ہے۔ بس تہذیب یہی ہے۔ اور یہی اس کا محدود پتھر ہے۔ یہ لانڈری والے اور باربر اور بیس زندگی بھر اسی مختصر سے بازار میں کام کرتے ہیں کہیں ادھر ادھر نہیں جاتے۔ البتہ یہ شکر ہے کہ فلموں کی بدولت وہ پرندوں اور درختوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ تیکر اور مصر اور بھالیہ پہاڑ کے قطارے۔ طوفانوں کے مناظر۔ جہازوں کی خرقابی کیسی کی تاجپوشی۔ چیونٹیوں کے گھر و ندے۔ جھینگ اور مڈے۔ چھپکلیوں اور بھپوڑوں کی لڑائی۔ پہاڑیاں اور سمندر کی طوفانی لہریں۔ رنگستان اور بادل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ چاند کی ٹھنڈی روشنی سے بھی فلم کے پردے پر ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

سچان اللہ تہذیب بھی کیا چیز ہے کہ کچھ اس کی تھاہ نہیں۔ اور یہ کیا جادوگا کہ انسان زندگی بھر سخت محنت کرتے رہتے ہیں۔ کام کے غلام بن جاتے ہیں انڈریو میں سرکھاتے ہیں۔ صورت اس لئے کہ روزی کما سکیں۔ اور اس سرگرمی میں انسان زندگی کے کھیلوں کو بالکل فرہوش کر دیتے ہیں۔

۲۔ فراغت کا چینی نظریہ

مشہور بات ہے کہ امریکہ کے لوگ بڑے ہنس و ہنسی کے ہوتے ہیں۔ اور چینی بڑے بیکار لوگ ہوتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ متضاد شخصیتیں ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کے ڈھانسو لوگ۔ بیکار اور کاہل چینیوں کے مددگار ہیں۔ اور سمت الوجود چینی امریکیوں کی حکم سہل کو بڑا پسند کرتے ہیں تو می کو

کی دلکشی کارا ز یہی خصوصیات ہوتی ہیں۔ آج رسل و رسائل کی آسانی اور وسعت کی بدولت مشرق اور مغرب ایک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور تہذیب دونوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لا رہی ہے۔ مشرقی ملکوں اور خاص طور پر چین کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہے کہ مشرق و مغرب کی الگ الگ ثقافت کیسے ایک دوسرے سے ملے گی۔ زندگی کے بارے میں چین کا قدیم فلسفہ آج کل کی موجودہ مشینی تہذیب سے کیسے لگا کھلے گا۔ اور ان دونوں کو ملا کر زندگی گزارنے کا ایک نیا ڈھنگ کیسے پیدا کیا جائیگا۔ شاید مغرب کے لئے بھی کبھی ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے۔ کہ مغربی زندگی میں مشرقی فلسفے کو کیسے ملا یا جائے۔ مگر ابھی یہ مسئلہ وہاں کے لوگوں کے پیش نظر نہیں ہے۔

مشینی تہذیب بڑی تیز رفتاری سے ہمیں فراغت کے دور کی طرف لا رہی ہے یہ وہ دور ہو گا۔ جس میں انسان کو کام کرنا پڑے گا۔ اور اسے تفریح کا وقت زیادہ ملے گا۔ جب انسان یہ دیکھے گا کہ اس کے پاس فرصت کافی ہے۔ تو اسے لامحالہ یہ سوچنا پڑے گا۔ کہ فراغت کے ان لمحوں سے کیسے لطف اٹھائے۔ فراغت کا وقت زیادہ اس لئے ہو گا کہ صنعتی پیداوار کے طریقوں میں روز بروز صلاح ہوتی جا رہی ہے۔ اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال تیار کرنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ اس صورت میں کام کا وقت کم اور فرصت کا وقت زیادہ ہوتا جائے گا۔ مگر ایسا کب ہو گا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اگلے تیس برس میں ہم اس منزل تک پہنچ جائیں۔ یا ابھی ایک صدی اور لگے گی۔ اور آج سے تیس برس کی زندگی کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا پڑے دل گروے کا کام ہے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ترقی کے لئے جو سرتور کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ انسان اس ترقی کی

سوشلسٹوں سے تنگ آجائے گا۔ اور پھر دم لے کر یہ جائزہ لے گا کہ اس نے
 مادی دنیا پر کیا کیا نفع حاصل کر لی ہے۔ اور پھر وہ فرصت کے کچھ منے لینا
 چاہے گا۔ کیونکہ یہ میں مان نہیں سکتا کہ جب انسان کے مادی حالات اسے
 بہت بہتر ہو جائیں گے۔ بیماریاں کم ہو جائیں گی۔ غربت اور محتاجی کا نام نہیں ہوگا
 اور زندگی سے انسان کو زیادہ امیدیں ہوں گی۔ تو اس وقت بھی انسان اتنا ہی
 کام کرنا چاہے گا۔ جتنا وہ اب کرنے پر مجبور ہے۔ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس
 نئے دور اور نئے ماحول میں انسان مزاجاً بھی کاہل اور آرام طلب ہو جائیگا۔

خیر اس امر سے قطع نظر کیجئے تو معلوم ہوگا ان معاملوں میں داخلی پہلو بھی اتنا
 ہی اہم ہے جتنا خارجی ماحول۔ اس لئے ذرا فلسفہ کا بھی دھیان کیجئے جو انسان کا نظریہ
 نہیں بدلتا۔ بلکہ اس کا کردار بھی بدل دیتا ہے۔ گویا مشینی ترقی کے انتہائی دور میں مشینی
 تہذیب کے بارے میں انسان کا رد عمل جو کچھ ہوگا اس کا سارا خار و مدار اس بات پر ہے
 کہ وہ انسان کیسا ہوگا۔ حیاتیات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی تحریک یا سہجان
 کے سلسلہ میں حواس کیا کریں گے۔ ان کا رد عمل سست ہوگا یا شدید و تیز ہوگا۔
 اور یہ کہ مختلف جانور ایک ہی ماحول میں ایک ہی چیز کے بارے میں کیا
 ردیہ ظاہر کرتے ہیں۔ بعض حیوان دوسروں کی بہ نسبت سست رد عمل ظاہر کرتے
 ہیں۔ اس مشینی تہذیب کے ملکوں میں بھی رجن میں امریکہ۔ انگلستان۔
 فرانس جرمنی اٹلی اور روس شامل ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشینی دور کے بارے میں
 لوگوں کا رد عمل مختلف ہے۔ یہ اختلاف ان ملکوں کے بسے والوں کی
 مختلف طبائع کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ یہ امکان باقی رہتا ہے کہ ایک ہی قسم
 کے ماحول میں ہر انسان کا رد عمل الگ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشینی ترقی سے چین

فراغت کا چینی نظریہ

۲۷۱

میں جس قسم کی زندگی رائج ہوگی وہ جدید فرانس کی زندگی سے بہت مشابہ ہوگی
کیونکہ چینی اور فرانسیسی ذہنیتوں میں بہت چیزیں ملتی جلتی ہیں۔

آج کل کی مشینی تہذیب امریکہ میں سب سے زیادہ عروج پر ہے۔ قرآن
یہ بتاتے ہیں کہ اب ساری دنیا میں امریکی قسم کی مشینی تہذیب اور امریکی طرز
زندگی کا دور دورہ ہوگا۔ مگر مجھے اس اندازہ سے اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ کوئی نہیں
بتا سکتا کہ امریکی مزاج کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مزاج ایسا کہا جاسکتا ہے
جو بڑی سرعت سے بدل رہا ہے۔

میرے نزدیک ثقافت یا کلچر فراغت کی پیداوار ہے۔ لہذا ثقافت کا
فن لازمی طور پر بیکاری کا فن قرار پاتا ہے۔ چینی نقطہ نظر یہ ہے کہ شخص دانشمند
طور پر بیکار اور فارغ آدمی ہو وہ سب سے تہذیب آدمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مصروف
رہنے اور دانائی میں حکمی طور پر تضاد ہے۔ دانا لوگ مصروف نہیں رہتے۔ اور جو
لوگ سخت مصروف رہیں دانائی ان کے پاس نہیں بھٹکتی۔ اس صورت میں دانا
لوگ ذہبی ہیں۔ جو بڑے حسن و خوبی سے بیکار رہیں

میں اس موقع پر یہ نہیں بتاؤں گا کہ بیکار رہنے اور کچھ نہ کرنے کی کیا کیا
قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اور اس بیکاری کی تکنیک۔ میں بیکاری کے فلسفہ پر کچھ روشنی
ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ یہ فلسفہ چین میں بیکار رہنے کچھ نہ کرنے اور بالکل
فراغت کی زندگی گزارنے کی تحریک کرتا ہے۔ اسی سے وہ کاہلی اور خوش باشی اور
وہ بے غم بلکہ شاعرانہ طبیعت ظہور میں آتی ہے جو چینی عالموں کا طرہ امتیاز ہے۔

یہ خصوصیات عام چینی قوم میں بھی نظر آتی ہیں

آپ پوچھیں گے کہ یہ مخصوص چینی مزاج کیسے پیدا ہوا۔ آخر چینی لوگ

کامیابی اور کارکردگی کو مشکوک کیوں گردانتے ہیں؟ اور زندگی کا مزہ لینے کی یہ صلاحیت زندگی سے یہ پیارا ان میں کتنی باتوں کی بدولت پیدا ہوا۔
سب سے پہلے یہ سنئے کہ فراغت کے بارے میں چینی نظریہ کیسے ہے؟ یہ اٹھارویں صدی کے ایک گناہ مصنف شو پائیا سیانگ کا نظریہ ہے۔ وہ کہتا ہے وقت اس لئے مفید ہے کہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا۔ اور فراغت کے وقت کا وہ لمحہ ہے۔ جو کسی کمرہ کے خالی فرش کی طرح ہے۔

یوں سمجھئے کہ اگر تنخواہ کم ہو تو آپ چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے لیں گے۔ جس کا چپہ چپہ پورے طور پر استعمال میں آئے گا۔ لہذا اس کمرے میں بے آرامی کا سامنا ہوگا۔ کیونکہ آپ تنگی سے گزر کریں گے۔ اس میں چلنے پھرنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی مگر جو ہنی تنخواہ بڑھی آپ اس سے زیادہ بڑا کمرہ کرایہ پر لے لیں گے۔ اس کمرے میں راحت ہوگی۔ گویا فرش کا کچھ حصہ خالی بھی ہوگا۔ اور باقی جگہ کو بلیک۔ میز کرسیاں وغیرہ بھرے ہوں گی۔ بس یہ خالی جگہ وہ چیز ہے جو کمرے کو رہنے کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح فراغت کے لمحے ہی زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بناتے ہیں۔

۳۔ بیکاری :- ایک مسلک

چینیوں کو فرصت اور فراغت سے جو محبت ہے اس کی وجوہ کئی ہیں۔ فرصت اور فراغت سے گہرا لگاؤ اصل میں چینی طبیعت کا خاصہ ہے۔ پھر اسے ایک ادبی مسلک بھی بنا دیا گیا۔ اور اس نام یہ ہوا کہ فراغت کے جواز میں پورے فلسفہ تیار کیا گیا۔ فراغت سے یہ لگاؤ زندگی کے ساتھ گہرے لگاؤ سے پیدا ہوا۔ اسے

ادب کی رومانی تحریک نے ہر صدی میں زندہ رکھا۔ اور آخریہ دور آیا کہ زندگی کے ایک فلسفہ نے اسے بالکل جائز اور معقول قرار دیا۔ زندگی کا یہ فلسفہ - تاؤ (تاؤ) فطرت یا صراطِ مستقیم) کا فلسفہ تھا۔ زندگی کے اس نظریے کو چینی ذہن نے عام طور پر قبول کر لیا ہے۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ چینی مزاج میں تاؤ کا خول (تاؤ) نگر پہلے ایک بات کی وضاحت ہو جائے۔ فراغت اور کاہلی کی زندگی ایک رومانی مسلک ہے۔ اسے ہم نے زندگی سے گہرے لگاؤ کی پیداوار قرار دیا ہے۔ مگر یہ زندگی یقیناً امیر طبقے کے لئے نہیں تھی۔ زندگی کا یہ مسلک غریب - ناکام اور خاکسار قسم کے علم دوست لوگوں کے لئے تھا۔ جنہوں نے یا تو خود کاہلی کی زندگی اختیار کی۔ یا کاہلی اور بیکاری انہیں مجبوراً اختیار کرنی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کو اس زندگی میں بڑا چین آرام رہا ہوگا۔ اور انہیں روحانی خوشی بھی حاصل ہوگی۔ شہرت کے نقصانات اور گناہی کے فائدوں پر چینی ادب کی بحثیں ان لوگوں کے لئے بڑی دل خوش کن تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ اعلیٰ عہدوں کے امتحانات میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ یہ لوگ اپنے گھر والوں کے لئے زیادہ روپیہ اور زیادہ عیش آرام کا سامان ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اس قسم کے مقولے ان کی بناہ گاہ ہوتے تھے۔ کہ دیر میں کھانا کھانا گوشت کھانے کے برابر مزہ دیتا ہے۔ اس طرح یہ مکھڑ لوگ اپنے گھر والوں کی کی نظروں میں کم مقرب ہو نیکا رہتے نکاتے تھے۔ آج کل چین کے اشتراکی ادیب پرانے شاعروں اور ادیبوں پر فقرے کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شاعر سوزناک پو اور یوآن سناک وغیرہ اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جسے کچھ کام نہیں تھا۔ طبقہ چین کے جدید محنت کش ادیبوں کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ یہ اندازہ لگنا سخت نا انصافی پر مبنی ہے۔ سونے آج جو کی ہروں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی باد صبا کے گیت گاتے

اور یوآن سنگ نے لکھا تھا کہ شبنم کی مٹی میرے دہنوں کو تر کر رہی ہے۔ ہمارے
اشتراکی دوست غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ باد شمال چاند شبنم اور پرندے۔ گویا سرمایہ دار
طبقے کی ملکیت ہیں۔ حالانکہ قدیم زمانہ کی عظیم شخصیتیں مزدوروں اور سرمایہ داروں
کے جھگڑوں سے بالاتر تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ خود غریب کسانوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں
اور اسی زندگی میں انہوں نے فطرت سے ہم آہنگی اور ولی سکون پایا

اس معنی میں بے کاری اور کاہلی کی زندگی کے اس رومانی مسلک کو نیا دور
طور پر ایک جمہوری چیز سمجھا جاسکتا ہے۔ فطرت سے لطف اٹھانے پر عیاشیوں
سے مزے لینے کے مقابلے میں بہت کم خرچ آتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات
کی ہوتی ہے کہ مزاج فنکارانہ ہو۔ ایسا مزاج جسے کسی فارع سپہا کی تلاش ہو تاکہ
وہ سپہا بالکل بے مصرت طریقے پر بسر کر سکے۔ اصل میں کاہلی اور آرام طلبی کی
زندگی پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ یہ بات امریکی ناول نویس تھوریو نے اپنے ناول
میں بڑی خوبی سے ظاہر کی ہے۔ چین کے رومانی ادیب اور شاعر عام طور پر ایسے حضرات
تھے جن میں احساس کی لطافت حد درجہ کی تھی۔ فطرتاً یہ لوگ آزاد نس اور آزاد رو
تھے۔ ان کے پاس دنیاوی مال و دولت کچھ نہیں تھا۔ مگر جذبات اور احساس کی
دولت سے یہ لوگ مالا مال تھے۔ زندگی سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اور زندگی کے اس
پیار کا مظاہرہ وہ یوں کرتے تھے کہ سرکاری عہدہ داری کی زندگی سے انہیں شدید
نفرت تھی۔ اور وہ اپنی روح کو جسم کا غلام بھی نہیں بناتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا
کہ آرام طلبی اور بے کاری کی زندگی۔ امریکہ کے حصے میں آنے کے بجائے
صرف ان لوگوں کا حصہ تھی جو عالی دماغ ہوں۔ اور بس۔
دیہ عالی دماغی مغرب کے پیشہ ور ادارہ گردوں کی شان سے

بہت ملتی جلتی ہے۔ جو اپنی خود داری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اپنی خودی کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے۔ اس لئے کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن ان میں خدا نے اتنی عقل ضروری ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی کامیابی کو ہی سمجھیں، یعنی داناؤں کی یہ عالی دماغی آزادی رکھنے کی بدولت تھی۔ وہ اپنے گرد پھیلے ہوئے زندگی کے وسیع ڈرامے اور اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اور سچ پوچھتے تو اس بے تعلقی سے ہی عالی دماغی وجود میں آتی ہے۔ یہ لوگ انسان کی ادنیٰ اُمنگوں اور حرص اس کی حاکم اور شہرت اور دولت کی ہوس کو ہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے یہ عالی دماغ تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ یہی عالی دماغ جو اپنی ذات اور اپنے کردار کو دنیاوی کامیابی سے زیادہ قیمتی چیز سمجھتے تھے۔ اور جو شہرت اور دولت پر روحانی پاکیزگی کو ترجیح دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ چینی ادب کا آدرش بن گئے۔ چینی ادب کا یہ مثالی انسان ساڈ زندگی کا پیکر تھا۔ اُس کے دل میں ہمیشہ دنیاوی ترقی کیلئے تھخیر کا جذبہ ہوتا تھا۔ اس طبقے کے عظیم ادیب یوان منگ۔ سونگ پو۔ پو چوہا۔ یوان چنگ لان یوان است سائی زندگی کے ایک مختصر دور میں سرکاری عہدہ دار رہے تھے اور اس حیثیت سے وہ ایک بید کامیاب افسر بھی تھے۔ پھر اس سرکاری زندگی سے ان کا جی بھر گیا۔ وہ اپنی منصبی خوشامد اور ساتھی افسروں کی خاطر تو ہنص ان کی ہمان نوزری سے تنگ آ گئے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا۔ اور گوشہ نشین ہو گئے۔ یوان چنگ لان نے تو اپنے اعلیٰ افسروں کے نام سات دفعہ یہ عرضی لکھی کہ وہ اپنے منصبی ادب و آداب سے تنگ آ چکا ہوں اور وقت وہ شہر سوچاؤ کا

حاکم تھا، اور مجھے اب خدمت سے معاف رکھا جائے۔ تاکہ میں ایک آزاد اور
 بے غم شہری کی حیثیت سے زندگی کے چار دن آرام سے بسر کر سکوں
 بے مصرت اور بیکار زندگی کی فرمائش میں ایک صنیعی شاعر پوپچی آن دیں
 رطب اللسان ہے۔ یہ خیالات ایک کتبے کی شکل میں لکھے گئے۔ تاکہ وہ انہیں
 اپنے دیوان خانے پر نصب کر سکے اس دیوان خانے کو شاعر دیوان نساہل کہا کرتا تھا۔
 ”تاؤ فلسفے کی سکاہی کی کتابیں پڑھنے کی ہمت کون کرے کیونکہ تاؤ کا قانون
 فطرت کتابوں میں کہلاں۔ مذہبی کتابیں بھی کون پڑھے وہ بھی قانون فطرت کے بارے
 میں فضول باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ کام کی بات ایک میں نہیں۔
 اصل یہ ہے کہ تاؤ کے قانون فطرت کی روح رواں خلا ہیں صاف اور ٹھنڈے
 خلا۔ اور یہ خلا پن دن بھر کچھ نہ کرنے کے بغیر کہاں ملے گا۔
 شعر بھی کون پڑھے۔ جہاں شعر پڑھتے پڑھتے رک جاؤں گا ساری شہرت
 فنا ہو جائے گی۔

رباب بھی کون بجائے۔ رباب کا نغمہ انہی تاروں میں فنا ہو جاتا ہے جن
 سے وہ پیدا ہوتا ہے۔

شراب بھی کون پیئے بوتل کے رسیا نشہ اور سرور کے باوجود بھی ان پہاڑوں
 اور دریاؤں تک نہیں پہنچ سکتے جو ان کی زد سے باہر ہیں۔
 پہاڑوں اور چشموں کی طرف کون دیکھے۔ خود میرے دل میں مست قدرت کی
 نہایت شاندار تصویر موجود ہے۔

ہواؤں اور چاندنی کا سامنا کون کرے۔ خود میرے وجود میں لسی ہی
 امر چیزوں کی ایک دنیا بستی ہے۔

دنیا کے کاموں پر توجہ کوئی دے۔ خود میرے اندر ہی میرا گھر بار اور میری

دولت موجود ہے۔

موسموں کے تلوٹی سے کوئی متاثر ہو۔ میرے اندر آسانی جلوس کی تصویریں

رہناں رہتی ہیں۔

تندر درخت گل سڑ کر مٹی میں مل جائیں گے۔ چٹائیں بھی ٹوٹ کر ریزہ

ریزہ ہو جائیں گی۔ مگر میں جو کچھ ہوں وہی رہوں گا۔

کیا یہ میرے ایوان تامل کے لئے موزوں کتبہ نہیں۔ کیا اس کمرے کو

ایوان تامل کہنا مناسب نہیں ہوگا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصروف زندگی اور کاہلی کا یہ مسلک روحانی سکون

کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی بددولت ہر قسم کی ذمہ داری سے آزادی اور

بینفکری ملتی تھی۔ اور فطرت کے مظاہر سے بھی بھر لطف اٹھانا۔ اسی مسلک والے

لوگوں کا حصہ تھا۔ اسی رعایت سے صینی شاعروں اور ادیبوں نے اپنے آپ کو عجیب

وغریب ناموں سے یاد کیے۔ تو فو ہے آپ کو دریاؤں اور جھیلوں کا مہمان

کتا ہے۔ سونگ پونے اپنے آپ کو مشرقی دھواں کا زاویشین لکھا کرتی اپنے آپ کو

دھند میں لپٹی ہوئی تھیل کا خوش باش فرد کہتا ہے تو کسی نے اپنے لئے دھند میں لپٹے

ہوئے مینار کے باسی کا خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

چونکہ بے مصروف اور بے کار زندگی کا مزہ لینے پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ اس لئے

اس کا لطف اٹھانے سے امیر طبقہ محروم ہے۔ اس طبقہ میں یہ صلاحیت ہی باقی

نہیں رہی۔ یہ صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو دولت کو بالکل ہیچ سمجھتے ہوں بیچار

کی زندگی کا لطف اٹھانا صرف اس شخص کے بس کی بات ہے جس کا دل غنی ہو۔

جو سادہ زندگی کا دلدادہ ہو۔ اور جو روپیہ کمانے کے دھندوں سے درد بھاگتا ہو۔ جو شخص زندگی سے لطف اٹھانا چاہتا ہے اسکے لئے زندگی کے مزوں کا شمار نہیں۔ جو لوگ اس فانی زندگی کے مزے نہیں لے سکتے ان کے دل میں زندگی کی سچی قدر نہیں ہوتی۔ اسلئے وہ اپنی زندگی کو روزمرہ کی بیکساں اور پزار کی زندگی بنا دیتے ہیں۔ چینی شاعر اور فلسفی لائوتزے پر یہ الزام عطا ہے کہ وہ زندگی کا دشمن تھا۔ میں سمجھتا ہوں اس نے دنیاوی زندگی کی فضول مصروفیتوں کو تیاگ دینے کی تعلیم اسلئے دی تھی کہ اس کے دل میں زندگی کے لئے بڑا پیار بڑی قدر موجود تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی اپنے اونچے مقام سے گر کر محض دم شماری اور وقت گزاری کا حیلہ بن جائے۔

یہ قاعدے کی بات ہے کہ جہاں محبت ہوگی وہاں رشک و حسد ضرور ہوں گے۔ جو شخص زندگی کو بڑی متاع سمجھتا ہو وہ اپنی فرصت کے چند بے بدل لمحوں کی بڑی حفاظت کر لگا۔ اسے اپنی آزاد روی اور بے فکری کے مخصوص طنطنے۔ اور اپنی عزت نفس کی پامداری کرنی ہوگی۔ اسکے ہاں کاہکے بھٹے جتنے ضروری اور عزیز ہوں گے مچھلی کا شکار کھیلنے کے لمحے بھی اتنے ہی گرانمایا ہونے چاہئیں۔ فراغت اور تفریح کے لان لمحوں کا پاس کرنا رفتہ رفتہ ایک عقیدہ بنائے گا۔ بسکی چڑی جو بصورت مثال انگریز قوم کی ہے۔ جس نے اپنے گھیل کے وقت کو ایک ندی ہی فریضہ کی طرح مقدس بنا لیا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں اگر کلب میں کوئی شخص آپ سے کاروبار کا تذکرہ شروع کر دے۔ تو آپ اس کی گفتگو کو برداشت نہیں کریں گے جس طرح ایک سائنس دان کو اگر اس کی تجربہ گاہ میں جا کر باتوں میں لگا جائے تو وہ جڑ جاتا ہے۔ اسی طرح آپ کلب میں غیر نفری باتوں سے جڑ جائیں گے۔

آپ رفتہ رفتہ اس مرحلے پر آجائیں گے کہ آج کی بہاروں کے باقی ماندہ دن
پشیمانی اور امنوس کے ساتھ شمار کرنے لگیں گے۔ آپ کو تاسف ہو گا کہ آپ نے
اس بہار میں زیادہ سیر کیوں نہ کی۔ آپ کو اسی طرح کچھ کھونے کا احساس کسی چیز
کی کمی کا خیال ہو گا۔ جس طرح اس دکاندار کو ہونے چاہیے جسکی رو دکا لٹریں کم بکری ہوتی ہو

۴۔ دنیا ہی اک بہشت ہے.....

زندگی کو عزیز سمجھنے کے ساتھ ایک خلش موجود ہے۔ یہ خلش بڑی شاعرانہ ہے
اس کی تہ میں یہ حقیقت ہے کہ آخر میں انسان زندگی فانی ہے۔ عجیب بات یہ ہے
کہ فانی زندگی کے اس غمناک احساس نے چینی دانشوروں میں زندگی سے لطف
اٹھانے کی خواہش کو زیادہ شدید اور گہرا کر دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر زندگی
یہی ہے جو ہمیں ملتی ہے تو جیت تک دم میں دم ہے ہمیں اس زندگی سے جی بھر کر
لطف اٹھانا چاہیے۔ اس کے برخلاف اگر انسان کے دل میں زندہ جاوید
یہ جو جانے کی مبہم سنی امید بھی رہے تو اس ارضی زندگی کے مزے لینے پر اسکی توجہ
ہیں نہ سکتی چنانچہ سراسر کہتے ہیں اس مخصوص چینی احساس کو بڑے خوبصورت
لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کا عقیدہ یہ ہے (اور میرا
تو ہی عقیدہ ہے) کہ ہماری یہ دنیا یہ زمین ہی جنت ہے تو انسان اسکو جنت
نابینگی واقعی بھر پور کوشش بھی کریں گے۔ سونگ پونے کہا ہے۔ زندگی ہمارے خواب
کی طرح گزر جاتی ہے۔ اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس لئے سونگ زندگی
کے ساتھ اتنی گہری دل بستگی دکھاتا ہے۔ فانی زندگی کے بارے میں یہی احساس ہے

یادگار چینی ادب میں ملتا ہے۔ فنا ہونے اور مرنا جانے کا یہ احساس چینی شاعر اور دانشور کو ہمیشہ طرب و انبساط کے لمحوں میں باریا رہتا ہے۔ اور اس احساس کی غلش چینی شاعر کی زبان سے یہ کہلاواتی ہے کہ

چاند پورا نہ رہے گا ایسے !

پھول کھلتا نہ رہے گا ایسے !

یہ احساس اس وقت اور بھی شدید ہو گا۔ جب وہ کھلتے پھولوں کے ساتھ پورے چاند کو دیکھے گا مشہور شاعر بی یو کی خوبصورت نظم "تسفا لوتوں کے غنچوں کے درمیان ہمارا کیا رات" دیکھئے۔ جو اس نے ایک شاندار سخن کی یاد میں تصنیف کی۔ اس میں یہی خیال ملتا ہے جو چینی ادب میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ "عمر رواں خواہ سب کی مانند ہے۔ آخر میں اس زندگی سے کتنی پار لطف اٹھانے کا کتنی بار موقع ملے گا؟ زندگی کے فنا ہونے اور مرنا جانے کا یہ احساس وہ ایک ہی جھلنے پنے زندہ جاوید مضمون "ایوان گل" میں بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے۔ یہ مضمون اس نے اپنے خوش باش اور عالی مرتبت دوستوں کی ملاحظت پر لکھا تھا وہ کہتا ہے:-

"بنگ ہو کے جلوس کے نویں سال ۱۹۵۳ء بہار کے دور آخر کے آغاز میں ہم لوگ جشن آب کی سلسلہ میں ایوان گل میں جمع ہوئے تاکہ آبی جشن مناکر حلیت روجوں کو جگھا سکیں۔

جشن میں ہم سب لوگ موجود ہیں۔ بوڑھے بھی اور جوان بھی۔ سامنے بلند پہاڑوں کی شاندار چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ تناور درختوں کی چھتر چھاؤں ہے۔ بالٹوں کے ایچے بیڑ ہر طرف کھڑے ہیں۔ یہاں صاف شفاف چشمے

شور مچاتے ہوئے آبتار ہیں۔ ہم لب جو ایک قطار میں سمجھ جاتے ہیں اور
 ایک ہی جام سے باری باری پلاری رہے ہیں جو بہتے پانی کی توس پر
 تاجتا ہوا ہر ایک کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ کوئی ساز موجود نہیں۔ نہ تکرار نہ
 دم کا ساز جسکی موسیقی ہم نہیں۔ بھر بھی ہم بی رہے ہیں اور گارے ہیں۔
 دل کی باتیں ایک دوسرے سے کہنے اور باہمی گفتگو کا مزہ لینے کیلئے
 سب تیار ہیں۔ آسمان صاف ہے فضا میں تازگی ہے۔ اور ہوا کے
 جھونکے ہلکے ہیں۔ اور پھیلے ہوئے آسمان اور نیچے زمین پر ہزاروں مظاہر
 نظرت کو دیکھنے۔ ان کا لطف اٹھانے کا یہی وقت ہے۔ سارے منظر پر
 نظریں دوڑانا کتنا فرحت بخش ہے۔ اپنے احساس کو بندشوں سے آزاد
 کر کے ان کی عنان ہاتھ سے چھو کر دینا کتنا کیف آگیا ہے۔ گویا چشم
 دگوش دونوں کے لئے آسودگی دونوں کے انبساط کا پورا پورا سامان موجود ہے۔
 لوگ اکثر زندگی کے بارے میں بات کرنے کے لئے مل بیٹھتے ہیں۔
 لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ دل کی باتیں کرہ کی مانوس چار دیواری کے اندر
 بیٹھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ بعض لوگوں پر اس بات جیتا گیا جو ذہن آسنا لہجہ
 آجاتا ہے کہ وہ حقائق سے بہت اونچے اڑنے لگتے ہیں ہم لوگ اپنے اپنے ممالک
 کے مطابق دل بہلاوئے اور تفریح تلاش کرتے ہیں بعض لوگوں کو شور شرابے اور
 ہڈ بازی میں مزہ آتا ہے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی تفریح زیادہ سٹین اور
 سنجیدہ قسم کی ہوتی ہے۔ اور جب ہم اپنی مسرت کے یہ ذریعے ڈھونڈ لیتے ہیں تو
 مطمئن ہوجاتے ہیں۔ ادھاتی مسرت میں یہ بھی بھلا دیتے ہیں کہ جو لئی گزر کر
 بڑھا پافرین آتا جا رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ ان کو شوق اور تفریح

سے دل بھرجاتا ہے۔ اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہماری پسند ناپسند اور آرزوئیں ٹک بدل جاتی ہیں۔ اسوقت دل میں پشیمانی کا شدید جھس پیدا ہوتا ہے۔ پلک جھپکے میں ہماری گری ہوئی مسرتوں کے سرچشمے دور کے ماضی کی دھندلی یادیں بن جاتی ہیں۔ اور ان یادوں میں تاسف اور دلگیری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسکے علاوہ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ جاہ زندگی مختصر ہو یا طویل اسکا انجام ہر حال میں نصاب ہے۔ قدیم داناؤں نے کہا تھا کہ زندگی اور موت دونوں عظیم ہیں، لیکن المذاک خیال ہے یہ۔ میں قدیم زمانے کے لوگوں کی مسرتوں اور ان کے کلام کا اکثر مطالعہ کرتا ہوں۔ میں ان کی تصانیف پڑھتا ہوں اور مجھے فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل پر بھی زندگی اور موت کا وہی اثر ہوتا تھا جو ہمارے لوگوں پر ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے دل پر بڑی اُداسی چھا جاتی ہے۔ اور مجھے ان پر بڑا رحم بھی آتا ہے۔ مگر بات واضح نہیں ہو پاتی۔ یہ زندگی کا ہمہ جس کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ زندگی اور موت کو ایک کہنا اور ایک سمجھنا جھوٹ ہے۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ طویل زندگی اور دنیوی موت کوئی فرق نہیں پڑتا۔ افسوس یہ ہے کہ آج جس طرح ہم قدیم داناؤں کے مرنے جینے کا خیال کر رہے ہیں۔ کل کو آئندہ نسلیں یہی کچھ ہمارے بارے میں سوچیں گی۔

اسی خاطر میں نے یہ الزام کیا ہے کہ اس ضمن میں جو جو معاصرین تریک ہیں میں ان کا نام اور ان کے احوال تحریر میں لارہا ہوں۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدل جائیں گے لیکن وقت

اور حالات جس طرح مسرت اور رنج کے جذبات پیدا کرتے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

خدا جانے مستقبل کے قاری اس تخریر کو پڑھ کر کیا خیال کریں گے
کیا محسوس کریں گے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسان کو اپنے فانی ہونے کا خیال رہے اور اسے احساس رہے کہ ایک نہ ایک دن اس کی زندگی کا شعلہ شمع کے شعلے کی طرح بج کر رہ جائے گا تو یہ بڑی زبردست چیز ہے۔ کیونکہ یہ احساس ہماری آنکھیں کھول دیتا ہے ہمیں کچھ کچھ عمیق کر دیتا ہے۔ اور ہم میں سے اکثر لوگوں پر شاعرانہ جذبات طاری کر دیتا ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی فنا کے احساس کی بدولت ہم میں معقولیت سے زندگی بسر کرنے اور سچائی کے راستہ پر چلنے اور اپنی مجبوریوں کو ہمیشہ یاد رکھنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ اس سے دل کو بڑا سکون بھی ملتا ہے کیونکہ صحیح معنی میں دل کا سکون اسی صورت میں ملتا ہے کہ بدترین بات کو بھی بے چون و چرا مان لیا جائے اور بھیانک سے بھیانک حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے نفسیاتی لحاظ سے یہ سکون اسلئے حاصل ہوتا ہے کہ اعصابی تناؤ دور ہو جائے اور جو قوت اس تناؤ پر خرچ ہو رہی تھی اس طرح وہ سکون میں بدل جانے کے لئے آزاد ہو جاتی ہے۔

چینی شعرا اور عام لوگ جب خوشیاں مناتے ہیں تو ان کے دل میں ہمیشہ یہ تحت الشعری احساس رہتا ہے کہ یہ خوشی دائم و قائم نہیں ہے۔ اسلئے کسی ملاپ اور بڑی فرحت افزا ملاقات کے بعد ان کا یہ عام مقولہ ہوتا ہے "اچھا بھائی بہت بڑا جشن بھی ہو۔ جس کا پینڈال سینکڑوں میل میں پھیلا ہو تو کس کا انجام اور سکی

انتہا آخر کہیں نہ کہیں ضروری ہوا کرتی ہے۔۔۔ گویا زندگی کا یہ جشن سوتے جاگتے کا جشن خواب ہے۔ اور یہی اس کا اصل جشن ہے۔ کیونکہ اس کی حیوانی ہی اس میں ایک روحانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

زندگی کے ساتھ اگر بقا و دوام کا جھگڑا نہ رکھا جائے تو جینے کا مسئلہ بالکل ایک سادہ اور آسان مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہم انسانوں کو اس زمین پر زندہ رہنے کے لئے محدود مدت دی گئی ہے۔ یہ مدت شاید نوادری سترائی برس سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ہمیں کرنا یہ ہے کہ زندگی کی اس محدود فرصت کو اس طرح ترتیب اور تنظیم دے لیں کہ ایک خاص ماحول میں ہم جہاں تک ممکن ہو مزے سے زندگی گزائیں۔ یہ مسئلہ اس صورت میں عین عین کنفیوٹیشنس کی تعلیمات کا ایک عکس بن جاتا ہے۔ اس میں وہی ٹھوس دنیاوی رنگ اور ارضی کیفیت ہے جیسا کہ اس سادہ حقیقت کو ماننے کے بعد انسان بڑے استقلال اور بڑی سوجھ بوجھ سے دنیا داری کے کام کاج کرنے لگتا ہے۔ اسی وصف کو امریکی دانشور اور حکیم جارج سنٹیانا نے حیوانی اعتقاد سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس حیوانی اعتقاد کے ہونے ہونے ہمیں ڈارون کی اس شہادت کی ضرورت نہیں رہتی کہ حیوانوں سے ہمارا رشتہ بڑا محکم ہے۔ اسی حیوانی اعتقاد کی بدولت ہم زندگی کے رشتہ سے وابستہ رہتے ہیں۔ وہ زندگی جو جلیبتوں اور حواسِ خمسہ

کی زندگی ہے۔ اور اس وابستگی کی تہہ میں بات صرف یہ ہے کہ چونکہ ہمیں حیوان ہیں لہذا ہم اسی صورت میں خوش و خرم رہ سکتے ہیں کہ ہماری عام جلیبتی ضرورتیں سیدھے سادے طریقہ پر اُسودہ اور سطلین ہو سکیں۔ اس کا اطلاق زندگی کے ہر پہلو پر ہوتا ہے اور جیسے کا مزہ لینے کا کوئی پہلو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ تو پھر کیا ہم لوگ ہم جلیبتی شدید

ظہر پر مادہ پرست ہیں ؟ سچ پوچھے تو ایک چینی کو اس سوال کا جواب دینا نہیں آئیگا
 اسکی ساری روحانیت ایک مادی اور ارضی حیات کی بنیاد پر مبنی ہے لہذا روح اور جسم فرق
 اور امتیاز اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ہمیں شک نہیں کہ ہر چینی زندگی کے عام آرام اور
 ضروریات مثلاً اچھا کھانا پینا وغیرہ) کا بڑا قائل ہے۔ مگر یہ چیزیں بھی تو حواس و حواس
 سے تعلق رکھتی ہیں۔ باقی رہا جسم اور روح کے امتیاز کا معاملہ۔ تو جسم اور روح کا فرق صرف
 ذہن کے ذریعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اسکے برعکس ہمارے حواس جسم اور روح دونوں
 کے لئے دروازوں کا کام دیتے ہیں جیسا کہ گزشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے۔
 موسیقی ہمارے فنون لطیفہ میں سب سے ادنیٰ فن ہے جس کا تعلق روح سے ہے۔
 اور جو انسان کو روحانیت کی بلندیوں کی سیر کر سکتی ہے۔ مگر اس کا سارا
 دار و مدار بھی سننے کی قوت (سامعہ پر) ہے۔ اسی طرح ایک چینی کی سمجھ میں
 نہیں آتا کہ اگر کھانے کے بارے میں دو شخصوں کا مذاق ایک سا ہو تو یہ آوازوں
 کی ہم آہنگی (موسیقی) کی طرح ایک روحانی چیز کیوں نہیں ہے ؟ آخر اس ہم مذاق
 کا سارا دار و مدار بھی تو ایک اور حس یعنی چکھنے (ذائقہ) پر ہے۔ اس حقیقی رنگ
 میں ہم اپنی محبوبہ کے لئے اپنے دل میں گہرا پیار محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی
 روح اور اس کے جسم میں امتیاز کی ایک حد فاصل قائم کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہمیں ایک
 عورت سے محبت ہے تو اس کے خط و خال اور ان خط و خال کی اقلی سی شکل ہی
 سے یہ محبت نہیں ہوگی۔ بلکہ ہمیں اس کے انداز۔ اس کے اطوار اسکی حرکات و
 سکنات اس کے روپ اور چہرہ۔ اس کے تبسم سے بھی محبت ہوگی۔ اب کئی
 پوچھے کہ محبوبہ کا تبسم ایک روحانی چیز ہے یا جسمانی۔ تو اس کا جواب
 کون دے سکتا ہے ؟

زندگی کی حقیقت اور زندگی کی روحانیت کا احساس حسنی نہان پرستی سے تقویت پاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چینی قوم کا انداز فکر اور جینے کا ادب دونوں ہی اس احساس کی پشت بناہ ہیں۔ اس لئے چینی فلسفہ کی مختصر اور جامع تعریف یہ بتائی جاسکتی ہے کہ چینی فلسفہ زندگی کے علم میں لچپی کا نام ہے۔ سچائی کے عرفان سے اس کا تعلق کچھ کم ہی ہے چینی فلسفی جینے اور زندگی کرنے کے سلسلہ میں سارے مابعد طبیعیاتی اندازوں کو غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ براہ راست زندگی سے ناتا جوڑتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے آپ سے ہی ازلی اور بد سوال کرتے ہیں ہمیں زندہ کیسے رہنا ہے۔ اس لئے مغرب جس چیز کو فلسفہ سمجھتا ہے چینی قوم کے نزدیک وہ بالکل بیکار چیز ہے مغرب کا فلسفہ منطق کی بھول بھلیاں میں الجھا ہوا ہے۔ اور منطق کا سارا کام یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے طریقوں کا سراغ لگائے۔ مغرب کا فلسفہ منطق کے علاوہ اس سوال کے چکر سے بھی باہر نہیں نکلا کہ علم حاصل کرنے کے امکانات کیا ہیں اس لئے ان دو چیزوں میں الجھ کر مغربی فلسفہ خود زندگی کے متعلق باتیں معلوم کرنا بالکل فراموش کر چکا ہے۔ زندگی کے حقائق اور زندگی کے عرفان سے مغربی فلسفہ کا اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اسی لئے مغربی زندگی کو دیکھا جائے تو اس میں سوائے مہمل باتوں اور فضول ہوتی مچالنے کے اور کچھ نہیں۔ اس میں عشق بازی اور کورٹ شپ کی بھرمار ہے دی گدیس نام نہیں۔ اور لطف یہ کہ بچے بھی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور یا پھر بڑی بڑی توہیں ہیں جو مارچ کرتی رہتی ہیں۔ اور جنگ کا منہ نہیں دیکھتیں۔ یہی حال فلسفہ کا ہے اور اس سلسلہ میں جرمن فلسفی سب سے بدتر ہیں۔ ان کی ہرزہ سرائی کا عالم تو یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ بڑے دل پھینک عاشقوں کی طرح حقائق کو کرتے ہیں لیکن سچائی

کے دوامی نلتے کا نام نہیں لیتے۔

۵۔ قسمت کیا ہے؟

عین میں تاؤ کے قانون نظرت نے بیکار زندگی کا جو درس دیا ہے اس کا ایک مخصوص پہلو یہ ہے کہ بے مصرت زندگی بسر کرنے والی ذہنیت بدیہی اور خوش بختی دونوں کی قائل نہیں۔ تاؤ کی بڑی تعلیم یہ ہے کہ کرنے سے زیادہ تم ہونا ہے۔ کام سے زیادہ اہم کرنا ہے۔ اور عمل سے اہم تر سکون ہے۔ مگر دلی سکون اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان کو تقدیر کے تھپڑے نہ کھانا پڑیں اور تقدیر کا اٹا سیدھا چکر اسکی زندگی کو پریشان نہ کرے۔ تاؤ فلسفہ کے عظیم مسلح اور فلسفی لائت زسنے نے اس سلسلہ میں ایک تشلی حکایت بیان کی ہے۔

۱۔ ایک بوڑھا ایک دیران قلعہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ ایک دن اسکا گھوڑا گھوڑا اس کے ہمسائے اظہار ہمدردی کے لئے آئے۔ ان سے بوڑھے نے پوچھا۔ ہائیو آپکو کیسے معلوم ہے کہ گھوڑا لیکر آگیا ہو جانا میری بیٹی ہے چند دن بعد کا گھوڑا چند جنگلی گھوڑے ساتھ لیکر گھر واپس آگیا۔ بوڑھے کے ہمسائے اس خوش بختی پہاڑ سے مبارکباد دینے آئے تو بوڑھے نے پوچھا۔ آپکو کیسے معلوم ہے کہ یہ میری خوش بختی ہے۔ اب اتنے گھوڑوں کے ہوتے ہوئے اسکے لڑکے نے سواری سیکھی اور ان گھوڑوں پر چڑھنا شروع کر دیا ایک دن گھوڑے سے گر کر لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہمسائے بھر ہمدردی کا

اظہار کرنے کے لئے تو بوڑھے نے بھر کہا۔ بھائیو آپ کیسے تہ چلا کہ میرے
 لڑکے کی ٹانگ کا ٹوٹ جانا بد بختی کی بات ہے؟ اگلے ہی سال
 ملک میں جنگ چھڑ گئی۔ چونکہ بڑھے کا لڑکا چلنے پھرنے سے معذور تھا
 اس لئے اسے میدان جنگ میں نہ بھیجا گیا۔“

ظاہر ہے یہی وہ فلسفہ ہے جو آدمی میں کچھ سختیاں سمیٹنے کی قوت بھی پیدا
 کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس فلسفہ کی بدولت انسان کو تہ چل جاتا ہے کہ ہر سختی اور
 ہر مشکل کے ساتھ کچھ آسانیاں اور کچھ فائدے بھی ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسا
 شخص جانتا ہے کہ تصویر کا ایک ہی رخ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر چیز کے دور رخ ہوا
 کرتے ہیں ول کا سکون حاصل کرنا زندگی کی فضول مھاگ دوڑ سے گریز کرنا۔ اور دنیاوی
 کامیابی کو سچ سمجھنا اسی کے لئے ممکن ہے جو زندگی کے اس فلسفہ کو مد نظر رکھے
 جو یہ مقولہ سامنے رکھے۔

” اسے کچھ بے وا نہیں ہوتی جو کسی چیز کی طرف توجہ کرے۔“

جو شخص یہ احساس رکھتا ہو کہ جو بھی ہوتا ہے کوئی خوف نہ کر ہونے دے اسے دنیاوی
 کامیابی کی خواہش نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیاوی کامیابی کی خواہش اس میں نامکامی کے
 ڈر کا دوسرا رخ ہے۔ کوئی شخص جتنی زیادہ ترقی کرتا ہے اتنا ہی اُسے اپنے
 منزل کا دھڑکا لگا رہتا ہے گویا ایک طرف شہرت اور کامیابی کے خیالی انعامات
 ہیں۔ اور دوسری طرف گمنامی کے ٹھوس فائدے آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ دونوں
 میں کون سا پلہ بھاری ہے۔ تاکہ فلسفہ کی رو سے تعلیم یافتہ آدمی وہ ہے جو کامیابی
 ہونے پر یقین نہ کرے کہ اس نے کامیابی حاصل کر لی۔ اور جب ناکام ہو تو اُسے

قسمت کیا ہے

۲۸۹

اپنی ناکامی پر کبھی اعتبار نہ آئے۔ اس کے برعکس نیم خواندہ بلکہ نیم جاہل شخص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اسکے لئے ظاہری کامیابی یا ظاہری ناکامی بڑی ٹھوس اور قطعی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن سے گویا مفری نہیں۔ چنانچہ بدعہمت اور تاؤست میں فرق یہ ہے کہ بدعہمت کے پیرو کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ اُسے کسی کی ضرورت نہ پڑے۔ تاؤست کے پیرو کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ اُسے کسی کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ جس شخص کی ضرورت پہلک کو نہ ہو۔ وہی شخص بیچ و آلام سے آزاد رہ سکتا ہے۔ اور جو شخص بیچ و آلام سے آزاد ہوگا وہی خوش باش انسان ہو سکتا ہے۔ اسی کے لئے تاؤ کے فلسفے کے قابل ترین اور عظیم ترین فلسفی چونگ زے نے برابر یہ تعلیم دی کہ زیادہ تمنا بھی نہ بنو۔ زیادہ کام کے آدمی بننے کی کبھی پیشکش نہ کرو۔ زیادہ اچھے کارکن بننے سے لانا طور پر گریز کرو۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہی جانوروں کو دیوتاؤں کی قربانی کے لئے چمڑے چھتے جاتے ہیں جو خوب موٹے تازے ہو جائیں۔ زیادہ خوبصورت پرندوں کو شکاری ضرور شکار کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے رنگارنگ پروں کو نوچ سکیں۔ اسی سلسلے میں چونگ زے نے ایک حکایت بھی لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کفن چوروں نے ایک قبر کھودی کہ کفن اتالیس اور مردہ نکال لیں۔ انھوں نے ہتھوڑا لے کر مردے کی کھوپڑی توڑی۔ پھر جبروں کی ہڈیاں بھی چور چور کر ڈالیں۔ کیونکہ انھیں کسی نے بتایا تھا کہ اس قبر میں جو مردہ دفن ہے اُس کے منہ میں ایک انمول موتی ہے! گویا مردے کی بے حرمتی کا سبب یہ ہوا کہ اس نے ایک موتی منہ میں رکھ کر دفن ہونے کی حادثت کی ہے۔

اس سارے فلسفے اور بحث کا نتیجہ لازمی یہی نکلتا ہے کہ بے کاری اور

آزادہ روی کے مزے کیوں نہ لئے جائیں؟

۶۔ تین امریکی عیوب

آپ نے دیکھا چینی کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ "جو شخص کسی بات کی پروا نہ رکھے اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی! مگر امریکی اور اس چینی فلسفے میں بڑا عجیب تفاوت ہے۔ چینی فلسفہ بار بار پوچھتا ہے کہ کیا زندگی اس زبردست تگ دو کے قابل بھی ہے کہ ہم اپنی روح کو اپنے جسم کا غلام بنا کر رکھ دیں۔ آزادہ روی کے فلسفہ میں جو اعلیٰ روحانیت پرستی پہنا ہے۔ وہ اس غلامی کی سخت مخالفت کرتی ہے مگر امریکہ میں معاملہ برعکس ہے۔ اس موقع پر مجھے ایک مشہور امریکی کارخانہ کا اٹھتارہ یاد آتا ہے جس میں جلی حروفوں میں یہ لکھا تھا۔ جو چیز تقریباً ٹھیک ہو وہ ٹھیک نہیں ہوتی۔" گویا امریکی زندگی سو فیصدی کارگزاری اور عمدگی پر جان دیتی ہے میرے نزدیک کارگزاری اور عمدگی کی یہ شدید خواہش کوئی اثر لیانا یا حصول بات نہیں امریکیوں نے اپنی جان کو یہ روگ لگا رکھا ہے کہ اگر کوئی چیز تقریباً ٹھیک (اچھی خاصی) ہو تو وہ اس پر مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ اسے اور بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس چینی قوم کا شیوہ ہے کہ جو چیز تقریباً ٹھیک کے ضمن میں آتی ہو۔ وہ بالکل ٹھیک سمجھی جاتی ہے۔

اس طرح امریکی قوم کے تین بڑے عیوب یہ ہیں کہ امریکی اعلیٰ کارگزاری وقت کی ٹھیک پابندی اور دنیاوی کامیابی پر جان دیتے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے عام امریکیوں کی زندگی تلخ رہتی ہے۔ اور ان کے اعصاب تباہ ہو جاتے ہیں۔ ان تینوں باتوں کی بدولت امریکی قوم نے اپنے آپ سے فراغت کا اعلیٰ حق چھین رکھا ہے۔ اور فرصت کی خوبصورت اور بیکار شاموں سے اپنے آپ کو محروم

کر رکھتا ہے۔ دنیا میں ہمیں یہ سوچ کر زندہ رہنا چاہئے کہ اس دنیا میں کوئی بڑی
 بیٹا کوئی بڑے مصائب موجود نہیں۔ اور اگر کام کرنا بلکہ اعلیٰ فن ہے تو کام نہ کرنا اس سے
 بھی اعلیٰ فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آپ خطوں کا جواب بڑی پابندی اور باقاعدگی
 سے دیتے ہوں تو اس کا نتیجہ مجموعی طور پر اتنا ہی اچھا یا برسا ہوگا جتنا کسی خط کا
 جواب نہ دینے سے ہو سکتا ہے۔ خط لکھنے نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خطوں
 کے باقاعدہ جواب نہ لکھنے سے زیادہ سے زیادہ ہی ہوگا کہ آپ چند اچھی
 قسم کی ملاقاتوں اور تقریروں سے محروم رہیں گے۔ مگر یہ بھی سوچئے کہ اس طرح
 آپ چند فضول ملاقاتوں اور تقریروں سے بچ بھی تو جائیں گے۔ اصل میں زیادہ تر
 خطوط اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کا جواب لکھا جائے۔ اس آزمائش کی سادہ سی صورت
 یہ ہے کہ آپ ان خطوں کو تین ماہ تک اپنی میز پر رکھا رہنے دیجئے۔ تین مہینے
 بعد نہیں نکال کر پھر پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا جواب لکھنا محض وقت ضائع
 کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اصل میں خط لکھنا بھی ایک عیب یا کمزوری بن جایا کرتا
 ہے۔ کیونکہ خط لکھنے کے بدولت ہی اچھے بھلے ادیب سلیز مین بن جاتے ہیں۔ اور کالجوں
 کے پروفیسر کارڈ بارڈ بن جاتے ہیں۔ اس بنا پر امریکی نادل نگار تھور یو کو ان لوگوں
 سے نفرت محسوس کرتے ہیں۔ جو بڑی باقاعدگی سے ڈاک خانے آتے جلتے رہتے ہیں۔

میں کارگزاری اور مستعدی کے خلاف نہیں ہوں۔ اس کارگزاری کی بدولت
 دنیا میں قابل اعتماد چیزیں بن سکتی ہیں۔ مثلاً میں امریکہ کی ساختہ نل کی ٹوٹی کو زیادہ
 قابل اعتماد سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اس سے پانی فضول ٹپکتا نہیں رہتا۔ اور یہ بڑے
 اطمینان کی بات ہے۔ اصل میں جھگڑا دوسری بات کا ہے۔ یہ ایک پرانی لٹکار ہے کہ
 ہر انسان کو مفید کار گزار بننا چاہئے۔ اسے سرکاری ملازمت حاصل کر کے اختیار اس پر نبھانے

چاہئے۔ اس لکار کا جواب بھی اتنا ہی پُرانا ہے کہ دنیا میں ایسے جموں کی کمی نہیں۔ جو کارگزاری دکھانے پر تلے بیٹھے ہیں جو مصروف رہنا چاہتے ہیں اور جو اختیار حاصل کر کے بڑے خوش ہونگے۔ لہذا ہمارے بغیر بھی دنیا کا کام کاج چلایا جاسکتا ہے اور چلتا رہے گا۔ نکتہ یہ ہے کہ دانا لوگ کون ہیں؟ وہ جو آزادہ روادار آزادش ہیں۔ یا وہ جو مصروفیت اور کارکردگی پر جان دیتے ہیں۔ گویا مستعدی اور کارگزاری کے خلاف یہ اعتراض نہیں کہ اس کی بدولت دنیا کے کام کاج ہوتے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ مستعدی اور مصروفیت ہمارے وقت پر ٹکا کہ ڈالتی ہیں۔ ان کی بدولت ہمیں فراغت کا ایک لمحہ نصیب نہیں ہوتا۔ زندگی کا لطف اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی اور یہ معیار کی بہتری اور کام کی عمدگی ہمارے اعصاب تباہ کر دیتی ہیں امریکہ میں کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کو لیجئے۔ وہ اس فکر میں بال سفید کر لیتا ہے کہ اس کے اخبار یا رسالے کے صفحات پر طباعت کی کوئی غلطی نہ ہونے کے لیے اس سلسلہ میں چینی ایڈیٹر زیادہ دہشت مند واقع ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو اس روحانی خوشی کا موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کے اخبار یا رسالے میں کبھی کبھی طباعت کی چند غلطیاں بھی ڈھونڈ نکالیں۔ چینی ایڈیٹر تو بعض دفعہ سلسلہ دار ایک ناول چھاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر عین درمیان میں ناول کی ایک قسط چھاپنا بھول جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کی فروگزاشت امریکہ میں ہو تو امریکی ایڈیٹروں کی شامت آجائے۔ مگر چین میں یہ کوئی اہم بات نہیں۔ کیونکہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ امریکی انجینئر کسی دریا کا پل بنا لیں گے تو اتنی درستی اور محنت سے حساب لگائیں گے کہ اونچ کے دسویں حصہ میں بھی بال برابر کا فرق نہ رہ جائے۔ اور اگر دو چینی انجینئر ایک پہاڑ میں دو طرفت سے سڑک کھودنا شروع کریں تاکہ درمیان میں آکر مل جائیں تو دونوں کے دونوں پہاڑ کے

آر پار دوسرنگیں کھود لیں گے۔ جینی مزاج کا یہ اعتقاد ہے کہ پہار میں سے سرننگ نکالنی مقصود تھی سو اب ایک کے بجائے اگر دوسرنگیں نکل آئیں تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ اب ایک کے بجائے دو راستے بن گئے ہیں۔ اگر کام ختم کرنے کی جلدی نہ ہو تو دو سرنگیں بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی ایک سرنگ ہو سکتی تھی۔ شرط یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ دوسرنگیں نکل نہ جائیں۔ اور ان میں سے کازن بھی گزر سکے پھر جینی قوم اتنی بے قاعدہ بھی نہیں۔ اگر آپ انھیں کوئی کام کرنے کی کافی ہدایت دیدیں تو جینی وقت کی پابندی بھی کر لیتا ہے۔ جینی ہر کام کو گوشوارہ کے مطابق ختم کر سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ کام مکمل کرنے کا یہ گوشوارہ مختصر نہ ہو ذرا طویل ہو۔

مصیبت یہ ہے کہ صنعتی تہذیب کی بدولت زندگی شاندار فراغت اور سہل انکاری سے محروم ہو گئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ صنعتی تہذیب نے وقت کے متعلق ایک مختلف نظریے کو ہم پر سوار کر دیا ہے جیسا کہ پیمانہ انسان نہیں بلکہ کل پرزوں سے بنی ہوئی گھڑیاں ہیں۔ یہ گھڑیاں رفتہ رفتہ انسان کو بھی ایک گھڑی بنا کر دم لیتی ہیں۔ مشرق میں صنعتی لہے پھیلنے سے یہ بات بھی ضرور آئے گی کیونکہ اگر چین میں کوئی ایسا کارخانہ قائم ہو جس میں پورے بارہ ہزار مزدور کام کرتے ہوں تو انھیں اپنی مرضی اور خوشی سے حسب ان کا جی چاہے کام کرنے پر اجازت کیے دی جا سکتی ہے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وقت کا یہ تعین اور یہی پابندی زندگی کو اتنا کٹھن اور اتنا طوفانی بناتی ہے اگر آپ کو ٹھیک پانچ بجے شام کہیں پہنچنا ہو تو آپ کی ساری سہ پہر غارت ہو چکی اور ایک سے پانچ بجے تک کا وقت کبھی کام نہیں آئیگا۔ مگر امریکی لوگ دن اور رات کو گھڑیاں اسی طرح مخصوص اور تعین کرتے رہتے ہیں جس طرح ایک اسکول کے بچے کا نام ٹیل بتاتا، تین بجے

یہ کرنا ہے۔ پانچ بجے فلاں کام ہے۔ ساڑھے چھ بجے کپڑے بدلے جائیں گے ساتھ
بچاس پرس میں سوار ہوتا ہے۔ اور پورے سات بجے فلاں ہوٹل میں پہنچ جاتا ہے
یہ سب کیا ہے؟ اگر جینا یہی ہے تو اس سے تو موت اچھی ہے۔

اس چکر میں امریکی لوگ یہاں تک گرفتار ہیں کہ نہ صرف ان کا کل دن
بک ہے بلکہ پورے ہفتے ہفتے بلکہ سارے مہینے کا پروگرام بھی بنا بنایا تیار ہے
چین میں اس کا تصویری شکل ہے۔ چین میں آج سے تین ہفتہ بعد ملاقات کا وعدہ
اسی چیز ہے جس کا ذکر کسی نے نہیں سنا۔ چین میں اگر کوئی شخص دعوتی رقعہ وصول
کرے تو اسے یہ نہیں کہنا پڑتا کہ میں اس دعوت میں شریک ہوں گا یا نہیں وہ امریکیوں
کی طرح دعوتی رقعوں کی منسلک فہرست پر یہ لکھ دیتا ہے کہ اوں گایا میں نہیں آ سکتا
تسکر یہ۔ مگر وہ صرف یہ لفظ لکھ دیتا ہے "اطلاع پائی" اس کا مطلب یہ ہے کہ
مجھے دعوت مل گئی۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ دعوت میں شامل ہو گا یا
نہیں۔ گویا اسے اپنی نیت اور ارادے کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔ دھرا امریکہ اور یورپ
کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ آج اگر سنگھائی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ تو وہ بڑے
یقین کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ آج سے اتنے عرصہ بعد ۵ مئی ۱۹۵۵ء کو تین بجے
سہ پہر پرس میں ایک کمپنی کے جلسہ میں شامل ہوں گے۔ ۱۵ مئی کو سات بجے تمام
کی گاڑی سے دی آنا پہنچیں گے۔ میں پوچھتا ہوں اگر ایک سہ پہر کا خون کرنا ہی
مطلوب ہے تو اتنی مدت پہلے اسکے خون کا اعلان کرنے کی کیا تک ہے؟ کیا یہ
ہو سکتا کہ ایک خدا کا بندہ اپنی مرضی سے سفر کرے۔ جب جی چاہے کہیں ٹھہر جائے
اور جب جی چاہے پھر سفر پر روانہ ہو جائے۔

امریکہ کے لوگ فراغت اور آزاد روی سے محروم آسمانے ہیں کہ امریکہ

میں ہر شخص کام کرنے پر تیار رہتا ہے۔ اور عمل کو زندہ رہنے سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ہمارا مطالبہ تو یہ ہونا چاہئے کہ زندگی میں امتیاز کی شان ہو۔ آئی طرح جیسے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر عظیم فن پارے میں کوئی خصوصیت۔ کوئی امتیاز ہونا چاہئے بد قسمتی سے امتیازی شان اور خصوصیت ایسی چیز نہیں جسے شب بھر کی فرصت میں تیار کر لیا جائے۔ پرانی شراب کے جوہر کی طرح زندگی میں امتیازی شان بھی وقت گزرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سکون سے پردرش پاتی ہے مگر امریکہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی عمر کے مردوں اور عورتوں کو بھی کام کرنے کی دھن سوار رہتی ہے۔ گویا اس طرح وہ اپنی عمر نفس اور کم عمر لوگوں کا احترام حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں یہ بات ایک مشرقی کوچید مضحکہ خیز معامہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس رسیدہ شخص زیادہ کام کرے تو اچھا نہیں لگتا کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے گویا علمی گانے یا ناچ کی کوئی دھن شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ سے نشر کی جا رہی ہے۔ کیا یہی کافی نہیں کہ کچھ بوڑھے آدمی دنیا میں موجود ہیں؟ کیا ان کے وجود کی شہادت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے رہیں؟ ادھیڑ عمر کے شخص کو بھی اگر فراغت اور بیکار زندگی گزارنے کا سلیقہ ہو۔ یا وہ اس نعمت سے بالکل محروم ہو تو یہی کافی بڑا جرم ہے۔ بڑھاپے میں بے مشغلہ زندگی گزارنے سے محروم رہنا تو انسانیت کے خلاف بہت بڑا جرم ہے۔

اصل یہ ہے کہ کردار کے امتیاز اور خصوصیت کا تعلق ہمیشہ بڑھاپے سے ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کو پر دان جڑھنے میں وقت لگتا ہے۔ کسی ادھیڑ عمر کے شخص کا چہرہ دیکھئے۔ اس پر جو لکیریں ہیں وہی اس شخص کے کردار کے مستقل نقوش ہیں۔ مگر ان لکیروں کے واضح ہونے اور ایک دلکش صورت اختیار کرنے کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے؟ ان لوگوں میں کردار کی کیا خصوصیت ڈھونڈیے گا!

جن کی زندگی چیزوں کو تہ و بالا کرنے میں گزرتی ہے۔ جو ہر نئے سال کے آنے پر گزشتہ سال کی کار کو بیچ کر نیا ماڈل خریدنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہم جو چیزیں بناتے ہیں ان کی ناپائنداری ہم میں سرایت کر جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سترہ سالوں میں ہر مرد عورت ۱۹۳۷ نظر آتا ہے اور ۱۹۳۸ میں ہر شخص ۳۵ سالہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ یوں کہنے کو ہمیں پُرانی کتابوں۔ قدیم قلمی نسخوں۔ پُرانے فرنیچر پرانے چاندی کے برتنوں۔ پُرانی تصویروں۔ پُرانی تاریخی عمارتوں سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ مگر اس زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہم نے پختہ عمری کے حسن کو بالکل فراموش کر رکھا ہے میں سمجھتا ہوں بڑھاپے میں جو حسن ہے اس کا شعور ہماری زندگی کے لئے بڑا ضروری ہے کیونکہ میرے نزدیک حسن۔ بختگی۔ سبیلے پن اور پتے پن کا نام ہے!

بعض اوقات ایک پیغمبرانہ رویا میرے سامنے آتا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ آج سے ایک ہزار سال بعد ایک ایسا باسعادت دور آئے گا۔ جب مصروف ترین شہروں میں زندگی کی رفتار سبک اور دھیمی ہو جائے گی۔ اور دھکم پیل اور چھینا جھپٹی کی جگہ فراغت اور آزاد روی آجائے گی۔ شرفالمسی عبا میں پہنے روٹوں پر آرام سے ٹہلتے پھریں گے۔ جو رابے میں جو سیاہی کھڑا ہوگا۔ وہ آہستہ چلنے والے ہر ڈرائیور سے دعا سلام کرے گا۔ خود گاڑیوں کے ڈرائیور جگہ جگہ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کی خیریت پوچھا کریں گے۔ اور ساری ٹریفک آرام سے رواں رہیگی کوئی شخص اپنی دکان کے سامنے کھڑا ہو کر دانت صاف کرتا نظر آئے گا اور ساتھ ساتھ ہمسایہ دکاندار سے باتیں بھی کرتا جائے گا۔ کبھی کبھی کوئی عالم بھی لٹلے کا جس نے ایک کتاب موڑ توڑ کر اپنی عبا کی آستین میں ٹھونس رکھی ہوگی آج کی طرح اس باسعادت دور میں ایسے سر راہ طعام خانے نہیں ہوں گے جہاں لوگ کھڑے کھڑے دیکھ کر کھانا

سخت جلدی میں نگلا کرتے ہیں۔ بلکہ مشینوں سے چلنے والے ہوٹل ہوں گے۔ جہاں لوگ نرم اور آرام دہ کرسیوں میں آرام سے نیم دراز رہیں گے۔ اور کھانے کی ہر چیز خود بخود ان کے پاس مشینیں پہنچائیں گی۔ لوگ اس وقت پورا پورا دل چاہے خانوں میں آرام سے باتوں میں گزارنے کا فن سیکھ چکے ہوں گے۔ ہر شخص سنگترے کے رس کا ایک گلاس پینے میں پورا آرام دہ گھنٹہ صرن کیا کرے گا لوگ یہ سیکھ جائیں گے کہ شراب ہلکے ہلکے گھونٹ لے کر پینی چاہئے۔ اور ہر گھونٹ کے بعد اچھی اچھی باتیں کہنی سنی چاہئیں۔ اب کی طرح نہیں کہ جام اٹھایا اور حلق میں اُنڈیل لیا۔ اس دور میں ہسپتالوں میں نام لکھانے کی بدعت نہ ہوگی ہنگامی حادثوں کے لئے فوری امداد کے وارڈ کسی ہسپتال میں نہ ہوں گے۔ کیونکہ فوری حادثے ہو ہی نہیں کریں گے۔ اور مریض اپنے ڈاکٹروں کے ساتھ زندگی کے فلسفہ پر باتیں کیا کریں گے۔ آگ بجھانے والے انجن جوں کی چال چلیں گے اور ان انجنوں کا عملہ راستہ میں رک رک کر آسمان پر اُرتی ہوئی مزعاجیا دیکھے گا۔ اور آسپس میں بچنے کے لوگ مرغابیوں کی تعداد پوچھتے کیسا کریں گے۔

مگر کیا کیا جائے پُرسور شہر دل پر اس قسم کا دور سعید آنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اگر یہ دور آجائے تو لوگوں کو کتنی فارغ اور بے مصرت سے پھر زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے مل جائیں۔

بائشتم
گھر گھر کے مزے

- ۱۔ بہم کے تقاصے
- ۲۔ تجرد اور کنوار پن
- ۳۔ جنسی کشش
- ۴۔ چینی گھر کی تصویر
- ۵۔ پر وقار بڑھاپا

احسب کے تقاضا

میرے نزدیک کسی تہذیب کے پرکھنے کا فیصلہ کن امتحان یہ ہے کہ اس تہذیب نے کس قسم کے شوہر کیسی بیویاں اور کیسے ماں باپ دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں؟ یہ سوال ہی سادہ ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے سامنے تہذیب کے باقی تمام کارنامے آرٹ، فلسفہ، ادب، مادی ترقی سب کے سب ماند پڑ جاتے ہیں۔

میرے جو ہم وطن مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا مقابلہ کرنے میں سرکھیا تھے رہتے ہیں میں انہیں دوا کی یہی ایک خوراک بلاتا ہوں۔ اور اس سے انہیں فوراً سکون ہو جایا کرتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ مغربی زندگی کے مشرقی طالب علم جا ہے وہ مشرق میں رہتے ہوں۔ یا مغربی ملکوں میں زیر تعلیم ہوں مغرب کی خیرہ کن مادھی ترقی سے بھونچکا ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مغربی ملکوں نے طبقاتِ لاکھ اور ظلمت سے لے کر آسماں بوس عمارتیں بنانے۔ شاندار سرکھیا تعمیر کرنے۔ اور قدیم رنگوں میں تصویر لینے والے کیمرے تک بنا ڈالے ہیں۔ مشرقی طالب علم یا تو مغربی ملکوں کے ان کارناموں کے گن گاتا پھرے گا۔ یا اسے یہ ندامت انگیز ہوگی کہ مشرق اس میدان میں مغرب سے کتنا پس ماندہ ہے۔ اور یا دونوں حسا باری باری اس پر غلبہ پاتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کمتری کے احساس کا خواہ مخواہ شکار ہو جائے گا۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑے غرور اور ڈری ہٹ دھرمی بلکہ سخت تعصب کے ساتھ مشرقی تہذیب کا ترجمان اور پیل بنائے گا حالانکہ

جنم کے تقاضے

۳۰۱

اسے کچھ پتا نہیں ہوگا کہ اسے کہنا کیا چاہئے۔ اور وہ کہہ کر کیا رہا ہے۔ اس کے ساتھ
 اسی وہ فہمینی طور پر مغرب کی آسماں بوس عمارتوں۔ شاندار مٹرکوں اور شاہراہوں میں
 سو سو کیرے ڈالے گا۔ راجھے کیمروں کو بڑا کہنے والا مجھے آج تک کوئی مشتری
 یا چینی نہیں ملا۔ ظاہر ہے اس بچارے کی حالت قابل رحم ہوگی۔ کیونکہ وہ
 ٹھنڈے دل سے اور معقولیت کے ساتھ نہ تو مغرب کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔
 نہ شرق کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے۔ پس اسے تو کمتری کے خیالات پریشا
 کر دیں گے۔ اس کی آنکھیں چندھیا میں گئے۔ اس کے اندازوں میں رخصت انداز
 ہونگے۔ یہی وہ شخص ہے جسے سکون دینے والی دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ اس کے
 دماغ کا بخار کم ہو۔

میں نے تہذیب کی خوبی کا جو امتحان تجویز کیا ہے اس کا اثر بڑا عجیب ہوتا
 ہے۔ اس امتحان کی بدولت تمام انسان برابر برابر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس
 امتحان کی وجہ سے ایک تہذیب و ثقافت کی تمام غیر ضروری چیزیں رکھنا مٹا
 پیر رکھے رہ جاتے ہیں اور ساری انسانیت اخوت اور برابری کی ایک سادہ سطح
 پر آ جمع ہوتی ہے۔ تہذیب کے باقی تمام کارنامے صرف اسی ایک مقصد
 کو حاصل کرنے کے ذریعے بن جاتے ہیں کہ یہ تہذیب بہتر شوہر بہتر بیویاں بہتر باپ
 اور بہتر مائیں پیدا کر سکے۔ کل انسانوں میں نوے فیصد کے زیادہ شوہر اور بیویاں اور
 فیصدی انسانوں کے ماں باپ ہو کرتے ہیں اسکے علاوہ شادی اور گھر ملو زندگی ایک انسان کی زندگی
 کا سب سے دلچسپ پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ جو تہذیب بہتر قسم کے خاوند بیویاں اور ماں
 باپ پیدا کر سکے گی وہی انسانی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنا سکتی ہے۔ لہذا وہی تہذیب اپنے
 درجہ کی تہذیب گنی جاگی لوگوں کے کام کاج کی اچھائی بڑائی سے کہیں اہم بات یہ ہے کہ جن میں

گھر گریہ کے مزے

ہمیں زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ کس نمائش اور کس معیار کے لوگ ہیں۔ جو تہذیب ایک
 نوجوان لڑکی کیلئے بہتر قسم کا شوہر مہیا کرے لڑکی کو اس تہذیب کا شکر گزار ہونا چاہیے
 میں مانتا ہوں کہ اچھائی ایک اصنافی چیز ہے۔ اور ہر زمانے اور ہر ملک میں انسانی
 قسم کے خاوند بیویاں مائیں اور باپ بھی ہوتے ہیں۔ مگر بہتر قسم کے خاوند اور بہترین
 بیویاں ڈھونڈنے کا سب سے اچھا طریقہ انسانی فعلیات کا علم ہے۔ کیونکہ اگر اس علم
 کے ذریعے سے جوڑے ڈھونڈے جائیں تو بیویوں کو تعلیم دے کر اچھی بیویاں بنانے
 اور شوہروں کو تعلیم دے کر اچھے شوہر بنانے کی رحمت نہیں ہوگی۔ اسکے برعکس
 یہ بھی یاد رکھئے کہ نسل کشی کے اس انتظام کی بدولت گھریلو زندگی تو معدوم
 ہو جائے گی۔ اور جو تہذیب گھریلو زندگی سے چشم پوشی کرے۔ یا گھریلو زندگی کو
 بہت معمولی حیثیت دے وہ گھٹیا قسم کے افراد ہی پیدا کر سکتی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میں کچھ جسمانی قسم کی باتیں کر رہا ہوں۔ مگر میرا تعلق ہی جسم
 اور حیاتیات سے ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ہر مرد و عورت کا تعلق انہیں سے ہوتا ہے۔
 ہر شخص جسمانی طور پر ہی خوشی۔ غم۔ رنج۔ غصہ محسوس کرتا ہے۔ ہم جاہے محسوس کریں یا
 نہ کریں۔ ہماری آرزو مندی۔ جاہ طلبی یا حوصلے بھی جسمانی چیزیں ہیں۔ ہماری
 مذہب پسندی اور امن پسندی بھی جسمانی ہوتی ہے۔ ہماری بشریت کا تقاضا ہی
 ہے اور اس حقیقت سے ہم انکھیں نہیں چر اسکے کہ ہم جسم اور حیاتیات کے
 چکرتے نکل نہیں سکتے۔ ہم اس جسم کے ساتھ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے
 ہیں۔ اور اس کی چپساتیوں سے دودھ پیتے ہیں۔ پھر ٹیٹے ہو کر شادیاں
 کرتے ہیں۔ اور اپنے بچے پیدا کرتے ہیں۔ ہر مرد ایک عورت
 کا لاکھ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور لگ بھگ ہر مرد زندگی بھر ایک

حسب کے تقاضے

۳۰۳

نہ ایک عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا باب بجا بنتا ہے
 ہر عورت بھی عورت کی کو کھڑے سے پیدا ہوتی ہے۔ قریب قریب ہر عورت
 ایک نہ ایک مرد کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ اونچے پیدا کرتی ہے بعض لوگ
 ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ماں باپ بننے سے گریز کرتے ہیں۔ مگر اس کا ثبات میں
 ایسے درخت اور ایسے پھول بھی تو ہیں جو اپنی نوع کے درخت اور پھول پیدا
 کرنے کے لئے بیج نہیں چھوڑتے۔ آپ چاہیں تو اپنے بچے پیدا نہ کریں۔ مگر آپ باپ
 سے گریز نہیں کر سکتے کہ آپ کے ماں باپ کوئی نہ ہوں۔ کوئی درخت بھی یہ انکار
 نہیں کر سکتا کہ میں ایک بیج سے پیدا نہیں ہوں گا۔

اس ساری بات کا نتیجہ یہ مینیا دی حقیقت ہے کہ زندگی میں سب سے
 ابتدائی اور بنیادی رشتہ مرد و عورت اور بچے کا رشتہ ہے۔ لہذا زندگی کا کوئی
 فلسفہ اس وقت تک موزوں اور مناسب فلسفہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اس بنیادی
 رشتہ پر ہر پہلو سے نظر نہیں ڈالتا۔ بلکہ میں تو ایسے فلسفہ کو فلسفہ ماننے سے بھی منکر ہوں
 مرد اور عورت کا باہمی رشتہ ہی کافی نہیں اس رشتہ کی بدولت بچوں کی
 پیدا آئش لازمی ہے۔ ورنہ میرے نزدیک مرد و عورت کا یہ باہمی رشتہ ادھورا اور
 نامکمل ہے۔ دنیا کی کسی تہذیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مرد یا عورت کو بچے
 پیدا کرنے سے محروم کرے۔ مجھے بتایا جانا ہے کہ آج کل کے زمانہ میں بچے پیدا کرنے
 کا مسئلہ بٹائیڑھا ہو گیا ہے۔ اور بہت سے مرد یا عورت یا تو شادی ہی نہیں کرتے
 یا پھر شادی کرنے کے بعد کسی نہ کسی وجہ سے بچے پیدا نہیں کرتے۔ میں اس بارے
 میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ چاہے بچے پیدا کرنے کی وجہ کچھ ہو اگر اس
 دنیا سے کوئی مرد یا کوئی عورت بچے پیدا کرنے کے بغیر چلے۔ تو وہ

گھر گریہت کے منے

اپنے خلاف دنیا کے سب سے بڑے جرم کے ترکیب ہونگے۔ اس سلسلہ میں بانجھ پن کا بہانہ پیش نہ کیجئے کیونکہ اگر یہ بانجھ پن جسمانی ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ انسانی جسم ہی اور مفلوج ہے اور اگر یہ بانجھ پن مصنوعی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے بچے پیدا نہیں کئے جاتے تو پھر یہ مہنگائی غلط چیز ہے۔ اور اگر اسکی وجہ یہ ہے کہ شادی کا معیار بہت اونچا ہے۔ تو پھر یہ معیار غلط ہے۔ اگر یہ بانجھ پن انفرادیت پسندی کے جھوٹے فلسفے کا پیدا کردہ ہے تو یہ فلسفہ غلط ہے۔ اور اگر یہ بانجھ پن سماجی نظام کا شاخسانہ ہے تو وہ سماجی نظام ہی سرے سے غلط ہے۔ آج نہیں تو آج سے چار پانچ صدی بعد کا ترقی یافتہ انسان مرد و عورت دونوں یہ بھی طرح سمجھ لیں گے کہ انسان کی زندگی کا مقصد حیاتیات ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بیسویں صدی حیاتیات کی صدی شمار ہوگی۔ اسی طرح جیسے انیسویں صدی علوم طبعی کے تقابلی مطالعے کی صدی تھی۔ انسان جب ترقی کرتے کرتے اس منصب کو پہنچے گا کہ وہ اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔ اپنی جیسی خصوصیات کے خلاف برابر جنگ کرنا چھوڑ دے تو وہ اس قسم کی سیدھی اور موٹی عقل کی باتیں زیادہ آسانی سے سمجھ لیا کرے گا۔ ابھی سے آٹھارہویں صدی میں کہ انسان نے سادگی کی دانائی کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ اور وہ حیاتیاتی اور طبی میدانوں میں کچھ ترقی کرنے لگا ہے۔ کیونکہ ہمارے آپ کے زمانے میں ہی مشہور ماہر نفسیات ڈرگ امیر طبقہ کی بیمار عورتوں کو یہ مشورے دیتا ہے کہ وہ کسی گاؤں میں جا کر رہیں۔ مرغیاں اور بچے لہیں اور بزیوں کی کاشت کریں۔ ان امیر عورتوں کا اصل مرض یہ ہوتا ہے کہ وہ جسمانی اور حیاتیاتی طور پر نکلی اور بے ثمر ہو جاتی ہیں۔ یہاں کہ ان کا حیاتیاتی فعل بہت ادنیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ طرح طرح کی اصلی اور خیالی

بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

مرد تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ڈھب نہیں سیکھ سکے۔ حالانکہ کوئی مرد آج تک عورت کے بغیر اس دنیا میں نہیں رہا۔ اگر ہر شخص یہ حقیقت ذہن میں رکھے کہ مال کے بغیر وہ دنیا میں پیدا نہ ہونا تو وہ کبھی عورتوں کے بارے میں حقارت آمیز باتیں نہیں کر سکتا۔ مرد پیدائش سے لے کر موت تک عورتوں ہی میں گھرا رہتا ہے۔ عورت کبھی ماں کبھی بیوی کبھی بہن کبھی بیٹی کے روپ میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص شادی نہیں کرتا تو بھی اُسے انگریز شاعر ولیم ورڈز ورث کی طرح اپنی بہن کی رفاقت میں زندگی بسر کرنی ہوگی یا فلسفی ہربرٹ اسپنسر کی طرح اپنے گھر کی منتظر کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص اپنی ماں یا اپنی بہن کے ساتھ اچھے تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔ تو دنیا کا کوئی فلسفہ اس کی مدد نہیں کر سکے گا۔ اور اگر وہ اپنے گھر کی تنخواہ دار منتظر کے ساتھ بھی ٹھیک تعلقات استوار نہیں کر سکتا۔ تو اس پر خدا ہی رحم کرے۔

جو شخص عورت کے ساتھ مناسب تعلقات قائم نہیں کر سکا۔ اور جو انگریز ڈرامہ نگار اور شاعر آسکر وائلڈ کی طرح اخلاقی بے راہ روی میں زندگی گزارے اس کی زندگی بڑی قابل رحم ہوتی ہے۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہے مگر عورت کے بغیر بھی زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ اس قول سے مجھے خیال آتا ہے۔ کہ سینکڑوں صدیوں پہلے ایک ہندو رشی نے جو تخلیق کی کہانی لکھی تھی انسانی عقل و دانش اس کہانی سے ایک اونچے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کہانی کے وقتوں میں انسانی دانش جس منزل پر تھی آسکر وائلڈ کے اس مشہور فقرے کے وقت یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں بھی وہیں کی وہیں ہے۔ کیونکہ چارھزار

برس پہلے اس ہندو رشی نے بالکل ہی بات ایک کہانی کے قالب میں کہہ دی تھی۔
تخلیق کی یہ کہانی یوں ہے۔

خدا نے عورت کی تخلیق کے لئے پھولوں کا نکھار پرندوں کے نغے
توہین قرع کے رنگ نسیم کی سبک روی موجوں کی مہنسی۔ بکری کے بچے
کی نرم دلی۔ لومڑی کی عیاری اور مکاری۔ بادلوں کی آوارگی اور پھاروں
کا تلون بہم پہنچایا۔ اور ان چیزوں کے خیمے سے عورت پیدا کر کے اسے مرد کے
حوالے کیا۔ کہ وہ اسے اپنی بیوی بنائے۔ یہ آدم اپنی حوا کو پا کر بہت خوش ہوا
اور یہ آدم اور حوا دونوں خدا کی اس خوبصورت زمین پر سیر کرنے نکل گئے
لیکن چند ہی دن بعد آدم خدا کی حضور میں حاضر ہوا اور پولا۔ یہ عورت مجھ
سے واپس لے لیجئے۔ میں اس کے ساتھ اب ایک دن بھی بسر نہیں کر سکتا۔
خدا نے آدم کی یہ عرض اٹھائی۔ اور حوا کو واپس بلا لیا۔ چند دن گزرے
تو آدم پھر خدا کے پاس حاضر ہوا اور بولا میری عورت مجھے پھر عنایت ہو۔
کیونکہ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چند دنوں میں
آدم بہت مغموم رہنے لگا تھا۔ خدا نے اس کی درخواست کو سنا اور اس کا
حوا سے واپس کر دی۔ چند دن بعد آدم پھر خدا کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا مجھ پر
گرم کیجئے جس حوا کو آپ نے پیدا کیا ہے اسے اپنے ہی پاس رکھئے۔ آپ کی قسم
میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ خدا نے اپنی لامحدود دہش کے بل پر آدم
کی یہ درخواست پھر تظہر کر لی۔ آخر چوٹی بار آدم جیب خدا کے پاس حاضر
ہوا۔ اور یہ شکایت کی کہ وہ بے چوں ساتھی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا
تو خدا نے اس سے وعدہ لیا کہ اب کی بار وہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا

جسم کے تقاضے

۳۰۷

اور یہ کہ خواہ کچھ ہو اپنی عورت کے ساتھ نباہ کرے گا۔ اور آئندہ
دوڑوں اپنی عقل کے مطابق خدا کی زمین پر اکٹھے زندگی گزاریں گے! ”
میں سمجھتا ہوں آج بھی وہی حال ہے۔ جو چار ہزار سال پہلے اس کی کہانی میں
بنا یا گیا ہے۔ اور اس کیفیت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

۲۔ تہجد اور کنوارین

تہذیب کا ایک غیر فطری شاحنا

انسانی زندگی کے باڑے میں جیسا تیا تیا نقطہ نظر بڑا سادہ اور بڑا فطری ہے
مگر اس کی قبولیت سے دو قسم کی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف انفرادیت
پسندی اور گھریلو زندگی کی کشمکش ہے۔ اور دوسری طرف عقل کی خشک فلسفہ طرزی
اور انسانی فطرت کے فلسفہ کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش کی وجہ یہ ہے کہ انفرادیت
پسندی اور خشک عقلی فلسفہ دونوں۔ انسان کو گھر گھرست کے حسن اور دل کشی
سے اندھا بنا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں سے عقل پرستی زیادہ خطرناک چیز ہے۔
ہو سکتا ہے جو شخص انفرادیت کا قائل ہو۔ اس کے تمام منطقی نتائج پر بھی
دسترس رکھتا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ ذہن رسا بھی رکھتا ہو۔ اور ذی فہم آدمی
ہو۔ مگر جو شخص قطعی طور پر عقل پرستی کا غلام ہو چکا ہو وہ بڑا احمق
ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دل اور دل کے جذبات اور ان کے خلوص اور گرمی سے
بے تعلق ہو جاتا ہے اصل یہ ہے کہ ایک طائندان کی چھت ساعی زندگی کے پھر
بھی کچھ بدل پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر انسان سے باپ کی شفقت اور ماں کی
ماتنا۔ اور بچے پیدا کرنے کی خوشی چھین جائے تو اس کا دنیا میں کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا

انسان اس دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا۔ نہ وہ تنہا رہ کر خوش رہ سکتا ہے
 انسان زندگی بسر کرنے کے لئے گروہ ڈھونڈتا ہے۔ وہ گروہ جو تعداد کے لحاظ سے
 اس سے بڑا ہو۔ انسان کا نفس اصلی اس کے جسم کے مطابق محدود نہیں۔ کیونکہ
 اس کا ذہن اور اس کی معاشرتی سرگرمیاں محدود نہیں ہوتیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ
 ہر دور میں ہر ملک میں اور ہر قسم کی حکومت کے سائے تلے انسان کی اصلی زندگی
 اپنے زمانے اور اپنے ملک کی وسیع اجتماعی زندگی کے مقابلہ میں اس چھوٹے سے گروہ کے ساتھ
 وابستہ ہوتی ہے۔ جو اس کے شناساؤں کا گروہ ہے۔ یہی اس کی ذاتی سرگرمیوں کا
 حلقہ ہوتا ہے۔ اسی معاشرتی گروہ میں انسان چلتا پھرتا۔ اٹھتا بیٹھتا ہے اس کا وجود
 اسی گروہ سے ہے۔ یہ گروہ چاہے کوئی اسکول ہو یا قید خانہ کوئی کاروباری ادارہ
 ہو۔ خفیہ انجمن ہو یا کوئی کار خیر کا ادارہ انسان اسی گروہ کی زندگی کے ساتھ زندگی بسر
 کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ معاشرتی گروہ گھر اور گھر ملیو زندگی کی جگہ لے لے یا گھر ملیو زندگی کو
 ایک الگ اور مستقل معاشرتی وجود کی حیثیت سے بالکل ہی ختم کر ڈالے۔ بعض اوقات
 مذہب کی لگن یا کوئی بڑی سیاسی تحریک انسان کی گھر ملیو زندگی اس کی کایا لیا لیل
 نکل لیا کرتی ہے۔ لیکن ان تمام معاشرتی گروہوں میں سے گھر ہی اسی معاشرتی وحدت
 ہے۔ جو حقیقی ہے۔ جس کا وجود فطری ہے۔ جو ہماری زندگی کا سب سے تسلی
 بخش با معنی اور سب سے درست حصہ ہے۔ گھر کا وجود فطری اس لئے ہے کہ چنانچہ
 پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک گھر میں پاتا ہے۔ اور پھر گھر ہی زندگی بھر اسکے
 ساتھ رہتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر گھر بڑی حقیقی چیز ہے۔ کیونکہ خون کا رشتہ ایک
 بڑی برادری اور پھر ایک نفس واحد کا تصور سامنے لاتا ہے۔ جو شخص اجتماعی زندگی
 کے اس قدرتی ادارہ میں کامیابی سے زندگی بسر نہیں کرتا اس سے یہ

امید کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ دوسرے معاشرتی گرد ہوں میں بھی کامیابی سے زندگی بسر کر لے گا۔ اس لئے کنفیو شس نے کہا ہے۔

بچوں کو یہ سیکھنا چاہئے کہ وہ گھر میں سعادت مندی سے رہیں۔

میں ہند ب ہونا سیکھیں۔ بچوں کو راستباز اور دیانتدار ہونا چاہئے ہر شخص سے محبت کرنی چاہئے۔ اور اچھے لوگوں میں بیٹھنا اٹھنا چاہئے اگر ان باتوں پر عمل کرنے کے بعد بھی ان میں کچھ ہمت باقی رہ جائے تو پھر انہیں چاہئے کہ کتابیں پڑھیں۔

ابتدائی زندگی کی اس اہمیت سے قطع نظر انسان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ دوسری جنس کے ایک مناسب فرد کے ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ مرد کی شخصیت اسی ہم رشتگی کی بدولت اظہار پا سکتی ہے۔ اور مکمل ہو کر اپنے اوج کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

عورتوں میں حیاتیات کا شعور مرد کی بہ نسبت گہرا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی ہر لڑکی چاہے چینی ہو یا امریکی غیر شعوری طور پر اپنی شادی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ قدرت نے عورت کو اتنا زبردست مادانہ جذبہ عطا کر رکھا ہے کہ کوئی بھی مصنوعی تہذیب اس جذبے کو پس پشت نہیں ڈال سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت عورت کو صرف ماں کی حیثیت سے پیدا کرتی ہے۔ مرد سے ہم رشتہ ہونے کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسی لئے قدرت نے عورت کو ایسی ذہنی اور اخلاقی خصوصیات سے نوازا ہے جو عورت کے ماں بننے کے لئے مفید ہو سکیں۔ یہ ذہنی اور اخلاقی خصوصیات ماما کے جذبے میں سمو گئی ہیں۔ اور یہی جذبہ عورت کی ان خصوصیات کا سب سے بڑا جواز ہے۔

گھر گریہ کے منہ

مخصوصیات کیا ہیں؟ حقیقت پسندی۔ صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت چھوٹی
چھوٹی چیزوں پر پوری توجہ دینے کا ملکہ۔ چھوٹی اور بے سہارا چیزوں کے لئے ترس
کا جذبہ۔ کسی نہ کسی شخص کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے۔ اس کی جبر گری کرنے کی
شدید خواہش۔ جسمانی محبت کا دفور۔ نفرت میں شدت۔ جذباتی لگاؤ اور گن دونوں میں
من مانی کرنا اور ہر چیز کے بارے میں ذاتی نقطہ نظر قائم کرنا۔ یہ عورت کے مخصوص
ذہنی اور اخلاقی امتیازات ہیں۔ کوئی فلسفہ اگر یہ گوشش کرے کہ عورت کے مادرانہ
جذبہ کا خیال کئے بغیر اس کی زندگی کو خوشگوار بنائے تو سمجھ لیجئے کہ یہ فلسفہ گمراہ اور
غلط ہے کیونکہ مادرانہ جذبہ ہی عورت کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے
اور یہی جذبہ عورت کے وجود کا عملی جواز بھی ہے۔ اسی لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں
بالکل پڑھی لکھی نہیں ہوتیں۔ یا جن عورتوں کی تعلیم صحیح معنی میں محقول اور عمدہ ہوتی ہے
ان میں مادرانہ جذبہ کبھی دبا دبا یا نہیں ملتا۔ یہ مادرانہ جذبہ ان عورتوں کے کچن ہی
میں ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔ اور بلوغ سے لے کر خستگی اور جوانی کے برسوں میں
دماغ تر اور شدید تر ہو جاتا ہے۔ اس کے عکس مرد میں پدری جذبہ ہوتا تو ضرور ہے لیکن
کوئی تیس پینتیس برس کی عمر تک مرد کو اس جذبے کا شعور نہیں ہوتا کم سے کم جب تک مرد کا کوئی
بچہ یا بچی پانچ چھ برس کی نہ ہو جائے مرد میں شاید ہی پدری شفقت پیدا ہوتی ہو ۲۵
سالہ نوجوان کبھی باپ بننے کی نہیں سوچتا۔ وہ تو صرف کسی لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے اور پھر
اس محبت کے بندھن کی بدولت اتفاقی طور پر بچہ کا باپ بن جاتا ہے اور اس بچہ کے
بارے میں بھول بھلا جاتا ہے۔ مگر بیوی کے خیالات کا مرکز ہی بچہ ہوا کرتا ہے۔ پھر کیا
ایک دن ایسا آتا ہے کہ نوجوان باپ۔ ۳۰ برس کی حد سے گزر چکنے کے بعد یکایک
اس احساس سے دوچار رہتا ہے کہ وہ ایک بچی یا بچے کا باپ بھی ہے جسے

وہ اپنے ساتھ لے کر بازار جا سکتا ہے۔ اسے اپنے دوستوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے
 اس کی حرکتوں کی نمائش کر سکتا ہے۔ بس یہی وہ موقع ہے جب اس کے دل میں
 پدری جذبہ یا شفقت جاگتی ہے۔ بیس پچیس برس کے کسی نوجوان کے سامنے اسکے
 باپ بننے کا ذکر کیجئے تو وہ ہنس پڑے گا۔ وہ اپنے باپ بن جانے کے بارے میں کچھ زیادہ
 خیال بھی نہیں کرے گا۔ لیکن عورت کے لئے بچے کی پیدائش یا بچے کے پیدا ہونے کی
 توقع بھی بڑی اہم ہے۔ غالباً یہ عورت کی زندگی کی اہم ترین بات ہوتی ہے کیونکہ
 اس سے عورت کی ساری زندگی۔ اسکا کردار اسکی عادتیں تک بدل جایا کرتی ہیں
 اور اس کی ساری شخصیت اس ایک واقعہ سے نہایت ہی دور رس اور گہرا اثر لیتی ہے
 عورت جب ماں بننے والی ہو تو ساری دنیا اس کے لئے ایک مختلف دنیا بن جاتی ہے
 اس مرحلے پر پہنچ کر اسے یقینی طور پر تپہ چل جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے
 اور اسے دنیا میں کیا کچھ کرنا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب اس کی زندگی نہایت
 قیمتی ہے اسی لئے وہ اپنا کام سرانجام دینے اپنے مشن کو پورا کرنے پر تل جاتی ہے
 میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ چین کے امیر خاندانوں کی اکلوتی بیٹیاں جو
 بی۔ ناز و نعمت میں پلی تھیں۔ اور لارڈ پیار نے انہیں کسی کام کا نہ رکھا تھا حیرت
 انگیز طور پر عظیم عورتیں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے اپنے بچے کی بیماری میں مہینوں تک
 بیک نہ ملائی۔ کارکردگی کی یہ مثال صرف عورت کے ہاں ملتی ہے کیونکہ نظامِ نظر
 میں پدری جذبہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ نہ اسے ہیا کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔
 اس سلسلہ میں انسان بھی بطح اور راج ہنس کی طرح بس بچے پیدا کرنے میں
 اپنا کام کرتا ہے۔ اور بس اس کے بعد اسے بچوں کی دیکھ بھال میں زیادہ
 دلچسپی نہیں ہوتی۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر عورتوں کو اپنی ہستی کی اس مرکزی قوت۔ اس مادہ جذبے کو عمل میں لانے کا موقع نہ ملے۔ اور اس سے کوئی کام نہ لیا جائے تو عورتیں نفسیاتی طور پر بہت زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہیں۔ آپ یہاں امریکی تہذیب کی مثال نہ دیجئے کہ امریکی تہذیب نے عورتوں کو کتنے حقوق اور کتنی آزادی دے رکھی ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ یہی امریکی تہذیب بیشمار اچھی لڑکیوں کو عمر بھر کنوا رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور اس میں ان بیچاروں کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ امریکہ میں شادیوں کی عدم مطابقت کی بڑی وجہ یہی فرق ہے جو عورت کے مادہ جذبے اور مرد کے پوری جذبے کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی نوجوان جذباتی لحاظ سے بڑے خام کار اور غیر پختہ واقع ہوئے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ امریکہ کے سماجی نظام میں نوجوانوں کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ اس لئے ان میں وہ قدرتی احتیاج۔ وہ ضبط نفس نہیں ہوتا جو عورتوں میں مادہ جذبے کی بدولت قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ اگر ماں بننے والی عورت کو قدرت نے یہ سنجیدگی۔ یہ تدبیر نہ بخشا ہو تو دنیا تل پٹا ہو جائے۔ اور قدرت نے عورت کو یہ وصف بڑی فیاضی سے بخشا ہے۔ پھر مردوں میں بھی دو طبقے ہیں ایک طبقہ تو غریب خاندانوں کے نوجوانوں کا ہے ان میں ذمہ داری کا جذبہ حالات کی سختی نے بڑی طرح پیدا کر رکھا ہے دوسرا طبقہ امیر نوجوانوں کا ہے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو جذباتی اور سماجی دونوں اعتبار سے نکتے لوگ بننے کی پوری صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اور زیادہ تر شادیوں میں عدم مطابقت انہی لوگوں کی وجہ سے ہے۔

بہر حال اصل سوال تو یہی ہے کہ خوشگوار زندگی کیسے بسر کی جائے۔

بھرد اور کنوارا پن

پاؤ رکھئے۔ زندگی کی ظاہری کامیابیوں اور مصنوعی چمک دکھانے سے زندگی خوشگوار نہیں بنتی۔ جب تک کسی مرد یا عورت کے کردار اور شخصیت کے ظاہری تقاضے آسودہ نہ ہوں۔ اور ان تقاضوں کو زندگی میں موزوں اور مناسب ذریعہ اظہار نہ ملے زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ عمر بھر بھر درہنہ ایک ایسا ذاتی کام ہے جس میں نہ صرف نمائشی افرادیت پسندی چھلکتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ بڑی فضول شی عقل پرستی بھی بجا رہتی ہے۔ یہ درہنہ بننا پر بھرد رہنے کو مرد و دو قرار دینا اور بھی ضروری ہے جو مرد یا عورتیں اپنی خوشی سے عمر بھر کنوارے رہنے کا عزم کر چکے ہوں میں انہیں ہمیشہ بڑے بیکار عقل پرست سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے کام دھندوں میں بری طرح کھوئے رہتے ہیں۔ اور بڑی بے وقوفی سے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے گھر پر زندگی کا ایک تسلی بخش بدل ڈھونڈ لیا ہے۔ یا وہ کسی دماغی کام کسی فنکارانہ مشغل کیسی کاروباری دلچسپی میں اتنے زیادہ کھو چکے ہیں جیسے اب یہی ان کا اڈرہنا بچونا ہے اور گویا یہی ان کی زندگی کا واحد تسلی بخش راستہ تھا۔ جو انہوں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ میں اس رویے اور اس خیال کی سختی سے تردید کروں گا۔ انفرادیت پسندی کا یہ نظارہ بے حد احمقانہ اور مضحکہ انگیز ہے کہ کوئی غیر شادی شدہ اور بے اولاد فرد بھر پور اور خوش گوار زندگی بسر کرنے کے بجائے اسکے بدل ڈھونڈتا پھرتا ہے کبھی کام کاج کی پناہ لیتا ہے۔ کبھی ذاتی کارناموں کی آڑ ڈھونڈتا ہے کبھی جانوروں کو ظلم سے بچانے کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیتا ہے اسکا نفیاتی کرشمہ اس وقت دیکھئے کہ کنواری بڑھیا عورتیں سرس کے شیر کو چابک سے پٹتے دیکھ کر سرس کے میجر پر حیوانوں پر ظلم کے قانون کے ماتحت مقدمہ دائر کرنے کی سوجھتی ہیں۔ اصل میں ظلم کے خلاف یہ احتجاج اس مادراتہ جذبہ کا پیدا کردہ ہے

جو نہ ٹھیک جگہ میں آلا یا گیا۔ نہ اسے شیر کے سلسلہ میں جوش میں آنا چاہئے تھا۔ اس مادہ جذبہ کا صحیح مقدار سرکس کا شیر نہیں۔ انسان کا بچہ رٹوڑھی خاتون کا اپنا کہہ ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ سرکس کے شیر کو دو چار چابک کے ترڑاٹوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ عورتیں ہیں جو زندگی میں ایک غیر مناسب جگہ حاصل کرنے کیلئے ٹاؤک ٹوئیے مارنی رہتی ہیں اور پھر اس مقام کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے جائز اور مناسب ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کرتی ہیں۔

اپنے سیاسی ادبی اور فنی کارناموں کو دیکھ کر ان کے خالق دل میں تھوڑا بہت ضرور جوش ہوتے ہیں۔ اور خوشی کی یہ لہر بڑی عقلی قسم کی ہوتی ہے۔ مگر اپنے بچوں کو بڑے ہوتے اور ہاتھ پاؤں نکالتے دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان بھی ہے۔ اور سید حقیقی بھی۔ کتنے فنکار اور ادیب بڑھاپے میں بھی اپنی زندگی کے کارناموں سے مطمئن ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی تحریروں ان کے فنی کارنامے محض فرصت کے وقتوں کا دل پہلاواتھے۔ اور ان کی بدولت چونکہ روٹی بھی ملتی رہی اس لئے ان کا جواز محض یہی ہے اور کچھ نہیں مشہور واقعہ ہے کہ انگریز فلسفی ہربرٹ اسپنسر نے اپنی موت سے چند دن پہلے اپنی مشہور کتاب "ترکیبی فلسفہ" کی اٹھارہ جلدیں مشکل اپنی گود میں رکھیں ان ۸ جلدوں کے بے حس بوجھ سے یکا یک اسے خیال آیا۔ اگر ان جلدوں کی جگہ اس وقت میری گود میں میرا پوتا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ انیسویں صدی کے مشہور انشا پرداز چارلس لیمپ کی بہن ایلینے اپنے بھائی کی خدمت میں زندگی گزار لی۔ اسے بھی کئی بار یہ خیال آیا ہوگا کہ انشا پرداز کی ان شاہکاروں۔ اس "اولاد معنوی" کے مقابلے میں صرف ایک بچہ عنیتا جاگتا بچہ کہیں گرا نہایا ہو سکتا تھا۔ — میں مانتا ہوں کہ فیاضی اور خدمت خلاق کے

کارناموں سے بھی دل کو سکون ہوتا ہوگا۔ مثلاً مشہور امریکی کروڑپتی جان ہاکی راک فیلڈ نے انسان کی بہبود کے لئے جو کچھ کیا ہے اس سے اُسے کافی اخلاقی اور روحانی اطمینان حاصل ہوا ہوگا۔ پھر بھی میرے نزدیک یہ روحانی اور اخلاقی اطمینان نہایت معمولی قسم کا ہے۔ کیونکہ راک فیلڈ کے لئے اصلی اور سچے اور دلی اطمینان کا باعث اس کے بیٹے کی ذات تھی۔

اُس نکتہ پر ایک اور پہلو سے نگاہ ڈالئے۔ زندگی کی مسرت کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے لئے ایسا کام۔ ایسا کاروبار ڈھونڈ نکالیں جو آپ کی تناؤوں اور صلاحیتوں کے عین مطابق ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کی دنیا میں ۹۰ فیصدی مرد۔ عورت وہ کام نہیں کر رہے ہیں جو انہیں پسند ہے۔ نہ لوگ ایسا کام ابھی تک ڈھونڈ سکے ہیں۔ جو واقعی دل کو محبوب ہو۔ یوں سننے کو ہم نے کئی دفعہ اچھے اچھوں کے منہ سے یہ بڑھسنی ہے۔ بھئی مجھے تو اپنے کام سے دلی انس ہے مگر اس بیان میں سچائی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ مگر ”مجھے اپنے گھر سے محبت ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا سنا گیا۔ کیونکہ گھر سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہے۔ کام کے یہ متوالے اپنے کام پر اسی طرح جاتے ہیں جس طرح چینی عورتیں بچے جنبتی ہیں۔ ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جب ہر ایک کام پر جا رہا ہے ریاچے جن رہا ہے، تو پھر میں اور کیا کروں۔ اسکے باوجود ہر شخص یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ مجھے اپنے منصبی کام یا اپنے کاروبار سے شدید لگاؤ ہے۔ یہ بیان بہت سے پیشیوں کے سلسلہ میں تو بالکل جھوٹ ہے مثلاً ٹیلی فون آپریٹرز کیوں اور دندان سازوں کے سلسلہ میں یہ کہنا غلط ہے۔ رہا ایڈیٹرز اور جاہل اد کے بیوپاریوں اور ٹیٹے کا کاروبار کرنے والوں کا معاملہ تو ان کے سلسلہ میں اس بیان میں سچائی بہت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ بس ایک قطب شمال

یا قطب جنوبی کے سیاحوں یا تجربہ گاہوں میں کوئی نئی ایجاد کرنے والے سائنسدانوں کو چھوڑ دیجئے۔ باقی ہر شخص کے لئے یہی ہوتا ہے کہ اپنے روزگار — اپنے منصبی کام کو پسند کر سکے۔ اس سے اکتائے یا گھبرائے نہیں۔ بہر کیف اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بعض اصحاب اس دنیا میں ایسے بھی ہیں جنہیں اپنے کام کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ پھر بھی اس محبت کا ماں کی محبت اور ماتا کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔

یوں دیکھا یہ ہے کہ عمر بھر بہت سے لوگ ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ایک پیشہ سے اکتا کر دوسرے پیشہ میں جی لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں عمر بھر اپنے اصلی کام اور پیشے کے بارے میں شک ہی رہتا ہے۔ مگر کسی ماں کو اپنے منصبی کام کے بارے میں کبھی کوئی شک نہیں ہوتا۔ ہر ماں جانتی ہے کہ اس کا کام اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی نگہداشت اور پرورش ہے۔ دنیا میں کامیاب سیاست دان بعض دفعہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ کامیاب ایڈیٹر رسالوں کی ادارت چھوڑ دیتے ہیں۔ اعلیٰ ہوا باز پرواز سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے باکسر مٹکا بازی ترک کر دیتے ہیں۔ او تو اور کامیاب ایکٹرا اور ایکٹریں تک اپنا محبوب مشغلہ اداکاری چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر دزا ماؤں کا خیال کیجئے۔ چاہے وہ ناکام مائیں ہوں یا کامیاب ماں ہونا کبھی ترک نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ یہ بات ان کی اور دنیا کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔ ماں کو یہ پتا ہوتا ہے کہ اب دنیا کو اس کی ضرورت ہے اسے پتا ہوتا ہے کہ

اس پھلی ہوئی زندگی میں اس نے

اپنا مقام ڈھونڈ لیا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ دنیا میں اور کوئی اس کی جگہ نہیں سکتا۔ یقین ہٹلر جیسے ڈکٹیٹروں کے اس جنونی یقین سے کہیں بچتا رہتا ہے کہ صورت دہی اپنے

اپنے ملک کو بچا سکتے ہیں۔ آپ اندازہ کیجئے۔ اگر کسی مرد یا عورت کو یہ معلوم ہو کہ زندگی میں اس کا مقام معین ہو چکا ہے تو اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی۔ اس زندگی میں ویسے تو مشکل سے ۵ فیصد خوش نصیب لوگوں کو ایسا کام مل سکتا ہے جو ان کو دل سے بھاتا ہو۔ مگر سو فیصد ماں باپ اپنے بچوں کی نگہداشت کے کام کو سب سے اہم اور سب سے اولین اور سب سے پسندیدہ مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ تو پھر کیا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر کوئی عورت ماہر تعمیرات بننے کے بجائے ماں بن جائے تو اسے زیادہ سچی اور حقیقی مسرت مل سکے گی کیونکہ قدرت کا تقاضا یہی ہے۔ اور قدرت کبھی جو کا نہیں دیتی۔ اسی طرح کیا یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ عورت کے لئے شادی ہی سب سے بہتر کام ہے؟

میں جانتا ہوں کہ عورتوں کے معاشرتی حقوق کے حامی اب تک میرے عزیزوں کو بھانپ چکے ہوں گے مجھے احساس ہے کہ میں نے گھر اور گھر بیوز زندگی کی اہمیت پر اب تک جوش بیان صرف کیا ہے اس سے یہ لوگ سخت ہیچ و تاب کھا رہے ہوں گے کیونکہ گھر اور گھر بیوز زندگی کی ذمہ داریوں کا زیادہ بوجھ عورت پر ہی ہوتا ہے۔ میں نے عمداً یہ کہا ہے۔ اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ عورتوں ہی کو گھر اور گھر بیوز زندگی کی زیادہ ذمہ داریاں اٹھانی چاہئیں۔ یہ فیصلہ تو بعد میں ہو گا کہ عورتوں پر زیادہ مہربان کون ہے وہ۔ یا میں؟ کیونکہ سارا سوال عورت کی خوشگوار زندگی کا ہے۔ اور دیکھنا یہ ہے کہ عورت کو معاشرتی امتیاز حاصل کر کے زیادہ خوشی ہوتی ہے یا اسے اپنی زندگی کے مقصد کی تکمیل سے زیادہ گہری اور پائیدار مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور میرے نزدیک عورتوں کی زندگی کا مقصد گھر گریہت کی ذمہ داریوں کو نبھانا۔ گھر کو اپنے خاوند اور بچوں اور اپنے لئے رہتا ہے

بنا ہے۔ باقی رہا کام اور منصب کے لئے کسی کی صلاحیت اور موزونہ توفی تو اسکا ذکر نہ کیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑے بڑے کاروباری لوگ اور بینکوں کے اعلیٰ منتظم بھی اپنے کام کے لئے حقیقت میں موزوں نہیں ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ محکموں کے افسر اکثر نالائق ہوتے ہیں۔ اور کاروباری اداروں میں منتظم نااہل ہوتے ہیں بینکوں والے اپنے کام کے لئے صحیح صلاحیت نہیں رکھتے۔ اور تو اور ملکوں کے صدر بھی اپنے منصب کے لائق نہیں ہوتے۔ مگر نااہل ماں کا وجود بہت ہی نادر ہے۔ یعنی عورتیں ماں بننے کی پوری طرح اہل ہوتی ہیں۔ اسی لئے وہ ماں بننا چاہتی ہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک مثالی عورت وہی ہے۔ جو اپنے مقصد حیات کے ساتھ بھی اتنا ہی پیار رکھے جتنا اسے بناؤ سنگار سے ہوتا ہے۔ اور جو نسائیت کا پیکر ہو۔ محض عورتوں کے حقوق کی علم بردار نہ ہو۔

یہ واضح رہے کہ ہم عام مردوں عورتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض خواتین بھی سچے ذہنی نہم اور ممتاز شخصیت کی مالک ہوتی ہیں اسی طرح جس طرح غیر معمولی قابلیت کے مرد بھی ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مردوں عورتوں کی تخلیقی قوت سے دنیا کی حقیقی ترقی ممکن ہوتی ہے۔ مگر ان غیر معمولی لوگوں کو چھوڑئے۔ میرا خطاب عام مردوں اور عورتوں سے ہے۔ میں اسی لئے عام عورتوں سے کہوں گا کہ شادی ان کے لئے بہترین کام ہے۔ اور انکا مقصد حیات بچے پیدا کرنا ہے اور گھر کا کام کاج کرنا ہے۔ مگر میں ساتھ ہی عام مردوں سے بھی یہ کہتا ہوں کہ آپ کا کام فنون لطیفہ سے نہ کھپانا نہیں۔ آپکا کام اپنے گھر والوں کے لئے روٹی کمانا ہے۔ چاہے آپ جہتیں بنا کر بوٹ پالش کر کے یا چور پکڑ کر یا برتنوں کی مرمت کر کے یا کسی طرح روٹی کمائیں۔ شادی شدہ جوڑے کو بچے جننا ہیں۔ ان کی پرورش

کرتی ہے۔ اور پیش خسرہ اور دوسری بیماریوں میں ان کی تیار داری کرتی ہے۔ پھر انہیں اپنی تربیت سے اچھے اور عمدہ شہری بھی بنانا ہے۔ چونکہ مرد بچے پیدا کرنے کے ناقابل ہیں اور بچوں کی نگہداشت۔ انہیں نہلانے دھلانے اور انہیں کھلانے پلانے میں بڑے نا اہل واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے میں ان کاموں کی توقع عورتوں سے رکھتا ہوں۔ رہا روٹی کا مسئلہ تو مرد روٹی کمائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دو کاموں میں سے اچھا اور بہتر کونسا کام ہے؟ بچوں کی پرورش یا لالوں کے بال کاٹ کر یا بوٹ پالش کر کے۔ یا در بانی کر کے روٹی کمانا۔ اگر شوہر بڑی بڑی دکانوں میں در بانی کی خدمت پر مامور ہیں۔ اور ہر آنے جانے والے کے لئے دروازہ کھولتے ہیں تو پھر بیویاں گھروں میں برتن دھونے کی شکایت کیوں کریں کبھی دکانوں میں سیلز مین مرد ہوتے تھے اب ترقی یافتہ شہروں میں یہ عادت عورتوں نے سنبھال لی ہے۔ اور وہ سمجھتی ہیں کہ گھر کے کام کی نسبت یہ اونچا اور ارفع کام ہے۔ اب بڑے بڑے ہوٹلوں میں لڑکیاں اس خدمت پر مامور ہوتی ہیں کہ گاہکوں کے کوٹ اور ہیٹ وغیرہ سنبھالیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اجنبی مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنا اپنے خاوند کی جرابیں رنو کرنے سے کیوں اعلیٰ کام ہے اصل میں جس کام سے روٹی ملتی ہو وہ گھٹیا یا بڑھیا ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو محض رنو کا کام ہے اور لیس۔ مگر گھر پر شوہر کے پڑانے موزے رنو کرنے والی عورت اور ہوٹلوں میں دوسرے مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنے والی عورت میں بڑا فرق ہے۔ موزے رنو کرنے والی عورت اپنے میاں کی قسمت کی مالک ہوتی ہے۔ اور ہوٹل میں دوسرے مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنے والی عورت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی مرد کو دعا کے طور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کو ایسا قابل شوہر ہو کہ اسکی بیوی اسکی جرابیں محنت

اور محبت سے رفو کرے۔ مگر آپ یہ اصول نہیں وضع کر سکتے کہ شوہر کی جبر میں رفو کرنا عورت کی شان کے شایاں نہیں۔ آخر سب کے سب خاندان دانے بڑے بھی نہیں ہوتے۔ گویا اصل بات یہ ہے کہ گھریلو زندگی نہایت اہم ہے۔ اور اسکا مقدس کام نئی نسلوں کی غور و پرداخت ہے۔ یہ فرض کر لینا کہ گھریلو زندگی اور

بچوں کی پرورش کا مقدس فریضہ عورت کی شان کے شایاں نہیں کوئی معقول اور قابل قبول معاشرتی رویہ نہیں۔ یہ رویہ صرف اس تہذیب کا ہو سکتا ہے۔ جو عورت اور گھریلو زندگی اور عورت کے مال بننے کے حق کا کوئی احترام روا نہ رکھتی ہو۔

۳۔ جنسی شش

امریکہ میں عورتوں کے حقوق اور ان کی معاشرتی مراعات کا بڑا چرچا بڑا شور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دکھاوے کے باوجود جدید امریکہ میں عورتوں کو ان کے جائز حقوق و مراعات حاصل نہیں ہیں۔ خدا کے میرا یہ اندازہ غلط ہو
۲۔ درمیری دعا یہ بھی ہے کہ خدا کرے عورتوں کے حقوق بڑھ جانے سے عورتوں کے لئے ہمارا احترام اور ہماری حمایت کم نہ ہو۔ امریکہ نے عورتوں کو اعلیٰ اہمیت پر پہنچا دیا ہے۔ عورتوں کو روپیہ پیسہ خرچ کرنے کی آزادی دی ہے۔ انہیں گھومنے پھرنے اور ووٹ دینے کی آزادی اور حق بھی دیا ہے۔ مگر یہ حقوق اور چیزیں اور عورتوں کے لئے دل میں سچا احترام اور چیز ہے۔ میں براتی دنیا (مشرق) کا باشندہ ہوں میرا نقطہ نظر بھی براتی دنیا کا نقطہ نظر ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ————— زندگی میں ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو ہم

نہیں ہوتیں اور ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جنہیں اہم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ امریکی عورتیں پرانی دنیا کی عورتوں سے ان چیزوں میں کہیں آگے ہیں جو بالکل اہم ہیں۔ اور جو چیزیں اہم ہیں ان کے سلسلہ میں امریکی عورتوں کا وہی حال ہے جو پرانی دنیا کی پس ماندہ عورتوں کا ہے۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ امریکہ میں شرق کی نسیت عورتوں کا احترام اور ان کی قدر زیادہ ہے۔ امریکی عورتوں کو حقیقی طور پر اگر کچھ اختیار حاصل ہے تو وہ ان کی روایتی ملکیت یعنی گھر میں ہے۔ اور گھر کے اندر ابھی تک امریکی عورت بھی فرشتہ رحمت ہے۔ میں نے امریکہ میں ایسے نسوانی پیکر دیکھے بھی ہیں۔ مگر ان کا وجود صرف گھروں کی مقدس نضل کے اندر ملتا ہے۔ جہاں سورت باورچی خانے اور دیوان خانے میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں وہ ایسے گھر کی مالکہ ہے جو محبت سے معمور ہے۔ اور یہ گھر کی مالکہ اپنی شفقت اور لگن سے گھر کی فضا میں ایسی روشنی بکھیرتی ہے جو گھر سے باہر مثلاً کسی دفتر میں نظر نہیں آسکتی اور شاید آنی بھی نہیں چاہئے۔

تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت گھریلو لباس میں دفتری لباس کی بہ نسبت دل کش اور گیرش ہوتی ہے؟ یا محض میرا خیال ہے؟ میں سمجھتا ہوں اس مسئلے کا خلاصہ یہ ہے کہ گھر میں عورت اپنی طرح خوش ہوتی ہے جس طرح پھلی پانی میں۔ آپ کسی عورت کو کاروباری یا دفتری لباس پہنا دیجئے۔ مرد اسے ٹوٹا ہوا محض ایک ساتھی کارکن سمجھیں گے۔ اور اس کے کام کاج پر نکتہ چینی کو بھی اپنا حق جانیں گے مگر اسی عورت کو نفیس جارحٹ یا شیفون کا لباس پہن کر دفتر کے سات گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ سامنے آنے دیجئے تو مردوں کی سٹی گم ہو جائے گی وہ کام کے میدان میں اس سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دیں گے۔ مگر مگر دیکھیں گے اور

گھر گھر کے منے

دم نہ ماریں گے۔ دفتری نظام میں آکر عورتیں دفتری نظم و ضبط کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ مگر جو یہی دفتری کام کا ماحول ختم ہوا اور عورتیں دفتری ماحول سے نکل کر اپنے مرد ساتھی کارکنوں کے ہمراہ کسی نیم سرکاری دعوت میں آئیں تو عورتیں دفتری کارکن نہیں رہتیں۔ بلکہ عورت بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھی مرد کارکنوں کو یا اپنے افسروں کو مشورہ دیتی نظر آتی ہیں۔ کہ نئے بوٹ خریدیں۔ یا بال جلد کٹوا لیا کریں۔ پھر کی خشکی دور کرنے کے لئے فلاں فلاں لوشن استعمال کیا کریں۔ گویا دفتروں میں عورتیں ادب آداب سے بات کرنے کی پابند ہوتی ہیں۔ لیکن دفتر سے باہر وہ اختیار اور حکم سے بات کر سکتی ہیں۔

صاف بات یہ ہے کہ عورتوں کا گھر سے باہر آکر عام زندگی میں کھلے بندوں پھرنے سے زندگی کی دلکشی اور زندگی کی آسانیوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں نے یہ بات مرد کے نقطہ نظر سے عرض کی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بات بحیثیت مرد کہی جا سکتی ہے۔ جب سے عورتیں دفتروں اور بازاروں میں نکل آئی ہیں۔ بازاروں کا شور و غوغا کم ہو گیا ہے۔ دفتروں میں میز کرسیاں زیادہ ضرورت رہنے لگی ہیں۔ سب سے زیادہ ماحول میں زیادہ کھار سا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جنسی کشش یا جنسی کشش کی خواہش میں شتمہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ اور امریکہ میں تو مردوں کے مزے ہیں۔ کیونکہ امریکی عورتیں روز بروز مردوں کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا مقابلہ ذرا اپنی عورتوں سے کیجئے تو معلوم ہو گا کہ چینی عورتوں کی بہ نسبت امریکی عورتیں اپنی فطری جنسی کشش میں مزید دلکشی پیدا کر کے مردوں کو خوش کرنے کی سعی کرتی ہیں۔

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مغرب کے لوگ جنسی معاملات کے

جنسی کشش

بارے میں تو بہت زیادہ سوچتے ہیں۔ مگر عورتوں کا بہت کم خیال کرتے ہیں۔
 مغربی عورتیں بال سوزارنے میں غالباً اتنا ہی رقت صرف کرتی ہیں۔ جتنا
 کبھی مشرقی عورتیں کیا کرتی تھیں۔ مغربی عورتیں بڑی آزادی سے گھلے بندوں اپنا ریکاپ
 کرتی ہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ چہرے کے بناؤ اور رنگار میں مصروف رہتی ہیں۔ مغربی
 عورتیں کھانے پینے میں سخت احتیاط کرتی ہیں جسم کی ماش کرتی ہیں اور جسم کو ٹھیک
 رکھنے کے بارے میں دنیا جہاں کے اٹھارات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اپنی کمر بلی رکھنے
 کے لئے صبح و شام لیٹر پر لیٹ کر ٹانگیں چلاتی ہیں، اور اس عمر میں پہنچ کر بھی
 اپنے چہرے ٹھیک رکھنے اور بالوں کو نہ گھنے کاوشش کرتی ہیں۔ جہاں ایک مشرقی
 عورت ان آرٹسٹوں کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔ مغربی عورتیں دنیا کی ساری عورتوں کے
 مقابلے میں ٹوشن اور خوشبوؤں پر زیادہ روپیہ صرف کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ٹوشن
 کی آرٹسٹ دن اور رات کو لگانے والی کرمیوں، جلد صاف کرنے والی کرمیوں،
 پاؤڈر کی تہ جمانے والی کرمیوں، نیس کرمیوں، ہاتھوں کی کرمیوں، مسام صاف کرنے والی
 کرمیوں، لیپوں کی کرمیوں، سورج کی تہازت سے بچانے والی کرمیوں۔ پھیراؤں سے بچانے
 والی کرمیوں اور تیل اور ہر قسم کے خوشبو دار تیل کا جتنا بڑا اور زبردست کاروبار
 امریکہ اور مغرب میں ہے۔ اور کہیں نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی عورتوں
 کے پاس ان آرٹسٹوں پر خرچ کرنے کے لئے روپیہ اور وقت دونوں داخل ہیں۔
 شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امریکی عورتیں لباس پہنتی تو اس لئے ہیں کہ مردوں کو خوش کنیں اور
 لباس اتارتی اس لئے ہیں کہ اپنے آپ کو خوش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ معاملہ اس کے
 برعکس ہو۔ یا یہ دونوں باتیں ہی تہہ میں کار فرما ہوں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ
 مشرقی عورتوں کو حسن کی آرائش کا اتنا سامان ملتا نہیں۔ کیونکہ جہاں تک مردوں کو بھانپنے

گھر گھر سفت کے مرتے

کی خواہش کا تعلق ہے۔ یہ سب قوموں میں یکساں ہے۔ یہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ ابھی پچاس ساٹھ برس ادا صحر کی بات ہے کہ چینی عورتیں اپنے پاؤں بچپن سے بندھوا دیتی تھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ننھے ننھے پاؤں مردوں کو خوش کر سکتے تھے۔ لیکن اب یہی چینی عورتیں چھوٹے جوتے پہننے کی بجائے اونچی اٹریکٹ کے مغربی جوتے پہنتی ہیں۔ میں پیغمبر نہیں۔ مگر میں پیغمبرانہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہت جلد چینی عورتیں بھی صبح کو دس منٹ ٹانگیں چلا چلا کر درزش کیا کریں گی تاکہ ان کے زیادہ سبب جسموں کو دیکھ کر ان کے شوہر خوش ہو سکیں۔ یا وہ خود زیادہ خوشی محسوس کر سکیں۔

مگر اس کے باوجود یہ حقیقت وہیں کی وہیں موجود ہے کہ آج کل امریکہ کی عورتیں اپنے جسموں کی جنسی کشش میں اضافہ کر کے مردوں کو خوش کرنے کی زیادہ سرگرمی شروع کر رہی ہیں۔ وہ جو لباس پہن رہی ہیں اس میں بھی جنسی کشش کے راز کا پورا شعور جھلکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پارکوں اور بازاروں میں جو عورتیں نظر آتی ہیں ان کے جسم سڈول ہوتے ہیں۔ ان کے لباس بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ عورتیں دن کا بڑا حصہ اپنے جسم کی درستی اور آرائش پر صرف کرتی ہیں۔ مردوں کے لئے یہ بچہ دلی خوش کن بات ہے۔ مگر جنسی کشش کی ان مسلسل کوششوں سے عورتوں کے اعصاب پر کتنی تھکن سوار ہوتی ہوگی؟ اس کا اندازہ مشکل ہے۔

پھر بھی جنسی کشش کہیں عورت کے ماں بننے کی کشش کے مقابلے میں ایک مخالف طاقت سمجھتا ہوں۔ اور اسی طاقت نے موجودہ زمانے کی محبت اور شادیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

آرٹھ نے جدید زمانے کے انسان کو جنس کے معاملے میں زیادہ ذکی لکھ بنا دیا ہے۔ پہلے تو آرٹھ نے عورت کے جسم کے خطوط اور قوسیں باہر پیش کیں! اب کاروباری دنیا نے بھی عورت کے جسم کے ہر اعضاء۔ ہر گولائی اور ہر خط اور ہر حنائی

ناخن تک کو اپنے اشتہار کے بیٹے پیش کیا ہے۔ عورت کے جسم کے ہر حصے سے کاروباری
 اشتہاروں نے ہر ممکن فائدہ اٹھایا ہے۔ اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ امریکی عورتوں
 نے کس طرح ہنستے کھیلتے اپنے جسم کو کاروباری اشتہار بازوں کی ہر جائز و ناجائز نفع
 اندوزی کے حوالے کر دیا ہے۔ مشرقیوں میں عورت اور عورت کے جسم کے لئے
 جو احترام موجود ہے اس کے پیش نظر ایک مشرقی یہ مشکل ہے برداشت کرے گا کہ
 عورت کے جسم سے اشتہار بازوں میں طرح فائدہ اٹھائیں مگر عورت کے جسم کی
 اس حد سے بڑھی ہوئی نمائش اور پیش کش کو مغرب کے آرٹسٹ حسن سے
 تعبیر کرتے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے والے اسی عریانی کو آرٹ کہتے ہیں۔ صرف تھیٹر کے
 پیچھے اور پروڈیوسرز میں چیز کی جنسی کشش کے سادہ نام سے یاد کرتے ہیں۔ باقی رہے
 عام مرد تو وہ اس نمائش جسم سے مزہ لیتے ہیں۔ اور بس۔ مردوں کے بنائے ہوئے
 سماج، مردوں کے تابع سماج سے خاصہ ہے کہ کاروباری اشتہارات کے لئے
 کاروبار کو چکالنے کے لئے عورتوں کو تو عریاں کر کے پیش کیا جائے اور چند بازی گروں
 کو چھوڑ کر سارے کے سارے مرد بھی کپڑے نہ اتاریں۔ ایچ کا تماشا دیکھتے
 تو یہاں بھی عورتیں ہی تریب تریب نیم عریاں پیش ہوں گی۔ حالانکہ دیکھنے والے مرد
 پورے ڈریس میں کوٹ۔ ٹائی کے ساتھ بیٹھے تماشا دیکھیں گے اگر اس معاشرہ پر
 عورت کی حکمرانی ہوئی تو آپ ہمیشہ مردوں کے نیم عریاں جسم دیکھتے اور عورتیں ہمیشہ
 پورے لباس میں نظر آئیں۔ ہمارے آرٹسٹ عورت اور مرد دونوں کے جسموں کا مطالعہ
 کرتے ہیں۔ مگر کسی مرد کے خوبصورت جسم کی تصویر بنا کر انہیں کاروباری
 لحاظ سے کوئی فائدہ اٹھانے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ ایسے تھیٹر بھی ہیں جنکے ایچ
 پر لڑکیاں اکرنا چھتے ناچتے اپنے جسم پر کا ایک ایک کپڑا اتارتی جاتی ہیں۔ سنا ہے کہ

گھر گہمت کے مزے

یہ تھیٹر لڑکیوں کے کپڑے اس لئے اترواتا ہے کہ مردوں کو ذرا ذوق کیا جائے۔ مگر تھیٹر
 عورتوں کو ذوق کرنے کے لئے کسی مرد رفاقت کے کپڑے اتروانے کا اہتمام کیا نہیں
 کرتے آخر طور میں بھی تو تھیٹر دیکھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ چیر یہ ذرا عام پسند تھیٹر ہیں۔ اعلیٰ قسم
 کے تھیٹر دن میں کھیل عام طور پر ایسا ہوتا ہے جس میں فنکارانہ حسن بھی ہوا اور اخلاقی
 لحاظ سے بھی قابل اعتراض نہ ہو۔ مگر ان کھیل تراشوں میں بھی فنکارانہ حسن عورت کے
 ذمے ہوتا ہے۔ اور اخلاقی پہلو مرد کرداروں کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ تھیٹر بھی عورت
 کو اخلاقی پہلو کا ترجمان اور مرد کو فنکارانہ حسن کا مظہر بنا کر پیش نہیں کرتے۔ اس کا
 نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں بیچاری آرٹسٹک ہونے کو اپنا فرض سمجھنے لگی ہیں۔ اسے لئے وہ اپنا
 جسم ٹھیک رکھنے کے لئے فاقے کھرتی ہیں۔ بالٹیں کراتی ہیں۔ ادا بڑے نظم و ضبط
 کسرت اور پابندی کو اپنا شعار بناتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ خوبصورت
 اور دلکش نظر آئیں۔ اور دنیا کے حسن میں اضافہ کر سکیں۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ زیادہ کم کچھ
 بوجھ والی عورتیں یہ یقین رکھتی ہیں کہ مرد کو قابو میں رکھنے کا واحد طریقہ جسٹی کشش ہے۔
 اور کچھ نہیں۔

میرے خیال میں جسٹی کشش اور دلربائی پر حد سے بڑھی ہوئی یہ تو جہ ظاہر کرتی ہے
 کہ عورت کی فطرت کے بارے میں انسانوں کا انداز نظر بڑا ناچختہ اور بے حد ادھورا
 ہے۔ اس انداز نظر کا اثر محبت اور شادی پر بھی پڑا ہے۔ جنانچہ شادی اور محبت
 دونوں کے بارے میں ہمارے خیالات بھی یا تو بالکل غلط ہیں یا بے حد ناچختہ
 ہیں۔ عورت اور جسٹی کشش کو ایک چیز سمجھ لینے کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کو گھر کی
 مالک تسلیم نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس سے محض زینت اور آغوش سمجھا ہوتا ہے۔ عورت
 بیوی اور ماں دونوں ہے۔ لیکن جنس اور جسٹی کشش پر جس طرح زور دیا جا رہا ہے۔

جنسی کشش

اس کی بدولت عورت کے ماں ہونے کا تصور دب جاتا ہے اور اسکی جگہ یہ تصور
 مدہ جاتا ہے کہ عورت بس بستر کی زینت ہے۔ میں پھر عرصن کر دوں گا کہ عورت
 اپنے اوج کمال کو اس وقت اور صرن اس وقت پہنچتی ہے جب وہ ماں بنتی ہے
 جو بیوی ماں بننے سے انکاری ہو جائے۔ وہ اپنے وقار اپنی تمکنت کا بڑا حصہ کھو
 بیٹھتی ہے۔ وہ یہ خطرہ بھی مول لیتی ہے کہ اسے محض ایک دل پہلا دے کی خیر ایک
 کھلنا کھجا جائے۔ میرے نزدیک بچوں کے بغیر ہر بیوی ایک داشتہ کے برابر
 ہے۔ اور جو داشتہ آپ کے بچوں کی ماں ہو وہ بیوی کے رتبہ کی حقدار ہے
 چاہے قانونی پہلو کچھ ہو۔ بچوں کا وجود داشتہ کی ہستی کو بھی مقدس اور ارفع بنا دیتا
 ہے۔ اور بچوں کا نہ ہونا ایک بیوی کو بھی اس کے رتبے سے گرا دیا کرتا ہے۔ مگر مصیبت
 یہ ہے کہ آج کل بہت سی عورتیں اس لئے بھی بچے پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں کہ بچوں
 کی پیدائش سے ان کے جسم بگڑ جائیں گے۔

زندگی کو بھرپور بنانے میں محبت اور اختلاط کے جذبے کا بھی ہاتھ ہوتا
 ہے۔ لیکن یہی بات اگر حد سے بڑھ جائے تو خود عورت کے لئے نقصان دہ ثابت
 ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو جنسی لحاظ سے پرکشش اور دلکش بنانے کا سارا بوجھ عورت
 کے اعصاب پر پڑتا ہے۔ مرد اس بارے قسطی بے نیاز ہے۔ اس کے علاوہ
 جنسی دل کشی کی اس مارا مار میں بڑا عیب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے جوان خوبصورت
 عورتوں کو ہر لحاظ سے ہر جگہ ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ادھیڑ عمر کی
 عورتوں کو جوان نظر آنے کے لئے سوسو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ سفید بالوں اور بڑھتی ہوئی
 عمر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مقابلہ کتنا بے سود ہوتا ہے اسی لئے
 چینی مشاعر کہتا ہے کہ جوانی ایک سراب ایک دھوکا ہے اور کوئی شخص سورج کو

گھر گھر بہت کے مزے

رسی یا بندہ کرکھڑا نہیں کر سکتا۔ نہ وقت کی گردش کو روک سکتا ہے۔ گویا اور
 عمر کی عورتیں اپنی جنسی کشش کو برقرار رکھنے کے لئے جو حتمین کرتی ہیں وہ گزرتی ہوئی عمر
 کو رسی یا بندہ کررہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ وقت کی برقی رفتار پر فتح
 حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتی ہیں۔ جو بالکل فضول اور بے کار ہے۔ ایسے موقعوں
 پر تو صرف تندرہ دلی اور جوش تداقی اثر سے آتی ہے۔ اگر بڑھاپے کے حالات یکسا
 بہاد کا کوئی فائدہ نہیں۔ تو پھر سفید بالوں کو ہی کیوں نہ تو بصورت کہا جائے۔
 چنانچہ جو لوگ کہتا ہے۔

”میرے سر پر بہت سے سفید بال آگئے ہیں۔“

کئی دفعہ انہیں نوح نوح کرکھینکتا ہوں۔ مگر ان کی جگہ اور سفید بال
 نکل آتے ہیں۔ تو پھر سفید بالوں کا نوچا چھوڑ کر کیوں نہ دوں۔؟ انہیں اپنی
 کے حال پر مگر کیوں نہ بھنوں؟ آخر سفید بالوں کا مقابلہ کرنے کا وقت کس
 کے پاس ہے؟“

اصل میں جوانی اور جنسی کشش برقرار رکھنے کی ساری کوشش فضول ہے۔ یہ
 ماؤں اور ذرا بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ سخت بے انصافی بھی ہے آج کی چھپس چھپس
 کو کل کسی جوان تر جولیف کے لئے میدان خالی کرنا پڑتا ہے۔ آج جو گھوڑا دنسالی سب
 سے بڑی گھوڑا دوڑ میں ادل رہا۔ دو چار برس میں اس سے کم عمر گھوڑا اسے مات
 دیدے گا۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی کم عمر کی عورتوں کے خلاف یہی ”بار“ کی لڑائی
 لڑتی ہیں۔ اور یہ تو سوچئے کہ یہ حریفانہ مقابلہ وہ اپنی ہم جنسوں اپنی بہنیوں کے
 ساتھ ہی کرتی ہیں۔ یہی لئے اچھے عمر کی عورتوں کے لئے یہ بات بڑی خطرناک بڑی اہمناؤ
 بالکل بے سود ہے۔ کہ جہاں لکشی کے حاملہ میں کم عمر عورتوں کا مقابلہ کرنے کی کھٹان

جنسی کشش

لیں۔۔۔۔۔ یہ بات اس لئے بھی احمقانہ ہے کہ عورت صرف جسمانی دل کشی اور جنسی کشش کا نام نہیں۔ عورت میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے پھر عورت کے دل کو جیتنا اور اسے بنانا یہ سب کچھ جسمانی خواہشوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس میں جسم کی دلربائی ہی کارفرما ہے۔ چنانچہ نچرے کا مردوں اور سنجیدہ عورتوں کو توجہ دینے کے اس کھیل سے بالاتر ہو جانا چاہئے۔

✓ جانداروں کی دنیا میں انسان ہی وہ جاندار ہے جس میں شہوانی جذبات سب سے زیادہ ہیں لیکن ان جذبات کے ساتھ ساتھ شدید محبت کا جذبہ بھی دیا گیا ہے۔ یہی جذبہ انسان کی گھریلو اور خانہ دانی زندگی کی بنیاد ہے۔ شہوانی جذبات اور بچوں کے ساتھ لگاؤ کی خصوصیت اور بھی کئی جانوروں میں موجود ہے۔ مگر انسان کے سلسلے میں زیادہ خطرہ یہ ہے کہ انسان کی عاشق مزاجی گھریلو زندگی کے جذبے پر بری طرح چھا جائے۔ کیونکہ ایک ایسی پر تکلف تہذیب کے ارد گرد موجود ہے جو اپنے آرٹ اپنی فلموں اپنے تھیٹر کے ڈراموں کے ذریعہ سے اس کے لئے ہر ہر قدم پر جنسی ہیجان اور تحریک مہیا کرتی ہے۔ ایسی تہذیب میں گھریلو زندگی کی مثالی زندگی سمجھنے کی ضرورت فراموش ہو سکتی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ ہر طرف انفرادیت پرستی کا دور دورہ ہو۔ اس لئے ایسے معاشرہ میں ہمیں شادی کا عجیب تصور ملتا ہے۔ ایسے معاشرے کے نزدیک شادی نام ہے کورٹ شپ کی لمبی چوڑی جو ماچائی کا جو شادی کے شادیوں پر ختم ہو۔ ایسے معاشرے میں عورت کے بارے میں بھی عجیب تصور ہے کہ عورت مرد کی جنسی ساتھی ہے۔ اور بس عورت کو اس معاشرے کی نظروں کے روپ میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس معاشرے کے نزدیک مثالی عورت وہ ہے جو بالکل نوجیز ہو۔ جس کا جسم سانچے میں ڈھلا ہو اور جس میں

گھر گزشت کے فریب

جسمانی کشش کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ مگر میرے نزدیک عورت اس کی ذات خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ بچے کے گھوارے کو تھلا رہی ہو۔ عورت اس کی وقت بھینچتا اور وقار کا جسم ہوتی ہے۔ جب وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ یا چار پانچ سالہ بچے کو انگلی سے لٹکائے جا رہی ہو۔ عورت رسمی وقت سچا مسرت کی تصویر ہوتی ہے جب وہ لیٹر پر لیٹ کر اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ کھیل رہی ہو۔ یہی چیزیں نے ایک مشہور مغربی تصویر میں بھی دیکھی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں افلاں کے بارے میں شدید قسم کے نفسی الجھاؤ کا شکار ہوں۔ ممکن ہے یہ ٹھیک بھی ہو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑنا۔ کیونکہ نفسیاتی الجھاؤ چینی لوگوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے آپ اگر یہ کہہ دیں کہ فلاں یعنی فلاں نفسیاتی الجھاؤ کا مریض ہے تو مجھے اس بات پر ہنسی آئے گی۔ اسکا لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ عورت کے بارے میں میرے یہ خیالات کسی نفسیاتی الجھاؤ کی وجہ سے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی بنیاد وہ نصب العین ہے جو گھر گزشت کے سلسلہ میں چینی قوم کے سامنے ہر وقت رہتا ہے۔

۴۔ چینی گھر کی تصویر

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ بائبل کی کتاب پریدہ میں کائنات اور انسان کی تخلیق کی جو کہانی بتاتی گئی ہے۔ اسے تے سرے سے لکھا جانا چاہئے۔ چینی ناول "سرخ شبتان کا خواب" کا ہیرو ایک نوجوان لڑکا ہے۔ جو عید جذباتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پڑا پسند ہے۔ اپنی خوبصورت رشتہ دار لڑکیوں پر وہ جان چھڑکتا ہے۔ اسے یہ افسوس کھلے جاتا ہے کہ اس لڑکی کیوں نہ ہو۔ یہ لڑکا

چینی گھر کی تصویر

ایک دفعہ انہی جذبات کی رو میں کہہ اٹھتا ہے عورت پانی سے تخلیق کی گئی اور مرد مٹی سے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خیال میں اس کی رشتہ دار لڑکیاں ساری کی ساری بڑی اچھی۔ بڑی پاکیزہ اور بے حد زیرک ہیں۔ اور وہ خود اور اس کے ساتھ لڑکے اس کے خیال میں بڑے کمزور۔ بڑے بد صورت اور سخت مزاج ہیں چنانچہ چینی ناول نویس پائو یو کے قول کی روشنی میں کتاب پیدائش میں آدم و حوا کی تخلیق کی کہانی یوں ہوتی چلے گی۔

”خدا نے مٹی بھری پونجے کر اسے انسان کی شکل دی۔ پھر اس بت کے متھنے میں خدا نے اپنی روح پھونکی اور آدم زندہ ہوا لیکن بہت جلد آدم لپٹنے پھوٹنے لگا۔“

خدا نے تھوڑا سا پانی لیا اور آدم کے بت کی مٹی کو پھر سے پانی ملا کر گوندھا۔ یہ پانی جو آدم کے پیکر میں داخل ہوا تھا حوا کہلا یا۔ اور حوا اپنے پیکر میں پا کر ہی آدم کی زندگی مکمل ہوئی۔“

میرے نزدیک شادی کی کنایاتی اہمیت یہی ہے۔ عورت پانی اور مرد مٹی پانی کے رنگ دیے میں سرایت کرتا ہے۔ مٹی میں نرمی اور لچک پیدا کرتا ہے۔ مٹی پانی کو گرفت میں رکھتی ہے۔ اور اسے وہ وجود عطا کرتی ہے جس میں پانی چلتا ہے۔ زندہ رہتا ہے۔ اور اپنی بہت سی کئی کئی کیل کرتا ہے۔

چینی مصور چاؤ منگ جو کی بیوی مادام گوان نے جو جو وہی مصور تھی اپنی اور مٹی کی اس مثال کو انسانی شادیوں کے ضمن میں بڑی خوبصورتی سے ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ اس وقت اس کا شوہر مصور چاؤ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا مادام کی جوانی بھی نہایت ہو رہی تھی نتیجہ یہ کہ چاؤ کا ذوق عشق کچھ ٹھنڈا پڑا تھا اور وہ سوچ رہا تھا

گھر گھر ہست کے مزے

کہ اب کہیں سے ایک ہلاشتہ مہیا کرے۔ مادام کو آنے یہ تعظیم لکھ کر مشورہ ہر کو دی ہیں
سے اس کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اور وہ اپنے ارادے سے باز رہا۔

تم میں اور مجھ میں

بہت زیادہ پیار ہے

اس کی بدولت

دم گھٹنے لگا ہے۔

تھوڑی سی مٹی لو۔

اسے گیللا کرو۔ اسے تھپتھپاؤ۔

اپنا بت بناؤ۔

میرا بت بناؤ۔

پھر انہیں پھوڑو۔ انہیں توڑ دو۔

اور تھوڑا سا پانی ملاؤ۔

اسے گوندھو۔ اسے خوب گوندھو۔

اور اپنا بت بناؤ۔

اور میرا بت بناؤ۔

اب میرے بت میں تمہارے بت کی مٹی بھی شامل ہے

اب تمہارے بت میں میرے بت کی مٹی بھی شامل ہے

اب ہمیں کوئی جڈا نہ کر سکے گا۔

جب تک زندہ ہیں ہم ایک ہی لحاف اوڑھ کر سوئیں گے۔

جب رجائیں گے تو ایک ہی قبر میں دفن ہوئیں گے۔

چینی گھر کی تصویر

یہ مشہور بات ہے کہ چینی معاشرہ اور چینی زندگی کا نظام گھرانے اور خاندان کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ چیز چینی زندگی کی مجموعی طرز پر اثر ڈالتی ہے۔ اور رہنے بہنے کے سارے طور طریقے اسی کے تابع ہیں مگر آپ پوچھیں گے کہ چینی قوم کے لئے گھریلو زندگی اور خاندان کا نصب العین کیسے معین ہوا۔ یہ سوال کم کم پوچھا جاتا ہے۔ کیونکہ چینی تو اپنے اس معاشرتی نظام کو طے شدہ بات سمجھتے ہیں۔ جس میں ٹک شہیے یا سوال جواب کی گنجائش ہی نہیں۔ اور باہر کے لوگ جو چینی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اس سوال میں اُلجھنے کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ تاہم مشہور یہ ہے کہ کنفیوشس نے یہ کہنے کے لئے اپنی تعلیمات میں ایک فلسفیانہ بنیاد قائم کی تھی کہ گھریلو زندگی ہی معاشرتی زندگی اور سیاسی زندگی کی بنیاد ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بیوی اور شوہر کا رشتہ بے حد اہم رشتہ ہے۔ اور یہی رشتہ سارے انسانی رشتوں کی بنیاد ہے۔ کنفیوشس نے یہ بھی تلقین کی تھی کہ ماں باپ کی مکمل فرماں برداری بچوں کا فرض ہے۔ ہر سال اپنے بزرگوں کی قبروں پر جانا چاہئے۔ اپنے بزرگوں کی پرستش کرنی چاہئے۔ اور ایک آبائی اور جدی ایوان بنانا چاہئے۔

بعض ادیبوں نے چینیوں کی بزرگوں کی پرستش کو ایک مذہب قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ خیال کافی حد تک درست ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس سلسلہ میں چینی کی پرستش میں دُفوقِ فطرت کے عنصر کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی چینی عیب یا بدھو یا مسلمان بھی ہو۔ پھر بھی وہ اپنے اعتقادات کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی یہ پرستش جاری رکھ سکتا ہے۔ اس پرستش کے اپنے رسوم ہیں اور یہ اپنی جگہ ایک قسم کا دین ہے یہ رسوم اپنی جگہ پر نظری بھی ہیں اور جائز بھی کیونکہ ہر عقیدے کے لئے کوئی ظاہری رسم اور قاعدہ ہونا لازمی ہے۔ چینی اپنے بزرگوں کے مزاروں پر پندرہ پنج لمبی لکڑی کی

چینی گھسری کی تصویر

جو تختی لگاتے ہیں۔ یہ احترام ہی کی نشانی ہے۔ یہ اسی طرح کا عقیدہ ہے جیسے برطانوی
ملکوں پر برطانوی بادشاہ یا ملکہ کی تصویر شائع کر کے ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ بڑوں
کی ردحوں کو دیوتا نہیں۔ بلکہ بزرگ انسان سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کی اسی طرح خدمت
کی جاتی ہے جس طرح ان کے بڑھاپے میں سوت سے پہلے ان کے بال بچے کیا کرتے تھے
ان بزرگوں کی ردحوں سے مال و دولت نہیں مانگا جاتا۔ نہ ان ردحوں سے بیماریاں
کو اچھا کرنے کی منت مانی جاتی ہے۔ گویا عبادت گزار اور مہجوروں کے درمیان جو سو دھاری
عام طور پر ہوتی ہے وہ اس سلسلے میں باہل نہیں ہوتی۔ پرستش کی یہ رسم محض اس قدر ہے
کہ ایک مقبرہ دن پر سارے کنبے والے اکٹھے ہوتے ہیں۔ مرحوم بزرگوں کو عقیدت کے ساتھ
یاد کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کا شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ مرحوم نے خاندان کے لئے
کیا کچھ کیا تھا۔ یوں دیکھنے میں یہ رسم جینے جی اس بزرگ کی سالگرہ منانے سے کہیں کھپکی
نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی تہ میں وہی عقیدت اور احترام کا گہرا جذبہ کار فرما ہے۔ جو
مثلاً امریکہ میں یوم اور منانے کے سلسلے میں ہوتا ہے۔

بزرگوں کی پرستش کی اس رسم میں جو اجتماعی دعوتیں اور جشن ہوتے ہیں۔ مسیحی
مشنریوں اور مبلغوں نے چینی عیسائیوں کو ان میں شامل ہونے کی ممانعت کر رکھی
ہے۔ انہیں یہ اعتراض ہے کہ اس رسم میں ہر شخص کو اپنے مرحوم بزرگ کی قبر کے
چوٹی کلبے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑتا ہے۔ اور یہ عیسائیت کے دس احکام
میں سے پہلے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میرے نزدیک یہ عیسائی مشنریوں کی سخت
بھول ہے۔ وہ اس رسم کی ماہریت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اول تو یہ کہ چینی لوگوں کے گھٹنے
اتنے قیمتی نہیں ہیں جتنے مغربی قوموں کے ہیں۔ چینی تو اسی طرح دوزخ کو ہر کر اپنے
بادشاہوں، اپنے حاکموں کو سلام کرتے ہیں۔ اور ہر نوز کو اگر ماں باپ زندہ

چینی گھر کی تصویر

ہوں تو ان کے سامنے بھی دوزانو ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔ اسی لئے چینی گھٹنوں میں زیادہ لچک ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کھڑی کی ایک کندہ تختی کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے سے کوئی کافر تو نہیں ہوتا۔ پھر بھی گھاؤں اور شہروں میں چینی مسیحیوں کو اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انہیں اجازت نہیں ہوتی کہ بزرگوں کی پرستش کے موقع پر اجتماعی دعوتوں اور جشن میں شرکت کر سکیں اس موقع پر جو کھیل تماشے ہوتے ہیں چینی عیسائی ان کے لئے چندہ بھی نہیں دے سکتے۔ گویا وہ بچارے اپنے کنبے برادری سے خود بخود باہر جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اکثر اوقات اپنے خاندان کے لئے احترام اور روحانی عقیدت کا جذبہ ایک مذہبی جذبہ بن جاتا ہے۔ اس کی مثال یوں یوان کی زندگی ہے۔ جو سترھویں صدی میں کنفیوشس فلسفے کا سب سے بڑا رہنما تھا۔ بڑھاپے میں یوان ایک لمبے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ اپنے گم شدہ بھائی کو ڈھونڈ نکالے۔ اس کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس سفر کی صعوبتیں اس نے شخص اس لئے اٹھائیں کہ شاید اس گمشدہ بھائی کا ہی کوئی لڑکا ہو۔ کنفیوشس فلسفے کا عظیم علم بردار شہر زی جوآن میں رہتا تھا۔ اس کا عقیدہ اور تعلیم یہ تھی کہ علم سے عمل ارفع ہے۔ اور اسکا بھائی کسی برسوں سے بے پتا تھا۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا درس دیتے دیتے وہ ایک دن اٹسا گیا۔ اور اسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے گم شدہ بھائی کا کھوج نکالے۔ صوفی لوگ اس خواہش کو خدائی امر کہیں گے، مگر اسے کچھ تپہ نہیں تھا کہ اسکا بھائی کہاں ہو گا اور وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ان دنوں سفر کرنا بڑا دشوار اور خطرناک کام تھا کیونکہ منگ خاندان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ملک میں ہر طرف بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر یہ یاہمت بٹھھا اپنے اس مذہبی سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ جہاں جاتا شہر

گھر گرسنت کے زندہ

درد اذوں اور شہر کی سراؤں پر اپنی غرض کا اشتہار لگا دیتا اسی طرح اس نے مغربی چین سے لے کر شمال مشرقی چین کے علاقوں تک ہزار ہا میل کا سفر طے کیا اور کئی سال اس تلاش میں گزر گئے۔ اتفاقاً اس کے بھائی کے بیٹے نے ایک عام پیشاب خانے میں جاتے ہوئے ایک شخص کا چھاتا دیکھا جس پر اس کے فاندان کا نام لکھا تھا۔ اور یہ بڑوں اس بوڑھے مسافر کو گھر لے آیا۔ اس کا بھائی عرصہ پہلے مر چکا تھا مگر فلسفی میں یوان نے اپنی منزل پائی۔ اس نے آخر اپنے بزرگوں کے فاندان کو چلانے کے لئے اپنے اسلاف کا نام زندہ رکھنے کے لئے ایک لاشیں ڈھونڈ ہی لیا۔

کنفیوشس نے بزرگوں سے بچوں کی اس سعادت مندی پر اتنا زور کیوں دیا ہے؟ اس کا ٹھیک جواب شاید کوئی نہیں دے سکتا۔ پھر بھی گھر جان کی ایک دوڑ لے اپنے گراں پایہ مقالے حقیقی کنفیوشس میں یہ لکھا ہے کہ کنفیوشس جو تکہ خود باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے اسے بزرگوں سے بچوں کی سعادت مندی میں بڑی بات نظر آتی تھی۔ اگر کنفیوشس کے بچپن میں اس کا باپ زندہ ہوتا تو پوری مضرب کے بارے میں اسکے خیالات اتنے رومانی اور اتنے پورا حترام نہ ہوتے۔ اور اگر اس کی جوانی میں بھی اس کا باپ زندہ ہوتا تو شاید نیچر اور بھی خراب ہوتا اس صورت میں اسے اپنے باپ کے تمام نقائص اور سارے عیوب معلوم ہو جاتے اور اسے پتا چلتا کہ باپ کے سامنے ایسا بے چارہ و چرا سعادت مندی عملی طور پر کمالی ہوگی۔ خیر یہ تو خیالی باتیں ہیں حقیقت اس قدر ہے کہ کنفیوشس کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی اس کا باپ مر چکا تھا یہی نہیں بلکہ کنفیوشس کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ باپ کی قبر کہاں ہے اصل میں اپنے ماں باپ کی جائز اولاد نہیں تھا۔ اس لئے اس کی ماں نے اسے یہ بتایا ہی نہیں کہ اس کا باپ

چینی گھر کی تصویر

کون تھا۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو کنفیوشس نے یہ معلوم کس جذبہ کے تحت اسے پانچ بزرگوں کی شاہراہ پر دفن کیا۔ پھر جب ایک بڑھیا نے اس کے باپ کی قبر کا نشان بتایا تو اس نے اپنے ماں باپ کو ایک جگہ ساتھ ساتھ دفن کرنے کا اہتمام کر دیا۔

ڈاکٹر جان سی ایچ دو کا نظریہ آپ کے سامنے ہے۔ اس پر میں .. کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر چین میں گھریلو زندگی اور گھرانے کو جو نصب العین ٹھہرایا گیا ہے اس کے بارے میں چینی ادب میں دلائل اور وجوہ کی کوئی کمی نہیں۔ پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ایک خود کفیل فرد کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ گھرانے یا خاندان کے رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کو سردار وال چشمے سے تشبیہ دی جائے تو زندگی کے جاری و ساری رہنے کا نظریہ اس نصب العین کی پشت پناہ ہے۔ اور اس کے جواز کے لئے فلسفہ موجود ہے کہ انسان کی تکمیل کی منزل یہ ہے کہ اس کے نظری جذبات اس کی جبلت کی تسکین ہو یہی چیز ہے جسے ساری اخلاقیات اور ساری سیاسیات کی آخری منزل قرار دیا گیا ہے۔

گھریلو زندگی اور خاندان کا یہ نصب العین فرد کی ذاتی انفرادیت کا سخت مخالف ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی شخص فرد کی حیثیت سے مکمل طور پر تنہا زندگی بسر نہیں کرتا۔ ایسے فرد کا وجود خیالی ہے حقیقی نہیں۔ اگر کسی فرد کو کسی کا بیٹا کسی کا بھائی یا کسی کا باپ یا کم سے کم کسی کا دوست نہ سمجھا جائے تو پھر وہ کیا؟ یہ فرد تو محض ایک تصور ہو گا۔ لیکن چینی تو جسم اور حیاتیات کو ایک لحظے کے لئے بھی فراموش نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ہر شخص کے حیاتیاتی رشتوں کا پہلے خیال کرتے ہیں گویا خاندان اس صورت میں ہماری زندگی کی سب سے مقدم حیاتیاتی مادہ کا ہی ٹھہر ہی تصور

گھر گریہت کے منے

میں ایک شخص کی شادی بھی اس کا ذاتی مسئلہ نہیں رہتی۔ بلکہ سارے خاندان کا ایک اجتماعی مسئلہ بن جاتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب میرا وطن اور میرے ہم وطن میں یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی پر چھا جانے والے اس گھریلو نظام زندگی میں خرابیاں کیا کیا ہیں اس نظام کی غالباً سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک خاندان ایسی اجتماعی خود غرضی کا قالب اختیار کر لیتا ہے جس سے ملک کو نقصان پہنچنے کا بڑا احتمال ہو سکتا ہے۔ مگر اس قسم کی خرابیاں تو ہر انسانی نظام میں ہوں گی۔ یہ خرابیاں گھریلو نظام زندگی کے علاوہ انفرادیت پسندی اور مغربی وطن پرستی میں بھی موجود ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت ہی ایسی ہے جہن میں آدمی کی ہستی مملکت اور حکومت دونوں سے اعلیٰ اور اہم مانی جاتی ہے لیکن اسے ایک خاندان سے اعلیٰ اور اہم نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ خاندان سے علاوہ ان کا کوئی بھی وجود نہیں ہوتا۔ باقی رہی وطن پرستی تو اس کی خرابیاں موجودہ یورپ میں دیکھ لیجئے۔ اسی جذبہ کا کرشمہ ہے کہ ایک ملک ایسا عفریت بن جاتا ہے (جیسا کہ آج بھی بعض ممالک میں) کہ فرد کی آزادی کفار اس کے نام ہی عقائد اور نظریات اور آقا اور عزت تک ٹھہرین لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ فرد کے پاس اس کی سرت بھی نہیں رہنے دیتا جو اس کا آخری سہارا ہے۔ ایسے اجتماعی نظریات کے جو نتیجے ہو سکتے ہیں وہ فاشزم اور اشتراکیت دونوں نظریوں سے ظاہر ہیں۔ بلکہ اشتراکیت کے پیغمبر کارل مارکس نے تو یہ نتائج بڑے منطقی طریقے پر پیش بھی کر دئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکسی ریاست کا آخری مقصد یہ ہے کہ پوری اور مادری جہلت کو سرے سے فنا کر دیا جائے کیونٹ مینی فیسٹو سے تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس مارکسی ریاست میں کنبے اور اعزہ کی محبت اور عزیزوں کی باہمی وفاداری کو بوزر و اجذہ قرار دیا گیا ہے اسکی

چینی گھر کی تصویر

کھلے بندوں مذمت کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ آج سے مختلف مادی حالات میں ایسے جذبات کا سرے سے وجود نہیں ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ کارل مارکس نے کس بنا پر یہ نتائج اخذ کئے۔ اور اس نے یہ کیسے اندازہ کیا کہ حیاتیات انسانی میں یہ مرحلہ بھی کبھی آسکتا ہے۔ اُسے معاشیات ضرور آتی تھی۔ مگر غالباً وہ عقل سلیم سے زیادہ بہرہ ور نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اسکول کالر کا بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ انسان کی جبلت اگر لاکھوں برس سے ترقی کر رہی ہو تو اُسے ختم کرنے کے لئے دو چار ہزار برس کی مدت بہت ہی کم ہے۔ لیکن مارکس کی دلیل یہی تھی۔ اور یہی عجیب سی دلیل مغربی ذہنوں کو بالکل منطقی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نظریہ کہ انسان کچھ مشینی قسم کے قوانین کے تحت طبقاتی کشمکش میں گرفتار ہے۔ قدرتی طور پر انسان کو عملی آزادی اور عقیدہ کی انفرادی آزادی سے محروم کر دیتا ہے۔ گویا آزادی کے اس انتہا پسندانہ نظریہ کے مطابق بھی انسان کو اتنی آزادی نہیں ہوتی جتنی گھریلو نظام میں مل سکتی ہے۔

لہذا مغرب کی انفرادیت پسندی اور وطن پرستی کے مقابلہ میں گھریلو زندگی کا نصب العین موجود ہے۔ اس نظام کے ماتحت کسی شخص کو فرد نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک خاندان کا رکن گردانا جاتا ہے۔ یہ رکن گھریلو زندگی کے عظیم دھارے کا ایک ضروری حصہ بھی ہے۔ اور میں نے "زندگی کے روال" دوں دھارے کے جس نظریے کا ذکر اوپر کیا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہی ہے اس کے مطابق ساری انسانی زندگی کو ایک بڑا دریا سمجھئے جو مختلف نسلوں کی زندگی کی الگ الگ ندیوں پر مشتمل ہے۔ ایک انسان اس زندگی کے دھارے کا وہی حصہ دیکھتا ہے جو اس کے اپنے کنبے پر مشتمل ہو۔ اسی کو وہ بلا واسطہ محسوس بھی کر سکتا ہے۔ شجرہ نسب کا تصور شرق و مغرب دونوں جگہ ہے۔ اس شجرے میں ہر شخص کا وجود ایک شاخ یا ایک شاخ کی کونپل کی حیثیت

گھر گھر ہر تہ کے منہ

رکھتا ہے۔ یہ شاخ خود سارے شجرے کے ساتھ ہی طرح وابستہ ہوتی ہے جس طرح درخت کی شاخ اپنے تنے کے ساتھ پیوستہ رہتی ہے۔ شجرے کی یہ شاخ شجرے کے جاری رکھنے کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کی افزائش اور پھلنے پھولنے میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کی مثال مستقبل نشوونما یا تسلسل اور دوام سے دی جاسکتی ہے۔ ہر شخص زندگی میں اپنے حصہ کا کام کرتا ہے۔ یہ کام خاندان کی تاریخ میں ایک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس باب میں وہ ذمہ داریاں شامل ہیں جو انسانی زندگی پر ایک کنبے کی مجموعی زندگی کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور انسانی زندگی اپنے کام یا اپنے نکلنے میں کی بدولت اپنے آپ کے لئے اور کنبے کی مجموعی زندگی کے لئے کلنگ کا ٹیکا بنتی ہے۔ یا دونوں کی عزت افزائی کا باعث بنتی ہے۔

چینی زندگی میں مل جل کر کام کرنے یا اجتماعی زندگی کے شعور کی صورت یہی ایک صورت ہے کہ ہر چینی کو گھر ملیو زندگی کا بڑا پاس ہوتا ہے اور خاندان کی عزت اور ناموس اسے بچہ عزیز ہوتی ہے۔ ایک خاندان ایک ٹیم ہے۔ کنبے کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے اس کھیل کو اتنی اچھی طرح کھیلے جتنی کوئی اور ٹیم کھیلتی ہے۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ کوئی غلط کام کر کے اپنی ٹیم رکبنہ کے کھیل کا ستیا ناس نہ کرے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ٹیم رکبنہ کے کھیل کو ترقی دے ایک نالائق بیٹا اپنے کنبے کے لئے اسی طرح ندامت کا باعث بن سکتا ہے جس طرح ایک ٹیم کا فل بیک جو گیند پاس آنے پر حریف کو روک نہیں سکتا۔ اور اپنی کوتاہی کے باعث گیند کے فل جانے دیتا ہے۔ اور جو بیٹا سول سروس کے تمام امیدواروں میں دل رہتا ہے وہ اس کھیلاری کی طرح بگڑی ٹیم کے لئے گولی کرتا ہے ہمیں اسکی اپنی کامیابی اور شان بگڑا ہے اور اسکی ٹیم کی عزت افزائی

چینی گھر کی تصویر

بھی ہے۔ چین میں جو لڑکا چوہا لگا یوان رشاہی امتحانات میں ادا رہنے کا امتیاز حاصل کرتا تھا۔ اس کی کامیابی پر اس کے کنبے والے اسکے رشتہ دار۔ اسکا قبیلہ بلکہ اس کا سارا شہر اس پر جذباتی لحاظ سے اور مادی اعتبار سے بھی ناز کرتے تھے۔ ایک ایک اور دو دو سو سال تک اس شہر کے لوگ فخریہ بیان کیا کرتے تھے کہ ہمارا لڑکا فلاں فلاں عہد حکومت میں شاہی امتحانات میں سارے ملک میں اول رہا تھا۔ اور جب یہ لڑکا کبھی اپنے شہر واپس آتا تھا تو سارا شہر اور اس کا سارا قبیلہ اس عزت افزائی پر بھولا نہیں سماتا تھا۔

گھریلو نظام زندگی میں بڑے تنوع اور بڑی رنگارنگی کی گنجائش ہے۔ خود انسان کو دیکھئے کہ ایک خاندان کے اندر وہ بچپن اور جوانی بچتہ عمری اور بڑھاپا عموماً عمر کا ہر بوقلمون حصہ بسر کرتا ہے۔ پہلے پہل اس کی نگہداشت دوسرے کرتے ہیں۔ پھر وہ دوسروں کی نگہداشت کرتا ہے۔ اور بڑھاپے تلخ پھر دوسرے اس کی نگہداشت شروع کرتے ہیں۔ پہلے پہل وہ دوسروں کی ہر بات بلا چون و چرا مانتا ہے۔ ہر ایک کی اطاعت اور عزت کرتا ہے۔ لیکن جوں جوں بڑا ہو جاتا ہے دوسرے اس کی بات ماننے لگتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت اور عزت کرنے لگتے ہیں۔ اس تصویر میں رنگ عورت کے وجود سے آتا ہے۔ کنبیہ کی زندگی میں عورت ایک آرائش ایک کھلونے کے طور پر نہیں آتی۔ بنیادی طور پر وہ بیوی کی حیثیت سے بھی نہیں آتی بلکہ شجرہ نسب کے سب سے ضروری حصے یعنی ماں کی حیثیت سے آتی ہے۔ کہوں کہ ماں کے وجود ہی سے انسانی زندگی کا تسلسل قائم رہ سکتا ہے کسی خاندان کی قوت اور خوبی کا دار و مدار ان عورتوں پر ہے جو اس خاندان کے مردوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں۔ انہی کے خون پر کنبے کی قوت و حیات کا انحصار ہوتا ہے۔ اس لئے

گھر گریہت کے مزے

خاندان کے پرانے بزرگ بہتوں تلاش کرتے وقت اچھے خاندانوں کی لڑکیاں تلاش کرنے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ یہ وہی احتیاط ہے جو ایک ہوشیار مالی شہر دار درخت کو اچھا پیوند لگانے میں برتتا ہے۔ کسی شخص کی زندگی کا بننا یا بگڑنا اس عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ شادی کرے۔ اور اس کے کہنے کا سارا ڈھانچا بھی اسی عورت کے بل بوتے پر بنتا بگڑتا ہے۔ آپ کے پوتوں کی صحت اور ان کی تربیت (جس پر بہت زور دیا جاتا ہے) کا سارا انحصار آپ کی بہو کی سلیقہ مندی اور سگھڑاپے پر ہے۔ بہو کے انتخاب میں احتیاط کی بدولت نسل انسانی کو بہتر بنانے کے بارے میں ایک قاعدہ ایک نظام سا مانج ہو جاتا ہے جس کی بنیاد وراثت اور خاندانی مزاج پر ہوتی ہے۔ اور جس میں شرافت اور عالی نسب کو اہم سمجھا جاتا ہے ایک خاندان کے بڑے بوڑھے اور ماں باپ خاص طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ انکی ہونے والی بہو صحت مند ہو بصورت اور سلیقہ مند ہے یا نہیں۔ اور انہی باتوں پر ان کے انتخاب کا سارا دار مدار ہوتا ہے۔ عام طور پر خاندانی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اور کفایت شعاری۔ محنت۔ خوش مزاجی اور تیز داری کو اس تربیت کی خاص چیزیں سمجھا جاتا ہے۔ بعض دفعہ جیب کوئی لڑکا اپنی مرضی سے کسی بے تیز اور چھوٹے لڑکی سے شادی کر لے تو باپ اس لڑکی کے خاندان کو برا بھلا کہہ کر جی ٹھنڈا کرتا ہے کہ انہوں نے اپنی لڑکی کو اچھی تربیت نہ دی۔ گویا مال اور باپوں پر اپنی بیٹیوں کی تربیت کا بوجھ ہے۔ تاکہ جب یہ لڑکیاں کسی اور کہنے میں بیاہی جائیں تو ماں باپ کی بدنامی کا باعث نہ بنیں۔ مثلاً اگر لڑکیاں پرانے گھر میں جا کر کھانا نہ پکا سکیں یا نوردز کے موقع پر عمدہ قسم کی کھیر تیار نہ کر سکیں۔ تو ماں باپ کی تربیت کو بڑے لگ جائے گا۔

چینی گھر کی تصویر

گھر بلو کینہ ہاری نظام کے اندر زندگی کے روال دواں اور جاری و ساری رہنے کا نظر یہ ایسا ہے کہ انسان کو اپنی بقا۔ اپنا دوام بھی ایک ٹھوس اور ظاہر چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ دادا اپنے پوتوں کو بستر نعل میں دبائے اسکول جلتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بار پھر ایک بچے کی زندگی بسر کر رہا ہے اس پوتے کو پیار کرتے وقت اسے محسوس ہوتا ہے کہ بچے کا گوشت پوست اس کا اپنا گوشت پوست ہے۔ بچے کا خون اس کا اپنا خون ہے۔ پوتے کی ہستی خاندان کے شجرے کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے روال دواں دہارے کا ایک قطرہ ہے۔ اور زندگی کا یہ دھارا ہمیشہ روال دواں رہتا ہے۔ اس لئے دادا کو اپنی زندگی کے اس تسلسل کے پیش نظر اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ وہ وقت آنے پر ہنسی جان دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں ہر باپ کو سب سے بڑا خیال یہ ہوتا ہے کہ مرنے سے پیشتر اپنے لڑکے لڑکیوں کی مناسب شادیاں کر سکے۔ اس کے نزدیک بچوں کی شادی کا مسئلہ۔ اپنی قبر کی جگہ کا انتخاب کرنے سے بھی زیادہ اہم ہو اگرتا ہے۔ جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کہ اس کے بیٹے اور بیٹیاں کیسی بیویوں اور کیسے شوہروں کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ اسے اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ اگر صورت حال تسلی بخش ہوگی تو وہ اپنے بستر مرگ پر بے فکر ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر سکے گا۔

زندگی کے بارے میں اس نظریے کا نتیجہ ہے کہ ہر چیز کے بارے میں انسان کا تصور وسیع تر ہونا چاہیے۔ اس نظریے کے ماتحت زندگی کو ایک انسان کی پیدائش اور اس کی موت کے ساتھ آغاز ملتا ہے۔ نہ اس کا انجام ہو جاتا ہے۔ بلکہ زندگی ایک کے بعد دوسرے انسانی پیکروں کی صورت میں ہمیشہ قائم رہتی رہتی ہے۔

گھر گرہستا کے مزے

گر یا ٹیم کا سنٹر فار ورڈ یا فل بیک اگر ختم بھی ہو جائیں تو بھی ٹیم کے دوسرے کھلاڑی کھیل جاری رکھتے ہیں۔ اس صورت میں کامیابی اور ناکامی کی بھی صورت بدل جاتی ہے۔ ساور زندگی کے بارے میں نصیب اعلیٰ یہ ٹھہرتا ہے کہ زندگی اس طرح بسر کرو کہ بڑوں کے نام کو بٹہ نہ لگے۔ اور اولاد ایسی پیدا کرو جس کی وجہ سے تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ تقریباً ہر چینی عہدہ دار جب لوکری پوری کر چکتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ فقرہ آتا ہے۔ اچھا ہوا کہ عہدے کا بوجھ سر سے اترا۔ اب زندگی آرام میں گذرے گی۔ کیونکہ اپنے بہت سے بیٹے ہیں۔

آدمی کی غالباً سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس کے بیٹے نالائق نکلیں جن خاندان کی عزت و آبرو قائم نہ رکھ سکیں۔ یا کم سے کم خاندان کی دولت بھی قائم نہ رکھ سکیں جواری بیٹے کا کلمہ پتی باپ جانتا ہے۔ کہ اس کی ساری دولت کیسے چٹکیوں میں اڑ جائیگی وہ دولت جو اس نے خون پسینہ ایک کر کے ساری زندگی میں جمع کی ہے۔ ایک بیٹا ناکام اور نکمے نکلے تو خاندان کی تباہی قطعی اور یقینی ہوگی۔ اس کے برعکس اس بیوہ کا خیال کیجئے جس کا پنج سالہ بچہ نہایت سعید اور ہونہار ہے۔ وہ اس بچے کے بل پر دنیا جہان کی مصیبتیں۔ برسوں کی مشکلیں اور دوسروں کے ظلم بھی برداشت کر لیتی ہے۔ چینی تاریخ اور ادب ایسی دوراندیش بیوہ ماں کے تذکرہ سے بھر پور ہے۔ بیوہوں نے سالہا سال ظلم اور مصیبتیں۔ اس امید میں برداشت کیں کہ ایک دن ان کا بیٹا جوان ہوگا۔ لائق ہوگا۔ اور دنیا میں بڑا آدمی بنے گا۔ ہمارے آب کے سامنے کی مثال نیشنلٹ چین کے بیڈر مارشل چیانگ کانگ کی ہے۔ بچپن میں ہی یتیم لڑکے اور اس کی بیوہ ماں کو اس کے ہمساؤں نے اتنا ستایا تھا۔ کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مگر بیوہ ماں کو اپنے بچے کی لیاقت پر بھروسہ نہ تھا۔ اس لئے

چینی گھر کی تصویر

اس نے بڑے صبر سے سارے ظلم و ستم برداشت کئے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ کہ بیوہ مائیں اپنے بچوں کے کردار اور اخلاق کی بڑی کامیابی سے تربیت کرتی ہیں اس کی وجہ غالباً عورتوں کی فطری حقیقت پسندی ہے۔ اس کے پیش نظر میں نے کئی بار سوچا ہے کہ جہاں تک بچوں کی پرورش اور تربیت کا تعلق ہے۔ باپ کا وجود بالکل غیر ضروری ہے۔ بیوہ کو جو مسرت اپنے بیٹے کے جوان ہونے پر ہوتی ہے وہ عام عورتوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کچھ دکھ اور تکلیفیں بیوہ نے گھیلی ہیں وہ عام عورتیں نہیں بھیتیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ کنبے کے نظام میں انسانی زندگی کا یہ مقام اور زندگی کی یہ ترتیب بڑی تسلی بخش ہے۔ گو یا اس نظام میں ایک شخص کی زندگی کے تمام جاتیاتی پہلو آسودہ ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو کنفیوشس بھی چاہتا تھا۔ — اس لئے کنفیوشس نے مثالی حکومت کا جو خاکہ بتایا ہے وہ بھی تریا جاتیاتی ہے وہ کہتا ہے۔ مثالی حکومت میں بڑے آدمیوں کو سکھ چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع ہوگا۔ نوجوان سب سے محبت کرنا اور وفادار رہنا سیکھیں گے۔ گھروں کے اندر لڑکیاں کنواری نہیں بچھی رہیں گی۔ اور گھروں کے باہر کنواریں مرد نہیں ہوں گے۔“

یہ الفاظ ملکا کے کسی ضمنی مسئلہ کے بارے میں نہیں کہے گئے۔ بلکہ یہ ایک حکومت کی آخری منزل... ایک حکومت کے نصب العین کو واضح کرتے ہیں۔ انسانیت پرستی کا فلسفہ ہے جسے چینی حکمرانوں نے جلیوتوں کی آسودگی سے تعبیر کیا ہے۔ کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ انسان کے سارے فطری تقاضے تسلی بخش طریقے پر پورے ہو جائیں۔ کیونکہ ان تقاضوں کے پورا ہونے سے ہماری زندگی مطمئن ہوگی اور مطمئن زندگی

گھر گریہت کے منزے

سے شانتی اور اخلاقی سکون پیدا ہوتا ہے۔ جو امن و آسشتی کی روح ہے کنفیوئس نے جو سیاسی نصب العین بتایا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی غیر ضروری بن جائے۔ اور ساری دنیا میں ایسے پائیدار امن و آسشتی کا دور دورہ ہو جائے جس کی بنیاد انسان کے دلوں پر ہتھوار کی گئی ہو۔ !!

ہیرو وقتار بڑھا پاپا

میں سمجھتا ہوں چین میں کنفیوڈری نظام ایسا ادارہ ہے جو بچے اور بوڑھے دونوں کے لئے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا ضامن بن جاتا ہے۔ بچپن - جوانی اور بڑھاپے کی صورتوں میں ہماری عمر گزرتی ہے۔ لہذا یہ لازم ہوا کہ ایک کنفیوڈری بچے اور بوڑھے دونوں مطلقاً زندگی بسر کر سکیں۔ بچے زیادہ بے دست و پا اور محبور ہوتے ہیں۔ اور خود اپنا خیال بھی نہیں رکھ سکتے لیکن بوڑھوں کی نسبت بچوں کو مادی آرام کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو مادی مشکلوں کا عالم طور پر احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایک غریب بچہ بھی اتنی ہی پر مسرت زندگی بسر کرتا ہے جتنی ایک امیر خاندان کے چشم و چراغ کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ ممکن ہے غریب بچے کی زندگی اس سے زیادہ پر مسرت ہو۔ غریب بچہ ننگے پاؤں رہے گا مگر یہ اس کے لئے آرام کا باعث ہوگا۔ لیکن بوڑھے آدمی کے لئے ننگے پاؤں چلنا پھرنا بڑی تکلیف دہ بات ہو کرتی ہے۔ بچے کو مادی تکلیفوں کا احساس اس لئے نہیں ہوتا کہ اس میں نیا خون اور نئی قوت ہوتی ہے۔ بچے کے سارے غم عارضی ہوتے ہیں۔ اور وہ بہت جلد انھیں بھول بھی جاتا ہے۔ اسے رد پے پے

پر وقار بڑھایا

کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اسے لکھتی بننے کا بھی جسطہ نہیں ہوتا لیکن بوڑھے آدمیوں کو یہ دونوں احساس کھلنے رہتے ہیں۔ بچے زیادہ یاد رکھتا ہے کہ انعامی کوپن جمع کرنے اور بھی اس لئے کہ ان سے ایک ننھی مہنی بندوق خرید سکے۔ لیکن بوڑھے آدمی تو گورنمنٹ کے قرضوں کے تمک جمع کرتے ہیں لیکن کوپن جمع کرنے اور تمک جمع کرنے میں کوئی مقابلہ نہیں۔ دونوں کا لطف ہی الگ ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچے بڑوں کی طرح زندگی سے ڈرتے نہیں۔ اس کی ذاتی عادات ابھی بچتہ نہیں جڑتی ہوتیں۔ وہ خاص قسم کے سگریٹ یا خاص مار کے کی کافی پینے کا علامہ نہیں ہوتا چنانچہ جو کچھ ملتا ہے۔ اور جو کچھ پیش آتا ہے بچے اسے قبول کرتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی نسلی تعصب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی تعصب سے تو بچے کا دل بالکل پاک ہوا کرتا ہے۔ بچے کے خیالات اور اس کے تہورات کسی بنی ہوئی لیکر کے فقیر نہیں بنے ہوتے اس لئے یہ عجیب بات بالکل درست ہے۔ کہ بوڑھے آدمی بچے سے بھی زیادہ مجبور اور دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اندیشے زیادہ واضح زیادہ قطعی ہوتے ہیں۔ اور ان کی خواہشات زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔

چین میں ابتدائی زمانہ ہی سے بڑے بڑے کے ساتھ شفقت چلی آتی ہے۔ اس جذبہ کا مقابلہ مغربی اقوام کی اس شیفستگی اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ جو مغرب میں ہمیشہ سے عورتوں کے سلسلہ میں موجود ہیں۔ چین میں یہ شفقت اور یہ احترام عورتوں اور بچوں کے لئے کم کم اور بوڑھے لوگوں کیلئے زیادہ ہے۔ چنانچہ یہی شفقت اور احترام فلسفی مین سی اس کے اس مقولے میں دیکھئے۔ کہ "بوڑھے لوگ بوجھ اٹھا کر تاروں میں چلتے نظر نہیں آنے چاہئیں۔" فلسفی مین سی اس نے عمرہ حکومت کا نصب العین قرار

دیا اور اس نے دنیا کے سخت مجبور اور بے سہارا لوگوں کے چار طبقے بنائے۔ بیوہ عورتیں
 رنڈو سے مرد۔ یتیم بچے اور لا ولد بوڑھے لوگ۔ اس نے یہ بھی قرار دیا کہ ان طبقوں میں پہلے
 دو طبقوں یعنی بیوہ عورتوں اور رنڈو سے مردوں کا انتظام تو ملک کے اقتصادی نظام
 کو کرنا چاہئے۔ جو ایسا بند و سبت کرے کہ ملک میں غیر شادی شدہ مرد عورتیں سرے سے
 باقی نہ رہیں۔ باقی رہے یتیم تو ان کے بارے میں مین سٹی اس نے کچھ نہیں بتایا
 اگرچہ چین میں ہمیشہ سے یتیم خانے اور بوڑھے لوگوں کے لئے قیام گاہیں قائم
 رہی ہیں۔ پھر بھی ہر شخص جانتا ہے کہ یتیم خانے اور بوڑھے لوگوں کے لئے قیام
 گاہیں گھر کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں۔ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ گھر ہی کی فضا بچوں
 اور بوڑھوں کے لئے ضروریات کے تسلی بخش انتظام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا
 ہوں۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں
 کیونکہ ایک چینی مثل کے مصداق "پانی نشیب میں مرتا ہے" بچوں کے لئے والدین کی
 شفقت اور محبت تو بالکل فطری اور مصدقہ چیز ہے۔ ہاں اہل مسلمان بوڑھے لوگوں کا ہے
 بوڑھے ماں باپ اور دوسرے بوڑھے بزرگوں سے پیار کرنا اور ان کے ساتھ شفقت برتنا
 ایسی چیز ہے جو ہمیں تہذیب اور ثقافت ہی سکھا سکتی ہے۔ رحیم انوں وحشی انسانوں
 میں بڑا پادری کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ گلے یا قبیلے کے بوڑھے افراد
 کو بارہم جھک کر مارنا بہتر سمجھا جاتا ہے) گو یا جو شخص فطرت سے باغی نہیں وہ
 اپنے بچوں کو تو پیار کر لے گا ہی۔ لیکن اپنے ماں باپ سے دلی
 لگاؤ صرف تہذیب یافتہ آدمی کو ہوا کرتا ہے۔ خیر زمانے کے گزرنے
 کے ساتھ ساتھ چین میں بوڑھے لوگوں کا احترام اور ان کی
 محبت ایک مسلمہ اصول بن گیا۔ اور بعض چینی ادیبوں کی تحریروں سے
 نو تہہ چلتا ہے کہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا لوگوں کا ازن تک ہو گیا۔ پتہ

پڑو تار بڑھایا

شرین زادے کے لئے سب سے زیادہ تاسف کی بات یہ ہوتی تھی کہ وہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت نہیں کر سکا اور ان کے بستر مرگ پر انہیں دوا اور بخینی نہیں پلا سکا جس وقت انہوں نے دم دیا تو وہ آخری دیدار کے لئے حاضر نہیں تھا۔ پچاس پچپن کے بیٹے کے کسی افسر کے لئے یہ بہت بڑا اخلاقی گناہ شمار کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو گاؤں سے بلا کر اپنے پاس نہیں رکھ سکا۔ اور خود ہر لات انہیں شب بخیر اور ہر صبح انہیں صبح بخیر نہیں کہہ سکا۔ اس اخلاقی کوتاہی کو کوئی معاف نہیں کرتا تھا۔ اور جو شخص اس کام تکب ہوتا اسے اپنے دوستوں اور اپنے ساتھی افسروں کے سامنے ہمیشہ طرح طرح کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی اس تاسف کا اظہار ایک شخص نے دو سطروں میں کیا ہے۔ وہ نوکری سے واپس گھر آیا تو اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔

وہ کہتا ہے:-

پیڑ کہتے ہیں کہ آرام کریں
تند جھونکے نہیں دیتے تسکیں

بیٹا کہتا ہے کہ خدمت کوں
بوڑھے ماں باپ مگر زندہ نہیں

اگر کسی کو اپنی زندگی اس طرح بسر کرنی ہے۔ جس طرح ایک قلم ہوتی ہے تو اسے اپنی زندگی کے غروب کے لمحات کو سب سے زیادہ خوشگوار اور پرست زمانہ سمجھنا پڑے گا۔ اور بڑھاپے کو ملتوی کرتے رہنے کی کوشش کے بجائے وہ ان ذریعہ لمحات کے انتظار میں چشم براہ رہے گا۔ اور زندگی کے ان بہترین ادھر میرتا بھر پور دنوں کے لئے وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو تیار کرتا رہے گا۔ میں نے مشرقی زندگی اور مغربی زندگی کا مقابلہ کرنے۔ اور ان میں ایک دوسرے کے خطن اور موافق باتیں ڈھونڈھنے کے سلسلہ میں جو کچھ کوشش کی ہے اس سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے بارے میں مشرق و مغرب کے رویے میں بڑا واضح اور قطعی

گھر گریہت کے مزے

فرق بلکہ اختلاف موجود ہے۔ باقی سارے اختلافات اتنے واضح اور قطعی نہیں مثلاً جنسی معاملات۔ عورت۔ کام۔ تفریح۔ کارکردگی وغیرہ کے بارے میں مشرق و مغرب کے خیالات میں اختلاف ضرور ہے۔ مگر یہ اختلاف اصنافی حیثیت رکھتا ہے بنیادی اور قطعی نہیں۔ چین میں عورت اور مرد کے جو تعلقات میاں بیوی کی حیثیت میں ہوتے ہیں۔ وہ مغرب سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ یہی حال ماں باپ اور بچوں کے تعلقات کا ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ انفرادی آزادی اور جمہوریت کے بارے میں مشرقیوں کے تصورات اور حاکم و محکوم کے تعلقات بھی مغربیوں کے تصورات سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک عمر کے بارے میں انسانی رویے کا تعلق ہے مشرق اور مغرب کا اختلاف قطعی ہے۔ اور اس بارے میں دونوں کے تصورات اور نظریات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کسی سے اس کی یا کسی کی عمر پوچھنی پڑے۔ یا خود اپنی عمر بتانی ہو چینی میں اگر کوئی شخص رسمی طور پر کسی سے ملنے جائے۔ تو وہ اس کا نام اور لقب پوچھنے کے بعد پہلا سوال یہی کرے گا۔ "آپ کا سن شریف کیا ہو گا؟" اگر دوسرا شخص سو دہا نہ کچھ عذر خواہی کے لہجے میں جواب دے۔ "جواب میں تیس برس کا ہوں" یا "میری عمر اٹھائیس سال کی ہے" تو دوسرا شخص اس کی ہمت بند ہائے گلہ کہے گا۔ "ماشاء اللہ آپ کا استقبال تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر خدا کرے آپ کی عمر دراز ہو۔" اگر جواب یہ ہو کہ میری عمر ۳۵ سال یا ۳۸ سال کی ہے تو ملاقاتی بڑے اہتمام سے کہے گا "سبحان اللہ خدا مبارک کرے۔" گو یا اگر عمر زیادہ سے زیادہ بتائی جاسکتی ہے تو دوسرے کا جذبہ شوق و احترام بڑھتا جائے گا۔ اور اگر کوئی خوش نصیبی سے صاحب خانہ سے کہہ سکے کہ میں بچا پس چلین کے پیٹے میں ہوں تو ملاقاتی کا ساوا

پر دقتار بڑھایا

رویت دیکھا ایکی بدل جانے گا۔ وہ احترام اور انکسار کے مارے اپنی آواز میں نرمی اور ملائمت پیدا کر لے گا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دنیا بھر کے بڑے لوگوں کو اپنا بڑھایا چین میں بکڑنا چاہئے۔ کیونکہ چین میں بڑے گد اگر کسی کے ساتھ بھی بڑی نرمی اور رحم دلی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ چین میں ادھیڑ عمر کے لوگ واقعی اس دن کے لئے ہمت تن و انتظار رہتے ہیں۔ جب وہ بڑی دھوم سے اپنی پچاسویں سالگرہ مناسکیں گے اگرچہ امیر سوداگر یا بڑے افسر تو اپنی اکتالیسیں سالگرہ بھی بڑے اہتمام سے منالیتے ہیں۔ پھر بھی آدھی صدی کا نشان یا پچاس برس کا ہو کر اپنی سالگرہ منانا تو ایسی چیز ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ اس بزرگی کا جشن مناتے ہیں۔ دس برس بعد کسٹھویں سالگرہ آتی ہے۔ جو اکیسویں سالگرہ سے کہیں زیادہ خوشی کا موقع ہوتی ہے۔ بھر دس برس بعد اکترویں سالگرہ کا دن آتا ہے۔ جو پہلے سے زیادہ شان کا جشن ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جو شخص اکیسویں سالگرہ بھی مناسکے اس پر تو آسمانی رحمتوں کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ ٹاڈھی بڑھانا ان لوگوں کا خاص حق سمجھا جاتا ہے۔ جو یا تو دادا۔ نانا بن چکے ہوں اور یا ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہو۔ جو شخص چین میں ان خاص شرائط کے بغیر دارگیا بڑھاتا ہے اس کی بیٹھو پیچھے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ بزرگی کی اس عزت کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان لڑک بزرگوں کی چال ڈھال۔ رکھ رکھاؤ اور انداز نظر کی نقل اتار کر یہ ثابت کر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بچتہ عمر ہیں۔ میں چین کے کئی نوجوان ادیبوں کی مثال دے سکتا ہوں۔ جن کی عمر ۲۰ برس سے زیادہ نہیں۔ مگر وہ چینی رسالوں میں اس بارے میں مضامین لکھتے ہیں کہ نوجوانوں کو کیا کتابیں پڑھنی چاہئیں اور کون کون سی کتابیں بالکل نہیں پڑھنی چاہئیں یہی نوجوان (ادیب بڑے بزرگانہ اور شرفانہ لہجے میں نوجوانوں کو یہ مشورے دیتے نظر آتے ہیں۔ کہ جو اپنی دیوانی ہوتی ہے۔ لہذا جوانی کی

گھر گریہ کے مزے

غرضوں سے خبردار رہنا چاہئے۔

چین میں کہیں سالی اور بڑھاپے کے جو فوائد ہیں۔ انکے پیش نظر بوڑھا ہونے کی خواہش عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ نہ یہ بات ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص بوڑھا ہو جانے یا کم سے کم بزرگ، نظر آنے کا اتنا خواہشمند کیوں ہے؟ بڑھاپے کے حقوق اور فوائد ہی ایسے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چین میں بات کرنا ہن سال بزرگوں کا حق ہے اور کم عمریوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ چپ چاپ ان بزرگانہ باتوں کو سنتے رہیں۔ چین کی مشہور مثل ہے کہ "نوجوانوں کے کان ہونے چاہیں زبان نہیں" اس بزرگی اور خوردگی کا رکھ رکھاؤ یہ ہے کہ اگر ۳ برس کا شخص بات کر رہا ہو تو ۲ سالہ نوجوان کو چپ چاپ اس کی بات سننی چاہئے۔ اسی طرح اگر ۱۰ برس کا آدمی بات کرتا ہو تو ۳ سالہ بزرگ کو اس کی بات چپ چاپ سنتے رہنا چاہئے۔ خود بات کرنا اور اپنی بات سنوانا ایک عالمگیر خواہش ہے انسانی عمری کے ساتھ ساتھ یہ مواقع زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ کہ آپ جس محفل میں جائیں۔ لوگ احترام سے آپ کی باتیں سنتے رہیں۔ زندگی کا یہ ایک ایسا کھیل ہے۔ جس میں زندگی کسی ایک شخص کے ساتھ، خاص طور عایت نہیں کرتی۔ کیونکہ ہر شخص وقت آنے پر بوڑھا اور بزرگ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی بات پر لکچر دے رہا ہو۔ اور وہیں دادا میاں آکھیں تو باپ فوراً چپ ہونے لگا۔ اور اس کا ساہرا اندازہ ہی بدل جائے گا۔ کیونکہ بات کرنے کا حق اب ابا کا ہے۔ باپ اور بیٹا اب صحت بات سننے کے اہل ہیں۔ اور سیر کا نظریہ میں عمر اور بزرگی کا کیا احترام ٹھیک بھی ہے۔ کیونکہ ایک بزرگ کے وسیع تجربے کے سامنے ایک نابالغ نوجوان کو بولنے کا کیا حق ہے؟

پڑوقار بڑھاپا

مغربی زندگی سے میرا واقفیت کافی پرانی ہے۔ مغرب میں بڑھاپے کے بارے میں جو نظریہ اور رویہ ہے وہ بھی میرے لئے نیا نہیں۔ پھر بھی جب بالکل غیر متوقع طور پر اس رویے کا سامنا ہو جائے تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی مشابہت مغربی زندگی میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایک بڑی بی تھیں جن کے بہت سے پوتے پوتیاں تھیں۔ عمر کا ذکر آیا تو کہنے لگیں۔ اب تو نیر کیا۔ مگر پہلے پوتے کی پیدائش پر مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ (یعنی اسی کی پیدائش سے مجھے اپنے بڑھاپے کا یقین ہوا تھا)۔ یہ مانا۔ کہ امریکی لوگ اپنے آپ کو بوڑھا بنا ہر کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر بھی اس احساس کا یہ اظہار ایسی چیز ہے جس کی کم سے کم مجھے امید نہ تھی۔ ادھیڑ عمر کے لوگوں کو تو یہ خواہش قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ کہ انہیں جوان اور مستعد سمجھا جائے۔ مگر کسی بوڑھی خاتون سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ عمر کا ذکر آتے ہی وہ بدک آٹھے۔ اور بات بدل کر موسم کی بات کرنے لگے۔ حالانکہ عمر کا تذکرہ کچھ میری بد تمیزی سے نہیں شروع ہوا تھا۔ بلکہ یونہی بات میں بات نکل آئی تھی۔ مغربی فضا میں یہ اکثر بھول جاتا ہوں۔ اور بالکل غیر شعوری طور پر کسی بزرگ شخص کو گاڑی میں یا کسی لفٹ میں پہلے داخل ہونے کے لئے راستہ دیتا ہوں۔ پھر یکایک یہ یاد آتا ہے کہ لوگ یہاں اس بات کا برامانتے ہیں۔ ایک مرتبہ اپنی اسی مشرفی عادات کے طفیل میں نے ایک نہایت معزز بزرگ کو گاڑی میں اپنی جگہ دی تو وہ کہیں سال بزرگ مڑ کر اپنی بوڑھی بیوی سے کہنے لگے "درا دیکھنا۔ یہ نوجوان سمجھتا ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے بہت کم ہے"

بڑھاپے کے بارے میں مغرب کا یہ رویہ انتہائی نامعقول ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کی تک کیا ہے۔ اگر نوجوان یا ادھیڑ عمر کی عورتیں جنکی شادی ہوتی ہو عمر ٹھیک بتانے سے گریز کریں تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ کیونکہ شادی کے

گھر گرمست کے مزے

سلسلے میں جوانی کو تزییح دی جاتی ہے۔ چینی لڑکیاں بھی اگر بائیس برس کی ہو جائیں اور بیاہی ہوئی نہ ہوں۔ یا ان کی منگنی تک نہ ہوئی ہو تو حون زدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ چھینے اور سال چپ چاپ گزرتے رہتے ہیں کسی کی بنتیا اور محبوری پر رحم نہیں سکا ہے اور ان لڑکیوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب زمانے ہمیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ عورت کی زندگی کا طویل ترین سال انتہیوں سال ہے کیونکہ ہر عورت ۳۰ سال کی عمر سے ڈرتی ہے۔ اور کئی برس تک لوگوں کے لئے اٹنیس سال ہی کی رہتی ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کو اپنی صحیح عمر کا پتہ نہ بتانا اور اس بات سے ڈرنا کہ کہیں لوگوں کو میری ٹھیک عمر کا پتہ نہ چل جائے بالکل نامعقول بات ہے۔ اگر آپ کو بچتہ عمر نہیں سمجھا جائے گا تو آپ کو دانشمند اور دانا کوئی کس طرح سمجھے گا؟ اور پھر بھلا تو جوان لوگوں کو زندگی اور شادی اور زندگی کی سچی اقدار کے بارے میں پتا ہی کیا ہے؟

مگر مغربی زندگی کا ہنچ یہ ہے کہ جو اتنی کو ہر حال میں تزییح دی جاتی ہے یہی تزییح عورتوں اور مردوں کو اپنی صحیح عمر بتانے سے روکتی ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ ۴۵ برس کی ایک خاتون سکڑ پڑی جو بڑی مستعد اور کارکن مانی جاتی ہے اپنی صحیح عمر کے انکشاف کے بعد فوراً نکلتی بھی جانی لگتی ہے۔ اس لٹی منطلق کی وجہ سے اگر یہ بیچاری اپنی صحیح عمر چھپائے رکھنا چاہے تو نجیب کی بات نہیں۔ کیونکہ اس بیچاری کو رہنی نوکری قائم رکھنی ہے۔ میرے خیال میں زندگی کا یہ ہنچ اور جوانی کی یہ تزییح دونوں باتیں نامعقول ہیں۔ میرے نزدیک اس کا کچھ حاصل نہیں۔ مگر یہ سب لچھ کار و باری زندگی کی برکت ہے کیونکہ ذوق کی نسبت گھر میں بوڑھے آدمیوں کی زیادہ عزت کرنی ممکن ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ

پُر دقار بڑا پایا

امریکی لوگ مصروفیت، مستعدی اور کاروباری کامیابی کو کچھ کچھ تحقیر کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ عام امریکی باپ جب دفتر کی بجائے گھر کو مثالی جگہ سمجھنے لگے گا اور اپنی باپ کی طرح فخر سے یہ کہہ سکے گا کہ اب میرا بیٹا دفتر میں میری جگہ کام کر سکتا ہے اور اپنے ساتھ میرا بھی پیٹ پال سکتا ہے تو وہ واقعی اس دن کا انتظار کرے گا۔ جب وہ بڑھا ہو جائے اور جوان بیٹا اس کا کام سمجھالے۔

امریکہ میں تندرست اور توانا بوڑھوں کی زبان سے میں نے یہ سنا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں۔ یہ شاید زبان کی بدبختی ہے کہ جوان سے ان کی "صحت مند" ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ بڑھاپے میں بھی صحت مند ہو۔ گویا کہن سالی اور صحت مند کلیمش بہا چیزیں ہیں۔ اب اسے "جوانی اور صحت مندی" سے تعبیر کرنا کتنی بڑی زیادتی ہے۔ ایک کامل چیز میں کئی عیب اور خامیاں اور خام کاریاں پیدا کر دینا گنتی زبردستی ہے۔ اس دنیا میں ایسے صحت مند دانا بڈھے سے بڑھ کر کوئی چیز دلکش نہیں جو بھرے بھرے چہرے اور سفید بالوں کے ساتھ زندگی کے بارے میں پورے یقین اور پوری دانش کے ساتھ بات کر سکتا ہو۔ چین میں یہ تصور بڑا عام ہے۔ اس لئے چینی لوگوں کے نزدیک زمینی خوشیوں کی زندہ علامت ایسا بوڑھا آدمی ہے جس کا چہرہ صحت مندی کی تصویر ہو۔ اور جس کے بال برف کی طرح سفید ہوں۔ "آپ میں سے بعض حضرات نے دراز کا عمر کے چینی دیوتا کی تصویر دیکھی ہوگی جو اونچے اونچے سرخ و سفید چہرے لمبی سفید ڈاڑھی اور اپنے تبسم کے ساتھ کتنا دلکش نظر آتا ہے۔ یہ تصویر دانا نائی کی ہے۔ دیوتا اپنی انگلیاں لمبی ڈاڑھی پر پھیرتا ہے۔ دلی طانیت اور قناعت کے ساتھ تبسم افشاں ہے۔ دقار اور متانت کا مجسمہ ہے کیونکہ ہر کوئی اس کا احترام

گھر گرمہت کے مزے

کرتا ہے اس کے چہرے سے خود اعتمادی ہرید ہے۔ کیونکہ کوئی شخص اس کی دانائی میں شک نہیں کر سکتا۔ رحم اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے۔ کیونکہ اس نے انسان کے ان گنت غموں کو دیکھا ہے۔

مگر بسی سفید ڈاڑھیوں والے شاندار بڑھے امریکہ میں نہیں ملتے غالباً ایسے بزرگ موجود ضرور ہیں۔ مگر وہ کسی سازش کے ماتحت اپنے آپ کو زمانے کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں بس ایک دفعہ نیوجرسی کے شہر میں میں نے ایک بڑھا دیکھا تھا۔ جس کی کچھ عمدہ ڈاڑھی تھی۔ درزہ سب صفا چٹ نظر آتے ہیں۔ شاید یہ سیفٹی ریزر کا کرشمہ ہے کہ سفید ڈاڑھی کہیں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ بھی ویسا ہی احمقانہ اور کوتاہ اندیشانہ فعل ہے۔ جس طرح چینی کسانوں نے شمالی چین کی ساری پہاڑیاں دخت اور جنگل کاٹ کاٹ کے پھیل بنا ڈالے ہیں۔ اور شمالی چین کے علاقے جو بصورت جنگلوں سے آکا طرح محروم ہیں۔ جس طرح بڑھے امریکیوں کی ٹھوڑیاں سیفٹی ریزر کی بدولت جو بصورت سفید ڈاڑھیوں سے محروم ہیں۔ اب امریکہ کے شاندار بڑھے افاضہ بن چکے ہیں۔ چچا سام اپنی جگی ڈاڑھی کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا کیونکہ اس نے سیفٹی ریزر لے کر یہ ڈاڑھی مونڈ ڈالی ہے۔ تاکہ صحت اور بخیر ڈاڑھی کی وجہ سے احمق نوجوان نظر آسکے اس کی ٹھوڑی اندر کی طرف تھکی ہوئی نہ ہے بلکہ باہر کو نکلی نظر آئے۔ اور موٹے ٹیشے کے چستے کے پیچھے اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک جھلکتی رہے۔ ایک شاندار بڑھے کے مقابلے میں یہ نقشہ کتنا حقیر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں جو کہن رسال لوگ

بڑے مصروف رہنا چاہتے ہیں۔ وہ محض انفرادیت

پسندی کی ایک احمقانہ نمائش ہے اور بس۔ ان کا غرور

پرندتار بڑھاپا

اور خود مختاری کا جنون نہیں اپنے بچوں کے سہارے بڑھاپے کے دن کٹنے
 نہیں دیتا امریکی عوام نے اپنے طبعی آئینوں کی نص سے انسان کو بہت حقوق
 دے رکھے ہیں۔ مگر اس آئین میں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی کہ بوڑھے ماں باپ کو
 اپنے بچوں کی دی ہوئی روٹی کھانے کا بھی حق ہے۔ یہ صحیح معنی میں ایک واضح
 حق ہے۔ ایک ایسی ذمہ داری ہے جو خدمت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کون
 انکار کر سکتا ہے کہ بچے چھوٹے تھے تو جوان والدین نے خون پسینہ اک کر کے
 ان کی پرورش کی۔ جب وہ بیمار تھے تو والدین نے اپنی راتوں کی نیند حرم کی ہٹا
 گو موت دھویا سلگ بھگت پچیس برس خرچ کر کے ان بچوں کو جوان کیا اور انہیں زندگی
 کی کشمکش کیلئے تیار کیا۔ اب کہ والدین بوڑھے ہو گئے تو پھر کیا ان بوڑھے والدین کو چھٹی حاصل
 نہیں کہ ان کے بچے ان کی کفالت کریں ان سے پیار کریں۔ انکا احترام کریں۔ گھر پر زندگی کے اس
 نظام میں جہاں بچپن میں آپکی نگہداشت دوسرے کرتے ہیں۔ اور پھر آپ اپنی باری آئے پلے
 بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں کیا اپنے اس رحم خودی اس گھر کے غرور پرانہ اہمیت
 پرستی کو بھولنا رواد نہیں۔ اور اپنے بچوں سے خدمت لینا جائز نہیں۔

چینی قوم میں فرد کی خود مختاری کا احساس بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی
 کا سارا نظام گھر کی چار دیواری میں ایک دوسرے کا ماتھ بٹانے پر ہی استوار ہے
 لہذا چین میں بوڑھے ماں باپ کے لئے یہ شرم کی بات نہیں کہ ان کے جوان بچے
 ان کی کفالت کریں۔ بلکہ چین خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے کہ آپ کے بڑھاپے میں آپ
 کے بچے جو ان پر جائیں۔ جو آپ کا سہارا بن سکیں۔ چین میں زندگی
 کا مقصد اور مہتا ہی ہے۔

مغربی زندگی میں کہن سال لوگ اپنے آپ کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گھر گریہ کے منے

ایسے کہن سال بچارے سماج کی دلچسپیوں سے دور کسی گناہ میں ہونے کی زندگی کے
 باقی ماندہ دن گزارتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے بال بچوں کی گھریلو زندگی میں دخل انداز
 نہ ہوں۔ ان کی یہ خواہش از حد بے غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بزرگوں کو اس
 مداخلت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ یہ مداخلت ناخوشگوار ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد
 رکھتے کہ زندگی مجموعی طور پر اور خاص طور پر گھریلو زندگی نظم و ضبط کا نام ہے اور وہ
 ٹوک ہی ضبط پیدا کر سکتی ہے۔ نیچے چھوٹے ہوں تو ماں باپ انکے ہر کام ہر بات
 میں ان کے کھلے کو دخل دیا ہی کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط
 ہے کہ ماں باپ کو چھوٹے بچوں کے بھی کسی کام کسی سرگرمی میں کوئی مداخلت نہیں۔
 کرنی چاہئے۔ میں پوچھتا ہوں اگر آپ اپنے بڑے مندر ماں باپ کا وجود اپنے
 گھر میں برداشت نہیں کر سکتے تو پھر کس کی موجودگی برداشت کریں گے؟
 ہر شخص کے لئے ضبط نفس پیدا کرنا لازمی ہے۔ ورنہ خود شادی بھی نہایت ناکام
 ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ اولاد کی محبت بھری
 خدمت اور ذاتی احترام اوسے لوثی کا ان بیروں کی خدمت سے کیا مقابلہ ہے
 جو وہ ہونٹ میں رہنے والے ایک ضعیف جوڑے کے لئے کرتے ہیں؟
 چہنچہن میں اس بات پر ہمیشہ زور دیا جاتا ہے کہ اولاد کو بڑے سے ماں باپ کی
 خدمت خود کرنی چاہئے۔ اس خدمت کا جو ارجینوں کے نزدیک یہ ہے۔ کہ
 دستوں کے احسانات تو گئے جاسکتے ہیں۔ مگر ماں باپ اولاد پر جو احسانات کرتے
 ہیں ان کا شمار ممکن نہیں۔ اولاد کی سعادت مندی کے بارے میں اپنی زبان میں جو
 کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ والدین بچوں کے پوترے تک اپنے ہاتھ
 سے صاف کرتے ہیں۔ اس معمولی سی بات کی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے۔

پر دقار بڑھایا

جب اولاد بڑی ہو کر خود والدین بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب ماں باپ بوڑھے اور معذور ہو جائیں تو کیا ان کا یہ حق نہیں کہ ان کی اولاد انہیں ان کے مرغوب کھانے کھلائے اور ان کے آرام آسائش کا بہرہ نفع خیال رکھے؟ ماں باپ کی خدمت کرنے والے بیٹے کے فرائض کافی سخت ہوتے ہیں۔ لیکن ان خدمتوں کا مقابلہ ایک ہسپتال کے مریض کی خدمت سے کرنا۔ ماں باپ کے مقدس رتبے کی زمین کرنا ہے تا عوسی شیبہ نے اپنے ایک مقالے میں بتایا ہے کہ گھر میں یہ خوردہ کنسٹریشن کیا کیا ہیں۔ پڑانے مدرسوں میں اخلاقیات کی کتابوں میں یہ مقالہ ہر جگہ شامل نصاب ہے۔ وہ کہتا ہے۔

گرمی کے دن ہوں تو بیٹیوں کو چاہئے کہ ماں باپ کو نیکھا جھلیں اور نکھلیوں، پھروں اور گرمی کو ان کے نزدیک نہ آنے دیں۔ سردیوں میں ان کا فرض یہ ہے کہ ماں باپ کے بستروں کے گدے اور ٹوشکاب گرم رکھیں۔ آتش دان میں آگ چلتی رہے۔ اور وہ خود اس کمرے میں کھڑا رہ کر یہ اندازہ کریں کہ آگ اور گرمی ٹھیک درجہ کی رہتی ہے۔ اولاد کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ماں باپ کے کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ان میں کوئی درز یا کوئی سوراخ تو نہیں جس سے ہوا اندر آتی ہو۔ گویا اولاد کا یہ فرض ہے کہ ماں باپ کو ہر موسم میں آرام ملے۔ اور وہ خوش و خرم رہیں۔

دس یا دس برس سے زیادہ عمر کے بچے کو چاہئے کہ صبح ماں باپ کے جاگنے سے پہلے بیدار ہو جائے۔ اور صندری حوائج سے فارغ ہو کر ماں باپ کے پاس جا کر پوچھے کہ آپ کی رات تو آرام سے گزری ہے۔

گھر گریہ کے منہ

ماں باپ بیدار ہو چکے ہوں تو بچے کو چاہئے کہ پہلے نہیں ہنایت
ادب کا سلام کرے۔ اور پھر ان کی طبیعت کا حال پوچھے اور پھر سلام کر کے
چلا آئے۔ رات کو اس بچے کا فرض ہے کہ پہلے ماں باپ کے لیٹر
بچھائے۔ اور جب تک وہ سو نہ جائیں ان کے پاس ہے۔ پھر صیبا وہ
سو جائیں تو کمرے کے پردے پھوڑ کر چلا آئے۔

آپ ہی انصاف فرمائیں۔ ان حالات میں چین میں کون نہیں چاہتا ہو گا۔ کہ بوڑھا
ہو جائے۔ یا بوڑھا باپ یا دادا بن جائے؟

ادھر کچھ عرصہ سے چین میں کچھ ترقی پسند قسم کے ادیب پیدا ہوئے ہیں۔ جو
اس قسم کے اخلاقی ضابطوں کو جاگیر داری کے جو نچلے کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے
ہیں۔ مگر ان چیزوں میں کچھ ایسی دلکشی اور پائیداری سی ہے کہ پڑانے لوگ
نئے زمانے کے چین سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم اصل بات یہ ہے
کہ ہر شخص وقت آنے پر بوڑھا ضرور ہو گا بشرطیکہ وہ اس وقت تک زندہ
رہے۔ اور تاویل زندہ رہنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ انفرادیت پسندی کی تعبیر
یہ کہہ سکتی ہے کہ ہر شخص خیالی دنیاؤں میں بالکل خود مختاری اور علیحدگی کی زندگی
بسر کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر ہمیں یہ مانتا پڑے گا کہ ہمیں اپنی زندگی کچھ اس
طرح بسر کرنی چاہئے کہ ہماری عمر کا بہترین حصہ ہمارے قابل (بوڑھا پانا) ہو اور ہمارے
نزدیک زندگی کا سنہری زمانہ وہ نہ ہو جسے ہم اپنی جوانی یا طفلی اور خصوصیت کے دن
میں بہت پیچھے پھوڑا آئے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم اپنے ماضی (جوانی یا طفلی
کے دنوں) کو عمر کا سنہری زمانہ سمجھیں گے تو ہم غیر شعوری طور پر گزرتے ہوئے
دقت کی بے رحم گردشوں کے ساتھ مصروفت پر کار ہو جائیں گے۔ ہم ہر آنیوالے

پر وقت بڑھا پا

دور سے ڈرتے رہیں گے۔ اور یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ وقت کے ساتھ لڑ کر
 کون جیت سکا ہے؟ وقت کی گردش آخر میں ہر ایک کو مات دے کر چھوڑتی ہے
 بڑھاپے کی آمد اور بوڑھا ہو جانے کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی زیادہ سے
 زیادہ ہم اپنے کو یہ دھوکا دے سکتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم نہ کریں۔
 مگر قدرت کے ساتھ لڑنا بیکار ہے۔ اس لئے اگر بڑھا پا مقدر ہی ہے
 تو پھر یہ وقت طریقے سے اور نفار سے سے بوڑھا ہونا بہتر ہے۔ زندگی کے
 طویل نغمے کو سکون اور طمانیت مادی آرام اور روحانی تسکین کی معراج
 بے پہنچ کر ختم ہو جانا چاہئے۔ یہ نہیں کہ اس نغمے کا اختتام شور و دھن
 اور بے سری آوازوں پر ہو۔ •

باب نہم

چھنے کے فن

- ۱ - بستر
- ۲ - مگر سی
- ۳ - گفتگو
- ۴ - چائے اور دوستی
- ۵ - تمباکو اور خوشبو
- ۶ - شراب
- ۷ - غذا اور دوا
- ۸ - مغربا کے کچھ عجیب دستور
- ۹ - مغربی لباس
- ۱۰ - مکان اور اس کی آرائش

۱۔ بستر۔

میرا خیال ہے کہ میں کچھ اشتہاری فلسفی بنتا جا رہا ہوں۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ یوں فلسفے کو دیکھتے تو فلسفہ ایسے علم کا نام ہے جو سادہ چیزوں کو مشکل بنا دے لیکن میرے ذہن میں علم کا تصور آتا ہے کہ وہ مشکل چیزوں کو بھی آسان کر دے فلسفے میں "مادیت" "انسائٹ پرستی" "ماورائیت" اور "تنوہیت" اور ایسی ہی کئی قسم کی باتوں کو فروغ ملا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ سارے فلسفی کسی صورت میں بھی میرے فلسفے سے زیادہ گہرے یا مفصل نہیں ہیں۔ زندگی آخر ہے کیا۔؟ —

زندگی کھانے پینے۔ سونے جاگنے۔ اپنے عزیزوں کو الوداع کہنے۔ اور عزیزوں سے پھر ملنے سے مرکب ہے۔ زندگی آنسوؤں اور قہقہوں کا آمیزہ ہے۔ زندگی یہ ہے کہ دو چار ہفتوں میں ایک بار بال کٹوائے جائیں۔ اپنے بھولوں کو باقی سے سینچا جائے۔ اپنے ہمسایوں کا نقصان اور ان کی شہادت کی جانے۔ زندگی کے بارے میں اپنے سادہ خیالات اور تاثرات کو عمیق بحث کا بھاری بھر کم لباس پہنا کر پیش کرنا دھوکے کا ٹی ہے۔ جس کی آڑ میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر اپنے بیحدہم خیالات کو یا اپنے عجز کو چھپاتے ہیں۔ گو یا فلسفہ ایسا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنے بارے میں دکھ سے کم سمجھنے کی طرف زیادہ سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ فلسفیوں کی کامیابی صرف یہیں تک ہے کہ وہ زندگی کے بلے میں جتنے زیادہ نکتے پیدا کرتے ہیں اتنا ہی ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ الجھتے ہیں۔

بستر

اب بستر میں لیٹنے ہی کو لیجئے۔ بہت کم لوگ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سمجھتے
واقف ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں فلسفے اور سائنس کی کل اختراعات کا ۹۰ فی صد
حصہ اس وقت موجود یا فلسفی کے ذہن میں آیا تھا۔ جب وہ رات کے وقت بچے یا
گھر دم یا پانچ بجے آرام سے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

بعض لوگ دن میں آرام کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ رات کو بستر پر لیٹنے کے عادی
ہیں۔ لیٹنے سے میری مراد واقعی لیٹنا اور آرام کرنا ہے۔ کہ جسم اور روح دونوں سکون
سے ہمکنار ہوں جو لوگ میری طرح آرام کرنے کے قائل ہیں اور اسے زندگی
کی ایک بہت بڑی مسرت سمجھتے ہیں وہی شریفین اور دیانت دار لوگ ہیں۔
اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں انہیں دن بھر اخلاقی اور جسمانی طور پر کسی کل اپنی نہیں آتا۔ آپ
پوچھیں گے کہ آخر بستر پر لیٹے رہنے کی جسمانی اور روحانی اہمیت کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں اسکی
جسمانی اہمیت تو یہ ہے کہ بستر پر لیٹ کر انسان دنیا سے الگ تھلگ اس کے شہو و غوغا سے
ہٹ کر گوشہٴ عاقبت میں پہنچ جاتا ہے وہ اپنے ہاتھ پاؤں و سارے اعضا کو اس طرح آرام دیتا ہے جس طرح وہ نہیں

زیادہ سے زیادہ آرام ملتا ہے۔ اور پھر عاقبت اور دھیان میں مگن ہو جاتا ہے
بستر پر لیٹنے کا کبھی ایک مناسب اور عمدہ طریقہ ہے۔ مثلاً زندگی بسر کرنے کا رت اور کیفیت
کبھی بستر پر شیر کی طرح سیدھا چت نہیں لیٹتا تھا۔ بلکہ کروٹا کے بل لیٹتا ہوا ہرگز آرام
کرتا تھا۔ میرے نزدیک زندگی کی بہت بڑی راحت بستر پر لیٹ کر اپنی ٹانگیں
سکڑنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس آرام کے لئے یہ بھی اہم ہے کہ آپ کے دونوں
بازوؤں کی پوزیشن صحیح یعنی دونوں بازو اس طرح رکھے جائیں کہ زیادہ سے زیادہ
خطا حاصل ہو۔ اور دماغ کو بھی تازگی اور فرحت و قوت
ملے۔

میرے خیال میں بستر پر لیٹنے کا

بچنے کے منہ

بہترین طریقہ یہ ہے کہ بستر پر بالکل سیدھے نہ لیٹا جائے۔ بلکہ آپ نرم اور
 گدگدے بڑے بڑے تکیوں کے سہارے پٹے ہوں۔ اور ایک بازویا دونوں بازو
 سرمکد گدی کے نیچے رکھے ہوں۔ یہ لیٹنے کا وہ انداز ہے کہ اس کی بددلت ہر شے لافانی
 شعر کہہ سکتا ہے۔ اس انداز میں لیٹنے سے ہر فلسفی انسانی فکر میں انقلاب برپا کر سکتا
 ہے۔ اور ہر سائنس دان عہد آفرین ایجادات کر سکتا ہے۔
 عجیب بات ہے کہ بہت کم لوگ تنہائی اور غور و فکر کی قدر و قیمت سے
 واقف ہیں۔ بستر پر لیٹنا صرف جسمانی آرام ہی کا نام نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ
 بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد لوگوں سے ملنے جھلنے۔ دوستوں کی بے سرو پا
 باتیں سننے اور بھائی بہنوں کی ہدایات سننے کے بعد جب آدمی بستر پر لیٹتا ہے۔ تو
 اس کا سارا جسم سکون و آرام حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے سوا بھی کچھ ہے
 اگر آپ کو بستر پر لیٹنے کا صحیح آرٹ آتا ہو تو اس سے دل و دماغ کی تازگی اور طہارت
 کا ہونا بھی لازمی ہے۔ میں نے بڑے بڑے کاروباری لوگوں کو دیکھا ہے۔ کہ وہ
 اپنی بھاگ دوڑ اور اپنے تین تین ٹیلی فونوں پر دن دن بھر لین دین کرتے ہیں۔
 اور اپنی اس محنت اور مصروفیت پر بڑے نازاں ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی یہ
 نہیں سوچا کہ اگر وہ دن رات میں کسی وقت صرف ایک گھنٹہ بھی بستر میں جاگتے ہو
 پر سکون طور پر گزار دیں تو شاید وہ اپنے کاروبار میں دگنا کمائیں۔ اگر کوئی سات
 بجے اٹھ جانے کے بجائے سات بجے سے آٹھ بجے تک چپ چاپ بستر میں
 لیٹا رہے تو کونسی قیامت آجائے گی؟ بلکہ اس سے بہتر ہے کہ وہ عہدہ سگرٹوں
 کا ایک ڈبا اپنے پاس رکھے اور بستر سے اٹھنے میں کافی دیر لگائے تاکہ بیداری کے بعد
 ان پر سکون لمحوں میں بستر پر لیٹے لیٹے اپنے تمام مسائل عوز و فکر سے حل کرے

بستر

پھر آرام سے اٹھے اور منہ ہاتھ دھوئے۔ بستر پر لیٹے لیٹے یہ کاروباری شخص ٹائی اور سوٹ بوٹ کے بندھنوں سے آزاد ہو گا۔ تنگ جانگیہ یا سیت بیٹی اسے ستاتی نہیں ہو گی۔ چہرے کے چکے اور سخت بوٹ اس کے پاؤں کو جکڑے ہوئے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس کا کاروباری ذہن آزادی سے کام کی بات سوچ سکے گا کیونکہ قاعدہ کی بات یہ ہے کہ اگر پاؤں قید سے آزاد ہوں تو سر بھی آزاد ہوتا ہے اور سر کی آزادی پر ہی کام کی بات سوچنے کا دار و مدار ہے۔ گویا بستر پر آرام سے لیٹ کر۔ یہ کاروباری گزرے ہوئے کل کی کامیابی اور ناکامی کا محاسبہ کر سکے گا۔ اور آنے والے دن کے ضروری کاموں اور غیر ضروری باتوں کو ٹھنڈا کر الگ الگ کر سکے گا۔ نوبے یا پونے نوبے دفتر پہنچ کر اپنے ملازمین اور ماتحتوں کو غیر ضروری کاموں میں بلا وجہ جوتے رکھنے اور ہر کام کی جلدی مچانے سے یہ کہیں بتر ہے کہ یہ شخص نوکے بجائے دس بجے آرام سے دفتر پہنچے۔ اور پوری صفائی۔ ذہن اور مکمل سکون سے کام کر سکے۔ اور دوسروں سے کام لے سکے۔

یہ ایک کاروباری شخص کا ذکر تھا۔ ایک مفکر یا موجد کے لئے تو بستر میں ایک آدھ گھنٹہ چپ چاپ لیٹے رہنا اور بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک ادیب اس وقفہ میں اپنے مضمون یا اپنے ناول کے لئے وہ باتیں سوچ سکتا ہے جو دماغ پر جم کر بیٹھ کر پورے دن میں بھی غالباً نہیں سوچ سکے گا۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ دنیا کے سب فضول کاموں سے آزاد ہو گا۔ وہ زندگی کو ایک رنگین پردے میں سے دیکھے گا۔ جو حقائق کو اپنی جھوٹ سے موز کر دے گا۔ اور زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز بھی اس شاعرانہ دنیا میں پہنچ کر طلسماتی حسن سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ زندگی کا ادھر اپنا نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ اس کے سامنے ایسی تصویریں بن جائیں گی۔ جو

جینے کے سنے

زندگی سے زیادہ صبح اور جاندار اور جو بصورت ہوں گی۔

آپ پوچھیں گے یہ سب کیسے ممکن ہے؟ بات یہ ہے کہ بستر میں لیٹ کر جسم کے سارے پٹھے آرام پاتے ہیں۔ خون کا دوران زیادہ باقاعدہ۔ زیادہ متدل ہو جاتا ہے۔ سانس ٹھیک آتا جاتا ہے۔ سننے اور دیکھنے اور کام کرنے کے عصاب کو کم و بیش مکمل آرام ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے سارا جسم راحت اور سکون پاتا ہے۔ لہذا دماغ کو زیادہ یک سوئی حال ہوتی ہے۔ اور ہمارا ذہن کسی خیال یا کسی جذبے پر پوری توجہ سے مرکوز ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ سو نکلنے کی حس یا سننے کی ایسے سکون کے لمحوں میں یہ بھی بہت تیز ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں۔

کہ عمدہ موسیقی لہیٹ کر سننی چاہئے۔ چینی ادیب لی لی ڈنگ نے اپنے مضمون میں بید مجنوں میں لکھا ہے کہ پرندوں کے نغمے صبح کو بستر میں لیٹ کر سننے چاہئیں۔ اگر صبح سویرے نیند سے بیدار ہو کر پرندوں کے آسمانی نغموں کو سننے کی عادت پیدا کر لیں تو حسن و موسیقی کی ایک نئی دنیا کے پٹے ہمارے لئے کھل سکتے ہیں۔ اس میں کھلی قضا کی تخصیص نہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں صبح کے وقت بے شمار پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ مشکل ہے کہ بہت کم لوگ انہیں سنتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ میں نے سنگھانی میں صبح کے وقت پرندوں کے نغمے سننے تو میں نے اپنے اپنے خیالات کو سپرد قلم کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ اس کا ایک قبلاں اب پیش کرتا ہوں۔

آج صبح رات بھر کی گہری نیند کے بعد میں ۵ بجے بیدار ہوا اور میرے چہرے اور آوازوں کا ایک نہایت شاندار سنگیت سنا۔ صبح میں مجھے کارخانوں کی سینٹیوں نے نیند سے جگایا تھا۔ لیکن چوڑی

بستر

دیر بعد میں نے دور سے بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنیں۔ یہ
غائباً رسالے کے جوان تھے جو یوآن روڈ سے گزر رہے تھے۔ پھر کچھ پرندوں
کے چہچہے سنائی دئے۔ مجھے معلوم نہیں یہ پرندے کون کون سے تھے کیونکہ
مجھے پرندوں کے بارے میں بہت کم واقفیت ہے۔ پھر بھی ان
چہچہوں سے میں نے بہت لطف اٹھایا۔

ان آوازوں کے علاوہ اور بھی آوازیں تھیں۔ ایک غیر ملکی باشندے
کا ملازم لڑکا "رات بھر کی عیاشیوں کے بعد کوئی ساڑھے پانچ بجے کے
قریب پاس کے کسی دروازے کو کھٹکھٹانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد
گلی سے مہتر کے جھاڑو دینے کی شرشر کی آواز آنے لگی۔ بکا بکا آسمان
پر ایک مرغابی اڑی۔ اور اس نے موٹی آوازیں کنگ کنگ کر کر نکالی۔
تھر تھری پیدا کر دی۔ چھ بج کر ۲۵ منٹ پر دو درتنگھانی سے ہانگ چاؤ
جانے والی گاڑی کی گرگرگراہٹ سنائی دی۔ اور تھوڑی دیر میں آوازوں
نے مجھے بتایا کہ یہ گاڑی اب حبس فیڈ کے جنکشن پہنچ کر ٹھہر گئی ہے۔
ان آوازوں کے ساتھ ساتھ کمرے سے سوتے بچوں کی ہلکی آوازیں
بھی آرہی تھیں۔ پھر زندگی بیدار ہو کر حرکت میں آنے لگی۔ دلنہانی سگریٹوں
اور کام کاج کی گونج میرے پاس اور مجھ سے دور بڑھنے لگی اس میں
تیزی آگئی۔ آوازیں اونچی ہو گئیں۔ خود میرے گھر میں نیچے کی منزل میں
ٹوکر جا کر جاگے انہوں نے کھڑکیاں اور دروازے کھولے پھر ہلکی
سی کھانسی کی آواز آئی۔ اور یاؤں کی ہلکی چاپ کے ساتھ چلنے کی
پہ پیالی کھٹکھٹائی۔ اس آواز کے ساتھ ہی ایک بچہ بکارا لہٹی۔ ... آئی!"

جینے کے منہ

مجھے خوب یاد ہے۔ اس سال بہار کے سارے مہینوں میں مجھے ایک پرندے کی آواز سن کر بڑی فرحت ہوتی تھی۔ جسے غالباً تیریا چکو رکھا جاتا ہے۔ سردوں میں اس کا نغمہ کچھ اس طرح کا تھا (سا، ما، رے، رے، نی) رکھب کو خوب لیا کیے اور اس پر پورا ٹھہراؤ دے کر ادا کیا جاتا تھا۔ اور آخری سرسری نکھار یکا یک تم کیا جاتا تھا اور یہ آواز بھی بہت ہی کوئل۔ یہی نغمہ میں جنوبی چین کے پہاڑوں میں سنا کرتا تھا۔ اور مزہ یہ تھا کہ نر پرندہ صبح سویرے میرے گھر سے کوئی ۲۰ گز دور ایک پٹر کی شاخوں سے یہ نغمہ کوکتا تھا۔ اور پھر کوئی سو گز سے مادہ۔ اس سے نچسلی ہٹک میں اسی نغمے کو ادا دیتی تھی۔ (نی، رے، رے، ماسا) کبھی کبھی اس میں کچھ تبدیلی آتی تھی اس کی چال کچھ تیز ہو جاتی تھی۔ اور اس تیز لے میں آخری سر پھوڑ دیا جاتا تھا۔ میں نے پرندوں کے جتنے نغمے سنے ہیں ان میں یہ کوک سب سے زیادہ میرے ذہن میں جاگزیں ہے۔ میں ان تمام نغموں کو لفظوں میں نہیں لاسکتا۔ صرف آپ کے سامنے ان نغموں کو موسیقی کے سروں (جسے درجن کہتے ہیں) میں ظاہر کر سکتا ہوں۔ مگر ان نغموں میں ہر ہ کی بولیاں تھیں۔ کبوتروں کا ہلکا اور گھمبیر نغمہ تھا۔ کھٹ بڑھی کی کوک بھی اور کیا کیا تھا۔ غالباً چڑیا ان سب سے بعد میں بیدار ہوتی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو عشر پسند شاعر کی ذمگ نے بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسرے پرندوں کو اس لئے منہ اندھیرے نغمہ مرانی کرتی پڑتی ہے کہ وہ شکاری انسانوں کی بند و قوں سے خائف ہیں۔ اور دن بھر شریر لڑکوں کے پھراؤ سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس لئے یہ پرندے ظالم انسانوں کی بیداری سے پہلے پہلے ہی آرام سے گلنے گاسکتے ہیں۔ جو یہی انسان نیند سے اٹھا ان غریب پرندوں کو چین سے نغمہ سرانی کرنی نصیب کہاں ہوگی مگر چڑیا کا معاملہ مختلف ہے۔ چڑیاں انسان سے ڈرتی نہیں۔ اس لئے وہ دیر تک

بستر

سوتی رہتی ہیں۔ اور آرام سے اٹھتی ہیں۔ پھر چوں چوں سے اپنا دل بہلاتی ہیں

۲۔ کرسی۔

کرسیوں پر بیٹھنے کے بارے میں مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ کرسیوں پر بیٹھنے کے سلسلے میں میری شہرت خاصی ہے۔ اب تو میرے بہت سے دوست بھی کرسیوں پر اینڈ نے میں کسی سے کم نہیں۔ مگر چین کی ادبی دنیا میں ہی اس سلسلہ میں بہت زیادہ معروف ہوں۔ میری گزارش یہ ہے کہ اس گناہ کا مرتکب اکیلا میں ہی نہیں اور کہ میری اس شہرت میں مبالغہ کر بہت زیادہ دخل ہے۔ اصل میں قصہ یہ ہوا کہ میں نے ایک رسالہ جاری کیا۔ میں نے اس رسالے میں پے در پے کئی مضامین میں یہ لکھا کہ تمہارا کپینے کے نقصانات کا جو غوغا ہے۔ وہ سب فضول ہے۔ اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ میرے رسالے میں سگریٹ کا کوئی اشتہار نہیں چھپتا تھا۔ مگر تمہارا کوئی سرلیٹا میں ہر دفعہ مضامین چھپا کرتے تھے۔ چنانچہ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں کوئی بیکار آدمی ہوں۔ جو سارا دن صونے پر پٹا رہتا ہے اور سگار پیتا رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اور احتجاج کیا کہ میں چین کے محنتی اور مصروف ترین اشخاص میں سے ہوں لیکن کو سنتا تھا یہ کہمائی مشہور ہو کر رہی اور تمہارا کوئی حمایت میں میرے مضامین کو اس بات کا ثبوت سمجھا گیا کہ میں اس مردِ وطن کے ایک فرد ہوں جو میرے اور خواہ مخواہ ادب میں ٹانگ اڑاتا ہے۔

دو سال بعد میں نے ایک اور رسالہ جاری کیا جس میں صرف مضامین لکھنا

سیدھی نثر شائع ہوتی تھی۔ اس میں میرا مقصد یہ تھا کہ چینی نثر کو پر تکلف و ہلکے

جینے کے منے

اور ابہام سے پاک کیا جائے۔ چینی نثر کی یہ گت اس لئے بنی ہے کہ آج سے کوئی دس بیس برس پہلے تک چینی مدرسوں میں لڑکے لڑکیوں سے ملک کی نجات کا راستہ اور استقلال کی خوبیاں وغیرہ جیسے عنوانات پر جواب مضمون لکھوائے جاتے تھے۔ اور ان جواب مضمونوں کے لئے ضروری تھا کہ نہایت پر تکلف اور مشکل عبارت میں ہوں) میں نے سوچا کہ کنفیوشس کے بتائے ہوئے اصولوں کی فرسودگی سے چینی نثر اس طرح آزادی جاسکتی ہے کہ اس کا اسلوب زیادہ بے تکلف ہو اور اس میں باہمی بول چال کا انداز ہو۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اسلوب کی بے تکلفی کے بارے میں جو چینی لفظ لکھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ بات کرنے کا انداز بڑا پر اطمینان ہو۔ اس میں فرصت اور فراغت جھلکتی ہو۔ بس پھر کیا تھا کمیونٹا دیوں کے کیمپک مجھ پر حملوں کا طومار شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اب اس بات میں کسی کو ذرا شک نہیں کہ میں سارے چین کے ادیبوں میں سب سے زیادہ فارغ اور بیکار ادیب ہوں اس لئے کشتنی اور گردن زدنی ہوں کیونکہ باقی سارے چین ان حضرات کے بقول "قومی دولت کی گہرائیوں میں سسک رہا ہے۔"

مجھے تسلیم ہے کہ میں جب کبھی اپنے دوستوں سے ملنے جاؤں تو ان کے دیوان خانوں میں آرام کرسیوں پر خوب بچھ بچھ کر بیٹھتا ہوں۔ مگر باقی لوگ بھی یہی کرتے ہیں۔ آخر آرام کرسیاں اور کس لئے ہوتی ہیں اگر اس بیسویں صدی میں بھی عورتوں اور مردوں کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ انیسویں صدی کی پر تکلف سوسائٹی کی طرح جب کسی سے ملنے جائیں تو بڑے ادب آداب سے کرسیوں پر تن کر سیدھے بیٹھیں تو پھر آج کے دیوان خانوں میں آرام کرسیاں نہیں ہوتی چاہیں۔ ان کے بجائے سخت لکڑی کی سیدھی لپٹت والی اونچی اونچی کرسیاں ہوتی چاہئیں۔

کرسی

پر بیٹھ کر اکثر خواتین کے پاؤں زمین سے کوئی ایک فٹ اونچے رہیں۔
 تو گو یا کرسیوں پر آرام سے چھ کر بیٹھنے میں کوئی حکمت پہنا ہے۔
 پرنے لوگ کرسیوں پر اس لئے تن کر بیٹھتے تھے کہ بارعب اور بادقار نظر آئیں
 آج کل کے لوگ کرسیوں پر اپنے آرام کے لئے بیٹھتے ہیں۔ ان باتوں میں بڑا فرق
 ہے۔ آج سے کوئی پچاس برس پہلے کے معاشرے کے نزدیک آرام۔ گناہ
 تھا۔ آرام سے بیٹھنا گویا دوسرے کے احترام کے منافی تھا۔ اسی لئے وہ لوگ قار
 اور رعب داب پر زور دیتے تھے۔ انگریز ادیب آلدس ہکسل نے اپنے مضمون
 "آرام" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام
 کی بدولت آرام کرسی وجود میں نہیں آسکی۔ آج سے کوئی بیس ایک برس پہلے
 چین میں بھی یہی صورت حال تھی۔ مگر آج حالات بدل چکے ہیں۔ اگر آپ کسی کے
 دوست ہیں تو آپ اس کے کمرے میں اس کی میز پر ٹانگیں پھیلا سکتے ہیں۔ یہ سو
 ادب نہیں۔ بلکہ بے تکلفی گہنی جاتی ہے۔ لیکن پورا نے بزرگوں کے سامنے اگر آپ
 میز پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھیں تو قیامت آجائے۔

فن تعمیر اور اخلاق اور کمروں کی اندرونی آرائش کا آپس میں گہرا تعلق
 ہے۔ آلدس ہکسل نے لکھا ہے کہ مغربی خواتین صدیوں تک بہت کم غسل کیا کرتی
 تھیں۔ کیونکہ وہ اخلاقی اعتبار سے اپنے آپ کو رنگا دیکھنا اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ چنانچہ
 اس اخلاقی بنیاد کی بدولت صدیوں تک غسل کا نام چینی کا چمکتا ہوا سفید سفید
 تپ ایجا دنہ ہو سکا۔ صدیوں سے چینی فرنیچر کچھ اس قسم کا رہا کہ اس سے آرام و
 آسائش کا بہت کم تعلق تھا۔ اسکی وجہ کفیو شس کے اخلاقی نظریوں کی وہ فضا تھی جس
 چینی قوم سانس لیتی رہی۔ چینی فرنیچر بنایا ہی اس لئے جانا تھا کہ لوگ تیر کی طرح سیدھے

جینے کے مزے

بیٹھیں۔ کیونکہ معاشرے کا قانون کہتا تھا کہ بیٹھنے کا یہی طریقہ مناسب ہے اور تو اور چینی شہنشاہ بھی ایسے سخت اور بے آرام تخت پر بیٹھنے جلتے تھے کہ میں تو ان پر بلخ منت بھی نہ بیٹھ سکوں۔ خیر یہی حال انگلستان کے بادشاہوں کا بھی رہا ہے۔ مگر باقی تمام تہذیبیں اس سے بہرہ نہیں کھو پیرا کہ یہ حال تھا کہ ایک ریشمیں اور زریں صوفے پر آرام سے نیم دراز رہتی تھی۔ اور خادم وہ صوفے اٹھکے اٹھکے پھرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے کبھی کنفیوشس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اگر کنفیوشس اسے اس طرح نیم دراز دیکھ لیتا تو اس کی شامت آجاتی۔ وہ ضرور اسکی بیڈلیوں پر زور سے ڈنڈا مارتا۔ کیونکہ ایک دفعہ کنفیوشس کا ایک شاگرد جو ان جانگد ذرا غلط طریقے پر بیٹھا دیکھا گیا تو کنفیوشس نے اس کے ساتھ ہی سلوک کیا تھا۔ کنفیوشی معاشرے میں شرفا مرد و عورت دونوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے میں تیر کی طرح سیدھے رہیں۔ کم سے کم رسمی تقریبوں میں تو اس کا خیال رکھیں۔ اور اگر کوئی ذرا سا مانگیں پسا کر یا مانگیں ادھی کر کے بیٹھا تھا تو یہ اس کی بدتمیزی اور بازاری پن کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اپنے افسروں کے احترام کا زیادہ مظاہرہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کے سامنے کرسی کے بالکل سرے پر بیٹھا جائے۔ اسے افسر کی عزت اور اپنی تمیز داری کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کنفیوشی روایات اور چینی فن تعمیر کے غیر آسائشی نکافات میں گہرا تعلق ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں

اس پر نکلتا فضا میں اٹھا رہوں صدی کے آخرانیوں صدی کے شروع میں رومانی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کی بدولت زندگی کا یہ رویہ نکلتا اور داب آداب ختم ہو گیا۔ اب اپنے آپ کو آرام دینا گناہ شمار نہیں

کرسی

کیا جاتا۔ رومانی تحریک اور انسانی نفسیات کے بہتر شعور کی بدولت زندگی کے بار
 میں اب حقیقت پرست رویہ رواج پا گیا ہے۔ رویے کی اس تبدیلی کا اثر ہے
 کہ تخیل کے تماشوں سے لطف اٹھانے کو بد اخلاقی نہیں سمجھا جاتا۔ نہ شیکسپیر کو اب
 وحشی آدمی شمار کیا جاتا ہے۔ اسی رویے کی تبدیلی کا یہ بھی اثر ہے کہ اب ہنسی
 کے خاص لباس ایجاد ہو چکے ہیں۔ عمدہ اور چمکتے ہوئے غسل کے ٹرین چلے ہیں۔
 دیوان خانوں میں نہایت آرام دہ کرسیاں اور نشستگاہیں رواج پا چکی ہیں۔ زندگی
 اور تحریر دونوں کا انداز اب حقیقت پرستانہ اور بے تکلف ہے۔

اگر ہم تسلیم کر لیں کہ آرام و آسائش گناہ نہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا ہو گا
 کہ کوئی شخص اپنے دوست کے دیوان خانے میں بٹنے زیادہ آرام سے ایک دم کرسی
 میں پھیل کر بیٹھے گا۔ وہ اپنے میزبان کا اتنا ہی زیادہ احترام کر رہا ہو گا۔ آخر
 مہمان داری اور خاطر تواضع کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ مہمان زیادہ سے زیادہ
 آرام محسوس کرے۔ گویا آپ جتنے زیادہ آرام سے بیٹھیں گے اتنا ہی اپنے میزبان
 کا تواضع کے سلسلے میں ہاتھ بٹائیں گے۔ میں نے کئی میزبانوں کو دیکھا ہے کہ وہ کسی دعوت
 یا پارٹی کے سلسلے میں سخت آتش بجالی رہتے ہیں کیونکہ اس پارٹی میں شامل ہونے والے
 مہمان سید تکلف برتتے ہیں۔ اور ذرا سی بھی بے تکلفی سے کام نہیں لیتے۔ ایسے موقعوں پر میں نے کئی
 بار اپنے میزبانوں کی مشکل آسان کی ہے کہ اس پر تکلف اور گھٹے ہوئے ماحول میں فوراً اپنی
 ٹانگیں میز پر پھیلا دی ہیں۔ یا اسی طرح کسی اور بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر مہمان کو
 فضول تکلیف اور جھوٹے داب آداب سے ہاتھ اٹھا کر سیری طرح بے تکلف ہونا پڑا ہے۔
 اچھا کر سیوں وغیرہ کے آرام دہ ہونے کے بارے میں ایک کلیتہ میں نے ڈھونڈ
 نکالا ہے۔ سادہ لفظوں میں کلیتہ یہ ہے کہ کرسی جتنی سچی ہوگی اتنی ہی آرام دہ

بچنے کے مزے

ہوگی۔ آپ نے کئی دفعہ تعجب کیا ہو گا کہ فلاں صواب کے گھر میں جو کرسی تھی وہ اتنی آرام دہ اور گدگدی کیوں تھی۔ اس کھیلنے کے انگشتان سے پہلے میں بھی یہ سمجھا کرتا تھا۔ کہ کمروں کی آرائش کے ماہرین ہی یہ بتا سکتے ہیں کہ کرسی کی اونچائی چوڑائی اور اس کی ڈھلان میں کیا تناسب ہونا چاہئے۔ تاکہ بیٹھنے والے کو زیادہ سے زیادہ آرام مل سکے۔ مگر اب میں جانتا ہوں کہ ایسے لمبے چوڑے حساب کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثلاً کوئی چینی کرسی لیجئے اور اس کی ٹانگیں چندا پنج چھوٹی کر دیجئے۔ یہ کرسی زیادہ آرام دہ ہو جائے گی۔ اس کی ٹانگوں کو مزید چھوٹا کر دیجئے تو یہ اور زیادہ آرام دہ ہو جائے گی۔ اس کا منطقی نتیجہ پھر یہ نکلا کہ جسم کو صحیح آرام اسی وقت ملتا ہے۔ جب بستر پر لیٹے ہوں پس اتنی سی بات ہے۔

اس بنیادی اصول سے ایک اور نتیجہ بھی نکلا کہ جب ہم کسی اونچی کرسی پر بیٹھیں اور ہم اس کی ٹانگیں کاٹ کر چھوٹی کر سکتے ہوں تو ہم اپنے سامنے کسی ایسی چیز کو ڈھونڈتے ہیں جس پر ہم اپنی ٹانگیں رکھ سکیں۔ اور اس طرح اپنے کولوں اور اپنے پاؤں کے درمیان جو فرق ہے اسے کم سے کم کر سکیں۔ میں اس موقع پر یہ کیا کرتا ہوں کہ میز کی ایک دراز باہر نکال لیتا ہوں۔ اور اس پر اپنے پاؤں رکھ لیتا ہوں ہر شخص اپنے ہم کے مطابق اس ترکیب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اپنے جسم کے رگ بچھوں کو آرام پہنچانا۔ ان کے تناؤ کو ڈھیل کرنا جرم نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ دن رات کے ۲۴ گھنٹے ہم انہیں آرام ہی پہنچاتے رہیں یا یہ کہ ان کو ہر وقت آرام دینا طبی اعتبار سے بڑا مفید ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں قطعاً نہیں ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ انسانی زندگی کا چکر۔ کھیل اور کام، اعصاب کے کھینچاؤ اور آسودگی دونوں سے مل کر پورا ہوتا ہے۔ اور اب تو

کرسی

سائنس کہتی ہے کہ مرد کے دماغ کی قوت اور کام کرنے کی صلاحیت اسی طرح ایک ماہواری چکر کی تابع ہے جس طرح عورت کا جسم اس کا تابع ہوا کرتا ہے۔ لہم جیمز نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر سائیکل کے چین کو ایک جگہ کس دیا جائے تو سائیکل کے پیئے آسانی سے نہیں چلتے۔ اور یہی حال انسان کا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر کام اور ہر بات میں انسان عادت کا غلام ہے۔ اور انسانی جسم میں حالات کے مطابق ڈھل جانے کا بے پایاں صلاحیت موجود ہے۔ جا پانی لوگ فرش پر چوکر سی یا کر بیٹھنے کے عادی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر انہیں دن رات کرسی پر بیٹھنا پڑے تو ان کے عھنا تشنج کے مارے اکر جائیں۔ گویا ہم دن بھر دفتروں میں جو سیدھے تن کر بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو اس کی تھکن شام کو صوفے یا پلنگ پر لیٹ کر اتارتے ہیں۔ اسی امتیاز اور تفریق سے ہی زندگی کی حکمتوں کو سمجھنا اور ان کا شعور ممکن ہے۔

آخر میں ایک بات خواتین سے کہوں گا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے اگر آپ کو سامنے پاؤں رکھنے کے لئے کوئی چیز نہ ملے۔ تو فوراً اپنے پاؤں بھی کرسی یا صوفے پر رکھ کر زانو تہر کر کے بیٹھ جائیے۔ اس میں شرمانے کی بات نہیں۔ خواتین اس طرح بیٹھی ہونی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

۳۔ گفتگو

”مختار سے ساتھ پوری رات باتیں کرنا پورے دس برس کے مطالعے سے بہتر ہے!“ یہ ایک چینی عالم کا قول ہے۔ جو اپنے دوست سے جی بھر کر باتیں کر لینے کے بعد اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس قول میں بڑی سچائی پنہاں ہے چینی زبان میں

حصے کے مزے

اب گفتگوئے شبانہ، ایک ایسی ترکیب ہے جس کا مطلب ہی دوسرے رات بھر
دل کی باتیں کہنا سنا ہے۔ چاہے یہ باتیں ہو چکی ہوں یا ہونے والی ہوں۔

مگر دوسرے رات بھر عمدہ باتیں کرنے کی اعلیٰ ترین مسرت بڑی نایاب چیز ہے
چنانچہ کی لی ونگ کہتا ہے۔ کہ دانا لوگوں میں سے شاید ہی کوئی باتیں کرنا جانتا ہو

اور جو لوگ باتیں کر سکتے ہیں شاید ہی ان میں سے کوئی دانا ہو۔

آج کل یہ عام شکایت ہے کہ آتش دان کے گرد بیٹھ کر باتیں کرنے یا محفل

سرور میں گفتگو کرنے کا فن ختم ہو چکا ہے۔ اسکی وجہ جدید زندگی کی رفتار اور مصروفیت
بتائی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جدید زندگی کی صبار رفتاری اسکی ذمہ دار ضرور

ہے۔ لیکن میرا یہ بھی خیال ہے کہ جب گھروں کو ایسے دیوان خانوں میں بدل دیا گیا

جس میں آتش دان نہ ہو تو فن گفتگو کا زوال شروع ہوا۔ اور پھر موٹر کاروں کے

اثر نے اس فن کی تباہی مکمل کر دی۔ ہماری زندگی کی رفتار بالکل غلط ہے کیونکہ

گفتگو کا فن صرف ایسے معاشرے میں پروان چڑھتا ہے جسکے پاس فراغت کا وقت ہو

اور اس معاشرے کے افراد فراغت کی آسانی اور کشاکش سے بہرہ ور ہوں اور اسکی

قدر کرتے ہوں۔ ہم کی وجہ یہ ہے کہ محض باتیں کرنے اور گفتگو کرنے میں بڑا فرق ہے۔

چینی زبان میں ان دونوں کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں ایک کا مفہوم صرف

» بولنا « ہے۔ اور دوسرے کا مطلب گفتگو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو

ایک زیادہ بے تکلہانہ چیز ہے۔ اس کے موضوعات کاروباری نہیں ہوتے۔ بلکہ

زندگی کی عام چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اسی قسم کا فرق کاروباری خط و کتابت

اور ادیب دوستوں کی خط و کتابت میں ہوتا ہے۔ ہم کسی شخص کے ساتھ بھی رہا

معاہلوں پر بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہونگے جن سے ہم

گفتگو

ایک مہانی رات گفتگو میں گزار سکتے ہیں۔ لہذا جب کبھی ہمیں ایسے شخص سے واسطہ ہو جو صحیح معنی میں خوش گفتار آدمی ہو تو اس ملاقات کا لطف ایک اعلیٰ مصنف کی کتاب پڑھنے سے اگر زیادہ نہیں ہوتا تو اس کے برابر ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ خوش گفتار آدمی کی باتیں سننے میں ایک اور مزہ ہے جو اچھے مصنف کی کتاب پڑھنے میں حاصل نہیں ہوتا کہ ہم اسکی خوش آئند آواز بھی سنتے ہیں۔ اور اس کی حرکات و سکنات سے بھی لطف اٹھاتے ہیں گفتگو کا مزہ بعض دفعہ ہمیں دوستوں سے پھرنا بھی میں حاصل ہوتا ہے بعض دفعہ پڑانے شناساں بھی ہیں اور پڑانی یادیں تازہ کرنے ہیں یا پھر جب کبھی لمبے سفر پر نکلتے ہوں تو رات کو گاڑی میں یا کسی سرے میں ایسے موقعوں پر ہر موضوع پر بات چیت ہوتی ہے۔ بھوت پریت اور جن پر یوں کے قصوں سے لے کر مختلف تجربات کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ڈکٹیٹروں اور غداروں کو جی بھر کر ستائی جاتی ہیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی کوئی دانا اور خوش گفتار شخص یہ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں ملک میں آج کل جو واقعات ہو رہے ہیں وہ آنے والی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ یاد ہاں تختہ لٹنے کے سامان ہو رہے ہیں۔ ایسی گفتگو کی یاد زندگی بھر ہمارے دل میں تازہ رہتی ہے۔

گفتگو کا بہترین وقت رات کا ہے۔ دن کے وقت گفتگو میں کوئی خاص دل کشی نہیں ہوتی۔ وہ جگہ جہاں گفتگو ہر قسمی طور پر غیر اہم ہوتی ہے۔ ادب و نطق کے بارے میں ایک لمبی بات چیت سے آپ کسی پڑانی وضع کے دیوانہ خانے میں بھی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اور باہر کسی کھیت کی منڈ پر بھی ہو سکتا ہے کہ باد و باران کی ایک رات آپ دریائی کشتی میں سفر کر رہے ہوں اور دریا کے دوسرے کنارے پر لنگر انداز کشتیوں کی دھیمی روشنیاں دریا کے پانی میں جھلجھل کر رہی ہوں

جلنے کے مزے

تو ملاحوں کی کہانیاں سننے کا سلطان زندگی بھر کے لئے قیمتی یادیں کر رہا تھا۔ اس میں
گفتگو کی ساری دلکشی کا راز یہ ہے کہ ہر دفعہ گفتگو کا ماحول اور موقع مقام اور
وقت بدلتے رہیں۔ جو گفتگو میں حصہ لے رہے ہوں گفتگو کا لطف ہمارے ذہنوں
میں مختلف ماحول اور مختلف مقامات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ
یاد آتا ہے کہ چاندنی کھلی تھی۔ اور ہلکی ہوئی ہلکورے لے رہی تھیں تو فلاں شخص
سے گفتگو کرنے کا بڑا مزہ آیا تھا۔ پھر یاد آتا ہے کہ رات اندھیری اور طوفانی تھی
اور کچھ لوگ آتش دان کے گرد بیٹھے تھے۔ تو بڑی اچھی باتیں ہوتی تھیں۔ پھر یہ یاد آتا ہے کہ
ہم کھلی چھت پر بیٹھے کشتیوں کو دریائے بہاؤ پر آتا دیکھ رہے تھے۔ اور باتوں کا مزہ
آ رہا تھا۔ اور ایک کشتی دریا کی طوفانی لہر سے الٹ گئی تھی۔ کبھی یہ یاد آتا ہے کہ
صبح کے اندھیرے لمحوں میں کسی ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے کیا اچھی باتیں
سنی تھیں۔ یہ ساری تصویریں ان گفتگوؤں کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں کبھی ہمیں یاد آتا
ہے کہ ایک دفعہ ہم دو آدمی کمرہ میں بیٹھے تھے۔ یا ایک دفعہ ہم پانچ چھ دوست تھے اور
فلاں شخص کو کچھ زکام بھی تھا جس سے اس کی آواز میں اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر
یہ یادیں۔ یہ ہنگام بھی آئے گئے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی ہی چل چلاؤ کا نام ہے کہ ہند
ہمیشہ کابل نہیں رہے گا۔ پھول ہمیشہ اتنے سنگتہ نہیں ہونگے۔ اور اچھے دوست ہمیشہ
مل نہیں سکیں گے۔ اس لئے اس عمر سے جتنا بھی بہرہ ور ہوں اتنا

ہی کم ہے۔

اچھی گفتگو لازمی طور پر اچھی انشاءِ ادب پارے کی طرح ہوتی ہے۔
اس کا اسلوب اور اس کا نفس مضمون دونوں انشاء سے ملتے جلتے ہیں مثلاً روحیں نکلیا
انگریزوں کی عجیب عادتیں مشرقی و مغربی تہذیبوں کی ٹکر دریائے سین کے

گفتگو

کنارے کتابوں کے اسٹال اپنے حکمرانوں سیاستدانوں اور جرنیلوں کی ذاتی زندگی کے قصے وغیرہ یہ سب موضوع (انشائیہ کی طرح) اچھی گفتگو کے موضوع بن سکتے ہیں۔ گفتگو اور انشائیہ جو بات بہت زیادہ مشترک ہے وہ دونوں کا اسلوب ہے جو بڑا بے تکلف ہوتا ہے۔ موضوع چاہے کتنا بھاری بھرم اور اہم کیوں نہ ہو چاہے اپنے ملک میں حالات کی ناسازگاری اور اتیری پر بات کرنا ہو۔ یا آج کل کے جرنیلی سیاسی عقیدوں کی وجہ سے تہذیب کی موت پر اظہار خیال کرنا ہو۔ یا انسان کی آزادی وقار اور خوشی کے چھین جانے کی بات ہو۔ یا محض سچائی اور انصاف کے اصول کا تذکرہ ہو۔ کوئی چیز بھی ہو پھر بھی اظہار خیال بڑے عام طریقے سے بڑی دھیرج سے اور بڑی بے تکلفی سے کیا جائے گا۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے تہذیب ہی سکھاتی ہے کہ دل آزادی کے رہزनों کے مظالم پر غصہ سے جل رہا ہو۔ پھر بھی زبان سے یا قلم سے بات کرو تو اس میں مسکراہٹ ضرور آتی چاہئے۔ طوفانی اور جذباتی تہن جن میں ہم اپنے دل کی جھلاہٹ کا پورا پورا اظہار کرتے ہیں صرف خاص جن دوستوں کے کانوں کے لئے ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کے لئے نہیں ہوتیں۔ اس لئے عمدہ گفتگو کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم ایک کمرے کے پرسکون ماحول میں چار پاروں کی محفل میں بیٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اور آس پاس کوئی ایسا شخص نہ ہو۔ جس کی موجودگی ہمیں پسند نہ ہو۔

اچھی گفتگو اور باتکلف مبادلہ خیال میں جو فرق ہے وہ ایک مثال سے واضح ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عمدہ گفتگو تو اچھے نمونہ انشائیہ یا مضمون کی طرح ہے دوسری چیز کو آپ سیاست دانوں کے بیانات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہ مانا کہ ان بیانات میں اعلیٰ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں جمہور پرستی کے جذبات۔ قومی وحدت

چینے کے طریقے

کی تمنا۔ غریبوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی۔ ملک کے ساتھ شدید محبت و ممانعت
پندی یضیب العین کی لگن۔ پن پسندی اور پن الاقوامی خیر سگالی کے جذبات حرص و ہوس
سے میزاری۔ روپے اور شہرت سے کنارہ کشی کے اعلانات غرض ہر اچھی بات ہوتی ہے
لیکن ان بیانات سے ایسا تصنع اور تکلف پکتا ہے کہ آپ ان سے بدکتے ہیں ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیانات بہت ہی بنی سنوری اور سچی سجائی عورت کی طرح ہیں
جس کے قریب پھٹکنا دشوار ہوتا ہے۔ اسکے برعکس جب ہم کوئی اچھا ادب پارہ پڑھتے
ہیں۔ یا عمدہ گفتگو کا مزہ اٹھاتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کسی اٹھ پڑھنے والی
رہا کی کو دیکھ لیا ہے۔ جو بڑی بے پروائی سے بال بکھیرے آستین چڑھائے
دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی ہے۔ جو اپنے اٹھ پڑھنے اور سادگی کے ساتھ بڑی
اچھی اور پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا اچھی گفتگو اور عمدہ مضمون دونوں میں
جو سادہ دل کشی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ وہی ان کی جان ہے۔

گفتگو کا مناسب طریقہ یہی ہو کہ گفتگو بے تکلف اور آزاد ہو۔ گفتگو میں
حصہ لینے والے اپنے آپ کو گفتگو کی رد میں کھو چکے ہوں اس بات کو بھول چکے ہوں
کہ وہ کیسا لباس پہنے ہیں کیسے بولتے ہیں کیسے کھنکارتے ہیں۔ بولتے وقت ہاتھ
ہلاتے ہیں یا نہیں۔ انہیں اس بات کی بھی خبر نہیں ہونی چاہئے کہ گفتگو کہاں سے
کہاں پہنچ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح معنی میں لطف گفتگو اسی
وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم اپنے دلی دوستوں سے ملتے ہیں۔ اور ان سے
دل کی باتیں کہنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ یہی بے تکلفی اور دلی لگاؤ کی محفل ہوتی
ہے۔ ایک شخص کھڑکی میں جا بیٹھا ہے۔ تو دوسرے نے کرسی پر بیٹھ کر اس کی انگلیں
پاس کی میز پر پھیلا رکھی ہیں۔ تیرا فرش پر پھبکڑا مادے بیٹھا ہے۔ ٹیک۔ اس

چینی کے مزے

گدی سے لگا رکھی ہے۔ جو اس نے ابھی ابھی صوفے سے گھسینی تھی اور صوفے کا بچا کر دیا تھا۔ دل کو سکون اسی وقت ملتا ہے۔ جب ہاتھ پاؤں کو آرام ملے اور جسم کو عافیت اور راحت نصیب ہو۔

دوستوں کی محفل اور رات کا ماحول دونوں عمدہ گفتگو کے لئے یہی لازمی شرطیں ہیں۔ عمدہ گفتگو میں موضوع کا تعین نہیں ہوتا۔ باتیں چل نکلتی ہیں اور یہ کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں کوئی سلسلہ یا ربط نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے جب محفل برخواست ہوتی ہے تو ہر شخص گھر کو خوش خوش لوٹتا ہے۔

فراغت اور لذت گفتار میں اور گفتار اور نشر کی ترویج و ارتقا میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ کسی ملک کے ادب میں عمدہ نشر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس ملک میں گفتگو ایک فن لطیف کی حیثیت سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ چینی نشر اور یونانی نشر کے ارتقا سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے۔ کنفیوشس کے بعد

کی صدیوں میں چینی فکر و نظر میں بڑی جان اور بڑی قوت تھی۔ ساری فنکارانہ مہذب اور نشاۃ تھی کہ عالموں کی بہت بڑی جماعت ملک میں موجود تھی۔ جس کا کام ہی فن گفتار کی ترقی دینا تھا۔ چینی تاریخ بتاتی ہے کہ یکے بعد دیگرے پنج چینی امیر عالموں کی سرپرستی کے لئے مشہور ہوئے ہیں۔ وہ سب کے سب اپنی سخاوت

اپنی دریا دلی اور اپنی ہمان تڑازی کے لئے ضرب مثل بن چکے ہیں انکے ڈیروں پر ہزاروں ہا چینی علماء رہا کرتے تھے۔ مثلاً چی بادشاہوں کے امیر منگ جانگ کے یہاں تین ہزار عالموں کا ڈیرہ تھا۔ جو موتیوں سے جڑی ہوئی مٹلا جوتیاں پہنتے تھے اور اس کے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ ان محلات میں رونق اور گفتگو کی گونج کتنی ہوتی ہوگی، ان کے علاوہ پیشہ ور اہل گفتار مصاحبین کی بھی ایک جماعت موجود تھی

جینے کے مزے

جو گفتار کے ماہر تھے۔ ان لوگوں کو نازک حالات میں چین کی مختلف ریاستیں رام
رکھتی تھیں۔ اور یہ لوگ سفارتی نمائندوں کی حیثیت سے دشمن ریاستوں کو بھیجے
جاتے تھے۔ تاکہ ریاستوں کے باہمی تعلقات کو استوار کریں کسی شہر کا محاصرہ کرنے والی
فوجوں کو محاصرہ اٹھالینے پر رضی کر لیں۔ دور ریاستوں میں باہمی معاہدہ کرادیں۔
اور یہ گفتار کے غازی عام طور پر بڑے کامیاب ہوتے تھے۔ کیونکہ انکی خوش گفتاری
ظرافت کہانیوں اور مثالوں کا ذخیرہ بے پناہ ہوتا تھا۔ ان میں کسی کو منلے اور آمانہ کرنے
کی زبردست صلاحیت ہوا کرتی تھی۔ ان باکمالوں کی گفتگو اور ان کے دلائل ایک
کتاب چانکلیوت میں محفوظ ہیں۔ بحث اور گفتگو کی ایسی ہی آزاد اور
خوش مذاق فضائے فلسفے کے بعض نامور ماہرین کو جنم دیا۔ ان میں یانگ چو بھی ہے
جو اپنی تضحیک اور کلبیت کی بنا پر نام آور تھا۔ انہی میں ہان فی زے ہے جو
حقیقت پسندی کا بادشاہ ہے۔ انہی میں وہ زبردست مدبرین زے ہے جو اپنی
خوش طبعی کے لئے بے مثال تھا۔

چین میں یہ زمانہ کوئی تیسری صدی قبل مسیح کے لگ بھگ کا ہے۔ اس
زمانہ کی تہذیب اور مجلسی زندگی کی ایک مثال ایک چینی عالم کی یوآن کی ہے۔
جس نے اپنی باکمال بہن کو چو سلطنت کے وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔
اور پھر اس مرئی علم وزیر نے اس لڑکی کو بادشاہ کی حضور تک پہنچایا۔ وہ
کہا تو کچھ اس طرح کی ہے۔

” بہت زمانہ گزرا کہ لی یوآن شہنشاہ جو کے وزیر اعظم شہزادہ
جنشن کے ہاں ایک صیغہ میں ملازم تھا۔ یوآن کی ایک بہن تھی جس کا
نام نو ہوآن تھا۔ ایک دن بہن نے بھائی سے کہا میں نے سنا

گفتگو

کہ بادشاہ کا وہی عہد کوئی نہیں اگر تم مجھے وزیر اعظم کے حضور میں پیش کرو تو میری ساری
 بادشاہ تک ہو سکتی ہے۔ بھائی نے کہا: "وزیر اعظم بہت بڑے رتبے کے مالک ہیں
 میری کیا مجال کہ ان سے اس مسئلے پر بات کر سکوں۔" بہن بولی تم وزیر اعظم کے حضور میں جاؤ
 اور ان سے فوراً گھر آنے کی اجازت مانگو۔ عذر یہ پیش کرو کہ گھر پر ایک بڑا معزز
 مہمان آیا ہے۔ وزیر اعظم پوچھیں گے کہ وہ معزز مہمان کون ہے؟ تم کہنا کہ میری
 ایک بہن ہے جس کے سلیقہ کی تعریف سلطنت آو کے وزیر اعظم نے سنی۔ اب اس نے
 ایک امیر کو بھیجا ہے کہ مجھ سے بہن کے رشتہ کی جو استگاری کرے۔ اور یہ کہ ابھی ابھی گھر
 سے ایک ملازم آکر اس مہمان کی آمد کی خبر دے گیا ہے۔ اس بات کو سن کر ہمارے
 وزیر اعظم ضرور پوچھیں گے کہ تمہاری بہن کو کیا کچھ آتا ہے؟ تم کہنا کہ وہ سازبجاسکتی
 ہے۔ لکھ سکتی ہے۔ پڑھ سکتی ہے۔ اور علوم پر اسے عبور حاصل ہے اس طرح
 وزیر اعظم مجھے ضرور بلائیں گے۔

ٹی یو آن نے اسی طرح کرنے کا وعدہ کیا۔ اگلی صبح وزیر اعظم کے پاس حاضر
 ہو کر اس نے کہا۔ "جناب والا ابھی ابھی غریب خانہ سے ایک نوکر نے یہ پیغام
 پہنچایا ہے کہ دور دیس سے ایک امیر مہمان آئے ہیں۔ مجھے اجازت مرحمت ہو کہ جا کر
 ان کی تواضع کروں۔" وزیر اعظم نے پوچھا۔ دور دیس کا یہ امیر کون ہے بھائی؟
 آنے جو اب دیا میری ایک بہن ہے سلطنت آو کے وزیر اعظم نے اس کے کمال
 کا شہرہ سنا۔ اور ایک امیر کو پیغام مہربنا کر بھیجا ہے کہ وہ رشتے کی درخواست
 کرے۔" وزیر اعظم نے کہا۔ "میں بھی تمہاری بہن کو دیکھنا چاہتا ہوں اسے ہمارے
 حضور میں لے کے محل میں پیش کرو۔" بھائی نے آکر بہن کو بتایا کہ اگلی تمام وزیر
 اعظم نے اسے محل میں آنے کی دعوت دی ہے بہن نے کہا۔ "تم بھی ضرور

جینے کے مزے

چلنا۔ جب میں وہاں پہنچوں تو استقبال کو موجود رہنا۔
 اگلی شام مقررہ وقت پر وزیر اعظم محل میں آئے۔ اور نوہو آن سے ملنے کی
 خواہش ظاہر کی۔ اسے حضور میں پیش کیا گیا۔ اور پھر سب نے بہت سی شراب پی اور
 نوہو آن نے ساز بجا کر سنایا۔ اور وزیر اعظم گیت کے ختم ہونے سے پہلے ہی وجد
 میں آگئے۔ اور

اس زمانہ کا معاشرتی پس منظر یہ ہے جو میں نے عرض کیا۔ اس فن میں
 اہل کمال خواتین اور فارغ البال اہل علم پر دان چڑھے اور انہی لوگوں نے چین
 میں نثر کی ترویج میں پہلا اہم اقدام کیا۔ اس زمانہ کی خواتین فن گفتگو کی ماہر
 تھیں۔ لکھ اور پڑھ سکتی تھیں۔ اور کسی نہ کسی ساز کے بجانے میں مہارت رکھتی
 تھیں۔ وہاں میں وہ تمام مجلسی و ادبی خوبیاں ہوتی تھیں جو مردوں و عورتوں کی باہمی مجلسی
 زندگی کو خوش آئند بنا سکتی ہیں۔ یہ معاشرہ اور اس کی فننا امیرانہ تھی کیونکہ جیسا کہ
 اوپر لکھی ہوئی کہانی سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا۔ وزیر اعظم کے سامنے باریابی بہت
 مشکل تھی۔ لیکن اسی وزیر اعظم نے جب یہ سنا کہ فالل خاتون موسیقی میں درک رکھتی
 ہے۔ اور پیرانے علوم کی بھی ماہر ہے تو اس نے باصرہ تمام اس خاتون سے ملاقات
 کی۔ یہ فراغت کی وہ زندگی ہے جو چین کے قدیم فلسفیوں اور مجلسی لوگوں نے
 بسر کی۔ ان قدیم چینی فلسفیوں کی کتابیں اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ان لوگوں نے
 باہم بحث و مباحثہ کیا اور اسے بعد میں قلمبند کر لیا۔

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس معاشرے کو فارغ البالی نصیب ہوگی۔ اور جس کے
 پاس وقت کی فراوانی ہوگی صرف اسی میں فن گفتار پیدا ہو سکتا ہے۔
 یہ بھی ظاہر ہے کہ فن گفتار کے وجود ہی سے

گفتگو

انشائے عالیہ کے فن پارے وجود میں آتے ہیں۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں فن گفتار اور اچھی نثر لکھنے کا فن دونوں کافی دیر میں رواج پائے کیونکہ ان دونوں فنون کے لئے انسانی ذہن کی طراری اور چابک دستی کی ضرورت ہے۔ اور یہ صرف فراغت کی زندگی میں ممکن ہے۔ مجھے خوب احساس ہے کہ آج کل کیسٹنسٹوں کے خیال کے مطابق فراغت کی زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس قابل نفرت طبقے کے فرد ہیں جو آسودگی اور امیری کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لئے آپ انقلاب دشمن ہیں۔ مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ سچی اشتراکیت اور سچی اشتمالیت کا مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد فراغت کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا جائے اور فارغ البالی سب کا حصہ ہو۔ اس لئے فراغت کی زندگی کا لطف اٹھانا کوئی خیر نہیں۔ بلکہ ثقافت کی ترقی کا سارا دار و مدار ہی اس بات پر ہے کہ فراغت کو فروغ دیا اور مناسب فائدہ اٹھایا جائے۔ اور فن گفتار ہی فراغت کے محول سے منبہوں اور مناسب فائدہ اٹھانے کی واحد صورت ہے۔ کاروباری لوگوں کو ایک لمحہ فراغت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ دن بھر سخت مصروف رہتے ہیں۔ اور شام کو کھانا کھاتے ہی بستر پر لیٹ کر گایوں بھیشوں کی طرح خراٹے لینے لگتے ہیں۔ ان لوگوں سے ثقافت کی خدمت کی بھلا کیا امید ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو فراغت کے لئے کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ فراغت خواہ مخواہ اس پر ٹھونس دی جاتی ہے۔ مجبوری کی اس فراغت سے بھی اچھا ادب پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کوئی اعلیٰ پائے کا ادیب جن میں بڑا جوہر موجود ہے اپنا وقت فضول پارٹیوں اور سوشل تقریبوں میں خراب کر رہا ہے۔ یا سیاسی معاملوں پر مقالے لکھ لکھ کر اس جوہر کو برباد کر رہا ہے تو ہمیں

جیسے کے مزے

چاہئے کہ اُسے جیل میں بند کر دیں۔ یہ اُس پر بڑا احسان ہو گا۔ کیونکہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ بادشاہ دین نے انسانی زندگی کے انقلابات پر فلسفے کی بہترین کتاب جیل میں لکھی تھی۔ اسی طرح سیمپلی ان نے بھی چینی زبان کی بہترین تاریخ جیل ہی میں سُرپر د قلم کی تھی۔ یہ بھی ہوا ہے کہ ادیب سیاسی زندگی میں مات کھا گئے یا یہ کہ ان کے وقت میں ملک میں سیاسی حالات بے حد اتر تھے۔ اور انہوں نے اس سے کنارہ کشی کر کے بہترین ادب پیدا کیا۔ چینی تاریخ میں اس کی مثال منگولوں کا عہد حکومت ہے۔ جس میں عظیم ڈرامہ نویس اور عظیم مصور پیدا ہوئے۔ مانچو خاندان نے جب چین فتح کیا تو اتر سیاسی حالات ہی نے شہ تاعو۔ اور پاتاشان جی جیسے اعلیٰ پائے کے مصور پیدا کئے۔ یہ عظیم شخصیتیں حب وطن کے جذبہ سے سرشار تھیں کیونکہ غیر ملکی حکومت کے جوئے تلے اپنے ملک کو کچلا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اور انہیں اپنی قومی ذلت کا شدید احساس تھا۔ اور اسی احساس نے انہیں آرٹ اور علم و ادب کے ساتھ ایسی دلہانہ شفیقتگی کا سبق دیا۔ چین نے جو عظیم ترین مصور پیدا کئے ہیں شہ تاعوان یا کمالوں میں سے ہے مغرب میں اُسے کوئی نہیں جانتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مانچو شہنشاہ ان فنکاروں کی ہرگز ہمت افزائی نہیں کرتی جانتے تھے جو ان کی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے عظیم ادیبوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے شاہی امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور انہوں نے اپنی تمام تر دماغی صلاحیتیں ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اس کی مثال شہ نیا آن اور پولیوسین ہیں۔

شہ نیا آن نے اپنے شاہکار "سب انسان بھائی بھائی ہیں" کے دیباچہ میں دوستوں کی باہمی گفتار کے لطف کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے

گفتگو

”میرے سارے دوست اگر میرے گھر آئیں تو انکی تعداد سو گزنی
 چلے۔ لیکن سب کے سب ایک دفعہ میں کم ہی آتے ہیں۔ مگر یہ بھی نہیں ہوتا
 کہ بارش اور اندھی کے دنوں کو چھوڑ کر، کوئی میرے یہاں نہ آئے۔ اکثر
 دن چھ سات دوست آ جلتے ہیں۔ یہ دوست آتے ہی پینا شروع نہیں
 کر دیتے۔ وہ آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے شراب کا
 ایک آدھ گھونٹ پی لیتے ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے نہیں پیتے کیونکہ
 وہ صحبت کا اصل لطف گفتگو کو سمجھتے ہیں۔ شراب کو نہیں۔ ہم لوگ آپس
 میں سیاسیات حاضرہ پر کوئی بات نہیں کرتے کیونکہ سیاسیات ہماری
 حد سے باہر ہے اور اسکا یہ کبھی وجہ ہے کہ اس دور افتادہ مقام تک خبریں
 صحیح نہیں آتیں محض سنی سنائی افواہیں سی ہوتی ہیں۔ اور افواہوں پر
 بات چیت کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔ ہم لوگ آپس میں دوسروں کے عیوب
 پر بھی بات چیت نہیں کرتے کیونکہ لوگوں میں عیوب نہیں ہوتے۔ اور
 کسی کی چغلی اور غیبت نہیں کرتی چاہے ہم ایسی باتیں نہیں کہنے جن
 سے کسی کو صدمہ پہنچے۔ اس لئے ہماری باتوں سے کسی کو صدمہ نہیں
 ہوتا۔ اس کے برعکس ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہیں لوگ سے سمجھیں
 مگر لوگ بھر بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جن معاملوں پر ہم بات کرتے ہیں۔ وہ
 انسان کے دل کی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دنیا والوں کو ذہنی فریب
 کہاں کہ ایسی باتیں سن سکیں۔“

یہ لے اپنی شاہکار کتاب اسی اسلوب اور اسی پیرائے میں اپنی جذبات
 کے ساتھ لکھی ہے۔ اور یہ کتاب صرف اس لئے لکھی جاسکتی کہ مصنف

جینے کے مزے

کے پاس لامحدود فراغت تھی۔

یونانی نثر کی ترویج اور اس کا ارتقا بھی فراغت کے ایسے ہی معاشرتی ماحول میں ہوا۔ یونانی فکرنے جو سلاست اور جزالت پائی ہے۔ اور یونانی نثر میں جو روانی موجود ہے۔ وہ تمام تر فن گفتار کی بدولت ہے۔ اسکا بڑا ثبوت افلاطون کے مکالمات کے عنوان سے ملتا ہے۔ صیانت والے مکالمے میں ہم دیکھتے ہیں کہ فرس پر چند اہل علم بیٹھے ہیں۔ اور شراب پھلوں اور خوبصورت لڑکوں سے معمور دفینا گفتار کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یونانیوں نے گفتار کے فن کو عروج تک پہنچایا تھا۔ اسی لئے ان کے خیالات اتنے واضح اور ان کا اسلوب اتنا سلیس ہے۔ ذرا اس کا مقابلاً آج کے علمی اسلوب سے کیجئے جو مشکل پسندی اور الجھاؤ کو ادنیٰ علمی باتوں کیلئے ضروری سمجھتا ہے۔ اور مشکل اصطلاحوں کے بغیر بات نہیں کرتا۔ اصل میں یونانیوں نے فلسفے کو خوش مذاقی کے ساتھ آمیز کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسی لئے یونانی فلسفیوں کی کتابوں میں گنگو کا اتنا دلکش انداز ملتا ہے گفتار کی یہ دلکش فنسنا۔ گفتار کے لئے یونانی فلسفیوں کی دلی تمنا جس گفتار کی قدر اور گفتار کے لئے عمدہ جگہ کا انتخاب یہ سب کچھ بڑے خوبصورت انداز میں فیڈرس کے ابتدائی میں بیان کیا گیا ہے اور اسکی سے ہمیں یونانی نثر کے ارتقا کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔

افلاطون کی کتاب "ریاست" بھی آج کل کسی "جدید کتاب" کے کسی اس

طرح کے فقرے سے شروع نہیں ہوتی۔

» انسانیت تہذیب کے ارتقا کے مختلف مرحلوں پر نظر ڈالی جائے

تو معلوم ہوگا کہ انسانیت تہذیب۔ اختلاف نوعی سے اتحاد نوعی کی طرف

ایک ارتقائے حرکی ہے۔

گفتگو

یا اسی قسم کی کوئی ناقابل فہم بکو اس اس عظیم کتاب کا پیش خیمہ نہیں کہونکہ آج کل کی علمیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ بات کرو جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے برعکس یہ عظیم کتاب اس خوش آئند فقرے سے شروع ہوتی ہے۔ کہ

” کل میں گلاؤ کو کے ساتھ پانی اس گیا تاکہ دیوی کے سامنے

اپنا سر جھکاؤں۔ میں یہ بھی جانا چاہتا تھا کہ دیوی کا جشن وہ لوگ کس

طرح مناتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ یہ جشن پہلی بار برپا کر رہے ہیں۔

چینی فلسفہ کے ابتدائی دور میں نفا ایسی ہی تھی۔ کیونکہ اس وقت فکر و نظر دونوں

صحت مند تھے۔ یونانی دانش و حکمت کی تصویر اس سے پیوستہ ہے ’ضیافت‘

والے مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونان کے مرد ایسی ہی صحت مند نفسیات میں

اور بحث کا مضمون یہ ہے کہ المیہ ڈراموں کے ایک عظیم مصنف کو طرہ تیشیوں کا بھی

مصنف ہونا چاہئے۔ یا نہیں۔ اس نفسیاتی سنجیدگی اور زندہ دلی۔ حسن مذاق اور

فقرے بازی دونوں آمیز ہیں۔ لوگ سقراط کے شراب پیئے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مگر

وہ ایک طرف بیٹھا ہے۔ جب چاہتا ہے قہقہہ اٹھا کر چڑھا لیتا ہے۔ اور جب چاہتا

ہے شراب پینا بند کر دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے صراحی کو پھر جام سے لبریز کر لیتا ہے

کسی سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ کسی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اس طرح وہ رات بھر

باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور ارسطو نہیں اور اگاتھان کے سوا حاضرین میں سے

ہر شخص سو جاتا ہے۔ جب باتیں کرتے کرتے وہ ہر شخص کو سلا دیتا ہے اور صحت

دہی ایک بیدار رہ جاتا ہے تو وہ جشن سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اور لانی سی ام جا کر

صبح کا غسل کرتا ہے۔ اور سارا دن تازہ دم ہو کر گزارتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے دوستانہ

گفتگو کے اسی ماحول میں یونان کا عظیم فلسفہ پیدا ہوا تھا۔

چینی کے مرنے

یہ بات پوچھنے کی نہیں۔ اس لئے عرض کر دوں کہ مجلس گفتگو کے باقیہماحول
 میں عورتوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ گفتگو میں وہ گفتگو اور لطف پیدا
 ہو جائے۔ جو گفتگو کی جان ہے۔ گفتگو اور دل لگی کے بغیر بات چیت بڑی سنجیدہ اور
 بھاری بھر کم ہو جاتی ہے۔ اور فلسفہ زندگی سے دور ہو کر احمقانہ باتوں کا مجموعہ بن
 جاتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی چینی کے فریے اور زندگی
 بسر کرنے کے فن کے بارے میں کسی ثقافت کو دلچسپی پیدا ہوتی تو عورتوں کو بھی مجلسوں
 میں شریک کرنے کا بہ دارج پیدا ہو گیا۔ پیری کلیز کے عہد میں یونان کے شہر ایتھنز میں
 یہی ہوا۔ اور پھر اسی کی مثال اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی دیوان خانوں میں دیکھنے
 چین میں عورتوں اور مردوں کی ملی جلی صحبتیں سخت ممنوع تھیں۔ پھر بھی چین اہل
 علم لوگ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ عورتیں بھی مجلس میں شریک ہوں۔ یہ عورتیں بات چیت
 میں بھی حصہ لے سکتی تھیں۔ چین میں تین خاندانوں میں چون سزنگ اور منگ کے
 عہد حکومت میں ہی فن گفتگو کو زیادہ ترقی دی گئی تھی۔ اور فن گفتگو ایک فلش ماس
 بن گیا تھا۔ ان زمانوں میں ہمیں یہ تاؤ یون۔ چاؤ یون اور لیو جس بہ چینی بالکل
 خواتین ملتی ہیں۔ چینی مرد ہمیشہ سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں باعصمت ہوں اور
 وہ مردوں سے میل جول نہ رکھیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ سے بالکل خواتین کی صحبت جو یا
 رہے ہیں۔ چینی زبان کی تاریخ۔ ادب اٹھا کر دیکھئے اس کا ڈیرہ دار طوائفوں کی
 زندگی کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ گفتگو کے دوران میں محفل میں لسانی
 دلکشی اور دلنوازی کا مطالبہ ایک عالمگیر مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور خواتین
 اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتیں۔ میں ایسی جرمن خواتین سے ملا ہوں جو یا پانچ بجے
 شام سے لے کر رات کے اربع بجے تک مسلسل باتیں کر سکتی ہیں۔ ایسی امریکی اور

گفتگو

انگریز خواتین بھی ہیں۔ جو معاشیات پر گھنٹوں بحث کر سکتی ہیں۔ اور یہ مضمون ہے جس کا مطالعہ کرنے کی ہمت مجھ میں تو پیدا ہی نہیں ہوتی۔ خیر اگر ایسی خواتین معاشرے میں نہ بھی ہوں جو کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس پر عالمانہ بحث کر سکیں پھر بھی محفل میں چند خواتین کی موجودگی سے گفتگو میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خواتین اگر محض چپ چاپ باتوں کو سنتی رہیں اور ان کے چہروں پر سوچ کے آثار پیدا ہوں تو کافی ہے۔ بیوقوف مردوں کی بہ نسبت ایسی خواتین سے بات کر کے مجھے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

۴۔ چلے اور دوستی

میں سمجھتا ہوں کہ انسانی کلچر اور انسانی مسرت کے پیش نظر انسان کی تاریخ میں تمباکو نوشی، شراب نوشی اور چلے نوشی سے بڑھ کر کوئی اہم ایجادات نہیں ہوئیں۔ یہ تینوں چیزیں انسان کے لئے بے حد اہم ہیں۔ اس کے فراغت کے لمحوں کا لطف انہی سے وابستہ ہے۔ دوستی اور یار باشی۔ ملتاری اور بے تکلفی ان سب کا مزہ انہی تین چیزوں کی بدولت ہے۔ تمباکو نوشی، شراب نوشی اور چائے نوشی تینوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تینوں کی تینوں ملتاری اور معاشرتی تعلقات میں بہت ہاتھ بٹاتی ہیں دوسری بات یہ ہے کہ ان تینوں سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا جس طرح کھانے سے بھرتا ہے۔ اور اس لئے کھانے کے وقتوں کے درمیان ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔ تیسری مشترک خوبی یہ ہے کہ تینوں کا مزہ نھنوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے یعنی یہ ہماری نوت

جینے کے مزے

شامہ پر براہ راست اثر کرتی ہیں۔ ان کا اثر کلچر پر اتنا زبردست ہے کہ مغربی ملکوں میں گارڈیوں میں کھانے کے ڈبوں کے ساتھ تمباکو نوشی کے لئے بھی الگ ڈبے ہوتے ہیں۔ اور عام ہوٹلوں کے ساتھ شراب پینے کے لیٹوران اور چائے خانے بھی عام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ چین اور انگلستان دونوں ملکوں میں چائے نوشی ایک قومی عادت ایک ملکی ادارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تمباکو۔ شراب اور چائے کا مزہ ایسی نعمتوں میں حاصل ہو سکتا ہے جو فرحت اور اطمینان۔ دوستی اور بھائی چارے سے معمور ہو۔ جن لوگوں میں بھائی چارہ اور برادری کا جذبہ ہوگا۔ اور جو درست بنانے میں بڑے محتاط ہوں گے۔ اور جن کو خدائے فرشتہ کی زندگی کی صحیح قدر بخشی ہوگی۔ صرف وہی لوگ تمباکو اور چائے سے مزہ لینے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان چیزوں کے لطف سے بھائی چارے اور ملساری عناصر نکال دیجئے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ گویا ان چیزوں کا لطف مناسب لوگوں کی صحبت کے ساتھ وابستہ ہے۔ چاندنی کی سیر برف باری کا نظارہ کرنا یا بھولوں کی گفتگو سے لطف اٹھانا بھی اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم مذاقی اور ہم شری میسر ہو۔ یہی حال ان تینوں کا ہے۔ فن زندگی کے ماہر چینی مفکر ول نے محفل کی مناسبت پر اسی لئے بڑا زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں قسم کے پھولوں سے خاص خاص قسم کے لوگوں کی صحبت سے فیض اٹھانا چاہئے۔ ان کا قول ہے کہ خاص قسم کے قدرتی مناظر کا لطف صرف خاص قسم کی عورتوں کی معیت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ اگر برستی بوندوں کے ساز و آواز سے پورا پورا لطف اٹھانا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ سادہ دن کے دن پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک خاموش مندر میں اکیلے۔ بانس کی گھڑی چار پانی پر لیٹے ہوں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز

چائے اور دوستی

کا لطف اٹھانے کا ایک مخصوص موڈ ہوتا ہے۔ اور یہ موڈ غلط لوگوں کی موجودگی سے تباہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے جو شخص زندگی بسر کرنے کے فن کا ماہر بننا چاہتا ہے یا جو شخص زندگی کے مزے لینے کا خواہشمند ہے اس کے لئے ابتدائی بات بلکہ اولین شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ہم مذاق اور ہم شرب دوستوں کی تلاش کرے انکی دوستی قائم رکھنے کے لئے آہنی جانکا ہی اور کوشش کرے جتنی اچھی بیوی اپنے شوہر کو اپنا بنانے کے لئے کرتی ہے۔ یا جس طرح شطرنج کا رسیا کسی دوسرے شاطر سے محض ملاقات کی خاطر ہزاروں میل کا سفر طے کرنے کی رحمت گوارا کرتا ہے گو یا اصل چیز ماحول دہننا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ ایک علم دوست شخص کے ماحول زندگی کو سمجھ لیں اور یہ بھی جان لیں کہ وہ فضا کیا ہوگی؟ جس میں زندگی کے مزے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو وہ دوست ہیں جن کے ساتھ آپ زندگی کے مزے لیں گے۔ یہ لازمی ہے کہ مختلف قسم کی تقریجوں اور لذتوں کے لئے آپ مختلف قسم کے دوست انتخاب کریں۔ اگر آپ گھوڑے کی سواری کے لئے جائیں اور اپنے ساتھ ایک کتابی اور نہایت سنجیدہ قسم کے دوست کو لے جائیں تو یہ بڑی حماقت ہوگی۔ اسی طرح اگر موسیقی کا کوئی کانسرٹ سننے جائیں اور آپ کا ساتھی موسیقی سے بالکل نااہل ہو تو آپ کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ اسی لئے ایک چینی ادیب نے لکھا ہے۔

» پھولوں کی شگفتگی کا لطف اٹھانے کے لئے فراخ دل دوست

تلاش کرو۔ اگر ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے پر جانا ہے تو اپنے لئے نہایت اعتدال پسند دوست ڈھونڈو۔ ادنیٰ چہاڑوں پر چڑھنے کے لئے بڑے رومانی مزاج کے دوست ہونا ضروری ہیں۔ اگر کشتی کی پیر کو

چھینے کے منہ

جانا ہے تو ایسے دوست ساتھ ہونے چاہئیں جن کے شربِ سیح اور دلِ آزاد ہوں۔
چاند کا سامنا کرنے کے لئے ایسے دوست چاہئیں جو کھٹے فکر و نظر کے مالک ہوں
برفباری کا لطف اٹھانا مقصود ہے تو خوبصورت دوست بناؤ۔ سادھے نوشی کی
مخض کے لئے ایسے دوست ہونے چاہئیں جن میں ذوقِ سلیم اور لہذازی موجود ہو۔“
مختلف موقعوں پر مختلف قسم کی تفریحوں اور زندگی کی لذتوں کا مزہ لینے کے لئے
آپ نے مختلف جنم اور مزاج کے دوست چن لئے۔ اور ان کی دوستی حاصل بھی کر لی
اگلا مرحلہ یہ ہے کہ آپ مناسب ماحول تلاش کریں۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں
کہ آپ کا گھر دہن کی طرح آراستہ ہو۔ صرف اتنا ہو کہ گھر خوبصورت جگہ واقع
ہو۔ تاکہ آس پاس کھیتوں میں جایا جاسکے۔ یا دریا کے کنارے گھنے درختوں کے
سانے میں آرام سے لیٹا جاسکے۔ گھر کی اپنی ضروریات بہت سادہ ہیں مثلاً
ایک مکان کا نقشہ یہ ہے۔

گھر میں کئی کمرے ہوں اور اس کے ارد گرد کھیت پھیلے ہوں ایک
چھوٹا سا تالاب بھی ہو۔ گھر کی کھڑکیاں روشن دان (ٹوٹے ہوئے مکانوں
کے خالی جوف سے بنے ہوں۔ منڈیریں کندھوں تک بلند ہوں۔ فراغت کے
لمحوں میں روٹی کے گدوں اور سبزی کی غذا کا لطف اُبھانے کے بعد روح
اتنی وسیع اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ ساری دنیا کس کائنات اس کی
پہنائی میں سما جاتی ہے۔ ایسے خاموش مکان کے لئے ضروری ہے کہ مکان
کے سانے دونوں طرف کے پیڑ ہوں۔ اور عقب میں ہرے بانس کے جھڈ
مکان کے جنوبی چھجے بڑھے ہوئے ہوں۔ اور شمالی طرف چھوٹی کھڑکیاں
ہوں جنہیں بہار اور سرما میں بارش اور ہواؤں سے بچنے کے لئے

چائے اور دوستی

بند کیا جاسکے۔ اور گرما میں اور خزاں میں ہوا کے لئے کھولا جاسکے وادنگ
کے پیڑ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے پتے بہار اور سرما میں گرتے ہیں۔ اس
طرح ان موسموں میں دھوپ خوب آسکتی ہے۔ مگر گرما اور خزاں میں
اس کی چھاؤں مکان کو ٹھنڈا رکھ سکتی ہے۔ ” ایک مصنف نے مکان کا نشیوں کو بیٹھے

” مکان ایسا بنانا چاہئے جس کی شاخیں ہوں اس کے گرد جن
درختوں کی باڑ ہو۔ ایک برآمدہ ہو جس پر گھانسن پھونس کی چھت ٹالی جائے
باغ میں بہن کے پیڑ۔ پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت لگانے چاہئیں
اور یا قی حصہ میں سبزیاں۔ ترکاریاں بوئی جائیں مکڑہ کی پھاریاں
سے خالی ہوں۔ سبزیوں کی رکھوالی کے لئے ایک کسان بچہ رکھا جائے
اچھی کتابیں رکھی جائیں۔ تار کا ساز ہو۔ شطرنج ہوتا کہ دوست آئیں
تو محفل کا لطف اٹھائیں۔ “

ایسے ماحول میں گھریلو پن ہوگا۔ میرے گھر میں ہر تکلف کو طاق پر رکھ دیا جائے گا
اور صرف وہی لوگ آسکیں گے جو میرے دلی دوست ہوں گے۔ ان کو میں وہی تو
یا معمولی کھانا کھلاؤں گا جو میں خود کھاتا ہوں۔ ہم باتیں کریں گے ہنسیں بولیں گے
اور اپنے وجود تک کو فراموش کر دیں گے۔ ہم دوسرے لوگوں کی اچھائی برائی کی بات
نہیں کریں گے۔ دور دنیوی نشان و شوکت یا دولت و حشمت سے بالکل بے
نیاز ہوں گے۔ فرصت کے لمحوں میں ہم قدیم و جدید ادیبوں اور غنیوں
کی باتیں کریں گے۔ اور سکون کے لمحوں میں پہاڑوں اور دریاؤں کے
ساتھ دل بہلائیں گے۔ پھر ہم ہلکی مصفا چائے پیئیں گے۔ اور
اس خوش گوار خلوت کو اچھی شراب سے گرمائیں گے۔

جینے کے مزے

یہ ہے دوستی کے بارے میں میرا نظریہ۔

اس خوش گوار فضا میں ہم اپنے حواس کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ اسی سے رنگ،
 مٹام اور آواز کی حس آسودگی حاصل کرتی ہے۔ گو یا تمباکو اور کچھ نیا دونوں
 مزے لینے کے لئے ضروری ہیں۔ اور اس ماحول میں بقول شخصے۔ "ہم چاندنی رات
 میں عود و عنبر جلاتے ہیں اور کسی قدیم ساز پر کوئی رگنی بجاتے ہیں۔ آن کی آن میں
 ہمارے سینوں سے غموں کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ ساری احمقانہ خواہشیں اور برائی نغموں
 انگلیں رخصت ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں۔ "اس خوشبو کی ماہریت کیا ہے؟
 اس کے دھوئیں کا رنگ کیا ہے؟ اور کھڑکیوں کی جھلیوں سے وہ سایہ سا کیا
 گزرتا جا رہا ہے؟ میری انگلیوں کے پوروں میں سے کیسی آواز چھن چھن کر آرہی ہے؟
 یہ لطف یہ مسرت کیا ہے؟ جس نے ہمارے دلوں کو چوچال کر دیا ہے۔ اور دنیا کی
 ہر چیز بھلا دی ہے۔ اور اس لامحدود کائنات کی حقیقت کیا ہے؟"
 روح کی اس طہارت اور دل کے اس سکون کے بعد مناسب دوستوں کی محفل
 میں انسان چائے کا لطف اٹھانے کے قابل بنتا ہے۔ چائے پر سکون مچلوان
 کے لئے اسی ایجاد کی گئی تھی۔ ویسی ہی جیسی شراب منگامہ پرور مجلسوں کے لئے
 ایجاد ہوئی تھی۔ چائے کی خاصیت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ ہمیں زندگی
 کے بارے میں پرسکون عوز و فکر پر مائل کرتی ہے۔ اگر اس پاس روٹنے بچوں کا
 غل غپاڑا ہو یا عورتوں نے شور مچا رکھا ہو۔ یا سیاسی ہنگامہ آراؤں نے بک بک لگا رکھی ہو تو
 چائے پینے کا سارا لطف تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات اتنی ہی خطرناک ہے جتنی یہ کہ
 برستی بارش میں یا ابر آلود دن میں چائے کی پتیاں کھیتوں سے چنی جائیں۔ چائے
 کی پتیاں صاف دنوں میں علی الصبح چینی جاتی ہیں۔ جب پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چوٹیوں پر

چائے اور دوستی

نیم سحر صاف اور شفاف ہوتی ہے۔ اور ان پتیوں پر شبہم کی بھینی باس تھی ہوتی ہے۔ اسی لئے چائے کا لطف ابھی تک شبہم کی طلسمی خوشبو اور لطافت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ تاؤ فلسفہ کی تعلیم ہے کہ فطرت کے ساتھ ہم آمنگ رہنا چاہئے اور یہ کہ کائنات کی زندگی اور بقا نور اور مادہ قوتوں کے باہمی ملاپ پر منحصر ہے۔ اسی فلسفہ کے مطابق شبہم آسمان اور زمین کا جوہر قرار پاتی ہے۔ کیونکہ رات کو یہ دو قوتیں (زمین و آسمان) مل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال عام ہے کہ شبہم ایک طلسماتی غذا ہے۔ جو بڑی لطیف۔ بڑی شفاف اور بڑی ہلکی ہے۔ اور جو شخص یا جو حیوان کافی مقدار میں اس شبہم کو پی لے وہ امر ہو سکتا ہے۔ انگریز مصنفٹاؤس ڈی کوئسی نے تو یہ کہا تھا کہ "چائے اہل دماغ لوگوں کا مشروب رہے گی۔ لیکن چینی اس سے بھی آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چائے کا تعلق اس عالی دماغ صاحب کمال کے ساتھ لازم ہے جو دنیا سے الگ تھلک گونشیں ہو۔"

اس اعتبار سے چائے زمینی پاکیزگی کی زندہ علامت بن جاتی ہے۔ اس کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ اس کی تیاری میں بڑی زبردست پاکیزگی اور صفائی سے کام لیا جائے مہنیوں سے چائے کی پتیوں کے چھننے۔ ان پتیوں کو مناسب گرمی میں پکانے اور پھرا نہیں ڈبوں میں بند کرنے سے لے کر چلنے کا رنگ نکلنے اور چائے پینے تک اگر کسی مرحلے پر بھی انتہائی صفائی سے کام لیا گیا۔ تو چائے برپا ہو جائے گی۔ اگر کسی مرحلے پر بھی نا صاف چکنے ہاتھوں یا چکنے پیالوں کو چائے کے قریب لایا گیا تو چائے چائے نہیں رہے گی۔ چنانچہ چائے کا لطف ایسے ماحول ہی میں آ سکتا ہے۔ جو عیش و عشرت کے شاہے سے پاک اور منسخر ہو۔ اور جہاں خیالات بھی بالکل مسطر اور پاکیزہ ہوں۔ کیونکہ اگر آپ کو کسی طوائف کے ساتھ

حصہ کے مزے

رنگ رلیاں منافی ہیں۔ تو آپ کی رفیق بزم چائے نہیں۔ شراب ہوگی۔ اور جب کوئی
 طوائف اس قابل ہو جائے۔ کہ اس کے پاس بیٹھ کر انسان چائے پی سکے۔ تو وہ ...
 طوائف نہیں رہے گی۔ وہ اس طبقے کی فردین جائے گی۔ جسے چینی شاعروں اور
 عالموں نے اتنا اچھا سمجھا ہے۔ سو تنگ پٹو نے ایک بار چائے کو ایک معصوم
 دوشیدرہ سے تشبیہ دی تھی۔ مگر بعد کے ایک تھوڑی سا بی جگ کے کہا کہ اگر چائے
 کو کسی عورت ہی سے تشبیہ دینی ہے۔ تو اسے ماکو پیری کے ساتھ نسبت دینی
 چاہیے بلور یہ کہ بچھنی رنگ اور چمکتی ہوئی مکروانی نازنیتوں کو حیرت پر دلوں ...
 والے بستروں کی زینت رہنے دیجئے۔ البتہ چٹانوں اور حشموں کو چھوٹے کیوں
 دیتے ہیں؟ اس نے یہ بھی کہا تھا۔ کہ دنیا کے شور و شغب کو بھولنے کے لئے
 چائے پینی چاہئے۔ چائے ان لوگوں کے لئے نہیں جو مرقن مغلایں کھاتے ہیں اور
 ریشمی کپڑے پہنتے ہیں۔“

چائے کے بارے میں مشہور کتاب قدیم چارلو میں لکھا ہے۔ کہ
 چائے کا مزہ لینے کا راز یہ ہے۔ کہ اس کے رنگ۔ اس کی باس اور اس کی
 خوشبو سے غطاٹھایا جائے۔ اور چائے تیار کرنے کے تین اصول۔ لطافت۔ خشکی
 اور منافی ہیں۔ چائے کی ان خوبیوں کو پہنچانے اور ان سے غطاٹھانے کیلئے سکون ضروری چیز ہے
 اور یہ اسی کو مراد ہے۔ جو دنیا کی گرمی ہنگامہ کو ٹھنڈے دل سے دیکھ سکے۔ سو تنگ خانہ ان
 کے جہد حکمت سے لیکر آج تک چائے کے ماہرین کا خیال ہے۔ کہ ہلکی چلی چائے کا پیالہ
 بہترین ہوتا ہے۔ اسکی باس اتنی نازک اور لطیف ہوتی ہے۔ کہ پینے والا اگر خیال میں کھویا ہو
 یا اس پاس رطائی کا غل مچ رہا ہو یا نہ کما پس میں بھگڑ رہے ہوں۔ تو اسے یہ باس بالکل
 محسوس نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر یہ چائے کوئی بد صورت غلامہ پیش کرے ... تو
 بھی یہ باس بالکل محسوس نہیں ہوگی۔

یہ بھی ضروری ہے کہ محفل مجرود اور مخصوص ہو کیونکہ یہ دکھا ہے کہ "چائے پینے کیلئے" یہ ضروری ہے کہ ہمان بہت کم ہوں۔ ہمان زیادہ ہونگے تو شور زیادہ ہوگا اور شور سے چائے کی لطافت اور دلنوازی جاتی رہنے لگی۔ اکیلے چائے پینے کو گوشہ گیری کہا جاتا ہے۔ دو آدمی پینے تو اسے "پر سکون" قرار دیا جائیگا۔ تین چار کی محفل میں چائے کا دور چلے تو اسے ایک "دلنواز" شے قرار دیا جائیگا۔ پانچ چھ اشخاص کے ساتھ چائے پینے کو "عامیانہ" کہا جائیگا۔ اور سات آٹھ آدمیوں کے ساتھ چائے پینے کو تحقیر کے لہجے میں "نیاضی برتنا" قرار دیا جائیگا۔

ایک اور مصنف کا قول ہے کہ "بڑی سی چائے دانی سے پیالہ در پیالہ انڑلٹنا اور سارا پیالہ غٹا غٹا ایک گھونٹ میں خالی کر دینا یا چائے کو پھر تھوڑی دیر بعد گرم کرنا۔ یا بہت تیز چائے بنوانا کسانوں اور مزدوروں کا شیوہ ہے۔ جو محنت کے بعد اپنا پیٹ بھر لینے کے لئے چائے پیا کرتے ہیں۔ اس صورت میں چائے کا ذائقہ اور اس کی خوشبو تلاش کرنا لا حاصل ہے۔"

چینی مصنفوں نے چائے بنانے میں بڑی صحت اور صفائی پر زور دیا ہے اسی لئے وہ مصر رہتے ہیں کہ چائے دم کرنے میں ذاتی توجہ دینی چاہیے۔ اگر اسمیں کوئی زحمت ہو تو پھر ملازم لڑکوں کو خاص طور پر چائے دم کرنے کی تربیت دینی چاہیے چائے عام طور پر باورچی خانے سے دور کسی کمرے میں یا باہر الگ چولہے پر ابالی جاتی ہے۔ ملازم لڑکوں کو چائے بنانے کی تعلیم آقا کو خود دینی چاہیے۔ انہیں لازم ہے کہ صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ پیالیوں کو ہر صبح اچھی طرح دھوئیں اور صرف توڑتے سے صاف نہ کریں، اپنے ہاتھ دن میں کئی بار دھوتے رہیں اور اپنے ناخن صاف رکھیں۔ اگر تین ہمان ہوں تو ایک ہی چولہا کافی ہوگا۔ اگر ہمانوں کی تعداد پانچ چھ

تک ہو تو وہ الگ الگ چولھے اور کیتلیاں دکار ہوں گی اور دونوں چولھوں پر الگ الگ ملازم چائے کے دم ہونے کا خیال رکھیں گے۔ کیونکہ اگر ایک ہی کو دونوں طرف دھیان دینا پڑا تو دیر بھی ہوگی اور کچھ نہ کچھ گڑ بڑ بھی ضرور ہوگی۔

تاہم چائے کے رسیا، خود چائے بنانے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو چائے کا آدھا مزہ اس کی تیاری میں ہے۔ جس طرح تربوز اور خربوزے کے بیج کھانے کا آدھا مزہ یہ ہے کہ انہیں دانتوں میں توڑا جائے۔

عام طور پر چائے کا چولھا کھڑکی کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس میں خوب سرخ کوئلے ہوتے ہیں۔ میزبان جب کوئلے دکھاتا ہے اور کیتلی سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلنے لگتی ہے تو بڑی اہمیت محسوس کرتا ہے۔ بڑے سلیقے سے وہ چھوٹی سی چائے دانی اور چائے کے چار ننھے ننھے پیالے ٹرے میں رکھتا ہے۔ یہ پیالے کافی کے پیالوں سے کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ چائے کی پتیوں کا مرتبان اس ٹرے کے قریب ترتیب سے رکھتا ہے اور اس دوران میں مہمانوں سے کچھ باتیں بھی کرتا جاتا ہے۔ لیکن اتنی باتیں نہیں کہ وہ اپنے فرض کو فراموش کر دے۔ پھر مردہ کر چولھے کی طرف دیکھتا ہے اور جب کیتلی میں پانی سوں سوں کرنے لگتا ہے تو پھر چولھے کے پاس سے نہیں ہٹتا بلکہ کونٹوں کو برابر دکھاتا رہتا ہے۔ کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھتا ہے کہ پانی کی تہ میں ننھے ننھے بلبے ابھر رہے ہیں، وہ بلبے جنہیں اصطلاح میں 'چشم ماہی' کہا جاتا ہے۔ وہ کیتلی کو پھر سے ڈھک دیتا ہے۔ یہ پانی کا پہلا اباں ہے۔ پھر وہ کان لگا کر سنتا ہے کہ پانی کی سوں سوں بڑھ کر ہلکی سی گڑ گڑا ہٹ من گئی ہے اور ننھے ننھے بلبے اب کیتلی کے چاروں طرف ابھر رہے ہیں۔ اسے اصطلاح میں 'دوسرا اباں' کہتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر وہ بڑھی احتیاط سے کیتلی کی نوٹی

کی طرف دیکھتا ہے۔ ان بخارات کو دیکھتا ہے جو اس ٹوٹی سے نکلیں گے بس اس تیسرے ابال سے ذرا پہلے جب پانی ابلتی ہوئی لہروں کی طرح کیتلی میں کھولنے لگے گا۔ وہ کیتلی کو آگ سے اتار لے گا اور چائے دانی کو اندر اور باہر دونوں طرف کھولتے ہوئے پانی سے دھو ڈالے گا۔ پھر فوراً پتیوں کی مناسب مقدار اس میں ڈال کر پانی ڈالے گا۔ اور چائے کا رنگ تیار ہو جائیگا۔ اس قسم کی چائے کا توام بہت کاڑھا ہوتا ہے۔ چھوٹی سی چائے دانی ٹینکس سے ننھی منی چار پیالیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن اس چائے دانی کا تیسرا حصہ چائے کی پتیوں سے بھرا ہوتا ہے چونکہ چائے کی پتی زیادہ ڈالی جاتی ہے۔ اس لئے چائے فوراً پیالیوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور فوراً پنی شروع کر دی جاتی ہے۔ یہ چائے ختم ہو جاتی ہے تو کیتلی میں تازہ پانی ڈال کر اسے پھر آگ پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ دوسری بار چائے تیار کی جاسکے۔ اصل میں چائے کی اس دوسری کشید، اس دو آتشہ کو بہترین چائے سمجھا جاتا ہے۔ پہلی کشید کو سینزدہ سالہ لڑکی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مگر دوسری کشید کو سولہ برس کی بیٹی عمر کی دوشیزہ کہا جاتا ہے۔ اور تیسری کشید کو پوری عورت کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ ویسے اہل ذوق اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انہی پتیوں سے تیسری بار بھی چائے کشید کی جائے۔ مگر آخر "عورت" (تیسری کشید) کے ساتھ بھی تو لوگ زندگی بسر کرتے ہی ہیں۔

چائے تیار کرنے کا جو طریقہ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس کا رواج میرے صوبے میں ہے۔ شمالی چین میں تو یہ فن کسی کو نہیں آتا ویسے عام طور پر چین میں بڑی بڑی چائے دانیاں استعمال کی جاتی ہیں اور چائے کا عمدہ رنگ وہ سمجھا جاتا ہے جو نہایت صاف زردی مائل سنہری ہو۔ انگریزی چائے کی طرح یہ رنگ

کبھی گہرا گھورا یا گہرا قرمزی نہیں ہوتا۔

یہ یاد رہے کہ چائے بنانے اور پینے کا جو طریقہ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ صرف اہل ذوق کے لئے مخصوص ہے۔ دکاندار اس طرح چائے بنا کر نہیں بیچتے اس کے علاوہ عام لوگوں سے بھی ایسی نفاستوں کی امید نہیں کی جاسکتی نہ یہ سرائی ایسی صورت میں پوری ہو سکتی ہیں۔ جب چائے منوں کے حساب سے استعمال کی جاتی

ہو۔ اسی لئے چار آسو کے مصنف سی ایس شو نے کہا ہے: "جب بہت بڑی پارٹی ہو اور مہمان آچار ہے ہوں تو انہیں صرف شراب پلائی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں سے نئی نئی ملاقات ہو یا جو لوگ عام ملنے والے ہوں انہیں ہلکی قسم کی چائے پلائی جانی چاہیے۔ اصل چائے کا موقع صرف اس وقت ہوتا ہے۔ جب دلی دوستوں کی محفل ہو۔ ہم مذاقی اور ہم مشربی نے رنگ جمایا ہو، سب لوگ خوش و خرم ہوں اور نہایت اچھی اچھی باتیں ہو رہی ہوں۔ اس وقت ہمیں ملازم سے کہنا چاہیے کہ آگ روشن کرے اور تازہ پانی کیتلی میں رکھے۔ اور پھر یہ دیکھا جائے کہ حاضرین کا لحاظ رکھتے ہوئے کتنی پیالیاں اور کتنی چائے دینا چاہئیں اور کتنے چولھوں پر چائے دم کی جائے۔"

چائے کی ایسی ہی محفل کا ذکر ایک جگہ یوں ملتا ہے: "رات کا وقت ہے اور ہم ایک پہاڑی جنگل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چولھے پر پہاڑی چٹنے کا پانی چائے کیلئے ابالاجا رہا ہے۔ آگ پانی کو گرم کرنے کے لئے جب بڑھتی ہے تو ایسی ہی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جیسے دیودار کے درختوں میں ہلکی ہوا کی سرسراہٹیں ہوں ہم چائے پانے پیالیوں میں ڈالتے ہیں اور اس کی ہلکی تابانی چاروں طرف پھیلتی ہے۔ ایسے لمحوں میں دل کو جو آند ملتا ہے اسے عام آدمیوں کے ساتھ کسی طرح بانٹنا نہیں جاسکتا۔"

چائے کے پتے پیاروں کو چائے کی تیاری اور ساز و سامان میں امتثال لطف ملتا ہے کہ وہ صرف اسی کے لئے جیتے ہیں۔ اس کی مشہور مثال سانی سیانگ کی ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے خود چائے نہیں پی سکتا تھا۔ لیکن عادت سے مجبور ہر روز اسی طرح چائے تیار کرتا تھا۔ ایک اور با ذوق عالم چاؤ دین فو صبح سے شام تک مقررہ وقت پر چھ بار چائے بنا تا تھا اور پیتا تھا۔ اسے اپنی چائے دانی سے اتنی محبت تھی کہ مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق یہ اس کے ساتھ دفن کی گئی۔

گویا چائے کا مزہ لینے کا فن اور اس کی ترکیب یہ قرار پائی کہ ۱۔

اول۔ چائے بڑی نازک چیز ہے۔ اس کی باس اور مزے کے کسی بھی چیز سے آلودہ ہو جانے یا خراب ہونے کا سخت خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے چائے کی تیاری میں ہر مرحلے پر ہر ممکن صفائی سے کام لیا جائے۔ چائے کی پتی کو شراب خوشبو اور دوسری باس والی چیزوں سے دور رکھا جائے۔ ان لوگوں کو چائے کی پتی کو چھونے نہ دیا جائے جو ایسی چیزوں میں ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں۔

دوم۔ چائے کی پتی کو خشک اور ٹھنڈی جگہ رکھئے۔ مرطوب موسم میں استعمال کی تھوڑی سی مقدار تو چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں رکھی جائے اور باقی ذخیرہ بڑے بڑے بند مرتبانوں میں رکھا جائے۔ جنہیں اشد ضرورت کے بغیر کبھی نہ کھولا جائے۔ اگر چائے کی ساری پتی مرطوب ہو کر سبیل جائے تو اسے ہلکی آگ پر دھیرے دھیرے کھون لیا جائے۔ یا پھر برتن میں پھیلا کر اسے پکھے کی ہوادیں جائے تاکہ پتی بدرنگ اور بدہیئت نہ ہو جائے۔

سوم۔ اچھی چائے بنانے کا آدھا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ابا لنے کے لئے عمدہ اور شکر ایانی لیا جائے۔ اس سلسلے میں پہاڑی چشموں کا پانی سب سے عمدہ

ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر دریا کا پانی ہے۔ تیسرے درجے پر کنوئیں کا پانی ہے۔ پانی کے نلوں کا پانی اگر تالابوں سے آتا ہو تو اسے بھی اچھا سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ بھی اصل میں پہاڑوں سے آتا ہے۔

چہارم۔ چائے کے تادر پیالوں کا مزہ اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک وقت میں بہت سے دوست جمع نہ ہوں اور جو دوست موجود ہوں وہ خاموش طبع اور سنجیدہ طبیعت کے ہوں۔

پنجم۔ چائے کا مناسب رنگ عام طور پر پیلا سنہری ہونا چاہئے۔ گہری بھوری یا گہری قرمزی چائے کو دودھ ملا کر پینا چاہیے۔ یا اس میں لیمو کا عرق ملا دیا جائے یا اس میں کچھ سپرمنٹ ڈال کر پیا جائے تاکہ اس کا کڑواکیلا ذائقہ کچھ ٹھیک ہو جائے۔

ششم۔ بہترین چائے وہ ہے جس کی باس اور ذائقہ پینے کے ایک آدھ منٹ بعد ہی کام و دہن کو سرشار کرنا شروع کر دیں۔

ہفتم۔ چائے ہمیشہ تازہ بنا کر پینی چاہیے اور اسے فوراً پی لینا چاہیے اور اگر کشید کو کافی دیر گزر چکی ہو تو اسے چائے دانی میں زیادہ عرصہ نہ رکھنا چاہیے۔ اچھی چائے کی یہ ضروری شرط ہے۔

ہشتم۔ چائے پانی کو ابال کے درجے تک لا کر بنانی چاہیے۔

نہم۔ چائے میں کسی چیز کی ملاوٹ سخت ممنوع ہے۔ ان لوگوں کے لئے البتہ کچھ رعایت کی جاسکتی ہے جو چائے کی باس کے علاوہ کسی اور باس کے بھی شیدائی ہوں۔ مثلاً اس میں جنسلی وغیرہ کی خوشبو چاہتے ہوں۔

دہم۔ چائے کی بہترین باس وہ ہے جسے "بچے کے سیم" کی خوشبو کہا جاتا ہے۔

چینیوں کا عام دستور ہے کہ کسی چیز کا لطف اٹھانے کے مناسب موقع محل کا
تعیین کر دیتے ہیں۔ اور اس ماحول کا بھی تعین کرتے ہیں جس میں اس چیز سے مزہ
آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں چائے پر ایک عمدہ رسالے چچی آسو میں یوں لکھتے ہیں۔

(۱) چائے کب پینی چاہیے.....

جب دل خالی ہو اور ہاتھ بیکار ہوں،

جب آپ شعر پڑھتے پڑھتے تھک جائیں،

جب خیالات پریشان ہوں،

جب گیت اور گانے سنے جا رہے ہوں،

جب ایک گیت مکمل کیا جائے،

جب کوئی شخص تعطیل کے دن گھر میں بند رہے،

جب آپ ساز بجا رہے ہوں اور تصویریں دیکھ رہے ہوں،

جب آپ ایک روشن دریچے کے سامنے ایک صاف میز پر بیٹھے

ہوں۔

جب آپ دلتواز دوستوں اور نازک جسموں والی نازنینوں کے

چہرے میں ہوں،

جب آپ دوستوں کے ساتھ کہیں سے واپس آئیں،

جب دن صاف ہو اور ہوا ہلکی ہو،

جب بہت ہلکی پھواریں پڑ رہی ہوں،

جب آپ ایک مرصع بجرے میں ایک چھوٹے سے چوبلی پل کے پاس ہوں،

جب آپ ایسے جنگل میں ہوں جس میں اونچے بانسوں کے ہرے جھنڈ ہوں
جب آپ گریا کے ایک دن ایسے بنگلے میں بیٹھے ہوں جہاں سے کنول
کے کھول نظر آتے ہوں،

جب دعوت ختم ہو جائے اور مہمان جا چکیں،

جب بچے اسکول جا چکے ہوں،

جب آپ نہایت خاموش اور تنہا مندر میں ہوں،

جب آپ مشہور چشموں اور عجیب و غریب قسم کی چٹانوں کے پاس
بیٹھے ہوں۔

۱۳) چائے کب نہیں پینی چاہیے.....

لام کے وقت،

ڈرامہ دیکھتے وقت،

خدا کھولتے ہوئے۔

سخت بارش اور برف باری کے وقت،

شراب نوشی کی ایک طویل محفل میں جہاں بہت سے لوگ ہوں،

کاغذات اور کتابیں دیکھتے وقت،

مصروف دنوں میں،

عام طور پر ان حالات میں مجموعاً کے بیان کردہ شرائط کے خلاف ہوں،

(۳) چائے کے سلسلے میں کئی باتوں سے ہمہ گیر لازمی ہے۔

براپاتی،

برے اور گندے برتن

پیتل کے چمچے ،

پیتل کی کیتلیاں ،

پانی کے لئے لکڑی کی بالٹی ،

پانی ابا لنے کے لئے لکڑیاں نہ جلائیں (تاکہ دھواں نہ لگ جائے) ،

پچھ کوئلے ،

بد تمیز نگر ،

بھوٹرا اور بد مزاج خادمہ ،

گندی صافنی ،

ہر قسم کے بخورات اور دوائیں ،

(۴۴) کن چیزوں اور کن جگہوں سے الگ رہنا چاہیے۔

مرطوب کمرے ،

باورچی خانے ،

پر شور بازار اور گلیاں ،

روستے جھینکتے بچے ،

جو شیلے اور غصہ ور لوگ ،

جھگڑالو نوکر ،

گرم کمرے ،

۵۔ تمباکو اور نوشیو

دنیا آج کل تمباکو نوشوں اور تمباکو نہ پینے والوں میں پٹی ہوتی ہے۔ تسلیم کہ تمباکو

پینے والوں کی وجہ سے نہ پینے والوں کو کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اس تکلیف کی نوعیت کچھ جسمانی ہے۔ لیکن تمباکو نہ پینے والوں کی وجہ سے تمباکو نوشوں کو جوڑھنتیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ سراسر روحانی ہیں۔ پھر کبھی تمباکو سے بہت سے پرہیز کرنے والے ایسے لوگ موجود ہیں جو تمباکو نوشوں سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ بیچاری میویوں کو بھی رفتہ رفتہ یہ عادت ہو جاتی ہے کہ ان کے شوہر آرام سے بستر میں لیٹ کر سگڑ پیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک خوشگوار اور کامیاب شادی کی سب سے یقینی علامت ہے۔ پھر بھی بعض اوقات یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ تمباکو نہ پینے والے لوگ اخلاقی لحاظ سے بلند تر ہوتے ہیں۔ اور ان کے پاس کوئی بات ناز کرنے اور اترا نے کی بھی ہوتی ہے۔ مگر انہیں شاید یہ احساس کبھی نہیں ہوتا کہ تمباکو نوشی سے احتراز کر کے وہ نوع انسان کی ایک بہت بڑی مسرت محروم رہتے ہیں۔ میں یہ تو شاید مان جاؤں کہ تمباکو پینا اخلاقی کمزوری ہے۔ مگر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس آدمی سے خبردار رہیے جس میں کمزوریاں نہ ہوں! اس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا، وہ ہمیشہ باہوش رہیگا اور کبھی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔ اس کی عادتیں باقاعدہ ہوں گی۔ اس کی زندگی مثلی انداز کی ہوگی اور اس کا دماغ ہمیشہ اس کے دل پر حکمراں رہیگا۔ اس قسم کے منطقی وجود سے بچے بڑی نفرت ہے جو سراسر عقل اور منطق کے پتلے ہوں۔ اسی لئے میں ایسے گھر میں داخل ہونے سے ہمیشہ ڈرتا ہوں جس میں مجھے کہیں راکھ دان نظر نہ آئیں۔ ان کے بغیر کمزوریت سے زیادہ صاف ستھرا اور بہت ہی بتا بنایا ہوتا ہے۔ ہر تکیہ ٹھیک اپنی جگہ پر ہوگا اور اس گھر کے لوگ بالکل غیر جذباتی اور بہت زیادہ صحیح سالم اور ٹھیک ٹھاک قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے سامنے میں فوراً بہت عمدہ آدمی بن جاؤں گا۔ یعنی جب تک زبان رہوں گا سخت تکلیف میں رہوں گا۔

جو لوگ اس دنیا میں بالکل غیر جذباتی اور غیر شاعرانہ دل و دماغ کے مالک ہیں اور نہایت پارسا اور بڑے متقی ہیں وہ تمباکو نوشی کے اخلاقی اور روحانی فوائد سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ عام طور پر تمباکو نوشوں کے اخلاقی پہلو پر ہی حملہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے میں تمباکو نوشوں کے اخلاق کے بارے میں سب سے پہلے عرض کر دوں کہ مجموعی طور پر ان کی اخلاقی حالت تمباکو نہ پینے والوں سے نہیں بہتر ہوتی ہے۔ مجھے تو وہ آدمی بڑا پسند ہے۔ اس کے منہ میں پائپ دیا ہوا ہو اور وہ آرام سے اسے پی رہا ہو۔ ایسا آدمی عام طور پر زیادہ یا رہا باش۔ زیادہ منسا رہتا ہے۔ اس کے پاس دوسروں کو تباہ کرنے کیلئے باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ وہ باتیں بھی نہایت اچھی کرتا ہے اور اسے دیکھ کر یہ احساس تو ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی میری طرح کا ایک آدمی ہے۔ پائپ کے سلسلے میں انگریز ناول نگار تھیکرے کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ پائپ، فلسفی کے لبوں سے حکمت و دانش حاصل کرتا ہے۔ اور احمق کے ہونٹ سے دیتا ہے۔ پائپ ایسی گفتگو کو ترویج دیتا ہے۔ جو مفکرانہ، خیالی انگیز وسیع النظر اور تکلف یا تصنع سے بالکل عاری ہوا کرتی ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تمباکو نوش کے ناخن عام طور پر صاف نہیں ہوتے مگر یہ کوئی بات نہیں، اس کا دل زیادہ اچھا ہوتا ہے اور پھر اس کی گفتگو بقول تھیکرے خیالی انگیز اور اس کی نظر وسیع، اسکی باتیں تکلف اور تصنع سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ بہت بڑی چیز ہے اور ان سے مزہ لینے کے لئے اگر کچھ زیادہ قیمت بھی ادا کرنی پڑے تو مضائقہ نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پائپ بیٹا ہوا شخص ہمیشہ خوش و خرم ہوتا ہے اور یہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ مسرت انسانی خوبیوں کی معراج ہے۔ ڈبلیو گن کا کہنا ہے کہ آج تک رگڑ پینے والے کسی شخص نے خود کشی نہیں کی۔ اس سے بھی

بڑی حقیقت یہ ہے کہ کسی پائپ پیئے والے کی اپنی سیوی سے لڑائی نہیں ہوتی۔ اسکی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ آپ بیک وقت اپنے دانتوں میں پائپ دبائے اوپچی آواز میں کسی پر گرج برس نہیں سکتے کسی شخص نے آج تک ایسا کیا ہی نہیں۔ کیونکہ قدرتی بات ہے کہ پائپ پیئے ہوئے آدمی دھیمی آواز میں بات کیا کرتا ہے تمباکو پینے والے شوہر کو جب غصہ آئے تو وہ عام طور پر یہ کرتا ہے کہ فوراً ایک گریٹ یا پائپ سلگالیتا ہے اور سخت رنجیدہ نظر آنے لگتا ہے، منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہتی کیونکہ اس کے جذبات کو تسکین کی ایک راہ مل چکی ہوتی ہے اور اگرچہ وہ اپنے غصے کا جواز پیش کرنے کے لئے یا اپنی توہین کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے جھٹلا یا ہوا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے، پھر بھی وہ یہ روپ زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ پائپ کے ہلکے دھوئیں کی لہریں اس کے غصہ کی آگ پر پانی ڈالتی ہیں۔ اسے تسکین دیتی ہیں اور دھواں حلق سے باہر نکلنے کے ساتھ ساتھ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سانس کے ہمراہ دبا گھٹا غصہ بھی باہر نکل رہا ہے اسی لئے عقلمند بیویوں کا یہ طریقہ ہے کہ جو نہی شوہر کو غصے میں آتا دیکھتی ہیں، بڑی نرمی سے اس کے منہ میں پائپ دیدیتی ہیں اور کہہ دیتی ہیں۔ "بیچھے پائپ پیجئے اور اس بات پر خاک ڈالئے۔" یہ فارمولا ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ گویا شوہر کو منانے کے لئے بیوی ممکن ہے ناکام رہے۔ مگر پائپ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

اب تمباکو پینے کی فنکارانہ اور ادبی خوبیوں کی طرف آئیے۔ ان خوبیوں کا انداز

اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب کوئی تمباکو نوش تھوڑے عرصہ کے لئے تمباکو پینا بند کر دیتا ہے۔ عام طور پر تمباکو پینے والا کسی نہ کسی اہم مقامہ لمحے میں تمباکو نوشی ترک کر دینے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اور اپنے ضمیر کی فرضی آواز کے ساتھ کچھ

عرصے کی کش مکش کے بعد پھر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک بار میں نے بھی یہ حماقت کی تھی کہ تین ہفتے تک بالکل تمباکو نہیں پیا تھا۔ تین ہفتے کے بعد میرے دل نے پھر مجھے راہ راست پر لا ڈالا اور میں نے قسم کھائی کہ پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ اور ہمیشہ تمباکو کا پرستار ہوں گا۔ یہاں تک کہ میرا دوسرا بچپنا (اہن سانی) آجائے گا۔ پھر شاید میں ان لوگوں کے چٹکل میں کپنس جاؤں تو کپنس جاؤں جو ہر قسم کے نشے کو دنیا سے نیست و نابود کرے پر تلے ہوئے ہیں۔ بہر کیف جب تک مجھ میں شتمہ برابر قوت ارادی ہے اور اخلاقی جرأت کا شائبہ تک ہے میں پھر سے تمباکو ترک کرنے کے بارے میں سوچ کبھی نہیں سکتا۔ آخر میں دیکھ ہی چکا ہوں کہ اسے چھوڑنے کی کوشش کتنی فضول اور احمقانہ ہے۔ اس مفید ایجاد سے انسان کو جو روحانی قوت اور اخلاقی اطمینان کا احساس ہوتا ہے اس سے ہاتھ اٹھانا بہت بڑی ناشکری ہے۔ باقی رہا تمباکو پینے کی اہمیت کا مسئلہ تو انگلستان کے مشہور ماہر کیمیا پر و فیسر ہالڈین کا قول اس بارے میں سند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمباکو نوشی انسان کی تاریخ میں ان چار اہم ایجادوں میں سے ایک ہے، جنہوں نے انسانی ثقافت پر بڑا گہرا حیات باقی اثر چھوڑا ہے۔

میرے تمباکو نوشی ترک کرنے کے تین ہفتوں کی کہانی بڑی عبرتناک ہے۔ میں نے ان دنوں میں اپنے نفسِ عالی اور ذوقِ سلیم دونوں سے غداری کی۔ اور اپنے آپ کو ایک نہایت روح پرور لذت سے محروم رکھا۔ اس بات کو عرصہ ہو چکا ہے اور اب میں اس قابل ہوں کہ اس واقعے پر حقیقت پسندی سے نظر ڈال سکوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ پر غیر ذمہ داری کا یہ بھوت اتنے دن کیونکر سوار رہا؟ اگر میں اس روحانی کش مکش، اس ذہنی رزیے کو نظم میں قلمبند کروں تو یہ رزمیہ ہو

کی اودھسی کی طرح کوئی تین ہزار مصر و غول کا بن سکتا ہے۔ نثر میں لکھوں تو یہ زمیہ -
 باریک طباعت کے ڈیڑھ سو صفحات میں بمشکل سمائے گا۔ اصل میں اس ساری کش مکش
 کا مقصد ہی فضول تھا۔ کوئی پوچھے کہ انسانیت اور کائنات دونوں سے آپ کو واسطہ
 کھلا تمباکو نوشی چھوڑی کیوں جائے؟ مگر انسان پر ایسے موڈ۔ ایسی غیر معقولیت کی ترنگ
 اکثر طاری ہوا کرتی ہے۔ ان لمحوں میں انسان یہ چاہتا ہے کہ خواہ مخواہ کے لئے کسی
 مخالفیت، کسی کش مکش پر غلبہ پائے۔ اس طرح انسان اپنی زائد اخلاقی قوت کا
 بھی مصرف ڈھونڈ لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں بھی اپنے آپ کو ایسے
 ہی اخلاقی امتحان سے دوچار کر رہا تھا۔ جس طرح لوگ فضول کی جتنا سٹاک کیا کرتے
 ہیں۔ کہ خواہ مخواہ جسم کو ہلا رہے ہیں اور اس حرکت سے سماج کے لئے کوئی مفید کام
 نہیں کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے تمباکو نوشی ترک کرنا ایسا ہی ایک اخلاقی تعیش تھا۔
 اور بس۔

میں نے تمباکو پینا چھوڑا تو پہلے تین دن معدے کی ٹالی کے ادھر کے حصے میں
 کچھ عجیب طرح کی ضعف کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ اس کیفیت سے بچھا چھوڑانے
 کے لئے میں نے پیرمنٹ کی چیونٹ گم کھائی۔ اعلیٰ درجہ کی چینی چائے پی اور لائم
 فروٹس کی گولیاں چباتا رہا۔ اس کیفیت پر تین دن میں غلبہ حاصل ہوا اور پٹ
 گئی۔ اپنے ساتھ کش مکش کا یہ دور جمانی تھا۔ اس لئے اس پر قابو پالینا آسان بھی تھا اور میرے
 نزدیک بے حد معمولی بات بھی۔ عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تمباکو چھوڑنے کے لئے جو
 ناپاک کوشش کرنی پڑتی ہے وہ بس اتنی ہی ہے۔ مگر ان لوگوں کو کچھ پتہ نہیں۔ یہ لوگ ببول
 جاتے ہیں کہ تمباکو پینا ایک روحانی فعل ہے اور جو لوگ تمباکو نوشی کی روحانی اہمیت سے
 واقف نہیں انہیں اس بات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ خیر پہلے تین دن میں

لڑائی کا پہلا دور ختم ہو گیا۔ تو دوسرا دور شروع ہوا۔ جو اصل روحانی کشمکش کا دور تھا۔ اس دور میں میری آنکھوں کے آگے سے پردے ہٹے اور میں نے جان لیا کہ تمباکو نوشیوں کی دو الگ الگ نسلیں ہوتی ہیں۔ جن میں سے ایک ایسی ہے کہ اس لقب کی ہرگز اہل نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے تمباکو نوشی ترک کرنے کی کشمکش کا دوسرا دور روحانی کشمکش کا مشکل تر دور، کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ کیوں "بہت سے لوگ اتنی آسانی سے تمباکو پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور انہیں کسی کشمکش، کسی تکلیف کا سامنا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دانتوں کے پرانے برش کی طرح اس عادت کو چھوڑ سکتے ہیں۔ بس اسی سے تہہ چلتا ہے کہ ایسے لوگوں کی "قوت ارادی" کتنی مضبوط ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ صحیح معنی میں کبھی تمباکو نوش نہیں تھے اور زندگی بھر یہ عادت ان میں راسخ نہیں ہوتی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک تمباکو پینا محض جسمانی فعل ہے۔ اسی طرح کا ایک جسمانی کام جس طرح ہر صبح وہ اپنے دانت مانجھتے ہیں اور منہ دھو سکتے ہیں۔ گویا ایک معمولی سا جسمانی کام ایک حیوانی سی عادت جس میں روحانی اطمینان یا سکون کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو میرے خیال میں ذوق سے ہاسکل عاری ہوتے ہیں۔ جو شیلے کی نظم سکاٹی لارک یا شوپان کے نظم "شب" پر کبھی وجد میں نہیں آسکتے۔ وہ اس کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اسی لئے تمباکو پینا چھوڑنے سے ان کی زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

لیکن جو لوگ صحیح معنی میں تمباکو کے رسیا ہیں۔ ان کا معاملہ مندرجہ بالا حضرات کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہم لوگوں کے لئے تمباکو نوشی ترک کرنا، اپنے ساتھ سخت

۱۱ انصافی کرنا ہے۔ اور اس کے علاوہ بالکل مہل بھی۔ چنانچہ ہمارا ذوق سلیم بہت جلد اس پابندی کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اور یہ سوال کرتا ہے کہ آخر کون کون سے سماجی معیاریاں، اخلاقی یا مالی وجوہ سے بقائم ہوش و حواس اپنے آپ کو اس روحانی سکون اس بصیرت، اس تخلیقی قوت سے محروم کرنے کیلئے اپنی قوت ارادی سے کام لیا جائے۔ جو تمباکو پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تخلیقی قوت، یہ بصیرت، یہ تخلیقی اچھ وہ چیز ہے کہ اگر آتش ان بے پاس بیٹھ کر ایک درست کی باتوں سے لطف اٹھانا ہے تو یہ لازمی ہے۔ اگر کوئی قدیم کتاب پڑھ کر دل میں گداز اور روح میں گرمی پیدا کرنی ہے تو یہ لابدی ہے اور اگر کچھ لکھنا ہے تو لفظ و معنی کے توازن، سوزوں الفاظ کی تلاش ان کی نشست، ان کے استعمال کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ان موقعوں پر انسان قدرتی طور پر سگریٹ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اور یہ بات اخلاقی لحاظ سے درست بھی ہے۔ اب اگر ان موقعوں پر سگریٹ کے بجائے منہ میں چوونگ گم کی ایک ٹکڑیا ٹھونس لی جائے تو یہ کتنی بے وقوفی اور کتنی غلط روی ہوگی۔ میں تو اسے نجرمانہ ٹرینڈ کہوں گا۔۔۔ مثال کے طور پر میں ایسے چند لمحوں کا ذکر کرتا ہوں۔

میرا دوست ب شہر پی پننگ سے مجھے ملنے کے لئے آیا۔ ہم نے تین برس سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں پی پننگ کو پی کننگ کہا جاتا تھا۔ اور وہاں ہر شام ہماری ملاقات رہتی تھی۔ اور باتوں اور سگریٹ کے دھوئیں کی رفاقت میں شام گزرتی تھی۔۔۔ گفتگو کے عام موضوع سیاست، فلسفہ اور جدید آرٹ جاکرتے تھے۔ اب کی اس سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں نے پہلے ملاقاتوں کی یاد تازہ کی۔ اور گوری بائیں دہرانے لگے۔ ان تمام پروفیسروں اور شاعروں اور مسر بھروں کا ذکر ہوا جن سے پہلے پننگ میں ہماری ملاقات تھی۔ ہر اچھے فقرے میں ذہنی طور پر

سگار کے لئے ہاتھ بڑھاتا تھا مگر گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ میں اٹھتا تھا اور بیٹھ جاتا تھا۔ میرا وہ دست بڑے آرام سے سگار پی رہا تھا اور بڑے سکون سے سگار کے دھوئیں کے درمیان گھوکر باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے سگار اور سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ اتنی خود داری مجھ میں تھی کہ اس کے سامنے اپنے ہمد سے نہ پھروں اور لاپچ کے ماتے پھر سگار پینا شروع کر دوں۔ مگر دل میں جانتا تھا کہ بات بن نہیں رہی۔ چاہیے یہ تھا کہ میں اس ملاقات پر جذبات کی عنان ہاتھ سے دیکھتا اور دہم مذاق ردحوں کے کھل ملاپ میں رکاوٹ پیدا نہ کرتا۔ مگر میں عقل و منطق کا پتلا بنا بیٹھا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ ساری گفتگو ایک طرف سے رہی۔ میری آدھی ہستی اس گفتگو میں حاضر تھی اور آدھی غائب۔ آخر میرا وہ دست چلا گیا۔ میں نے اس ساری گفتگو میں بڑے مصبر و سکون سے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ جو لوگ "قوت ارادی" کا ڈھونڈ رہے ہیں وہ کہیں گے کہ میں نے ترغیب اور کٹکٹش پر قابو پا لیا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا دل بہت رنجور تھا۔ چند دن بعد میرے دوست کا خط ملا۔ اس نے لکھا: تم توت و جذبات اور زندگانی کا وہ میکر نہیں رہے جو کبھی تھے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ شاید سنلگھائی میں رہنے کی بدولت تم میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو آج تک موافق نہیں پایا۔ کہ اس رات میں سے اپنے مشغول عہد کو توڑ کر کہوں سگار پینا شروع نہ کیا۔

ایسی ایک اور رات مجھے یاد ہے۔ ایک کلب میں دانشوروں کا اجتماع تھا یہ اجتماع عام طور پر بڑی خوشحال تباکو نوشی کا موقع ہوا کرتا ہے۔ نہایت عمدہ کھانے کے بعد کسی صاحب کو ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ اس دفعہ میں کی باری تھی اور موضوع تھا "مذہب اور انقلاب" مقالے میں بڑے بڑے چہرے اور شدہ فقرے آتے تھے۔ ان

فقدوں پر کافی دلچسپ باتیں ہوئیں اور تمباکو کے دھوئیں کے بادل گہرے ہوتے گئے۔ ساری فضا عجیب و غریب انوکھے خیالات سے بوجھل لگھوتی تھی۔ ایک کونے میں شاعر سحر چپ بیٹھا تھا اور بڑے اہتمام سے بوجھل ہوا میں دھوئیں کے گول گول حلقے پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً وہ اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ ساری محفل میں اکیلا میں تھا جو تمباکو نوشی سے محروم تھا۔ اور اپنے آپکو سب سے الگ تھلگ بالکل یکہوتہ محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تمباکو چھوڑنے میں تنگ کیا ہوئی۔ پھر یکا یک مجھ پر یہ روشن ہوا کہ تمباکو نہ پینا بالکل بے وقوفی کی بات ہے۔ اس وقت میں نے لاکھ سوچا کہ آخر کن باتوں سے میں نے تمباکو نوشی چھوڑی تھی۔ مگر ایک بات بھی یاد نہ آئی۔ اور جو سبب یاد آیا وہ بالکل بے وزن اور کھوکھلا معلوم ہوا۔

اس کے بعد میرے ضمیر نے میری روح کو تنگ کرنا شروع کیا۔ میں نے اپنے آپ سے بوجھل تھا کہ میں نے بے خیالی میں ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ اور بھلا تمباکو سے بچنے والا دل دماغ کبھی تخیل کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔؟ پھر ایک سہ پہر میں ایک خاتون سے ملنے گیا۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا کہ پھر سے تمباکو پینا شروع کر دوں۔ مگر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ نوجوان خاتون سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے اپنا سٹول ہازو گھٹنہ ٹیک رکھا تھا۔ وہ ذرا سی آگے کوچھکی ہوئی تھی اور اس کا فکر سندھ، ارمان، نیگز، انداز بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ میرے دل نے کہا، اب وقت آگیا ہے۔ چنانچہ اس نے سگریٹ کا ڈبہ پیش کیا۔ تو میں نے بڑی پامردی سے ادبڑی آہستگی سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں عہد توڑنے کی اخلاقی ذلت کے نہایت عارضی وقفے پر غالب آچکا ہوں۔

گھر واپس آکر میں نے فوراً ملازم کو بھیجا کہ کیپشن کا ڈبہ لائے۔ میری لکھنے

کی میز کے دائی طرف ایک جگہ لکڑی کا کچھ حصہ جلا ہوا تھا۔ کیونکہ میں کام کرتے وقت ہمیشہ جلتا ہوا سگریٹ دہیں رکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک بار یہ بھی حساب لگایا تھا کہ میز کا اوپر کا تختہ گوئی دو انچ موٹا ہے۔ اسے آدھا چل جانے کے لئے گوئی سات آٹھ سال کی مدت درکار ہوگی۔ اب میں نے سگریٹ چھوڑے تو میں حسرت سے دیکھا کرتا تھا کہ جلتے کا نشان دیسے کا ویسا ہے اور گوئی نصف سنٹی میٹر سے آگے نہیں بڑھا۔ چنانچہ میں نے سگریٹ پی کر اب جو جلتا ہوا ٹکڑا اسی نشان پر پھر رکھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اب پئے ہوئے سگریٹوں کے جلتے ٹکڑے اسی نشان کو اس کی منزل کی طرف پہنچانے میں کوشاں رہتے ہیں۔

چینی ادب میں شراب کی بہ نسبت تباکو کی تعریف میں بہت کم چیزیں ملتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تباکو نوشی کی عادت تو کہیں سو لھویں صدی میں پرینگیزی ملاحوں کی بدولت شروع ہوئی۔ میں نے سارے چینی ادب کے کھنگال ڈالا مگر تباکو کی تعریف میں محض چند پھیکے سیٹھے فقرے کہیں کہیں ملے جو ہرگز تباکو کی شان کے شایاں نہیں تھے۔ اس کے باوجود یہ یاد ہے کہ چینی قوم کی قوت شامہ بڑی نیز ہے۔ اس کا ثبوت چائے اور شراب کی ہلک اور کھانے کی بوباس پر ان کے اقوال سے ملتا ہے۔ اصل میں چین میں جب تباکو نہیں تھا تو چینی لوگوں نے بخورات جلانے کے آرٹ کو ترقی دی اور ان خوشبوؤں کا ذکر چینی ادب میں چائے اور شراب کے ساتھ ہر جگہ ملتا ہے۔ اوسا کا شمار بھی انہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ قدیم چین میں کبھی ہان خاندان کی حکومت تھی اور ہندوستان تک ان کے زیر نگیں تھا۔ ان دنوں ہی جنوبی ملکوں سے جلانے کی خوشبوئیں خود، غنہ اور دوسرے بخورات لائے جاتے تھے۔ ان کا رواج شاہی دربار اور امراء کے گھروں میں عام تھا۔ زمینگی بسر کرنے کے آداب چینی میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

ان سب میں بخورات اور خوشبوؤں کی قسموں، ان کی تیاری اور ان کی عمدگی پر الگ باب موجود ہیں۔ تاؤ لنگ نے اپنی کتاب میں خوشبوؤں اور بخورات سے نطف لینے پر جو لکھا ہے۔ اس کا ایک اقتباس میں درج کرتا ہوں :-

”خوشبو سلگانے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اہل علم، گوشہ نشین لوگ جو تلاشِ حق میں مصروف ہوتے ہیں اور مذہبی مسائل کی الجھنیں دو کرنے میں لگے ہوتے ہیں، لوہان یا اگر کی ایک تبی کا خوشبودار دھواں انکے ذہن کو صاف کر دیتا ہے اور روح کے لئے لطافت کا سامان بنتا ہے رات کے چوتھے پہر جب چاند آسمان پر اکیلا بھا اور آدمی اپنے آپ کو زندگی سے الگ تھلاک محسوس کر رہا ہو تو خوشبوؤں کا دھواں روح کو ہلکا کرتا ہے اور دل کی خوشی سے ہلکنا کرتا ہے۔ اگر ایک روشن دیکھے کے پاس آپ پرانے مخطوطات دیکھ رہے ہوں یا شعر گنگنا رہے ہوں تو بخورات نبند کے غلبے کو دور رکھتے ہیں۔ آپ خوشبوؤں کی دھونی کو چاند کی قدیم پہلی کہہ سکتے ہیں۔ اگر سرخ ملبوس والی حسینہ آپ کے پاس کھڑی ہو اور اپنے خوشبودان کے اوپر سے اس کا گداز ہاتھ پکڑ رکھا ہو، اسکے نازک کانوں میں آپ دفا کے رازوں کی سرگوشیاں کر رہے ہوں تو خوشبوؤں کی مہکتی لپٹ آپکے دل میں گداز پیدا کر دے گی اور آپ کی محبت میں شدت پیدا ہو جائیگی۔ اس لئے آپ خوشبو کو ”محبت کے جذبات کی قدیم محرک سے تعبیر کر سکتے ہیں۔“ یا اگر آپ تیرے پہر کی نبند سے بیدار ہوں اور برستی برسات کے دن، بند کھڑکی کے پاس بیٹھ کر خطاطی کی مشق

کر رہے ہوں اور چائے کے ہلکے سرور اور گندھ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو خوشبودان سے بھیننی خوشبودوں کی ایک لپٹ اٹھتی ہے اور آپ کے جسم کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے اور مارے کمرے میں ہوا کے دوش پر تیرتی پھرتی ہے۔

اس سے بھی بہتر وقت وہ ہے کہ مے نوشی کی محفل کے بعد اٹھیں پورا چاند شفاف رات کے سینے پر چمک رہا ہو اور سرور کے عالم میں آپ اپنی انگلیاں رباب کے تاروں پر چلائیں یا ایک خالی مینار میں ہلکی سی سیٹی بجائیں۔ دوسرے سبز پہاڑیاں صاف نظر آرہی ہوں اور خوشبودان سے بخورات کے باقی ماندہ شراروں سے خوشبو کی لپٹ پر دوں سے چھن چھن کر آنے لگے۔ خوشبو کی دھونی بدبو کو دور رکھتی ہے، دلدل کی گندھی فضہ کو پاک اور صاف کرتی ہے اور ہر جگہ اور ہر مقام پر کام آتی ہے۔ سلگانے کے لئے سب سے بہتر چیا نان کی لکڑی ہے۔ مگر یہ مشکل سے دستیاب ہوتی ہے اور پہاڑوں میں رہنے والوں کو میسر نہیں آسکتی۔ اس سے دوسرے درجے پر صنل کی لکڑی ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں اعلیٰ قسم میں خوشبو زیادہ تیز اور سخت ہوتی ہے اور سب سے گھٹیا قسم دھواں زیادہ دیتی ہے اور خشک بھی ہوتی ہے اس لئے دمیلے دجے کی صنل عمدہ ہوتی ہے اسکی خوشبو سکون پروردار نہیں ہوتی ہے۔ چائے بنانے کے بعد جو کونے بچ جائیں انہیں خوشبودان میں ڈالی دیجئے اور خوشبو کو دھیرے دھیرے ابھرنے دیجئے ایسے سکون کے لمحوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ جنت میں ہیں اور زندہ جاوید لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر اس ارضی زندگی سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔

آجکل کے لوگوں کو صحیح خوشبو کی قدر کا مذاق نہیں۔ یہ لوگ نت نئی خوشبوؤں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر مختلف خوشبوؤں کی طاوٹ کے سلسلے میں فوقیت جتلاتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ صحیح خوشبو صندل کی ہے جو بالکل قدرتی ہے اور اس کی بہترین قسم وہی ہے جس کی باس میں خاص قسم کی سکون پروری اور نفاست ہو۔

ماڈرن چیانگ نے اپنی کتاب اپنی محبوبہ کی یاد میں "میں ایک امیر شاعر اور اس کی باگمال اور ذہین محبوبہ کی زندگی کا حال بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں نے خوشبوؤں سے کیا کیا مزے لئے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

اکثر میں اور میری محبوبہ مشہور خوشبوؤں کی دھوئی اور بخورات کو پہچاننے کے لئے اس کے معطر شبتان میں بیٹھا کرتے تھے جس خوشبو کو "قصر کی خوشبو" کہتے ہیں وہ بڑی اریان انگیز ہے۔ لوگ جس طرح عود سے خوشبو لیتے ہیں وہ طریقہ بڑا عامیانا ہے۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ عود کی لکڑی کو آگ پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کی خوشبو جلتے ہوئے روزے کی بدولت بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہ تو خوشبو بھلتی ہے اور نہ کچھ حاصل ہوتا ہے بلکہ دھوئیں اور بو جھل ہوا سے کمرہ بھر جاتا ہے جو جسموں سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ عود کی ایک قسم ہے جو بہت سخت ہوتی ہے اور اس کے دانے اس کی لکیریں سب سیدھی ہوتی ہیں اس کی خوشبو بہت ہی عمدہ ہوتی ہے۔ ایک اور قسم بھی ہے جو پوری طرح پکی اور نچرت نہیں ہوتی ہمارے یہاں اس لکڑی کی ساری قسمیں تھیں اور میری محبوبہ ان کو نہایت نفیس ریت اور ہلکی آگ پر جلاتی تھی کہ دھواں مطلق پیدا نہیں آتا تھا اور ہلکی

خوشبو سارے کمرے میں بس جاتی تھی۔ یہ خوشبو ایسی تھی گو یا شبنمی گلابوں کی مٹی
 باس ہو یا عنبر کے ٹکڑے کو خوب رگڑا گیا ہو یا سینگ کے ریالے میں خوشبو دار
 شراب اتدیلی جا رہی ہو۔ جب بستر کو اس طرح خوشبو میں بسایا جائے تو
 یہ خوشبو عورت کے جسم کی خوشبو کے ساتھ مل جاتی ہے جو خوابوں میں بھی بڑی
 خوشگوار پڑی سرور آگئیں ہوتی ہے۔

۱۰۔ شراب

میں پینے والوں میں کوئی پینے والا نہیں۔ اس لئے شرابوں کے بارے میں بات
 کرنے کی بالکل اہلیت نہیں رکھتا۔ میری بساط یہ ہے کہ چینی چاول کی ہلکی شراب کی
 تین پیالیاں کافی ہیں۔ بلکہ میں تو بیئر کا ایک گلاس پی کر بھی مدہوش ہونے کی صلاحیت
 رکھتا ہوں۔ لیکن یہ آسانی قدرت کا عطیہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ شراب یا چائے
 پینے کی صلاحیت اور تباہ کنوشی کی صلاحیت ایک ساتھ کسی کو نہیں ملتیں۔ میرے کئی
 دوست ایسے ہیں کہ بلا نوش ہیں۔ لیکن آدھا سگار پنی کر برداشت کرنا ان کے امکان سے
 باہر ہے۔ میں دن رات کے چٹنے گھنٹے جاگتا رہوں۔ برابر تمباکو پیتا رہتا ہوں۔ مجھ پر
 اس کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔ مگر شراب کے معاملہ میں میری کوئی ہمتی نہیں۔ لی لی ونگ نے
 لکھا ہے کہ جو لوگ چائے بہت پی سکتے ہیں وہ شراب کے زیادہ شائق نہیں ہوتے اور
 جو شراب کے بسا ہوں وہ چائے نہیں پی سکتے۔ یہ اس کی حتمی رائے ہے۔ وہ چائے
 کا بڑا نقاد اور متوالا تھا۔ مگر خود کہتا تھا کہ مے نوشی میں میری کوئی بساط نہیں۔
 مجھے چین کی ادبی تاریخ میں ایسی ہستیوں کا حال پڑھ کر بڑی خوشی اور بڑا سکون ہوتا ہے

کہ میری طرح وہ بھی شراب زیادہ نہیں پی سکتے تھے۔ اور یہ کہ اس کا اعتراف انہوں نے صاف صاف لفظوں میں کر دیا ہے۔ مجھے ان مشہور ہستیوں کے خطوط اور دوسری تحریروں سے یہ اعترافات جمع کرتے کچھ وقت لگا ہے۔ پھر بھی اب مجھے معلوم ہے کہ اس قبیل کے لوگوں میں آئی بھی تھا، یوآن ست سائی، وانگ یوآننگ اور یوآن چنگ لانگ جیسے لوگ بھی تھے۔ سب کے دلوں میں شراب کا ذوق تھا۔ مگر ان میں سے بلا نوش کوئی بھی نہ تھا۔

اپنی نااہلی کے باوجود میں ان موضوع سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اچیز سے زیادہ شراب نے ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ تباہ کن نوشی کی طرح شراب نے بھی انسان کی تخلیقی قوتوں کو جلا دینے اور ان قوتوں کو دوام اور تازگی بخشنے میں بے حد اہم حصہ لیا ہے اور اس کے اہم نتائج بھی بتا رہے ہیں۔ چینی ادب میں بار بار تھوڑی سی پینے کے سرور کا ذکر کیا گیا ہے۔ میرے لئے یہ ہمیشہ ایک ستارہ رہا۔ آخر شنگھائی کی ایک مہر چین نے جو خود پینے ہوئے تھی اس سرور کی خوبیوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا کہ مجھے قائل ہونا پڑا اور میں نے سوچا کہ سرور کی جس حالت کا ذکر میں نے بار بار پڑھا اور سنا ہے۔ واقعی حقیقی چیز ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس متوالی حسینہ نے کہا تھا: نیم مستی میں انسان باتیں کرتا جاتا ہے، کرتا جاتا ہے، رکتا نہیں۔ اور نیم مستی ہی سب سے خوشوار حالت ہوتی ہے! — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پی کر مسرت اور شادمانی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ آدمی میں یہ زبردست خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر مشکل پر غالب آسکتا ہے۔ اس کا احساس، اس کا شعور بہت نازک اور تیز ہو جاتا ہے۔ آدمی کی تخلیقی فکر بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ قوت فکر، حقیقت اور تخیل کی سرحد کے آس پاس ملتی ہے اور نشہ اس کی تیزی اور اس کی برائی میں بہت زیادہ

اضافہ کرتا ہے۔ پی کر جو اعتقاد اور آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ تخلیق کے لئے بہت معاون اور ضروری ہوتا ہے۔ اعتقاد اور آزادی کے اس احساس پر سینے پٹائے کاغذوں اور پیپت کے بند مضمون سے چھٹکارے کے اس احساس پر تفصیل سے اس وقت بات ہوگی جب ہم آرٹ والے باب پر پہنچیں گے۔ ابھی اس کا موقع نہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈکٹیٹر، انسانیت کے لئے اس وجہ سے خطرناک ہیں کہ وہ پیسنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس خیال میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ میں نے چارلس ڈیولینزنگوسن جیسے صحافی اور ادیب کا مضمون اس مسئلے پر دیکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کے تفصیلی اقتباس پیش کروں۔ مگر جگہ کی کمی مانع ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سٹالین، ہٹلر اور مسولینی تینوں کے تینوں نشہ آور چیزوں سے احتراز کرنے کے سلسلہ میں مثالی انسان تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک بالکل جدید طریقہ پر انسانیت پر نظام کرنے میں انسانوں پر حکومت کرنے کے جدید ترین انداز میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ مگر ان کی زندگی ایسی تھی کہ ہر وہ نوجوان جو دنیا میں ترقی کرنا چاہتا ہے اسے ان کی زندگی کی مثال پر عمل کرنا چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک کسی شریف آدمی کا بہت اچھا داماد اور کسی شریف زادی کا مثالی شوہر بن سکتا تھا۔ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے اتنی مقطع زندگی بسر کرتے تھے کہ کٹر سے کٹر مذہبی شخص ان کی گرد گونہ پہنچے۔ ہٹلر نہ گوشت کھاتا تھا، نہ شراب پیتا تھا، نہ سگریٹ پیتا تھا۔ یہی نیکیاں کیا کم مصیبت ہیں۔ مگر ان کے ساتھ اس میں پارسائی اور پرہیزگاری کی بھی مصیبت موجود تھی۔ ہٹلر مسولینی تو وہ کھاتا اور گھوڑے کی طرح تھا لیکن ہر قسم کی تیز شرابوں سے بڑی سختی سے احتراز کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ہلکی شراب کا ایک سرور آگے گھونٹ لیتا تھا اور بس کوئی کام لسانہ کرتا تھا جس سے کسی ادنیٰ قوم پر غبر پانے کے ارفع و اعلیٰ مقصد

میں رکاوٹ ہو! — اب اسٹالین کی طرف آئیے تو وہ بڑی سادگی سے تین گروں کے ایک گھر میں رہا کرتا تھا۔ بہت غیر نمایاں کپڑے پہنتا تھا جس سے کوئی مذاق یا بد مذاقی بالکل ظاہر نہ ہو۔ خطرناک حد تک سادہ غذا کھاتا تھا اور کبھی کبھار برانڈی کی ہلکی چسکی یوں لیتا تھا جس طرح تیرابوں کے ذائقہ کے ماہر چسکی لیتے ہیں۔! آپ پوچھیں گے اس سارے بیان کی اہمیت ہمارے لئے کیا ہے۔ فرگوسن لکھتا ہے کہ کیا ان باتوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا ایسے لوگوں کے چمگل میں گرفتار ہے جو ہنسیادی طویل آدمیت سے بیزار اور تباہ کن حد تک پارسا ہیں۔؟ جن کو بڑی مہیب حد تک یہ شعور ہے کہ وہ میکانی ضبط نفس کے مالک ہیں۔ اس لئے یہ لوگ آدمیت کے لئے سخت خطرناک ہیں۔ اور اگر یہ لوگ اپنی پارسائی اور ضبط نفس کا عمارت تار تار کر کے نشے میں دھت ہو کر ہوسق نچانے پھریں تو دنیا کو بڑا آرام نصیب ہو جائے یا اور کھٹے جس شخص کو نشے کے اتار و ظار کی اعضا شکنی سے واسطہ پڑتا ہو وہ کبھی ڈکٹیٹر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس حالت میں اپنے اللہ تعالیٰ ہونے اور اپنے قادر مطلق بننے کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اگر ڈکٹیٹر کو نشے کے اتار کی حالت سے واسطہ پڑے تو وہ اپنے محکوم بندوں، اپنی رعایا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل اور بازاری محسوس کرے گا۔ وہ اس حالت میں عوام میں سے ایک معمولی شخص بن جائیگا۔ بلکہ عوام میں سے بھی سب سے گھٹیا قسم کا شخص ہو گا۔ اور یہ تجربہ اس ڈکٹیٹر کے حد سے بڑھے ہوئے تکبر اور تکلیف دہ پنہار کو سخت ٹھیس پہنچائے گا۔“

فرگوسن کا خیال ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ایک کاک ٹیل پارٹی کیجائے جس میں ہر ملک کے عوام کے چنے ہوئے رہنما بلائے جائیں۔ اس پارٹی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ ان معزز ہستیوں کو بڑی سادگی اور بڑی صفائی سے استری کر دیا جائے۔

تاکہ کل صبح جو یہ لوگ نیند سے اٹھیں تو آج کی طرح خطا اور عیب سے پاک فوک البشر نہ ہوں۔ بلکہ عام آدمی بن جائیں۔ اپنے گھٹیا سے گھٹیا محکوم کی طرح عیب اور کمزوری کے پتلے ہوں۔ چنانچہ وہ آدمی بن کر انسانیت کے مسئلے سلجھائیں۔ دیوتا نہ بنے رہیں۔

مجھے ڈکٹیٹروں سے اس لئے پڑ ہے کہ یہ لوگ انسان نہیں ہوتے اور ہر وہ چیز جو غیر انسانی ہو بری ہوا کرتی ہے۔ جو مذہب غیر انسانی ہو وہ مذہب کھلا کا مستحق نہیں۔ جو سیاست غیر انسانی ہو وہ احمقانہ ہوتی ہے۔ غیر انسانی آرٹ برا آرٹ ہوتا ہے اور غیر انسانی طرز زندگی، جانوروں کی طرز زندگی ہے۔ ہر چیز کی کوئی یہی بشریت ہے آدمی پن ہے۔ زندگی کے ہر شعبے اور فلسفے کے ہر نظام کو اسی کوئی پر پر کھنا چاہیے۔ آدمی کے لئے سب سے بڑا نصب العین یہ نہیں کہ وہ نیکیوں کا جیتا جاگتا نمونہ بن جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ خوش مزاج اور ملنسار ہو، لوگ اسے پسند کریں اور وہ ہر لحاظ سے معقول انسان ہو۔

چائے کے بارے میں مغرب کے لوگ چین سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن شراب کے معاملے میں مغرب کے لوگ چینی قوم کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ ایک چینی جب پہلی بار شراب کی امریکی دہان میں داخل ہوتا ہے تو وہ شراب کی مختلف قسموں کی بوتلوں اور ان کے رنگارنگ لیبلوں کو دیکھ کر بھونچتا رہ جاتا ہے۔ اس کے اپنے ملک میں تو صرف ایک شراب ہے اور وہ بہاں جاتا ہے وہاں شاؤنگ شراب سے ہی اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ کوئی چھ سات دیسی قسمیں اور بھی جوار وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں ان کے علاوہ طبی ضرورتوں کی ایک شراب بھی ہے۔ مگر یہ ساری قسمیں جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ چینی تہذیب میں یہ تکلف پیدا نہیں ہو سکا کہ مختلف کھانوں کے

ساتھ مختلف قسم کی شرابیں پیش کی جائیں۔ مگر شاد سنگ شراب کی ہر دلعزیزی کا عالم یہ ہے کہ اس شہر میں جس کے نام پر یہ شراب مشہور ہے ہر لڑکی کے پیدا ہونے پر شراب کا ایک ٹسکا الگ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس لڑکی کے جوان ہونے تک اور اس کی شادی کے وقت تک یہ شراب کم سے کم بیس سال ضرور پرانی ہو چکتی ہے یہ کہنہ شراب اس کے جہیز میں دی جاتی ہے۔

چین میں شراب کی قسموں کی جو کمی ہے اسے شراب پینے کے مناسب وقت اور مناسب ماحول پر زور دینے سے پورا کیا گیا ہے۔ شراب کا مذاق الگ ہے اور چائے اور شراب میں جو فرق ہے اسے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ چائے تارک دنیا سے مماثلت رکھتی ہے اور شراب کی مثال ایک بانگے امیر زادے کی ہے۔ شراب لطفِ صحبت کے لئے بے بہا چیز ہے اور چائے خاموش طبع شخص کی رفیق ہے! — شراب پینے کے مناسب موقعوں اور مقامات کے بارے میں بھی صاف صاف لکھ دیا گیا ہے۔ ایک مصنف لکھتا ہے: "مکلفاً اور رسماً جو شراب پی جائے وہ بہت دھیرے دھیرے اور سوجھ بوجھ پینی چاہیے۔ بلا نوشی میں ایک طرح کا بانگین اور رومان ہونا چاہیے۔ بیمار کو بہت کم شراب پینی چاہیے۔ غمگین شخص کو اس لئے پینی چاہیے کہ وہ نشے میں دھت ہو جائے۔ بہار کے موسم میں ایک کھلے صحن میں سے نوشی مناسب ہوگی۔ گرمیوں میں شہر کے مضافات میں اور خزاں میں کشتی میں بیٹھ کر پینی چاہیے۔ سردیوں میں مکان کے اندر بیٹھ کر مے نوشی کرنی چاہیے۔ رات کو صرف چاند کی موجودگی میں پینی چاہیے۔"

ایک اور مصنف لکھتا ہے: پنی کر دھت ہونے اور بھکنے کے بچی خاص موقعے ہو کرتے ہیں۔ دن میں پی کر بھکنا ہو تو پھولوں کے تختے کے باس بیٹھ کر پوتا کہ ان

پھولوں کی تاب اور ان کا رنگ تم میں رچ جائے۔ ہر ف کے دنوں میں رات کو پی کر دھت ہونا چاہیے تاکہ خیالات میں سلاست اور وضاحت پیدا ہو جائے۔ کامیابی پر جو شخص مسرور ہوا سے پی کر گانا چاہیے۔ تاکہ اس کی روح وجد کر اٹھے۔ کسی انوداعی دعوت میں جو شخص بہت زیادہ پینا چاہے اسے سرچھٹرنے چاہئیں تاکہ اسکی روح کو قوت مل سکے۔ پی کر ایک با علم شخص کو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مبادا وہ کوئی ایسی بات کر بیٹھے جس میں اس کی سبکی ہو۔ ایک مخمور فوجی کو اور زیادہ شراب کا آرڈر دینا چاہیے۔ اور اعزازی نشانات لگانے چاہئیں تاکہ اس کی شان بڑھے۔ برج میں بیٹھ کر مے نوشی صرف گرمی میں کرنی چاہیے۔ تاکہ فضا کی ٹھنڈک سے لطف اٹھایا جاسکے۔ غزاں میں کشتی میں بیٹھ کر شراب پینی چاہیے تاکہ آزادی اور دل کی کشادگی کا احساس زیادہ ہو۔ شراب پینے کے موقعوں اور مقام کے سلسلے میں مناسب قاعدے یہی ہیں۔ اگر ان قاعدوں سے انحراف کیا جائے تو مے نوشی کا سارا لطف تباہ ہو سکتا ہے۔

شراب کے بارے میں چینی لوگوں کا رویہ اور مے نوشی کی محفل میں انکار رکھ رکھاؤ ایسا ہے جو کچھ تویری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور کسی حد تک قابل ملامت بھی ہے اور کچھ کچھ تعریف کے لائق بھی ہے۔ قابل ملامت بات تو یہ ہے کہ چینی شخص کو اس کی بساط اور طرف سے کہیں زیادہ پی جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس سے انہیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مغربی معاشرے میں اگر یہ رواج ہے تو مجھے اس کی خبر نہیں مگر چین میں تو شراب کی مقدار پر زور ہے۔ چاہے خود پس یا کوئی اور پی رہا ہو۔ بے شبہ اس کا تعلق نوش باشی سے بہت زیادہ ہے اور جس کسی کو بھی زیادہ پینے پر مجبور کیا جاتا ہے اسے بڑے دوستانہ اور با مذاق طریقے سے مجبور کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس سے کافی شور مچتا ہے لہذا بہت گڑ بڑ بھی ہوتی ہے جس سے محفل کی رونق رخصتی ہے اور لطف محفل بھی زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھنے کا سماں وہ ہوتا ہے کہ محفل میں ہر شخص پر نشے کا خاصہ گہرا رنگ پڑھتا ہے اور ہر شخص اپنے آپ کو بھول جاتا ہے کہ وہ کون ہے۔ ہر طرف سے "اور لاؤ" کے نعروں سنائی دیتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں یا ایک دوسرے کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کسی کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ میرا نام کون ہے اور وہاں کون ہے۔ اس سے اگلے مرحلے پر پینے کا مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ بڑے فخر، بڑی لطافت اور بڑی جا بک دستی سے جاری رکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ حریف کو دھت کر کے نیچا دکھائیں۔ اس لئے حریف کی طرف سے کسی دھوکے کے سلسلے میں چوکس رہنا پڑتا ہے۔ حریف کی چالوں سے خبردار ہونا پڑتا ہے۔ اور غالباً محفل میں نوشی کا سارا لطف اسی مقابلے کی فضا میں مضمر ہوتا ہے۔

رہا چین میں شراب نوشی کا قابل تحریف پہلو تو وہ ان محفلوں کی ہنگامہ آرائی اور شور ہے۔ کسی چینی رستوران میں کھانا کھائیے تو شور سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رستوران میں نہیں بلکہ منٹ ہال کا میچ دیکھنے آئے ہیں۔ اس شور کی وجہ یہ ہے کہ مے نوشی کی محفلوں میں "انگلیاں گننے" کے ایک عجیب سے کھیل کا رواج ہے کھیل یوں ہے کہ دو شخص بیک وقت ہاتھ کی انگلیاں پھیلاتے ہیں اور پھر بلند آواز سے یہ بتاتے ہیں کہ ان کے خیال میں اپنے حریف کے ہاتھوں کی انگلیوں کی کل تعداد کیا ہوگی۔ اس کھیل میں وقت کی مطابقت کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے جب انگلیوں کی تعداد بتائی جاتی ہے تو یہ تعداد شاعرانہ ترکیبوں میں ڈھل کر ایک خاص آہنگ اختیار کر لیتی ہے۔

مے نوشی کی محفل کے بارے میں چینی لوگوں کا جو نظریہ ہے اب اس کے

اصل مقصد کی طرف آئیے۔ کیونکہ یہی نکتہ ہے جو چینی دعوتوں کی طوالت کی تشریح کر سکتا ہے۔ اس کی بدولت تہہ چل سکتا ہے کہ چینی دعوتوں میں کتنے کھانے پیش کئے جاتے ہیں اور کھانا کس طرح کھلایا جاتا ہے۔ چینی دعوتوں کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا کہ آپ ہم کر بھر پیٹ کھانا کھالیں اور بس۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے کھانوں کے درمیان جو کہا نیاں کہی جاتی ہیں، جو مذاق ہوتا ہے اور چیتیاں اور کہہ مکر نیاں ہوتی ہیں ان سے پورا پورا لطف اٹھایا جائے اور محفل کے مزے لئے جائیں۔ یہ دعوتیں اصل میں دماغی کھیلوں کی محفلیں ہوتی ہیں۔ جن میں ہر پانچ سات منٹ کے بعد گوئی کھانے کی چیز میز پر ہا جاتی ہے یا یہاں کچھ وقفے کے بعد تھوڑا کھانے لیتے ہیں۔ اور پھر اپنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے دو اثرات ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان دماغی کھیلوں میں سوال اور جواب کے سلسلے میں جو شوق بچتا ہے۔ اس کی بدولت نشہ آور مشروبات اور شراب کے اثرات جسم سے زائل ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا اثر یہ ہے کہ عام طور پر یہ دعوتیں ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہتی ہیں۔ ان کے ختم ہونے تک کچھ نہ کچھ کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جتنا آپ کھاتے جاتے ہیں اتنی ہی اندر بھوک معلوم ہوتی ہے۔ کھاتے وقت خاموش رہنا بڑے عیب کی بات ہے۔ یہ بات اس لئے اخلاق سے گری ہوئی ہے کہ بے حد غیر صحت مند ہے۔ عام طور پر عمر ملکی لوگوں کے دل میں یہ شک جاگزیں ہوا کرتا ہے کہ چین کے لوگ خوش باش نہیں ہوتے۔ ان میں سے جن لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ چینی بڑی سنجیدہ اور مقطع اور خاموش طبع قوم ہے انہیں چاہیے کہ چینیوں کو کھانا کھاتے ہوئے ایک ہار دیکھ لیں۔ کیونکہ اس وقت چینی لوگ موع میں ہوتے ہیں۔ اندان کے طبعی کمالات کا عروج اسی وقت نظر آ سکتا ہے۔ اگر کھانا کھاتے وقت بھی چینی خوش باشی کے پتے نہیں تو یوں سمجھئے کہ خوشی ان کی قسمت میں نہیں۔

معموں اور چیتانوں کے سلسلے میں چینی لوگ بڑے مشہور ہیں مگر شراب پیتے وقت ان کے دماغی کھیلوں کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں۔ چین میں بے شمار کھیل رائج ہیں۔ اور سب کے سب شراب پینے کے بہانے ہوتے ہیں۔ رات کے کھانے پر جو جو کھانے کھلائے جاسکتے ہیں۔ ہر چینی ناول میں ان کا عین ذکر موجود ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں شعر گوئی کے ایسے مقابلے بھی مذکور ہیں جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ مشہور نائی ناول چنگ ہوا یوآن میں ادبی مذاق رکھنے والی لڑکیوں کی ایسی کئی تفریحات کا ذکر ہے (ان میں تلفظ کے کھیل بھی شامل ہیں) اور غالباً ہی چیزیں اس ناول کا اصل موضوع ہیں۔

سب سے سادہ کھیل شہ نہ کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں کسی ایک لفظ کا ابتدائی رکن اور دوسرے لفظ کا آخری رکن ملا کر ایک لفظ بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو وہ رکن بتانا پڑتا ہے جو ان میں غائب ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ — حور کا ٹکڑا "سحور" اور "حور دس" دونوں میں مشترک ہے۔ اس کا معنی بنا کہ "س دس" کا لفظ دیکھا۔ گویا سحور کا پہلا رکن "س" اور حور دس کا آخری رکن "دس" ملا کر ایک لفظ بنا دیا۔ حریف سے کہا کہ ان میں سے جو رکن غائب ہے وہ بتاؤ۔ مناسب طریقہ یہ ہے کہ جو شخص ان دونوں لفظوں کا درمیانی رکن بوجھ لے۔ (حور) وہ اسے بتاتا نہیں۔ بلکہ اس سے ایک جوابی معنی بنا لیتا ہے۔ مثلاً حور کے لفظ سے حور طلعت اور سحور (جمع سحر۔ صبح) کے رکن ملا کر طلعت صبح کا لفظ بنا کر جواب میں کہہ دے گا۔ اصل معنی بنانے والے کو معلوم ہو جائیگا کہ غلطی کو صحیح جواب معلوم ہے۔ لیکن حاضرین کو کچھ پتہ نہ چل سکے گا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ حرف کا جواب اصل جواب سے بہتر ہے۔ اس سے بہتر لفظ کو ماننا لازم ہے گا۔ اس چیز کو اور زیادہ

پچیدہ اور مشکل بھی بنایا جاسکتا ہے اور نہایت مشکل اور بعض اوقات نادر الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ جہاں اس کھیل میں کچھ اہل علم لوگ حصہ لے رہے ہوں تو بڑے بڑے نادر تاریخی نام بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کی بدولت دوسرے کی علمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً شیکسپیر کے ڈراموں میں کرداروں کے یا بالزاک کے کرداروں کے ناموں سے پہیلیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن کا حل کافی دشوار ہوتا ہے۔

ایسے ادبی کھیلوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اہل علم لوگوں میں ایک کھیل عام ہے کہ ایک عالم شخص سات لفظوں کا ایک مزاحیہ سامصرعہ کہتا ہے۔ دوسرا اس پر گڑ لگاتا ہے اور پھر مصرعہ در مصرعہ نظم چلتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ آخر میں اس کا کوئی مطلب اور مفہوم پیدا نہ ہو۔ مصرعوں میں عام طور پر کسی چیز، کسی شخص یا کسی منظر پر کچھ کہا جاتا ہے ہر شخص دو مصرعے کہے گا۔ پہلا مصرعے میں تو اپنے سے پہلے والے شخص کے مصرعے پر گڑ لگا کر شعر بنا دیگا۔ اور دوسرا مصرعہ بعد والے کے لئے ہوگا۔ کہ وہ شعر پورا کرے۔ قافیہ کی پابندی سب سے پہلے مصرعے سے شروع ہوگی۔ تیسرے، پانچویں ساتویں مصرعوں میں (علیٰ ہذا القیاس) اس قافیہ کا التزام کیا جائیگا۔ عالموں کی محفل میں (جن میں ہر شخص نے "کتاب چہارگانہ" یا کتاب النغمات" کا ہر نام اور ہر فقرہ حفظ کر رکھا ہوتا ہے) میں یہ مطالبہ بھی کر سکتا ہے کہ حاضر میں کسی خاص موضوع پر مناسب مقولے اور ضرب الامثال پیش کریں۔ مقبول عام گیتوں اور تانگ نظموں کے مصرعوں پر مناسب مقولے کہنے کا بھی مطالبہ ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کا حاضرین سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے پھولوں یا دواؤں کے نام بتائیں۔ جن کا تعلق عورتوں کے جسم، لباس یا ان کے استعمال کی چیزوں سے ہو۔ اس کی مثال بیچہ مریم (ایک بوٹی) گوکھرو (ایک خاردار بوٹی) وغیرہ ہیں۔ ایسے

دوسری نام اسی صورت میں پیش کئے جاسکتے ہیں کہ ایک زبان میں پھولوں، دواؤں
درختوں وغیرہ کو کس قسم کے نام دیئے گئے ہیں اور وہ نام خوبصورت بھی ہیں یا نہیں۔
ناموں کی کہہ مکر نیاں اور ان کا الٹ پھیر ہر زبان میں ممکن ہے اور اس کا سارا دارو مدار
طباعتی اور دماغ کی طر آری پر ہے۔ اس کھیل کا سارا لطف جستگلی اور تیزی میں ہے
اور یہ ضروری ہے کہ ان ذومعنی لفظوں کے ساتھ عام معنی کے علاوہ دوسرے معنی
تجلی والبتہ ہوں جو بڑے نادر اور عجیب ہوں۔ کالج کے طالب علموں کو میرا مشورہ
ہے کہ وہ اپنے پروفیسروں کے ناموں سے ایسی ترکیبیں بنا کر اور الٹ پھیر کر کے
نہایت اچھا وقت گزار سکتے ہیں۔

ان کھیلوں کے علاوہ ایسے کھیل بھی ہیں جن میں کچھ ساز و سامان چاہیے۔
مثلاً لکڑی کے خاص وضع کے ٹکڑے چاہئیں۔ ناول پھولوں کا خواب میں ایسے
ہی ایک کیل کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں ٹکڑوں کے تین الگ الگ سیٹ دیے
ٹکڑے چاہئے کاغذ کے ہوں) ہوتے ہیں۔ ان میں چھ آدمیوں کا یہ گروہ چھ مختلف
لام، مختلف جگہوں میں کر رہا ہے۔

بانکا	گھوڑے کی سواری کرتا ہے	بازار میں
پتوری	ناز پڑھتا ہے	اپنے کمرے میں
خاتون	کشیدہ کاری کرتی ہے	اپنے حریم میں
قصاب	لڑ رہا ہے	گلی کوچوں میں
طوائف	ناز و انداز دکھاتی ہے	تجربہ خانے میں
گداگر	سوتا ہے	قبرستان میں

ان ٹکڑوں کو ملا دیا جاتا ہے۔ پھر ہر شخص ان تینوں سیٹ میں سے ایک ایک لگتا

اٹھاتا ہے، ان کو ملا کر ایسے عجیب فقیر بننے ہیں کہ جی خوش ہو جائے۔ مثلاً آپ نے ہر سیٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا اٹھایا۔ ان کو ملا کر یہ فقرہ بنا کہ: پادری، خاتون کے سریم میں ناز و انداز دکھا رہا ہے۔ یا: گداگر تجھ خانے میں ناز پڑھتا ہے۔ یا: قصاب بازار میں کشتی کا دی کرتا ہے! — یا: خاتون قبرستان میں لڑ رہی ہے۔ ان فقروں کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ اخباروں کی نہایت عمدہ اور لرزہ خیز سرخیاں نہیں بن سکتیں؟ خیر ایک ایسی بات کو موضوع ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ وہ پانچ رکن کا ایک مصرعہ نظم کے لئے کہے۔ آخر میں نظم کا نام آئے۔ اور نظم کے آخر میں کتنا انتہات کا ایک سوزوں اور رعبتہ فقرہ آئے۔ تاکہ اس موضوع پر ساری بات مکمل ہو جائے!

اس کے پیش نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مے نوشی کی ایسی دعوتیں دودھ گینے مچلتی ہیں۔ شریک محفل کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ کھائے پیئے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفریح میں شامل ہو اور جی بھر کر شور مچائے۔ اسی لئے جو شخص نیم مخمور ہے وہی اچھا رہے گا۔ پینے والے کے لئے اصل چیز شراب نہیں، جذبہ ہے۔ اس کا لطف ہے۔ اور اگر آپ میں زیادہ پینے کی بساط نہ بھی ہو، پھر بھی آپ اس جذبے، اس مذاق کی بدولت لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے

”ایسے بھی لوگ ہیں جو ایک لفظ پڑھ نہیں سکتے۔ مگر ان میں شعری مزہ اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں ایک دعا یاد نہیں مگر مذہب کا صحیح شعور ان میں ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو تڑا لاریک قطرہ نہیں پیتے۔ لیکن شراب کی کیفیت کا مذاق انہیں ہے ایسے بھی لوگ ہیں کہ منظر کے ہارے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ان

میں مصوری کا سچا جوہر موجود ہے۔"

یہی وہ لوگ ہیں جو شاعروں اور ولیوں، مے کشوں اور مصوروں کے ہم نشین ہونے کے قابل ہیں۔

۷۔ غذا اور دوا

کھانے کی چیزوں میں اگر ذرا وسعت نظر سے سوچیں تو ہر اس چیز کو غذا ہی شامل کرنا ہوگا۔ جو ہماری پرورش کرے۔ یا ہمیں قوت پہنچانے — ہم سب حیوان ہیں اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہم وہی کچھ ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ گویا ہماری زندگی دیوتاؤں کی گود میں نہیں بلکہ ہاوریوں کے ہاتھوں میں پتی ہے۔ اسی لئے چینی شرفا اپنے باورچی کو دوست بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کے مزے اسی کے اختیار میں ہیں۔ وہ چاہے تو زندگی کا لطف اٹھانے دے یا نہ دے۔ چینی ماں باپ اور میرے خیال میں مرنی ماں باپ بھی بچے کی انا کو ہمیشہ بہت اچھی طرح رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی صحت کا سارا دار و مدار انا کے مزاج، اس کی خوشنودی اور اس کے رہن سہن پر ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ اپنے ہاوریوں کو نہایت اچھی طرح رکھیں۔ کیونکہ اگر ہمیں اپنی صحت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا ہمیں اپنے بچوں کی صحت کا ہوتا ہے۔ تو باورچی کے ساتھ شاہانہ سلوک رعا رکھنا ہوگا۔ ایک معقول آدمی اگر صبح کے وقت بستر پہ پڑے پڑے زندگی کی نعمتوں کا شمار کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ زندگی کے ان مزوں اور نعمتوں میں سب سے پہلے نمبر پر کھانا ہے۔ گویا عقلمند آدمی کی پہچان یہ ٹھہری کہ وہ گھر پر اچھا کھانا کھاتا ہے یا نہیں۔

جدید زمانے میں شہری زندگی کی رفتار اتنی برق و دش ہے کہ ہم لوگ کھانا پکانے اور کھانے پینے کے مسئلے کو کم سے کم وقت دیتے ہیں اور اس کے بارے میں کم سے کم خیال کرتے ہیں۔ آج کل زمانے میں بیوی، جو اعلیٰ پائے کی اخبار نویس بھی ہو اپنے شوہر کو ڈبہ کا شوبہ اور سیم کی پھلیاں ہی کھلا سکتی ہے۔ اور اس سے کوئی شکایت بھی نہیں کی جاتی مگر ذرا خیال کیجئے، یہ کیا زندگی ہے کہ ہم صرف کام کرنے کے لئے کھائیں اور اس لئے کام نہ کریں کہ ہمیں کھانا نصیب ہو سکے۔ یہ اپنے ساتھ بڑا سخت ظلم ہے اور دوسروں پر رحم و الطاف کرنا سیکھنے سے پہلے ہمیں اپنے اوپر رحم کرنا پڑے گا۔

— آج کل کئی خواتین معاشرتی اصلاح کے لئے شہر کے غلبظ اور پانچ حصوں میں دن رات کام کرتی پھرتی ہیں۔ لیکن یہی خواتین گیس کے چولھے پر دس منٹ میں کوئی سمولی سی چیز پکا کر کھا لیتی ہیں۔ کیونکہ انہیں معاشرتی اصلاح کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی! — میں پوچھتا ہوں یہ معاشرتی اصلاح کس کام کی ہے؟ اگر کنفیوشس کو ایسی کسی خاتون سے واسطہ پڑتا تو وہ اسے فوراً طلاق دے دیتا۔ کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو اچھا کھانا نہ پکانے کے قصور پر طلاق دیدی تھی۔

اب یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ کنفیوشس نے اپنی بی بی کو طلاق دی تھی۔ یا وہ بیچاری خود زندگی کے اس نہایت نازک طبع پرستار کے مطالبات سے تنگ آکر گھر سے نکل گئی تھی۔ کنفیوشس کی لطافت ذوق کا یہ حال تھا کہ چاول کبھی اتنے سفید نہیں پکائے جاسکتے جتنے سفید ہونے چاہئیں، نہ قیمت اتنا باریک ہو سکتا ہے جتنا ہونا چاہیے۔ — اگر گوشت مناسب چٹنی کے ساتھ اس کے سامنے نہ رکھا جاتا تو وہ کھانے سے انکار کر دیتا تھا۔ یا جب اس کی بوٹیاں باقاعدہ اور عمدہ نہ ہوں، یا جب اس کی خوشبو ٹھیک نہ ہو۔ "تو وہ کبھی نہیں کھاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی

بیوی کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر کرتی رہی۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو بازار بھیجا کہ کچھ شراب اور کچھ گوشت لے آئے تاکہ کھاپنی کر سب فارغ ہوں۔ مگر کنفیوشس نے صاف کہہ دیا کہ میں وہ شراب نہیں، اپنی سکتا جو گھر میں نہیں بنائی گئی، نہ وہ گوشت کھاؤں گا جو گھر میں نہیں پکایا گیا۔ اس پر اس دیواری کے پاس گھر سے چلے جانے کے سوا کیا چارہ رہ گیا تھا۔ یہ عرض کر دوں کہ کنفیوشس کی بیوی کی نفسیات کے بارے میں جو کچھ میں نے عرض کیا وہ میرا اندازہ ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر جو شرائط عائد کر رکھی تھیں وہ بے حد کڑی تھیں ہم کنفیوشس کی کتابیں اس کی شاہد ہیں۔

چنانچہ یہ قرار پایا کہ غذا وہ چیز ہے جو ہمارے جسم کی پرورش کرے، اس لئے چینی لوگ غذا اور دوا میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھ سکے۔ جو چیز جسم کے لئے اچھی ہو وہ دوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غذا بھی۔ جدید سائنس نے ابھی گزشتہ صدی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیماریوں کے علاج میں غذا کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے آج اچھے ہسپتالوں میں غذا کے ماہر ڈاکٹر ضرور رکھے جاتے ہیں۔ اگر یہ جدید ڈاکٹر ایک قدم اور آگے بڑھیں اور ان غذائی ماہروں کو چین میں ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجیں تو انہیں شیشے کی بوتلوں میں بند دواؤں کی بہت کم ضرورت ہوا کرے۔ چین کے ایک بہت قدیم ماہر طب (چھٹی صدی عیسوی) نے لکھا ہے ایک ہوشیار طبیب سب سے پہلے تو بیماری کے اسباب معلوم کرتا ہے اور جب اصل سبب معلوم ہو جائے تو اسے غذا کے ذریعہ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہے جب غذا لگام نہ کرے تو پھر وہ کوئی دوا تجویز کرتا ہے! چین میں غذا کے بارے میں سب سے پہلی کتاب سنگول دربار کے شاہی طبیب نے کوئی ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ لکھی

تھی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر غذا کو صحت کی بنا ٹھہراتی ہے۔ ابتدا ہی میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "جو شخص اپنی صحت کا خیال رکھتا ہے وہ اپنی پسندنا پسند میں اعتدال ملحوظ رکھتا ہے، فکر اور تشویش کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا، خواہشات پر ضبط کرتا ہے، جذبات بد قابو رکھتا ہے۔ قوت حیات کو سنبھالتا ہے، کم سخن ہوتا ہے، کامیابی اور ناکامی کا زیادہ خیال نہیں کرتا۔ غموں اور مشکلوں کی پریشانی نہیں کرتا۔ فضول امنگوں اور اربانوں کو دل میں جگہ نہیں دیتا۔ باصرہ اور سامعہ کو سکون دیتا ہے اور اپنے اندرونی نظام اور غذا کی باقاعدگی کا پابند ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے وقت کو مضمحل نہیں کرتا اور روح پر بوجھ نہیں ڈالتا وہ بیمار کیسے ہو سکتا ہے؟ لہذا جو شخص اپنی پرداخت کرتا چاہے اسے صرف اس وقت کھانا چاہیے جب اسے بھوک لگے۔ اسے کھانا چاہیے ٹھونسا نہیں چاہیے۔ پانی اس وقت پینا چاہیے جب اسے پیاس لگے۔ اور پیٹ کو پانی سے بھرنا نہیں چاہیے۔ ٹھوڑا کھانا چاہیے۔ اور کھانوں کے درمیان لمبا وقفہ ہونا چاہیے۔ کھانا بہت زیادہ نہ ہو، اور یہ ہمیشہ کا دستور ہو۔ اسے چاہیے کہ جب وہ کھانے کی میز سے اٹھے تو اس کی بھوک باقی ہو اور جب وہ بھوکا ہو تو کچھ سیر بھی ہو۔ پیٹ کی سیری پھیپھڑوں کو تکلیف دیتی ہے اور بھوک قوت حیات کی روحانی میں رخنہ انداز کرتی ہے۔"

یہ اقتباس، کھانوں کی کتاب کا ہے اور چینی زبان میں کھانے کے بارے

میں ہر کتاب اسی طرح ہوتی ہے کہ اس میں اور طب کی کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

شنگھائی میں ہونان روڈ پر چینی دواؤں کی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں کو دیکھ کر

کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دکان دوائیں زیادہ بیچتی ہیں یا کھانے کی چیزیں۔ ان دکانوں میں گوشت کی ران کے ساتھ آپ کو دارچینی رکھی ملے گی۔ شیر کی سوکھی نشوں اور

اور بلاؤ کے گردوں کے ساتھ چھوٹی سمندری مچھلیاں ہوں گی اور ہرن بچے کے
 سینگوں کے ساتھ پیکنگ کی کھجوریں رکھی ملیں گی۔ یہ ساری چیزیں انسانی جسم
 کیلئے مفید ہیں۔ اور سب کی سب انسانی جسم کی پرورش کرتی ہیں اسلئے کھلنے کی چیزوں
 اور دواؤں میں امتیاز ناممکن ہے۔ چین میں کوئی طاقت آور دوا دواؤں پر عمل نہیں
 ہوتی۔ بلکہ اس میں چوزے کا شوربا اور جڑی بوٹیوں کا عرق ہوتا ہے۔ اسکی سادھی
 درجہ چینی طب کا دستور عمل ہے۔ مغربی طب کی دواؤں تو گولیوں اور پیکر کی صورت
 میں ہوتی ہیں۔ مگر چینی طب کی دواؤں عام طور پر دم پخت شوربے کی صورت میں
 استعمال ہوتی ہیں۔ تمام چینی دواؤں کا تصور اور ان کی تیاری عام شوربے کی چینی کی
 طرح ہے۔ اور انکی تیاری میں بوباس ذائقے اور اجزا کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ایسے
 شوربے میں عام طور پر سات آٹھ سے لیکر بیس تک اجزا ہوتے ہیں۔ اور نسخے کا مقصد
 یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف بیماری کو ٹھیک کیا جائے۔ بلکہ جسم کو بھی تقویت پہنچائی جائے
 اس صورت میں چینی طب جدید طب سے بالکل متفق ہے۔ کہ جب ایک شخص کا جگر خراب
 ہو تو اس کا صرف جگر ہی خراب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا سارا جسم بیمار ہوتا ہے۔ آخر دوا کا
 اور مقصد اور منہتا کیا ہے۔ یہی ناکہ انسانی جسم کے پیچیدہ نظام مختلف اعضا طوتوں
 وغیرہ کو تقویت دیکر ہمارے جسم کو مضبوط بنائے۔ اور اس طرح انسانی جسم اپنی
 مدافعت کی قوت کی بنا پر بیماری سے نجات حاصل کر لے۔ چنانچہ چینی ڈاکٹر مریض کو درد
 وغیرہ کے لئے کبھی اسپرین کی ٹیکہ نہیں دیں گے۔ وہ ان کے لئے خاص قسم کی چائے
 کا بڑا پیالہ تجویز کریں گے جس میں چائے کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہوں گی۔ اور جس
 سے مریض کو کھل کر لپیڈ آ جائے گا۔ ممکن ہے جب بیماری کا علاج کرنے میں
 غذا کی اہمیت پوری طرح جان لی جائے گی تو مریض کا بخار اتارنے

کے لئے کونین کی ٹکیا نہ دی جائے بلکہ اسے سبز کچھوے اور کھمبھی کا نہایت عمدہ سوپ دیا جائے۔ جس میں سینکونے کی چھال کے کچھ ٹکڑے بھی اُبلے جائیں گے۔ اس صورت میں ہسپتالوں کے شعبہ غذا میں بہت توسیع کرنی پڑیگی بلکہ جو ہسپتال یعنی ڈوریم اور رستوران کا ایک ملا جلا روپ بن جائیں گے۔ گویا آخر میں ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ صحت اور بیماری دوا لگ لگ چیزیں نہیں۔ ایک ہی صورت حال کے دو رخ ہیں۔ اس دور میں انسان کھائے کھا لے گا اس لئے کہ بیماری سے بچا رہے۔ اور آج کی طرح بیماری کے علاج کے لئے دوائیں نہیں کھاتا پھرے گا۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر اہل مغرب خاص طور پر توجہ نہیں دیتے کیونکہ مغرب میں لوگ ڈاکٹر کے پاس اسی وقت جاتے ہیں جب وہ بیمار ہوتے ہیں۔ صحت کی حالت میں کبھی وہ ڈاکٹر کے ہاں نہیں جاتے۔ مگر اس دور کے آنے سے پہلے جب غذا بیماریوں کی روک تھام کرے گی ہمیں کم از کم اتنا ضرور کرنا چاہئے کہ جسم کی پرورش کر نیوالی دوا اور بیماری کا علاج کرنے والی دوائیں سارے امتیاز اٹھا دیں۔

میں نے عرض کیا کہ دوا اور غذا میں چینی لوگوں نے کوئی امتیاز نہیں کھا اور وہ اسکے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کی بدولت ان کی دوائیں دوائیں کم ہوتی ہیں۔ اور ان کی غذا میں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں زیادہ غذائیت آگئی ہے۔ چین کی نیم تاریخی عہد کی جو چیزیں ملی ہیں ان میں شکم پروری کے دیوتا کے مجسمے بھی ہیں۔ یہ بات اہم ہے۔ کیونکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس دیوتا رتنا واپہ کی روح ہمارے معاشرہ میں جاری و ساری ہے اسکی بدولت ہماری طب کی کتابیں کھانوں کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں اور ماکولات کے یہ ذکر طب کی کتابوں کے مشابہہ نظر آتے ہیں۔ اسی کی بدولت قدرتی سائنسوں میں جیاتی اور علم حیات

دونوں فروغ پا کر ترقی نہیں کر سکے۔ کیونکہ چینی سائنس داں سانپ یا بکھر گوت یا اونٹ کے کوہان کے ذائقوں کے بارے میں تو سوچتے رہے ہیں۔ ان کی ماہیت پر کبھی غور نہیں کر سکے۔ اسی لئے چین میں اگر کوئی علمی کتب جس موجود ہے تو وہ صرف کھانے کی چیزوں کے بارے میں ہے اور بس۔

وحشی قبیلوں میں دوا اور جادو دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے چین میں تاؤ فلسفے کے پیروکار زندگی کی نمونہ اور جادو دانی زندگی یا طویل زندگی کو اپنا اصل اصول قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ غذا اور دوا دونوں انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے اس سے پہلے منگول دربار کے شاہی طبیب کی لکھی ہوئی کھانوں کی کتاب کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب میں کسی باب موجود نہیں۔ جو بیماری کو دور رکھنے اور لمبی عمر پانے کے بارے میں ہیں۔ تاؤ فلسفے کے پیروکار نظریے کے نتیجے سے پرستار اور پیروکار ہیں۔ اس لئے ان کی عام کتابوں میں عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو پھل پھول اور سبزیوں کی کھانی چاہئیں۔ مادی زندگی سے نکلتی اور شعریت قربت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ ان لوگوں نے نیلوفر کے تازہ بیج کھانے کو اہل ذوق کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ مسرت قرار دیا ہے۔ یہ بیج ایسے ہونے چاہئیں کہ شبنم نے انہیں تازہ تازہ ہکا یا ہو۔ ان لوگوں کے اختیار میں ہو تو وہ زریلو فر کے بجائے شبنم ہی پی لیں اس زمرے میں دیودار کے بیج۔ اراروٹ کے بیج اور چائنا روٹ کے بیج بھی آتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے کھلنے سے عمر بڑھتی ہے۔ کیونکہ ان سے دل صاف اور عمر بڑھتی ہے۔ اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔

چین کا علم الادویہ ایسا ہے کہ مغربی تحقیق کے لئے اس میں بڑی گنجائش موجود ہے۔ مغربی طب کا حال تو یہ ہے کہ ابھی بیس ایک برس ادھر یہ دریافت ہوا

تھا کہ کلیجی کھانے سے خون پیدا ہوتا ہے۔ چین میں ہمیشہ سے یہ خیال موجود ہے اور کلیجی کو بڈھوں کے لئے بہت عمدہ ٹانک سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یہ شک ہے کہ مغربی ملکوں میں قصاب جب کسی جانور کو حلال کرتے ہیں تو وہ تمام ایسی چیزیں پھینک دیتے ہیں جو اپنے اندر بہت غذائیت رکھتی ہیں۔ ان میں گردے۔ اوجھ۔ آنتیں۔ خون۔ ہڈیوں کا گو دا اور مغز وغیرہ شامل ہیں۔ مغرب میں اب اس بات کا انکشاف ہو رہا ہے کہ ہڈیوں کے اندر ہی خون کے باریک ذرے پرورش پاتے ہیں۔ لہذا بکرے یا گائے یا کسی اور جانور کی ہڈیوں کے پھینک دینے اور ان کی بخنی تیار نہ کرنے سے بیشتر غذائیت ضائع ہوتی ہے۔

مجھے کسی مغربی کھانے اور کھانے کی چیزیں پسند ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ترنجبین ہے۔ اگر تاؤ فلسفے کے پیروؤں کو گریپ فروٹ (مکب) مل جاتا تو وہ اسے یقیناً آب حیات کا درجہ دیتے۔ کیونکہ یہ لوگ عجیب و غریب پھلوں کی نادر بو باس کو تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹماٹر کا رس ہے جسے بیسویں صدی کا بہت بڑا انکشاف قرار دینا پڑے گا۔ جس کا سہرا مغرب کے سر ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے چینی لوگ بھی مغرب کے لوگوں کی طرح ٹماٹر کو کھانے کے قابل چیز نہیں گردانتے تھے۔ اس کے اگلے نمبر پر کچی سلیری کا نمبر ہے کہ ہرے بانس کی کوئیلوں کی طرح یہ بھی خاص مزہ رکھتی ہے۔ ایسپرگس اگر ہرانا نہ ہو تو خوب ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا ہو گا کہ انگلستان میں گائے کا گوشت جس طرح تلا جاتا ہے اور بانی قسموں کے گوشت بھی جس طرح روٹ کئے جاتے ہیں وہ بھی مجھے ہی پسند ہیں۔ صل میں ہر چیز اگر اس سرزمین میں پکائی اور کھائی جائے۔ جہاں وہ ملتی ہے اور بنا۔ موٹھی کھائی جائے تو اچھی ہوتی ہے۔ امریکی گھروں میں نے جو کھانا کھایا، وہ مجھے ہمیشہ پسند آیا۔ لیکن

نیو یارک کے بہترین ہوٹلوں کے کھانے سے مجھے کوئی مزہ نہیں ملا۔ یہ قصور نیو یارک کے ان ہوٹلوں کا نہیں۔ کیونکہ خود چینی لیسٹورائوں میں بھی اچھا کھانا نہیں ملتا۔ ہاں اگر آپ کھانے کا پہلے سے نوٹس دیدیں اور کھانا خاص طور پر تیار کریں۔ تو دو مری بات ہے۔

اس کے باوجود پورپی اور امریکی پکوان میں بڑی زبردست کیاں موجود ہیں مغربی پکوان بیکری کی چیزوں سے پکوانوں اور کھانے کے بعد کی مٹھی چیزوں میں بہت ترقی یافتہ تھی مگر مغربی پکوان بے حد محدود۔ بڑا بے مزہ اور جدت سے کھل عاری ہے۔ آپ کسی ہوٹل یا بورڈنگ ہاؤس یا کسی جہاز پر مینے مغربی کھانا کھائے ہر بار ہر پھر کر وہی چوزے کا گوشت گائے کے سینے کے ٹکڑے۔ مٹن چاپ وغیرہ ملے گا۔ اور ان کو کھاتے کھاتے آپ پزار ہو جائیں گے۔ مغربی پکوان کا سب سے پس ماندہ حصہ سبز یوں کا پکانا ہے۔ اول تو مغرب میں سبز یوں کی قسمیں ہی کم ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان سبز یوں کو پانی میں اُبالا جاتا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ ان کو اتنا پکلا یا جاتا ہے کہ یہ اپنا رنگ روپ کھو بیٹتی ہیں اور بالکل حلو ابن جاتی ہیں خصوصاً پالک قسم کی سبز یوں کے ساتھ تو بڑی زیادتی کی جاتی ہے۔ حالانکہ اسے روغن اور نمک کے ساتھ فرائی میں بھونا جائے اور خستہ رکھا جائے تو یہ بچہ لایڈ ہوتی ہے۔ یہی حال سلاد کا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان کو فرائی میں زیادہ دیر نہیں رکھنا چاہئے۔ ورنہ ان کی خشکی جاتی رہے گی۔ اور یہ بالکل ساگ بن جائیں گی۔ مغرب میں چوزے کی کلمیجی کو ایک نازیب سے سمجھا جاتا ہے۔ یہی حال بکرے کے گردوں کے کبابوں کا ہے۔ مگر ان کے علاوہ ان بیٹے اور بہت کھانے ہیں جنکے بارے میں مغرب والوں نے ابھی کوئی تجربہ نہیں کیا مغرب کے کھانوں میں لگانے

اور تنوع کی جو کمی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ مثلاً چین میں مرغ کا پوٹا (سنگدانہ) اور اس کے دل و جگر کو بھون کر کباب کرتے ہیں۔ اور نمک فرچ چھڑک کر کھاتے ہیں یہ بالکل غلط چیز ہے۔ سیم ٹھیلی کا سر اور اس کے گلپھڑوں کے آس پاس کے تازک گوشت کو خاص طریقے سے تیار کر کے کھایا جاتا ہے۔ یہ دسترخوان پر بڑے تکلف اور خاصے کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اسی قسم کے اور کھانے بھی ہیں جن میں گائے کے گوشت کی دم پخت یعنی بھی ہے اور کھپر گھونگا ٹھیلی ہے جو چین اور فرانس میں بڑی خاص چیز سمجھی جاتی ہے۔

شوربے کے معالہ میں جو اتنا کم تنوع ملتا ہے تو اس کی دو وجہیں ہیں پہلی تو یہ کہ سبزیوں کو گوشت کے ساتھ ملا کر پکانے کے سلسلے میں کم تجربے کئے گئے ہیں خشک جھینگا ٹھیلی، کھمبی، ہرے بانس کی کونپلیں، کرخ اور گوشت وغیرہ کو اگر نت نئی ترکیب اور ترتیب سے آمیز کیا جائے تو انہیں پانچ چھ چیزوں سے بہت سی قسموں کا شوربا تیار ہو سکتا ہے۔ ہری کرخ سے مغرب میں شوربا تیار تو ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے اگر مختلف طریقوں سے بنایا جائے اور اس میں سوکھی ہوئی جھینگا ٹھیلی کا چھینٹا دیا جائے تو یہ گریما کے لئے نہایت عمدہ شوربا بنتا ہے۔ تنوع نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شوربا بنانے کے سلسلہ میں سمندری چیزوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں مثلاً صدنی ٹھیلی کو صرف فراہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے اگر سکھا لیا جائے تو یہ شوربہ بنانے کے لئے نہایت عمدہ جزو ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر مغرب میں تو یہ حال ہے کہ جھینگا ٹھیلی پتی ہو تو اس میں جھینگوں کا نام نہیں ہوتا۔ سبز کچھوے کا سوپ ہو تو اس میں اس کے گوشت کا نشان نہیں ہوتا۔ حالانکہ اسے اس طرح پکانا چاہیے کہ کھانے میں لب جڑ جڑ جائیں۔ سمندری غذا کو پکاتے ہوئے ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

کہ یہ روغن دار نہ ہونے پائے۔

چین کے لوگوں میں کھانے کا جو ستھرا مذاق ہے۔ اس کی مثال کے طور پر میں

لی لی دنگ کے مضمون "کیکڑے" میں سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ یہ مضمون اس کی کتاب "چینی کے فن" میں غذا کے حصے میں ہے۔ وہ لکھتا ہے!

، کھانے پینے کی چیزوں میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی باس اور

سگندھ، میں پوری سمجھ اور زور تخیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر

کیکڑوں کا معاملہ اور ہے مجھے کیکڑے پسند ہیں۔ میرے کام و ذہن ان کی لذت

سے مزے اٹھاتے ہیں۔ میں انہیں زیادہ دیر تک کھائے بغیر رہ بھی نہیں

سکتا۔ اور نہ انہیں بھول سکتا ہوں۔ مگر میرے لئے لفظوں میں یہ

بیان کرنا ناممکن ہے کہ مجھے کیکڑے کیوں پسند ہیں۔ اصل یہ ہے کہ

کھانے کے معاملہ میں کیکڑوں کا سالن میری کمزوری بن گیا ہے اپنی جگہ یہ بھی

قدرت کا عجیب کرشمہ ہے۔ ہر سال کیکڑوں کا موسم آتا ہے اور میں انکی خریداری

کیلئے کچھ رقم مخصوص کر دیتا ہوں۔ میرے گھر والے کہتے ہیں کہ کیکڑے میری

زندگی ہیں۔ اس لئے اس رقم کو میں اپنی "بہائے زندگی" قرار دیتا ہوں

جس دن سے کیکڑے منڈی میں آنے شروع ہوتے ہیں۔ اس دن سے

ان کا موسم ختم ہونے تک میں ہر روز انہیں کھاتا ہوں۔ جو دوست

میری اس کمزوری سے واقف ہیں وہ اسی موسم میں میری دعوتیں کرتے

ہیں۔ اسی لئے میں اکتوبر اور نومبر کو، "کیکڑوں کی خزاں" کہتا ہوں۔

میرے پاس ایک خادمہ تھی جو بڑا جی نکا کر کیکڑے پکاتی تھی اسے میں نے

، کیکڑوں کی خادمہ کا لقب دے رکھا تھا۔ اب وہ جا چکی ہے۔ ہائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کیکڑوں کے آغاز و انجام سے
والبتہ ہو چکی ہے۔

اپنے مضمون کے آخر میں آئی نے بتایا ہے کہ اس کے لئے کیکڑوں کی پسندیدگی
کی وجہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیکڑے غذا کے اعتبار سے تین نہایت عمدہ خصوصیات
کے مالک ہیں۔ یعنی ان کا رنگ، ان کی ہلک اور لذت تینوں لاجواب ہیں۔ کیکڑوں
کے بارے میں عام چینی لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔

میرے نزدیک غذا کا فلسفہ محض تین باتوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کھانے کی چیز
وہی عمدہ ہے جو تازہ ہو، جس میں لذت اور ہلک ہو اور جو ٹھیک طریقہ پر پکائی جائے
دنیا کا بہترین بادرچی اچھا کھانا اسی صورت میں پکا سکتا ہے کہ اسے پکانے کیلئے تازہ چیز
ملے۔ اس لئے اچھے بادرچیوں کا قول ہے کہ پکانے کے ہنر میں آدھا حصہ اچھی چیز
خریدنے کا ہے۔ سترھویں صدی میں مشہور چینی شاعر یو آن ست سائی اپنی نفاست
مزاج اور ذوق کے سلسلے میں سد مانا جاتا ہے۔ وہ اپنے کاروبار کی تعریف میں قصیدے
لکھتا ہے اور یہیں بتاتا ہے کہ اگر چیز کا ٹھیک موسم نہ ہوتا تو اس کار کا بار اسے پکانے
سے یکسر انکار کر دیتا۔ یہ رکا بھار کچھ بد مزاج بھی تھا۔ مگر وہ محض اس لئے شاعر
یو آن کے ساتھ عمر بھر بناہ کر سکا کہ مالک کو ذائقے اور کھانے کی لذت کا صحیح ذوق
اور اصلی قدر تھی۔ آج بھی چین کے شہر زے جو آن میں ایک بہت ہی بوڑھا بادرچی
موجود ہے۔ اگر اس سے کھانا بچوانا ہو تو ایک ہفتہ پہلے باقاعدہ طور پر اس سے
درخواست کیجئے۔ وہ کھانے کا سامان ایک ہفتے میں نہایت سخت جانچ پر تال
کے بعد جمع کرے گا۔ اور اپنی مرضی کی چیزیں پکا کر کھلائے گا۔

خیر، یہ تو خاص لوگوں کا معاملہ ہے۔ عام لوگ اتنے مہنگے رکا بھار ادائیگی سے

کے باورچی نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لئے یہ اصول کافی ہے کہ ہر چیز اپنے موسم ہی میں اچھی ہوتی ہے۔ گویا کھانے پینے کی صحیح لذت اٹھانے کے لئے تہذیب کے بجائے فطرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ جو لوگ اپنے لئے سبزیاں خود اگاتے ہیں یا جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں انہیں کھانے پینے کے لئے بہترین اور خالص چیزیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اچھے باورچی ہوں یا نہ ہوں۔ اسی وجہ سے کھانے کی کسی چیز پر حکم لگانے سے پہلے اس چیز کو اس ملک یا اس خطے میں جا کر کھانا چاہیے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن غالباً یہ مغرب میں ممکن نہیں۔ مغرب میں عام عورتیں تازہ چیزیں خریدنا جانتی ہی نہیں۔ شوہر بھی ایسے ہیں کہ کوئلہ سٹوریج کے ذریعہ سے محفوظ کی ہوئی سبزیوں اور کھانے کی دوسری چیزوں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے ذائقے اور کھانے کی لذت اور کھانے کی نفاستوں کا ذکر بالکل بیکار ہے۔

بچے ہوئے کھانے کی صحیح صورت کے بارے میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ پکا ہوا کھانا نرم ہونا چاہیے۔ اس میں بچک اور کراہن اور خشکی بھی ہونی چاہیے۔ یہ ساری باتیں اندازے سے تعلق رکھتی ہیں کہ کس چیز کو کتنی آہنچ پر کتنی دیر پکانا چاہیے۔ چینی ریسٹورانوں میں بعض کھانے کی چیزیں ایسی ملتی ہیں جو گھر میں پک ہی نہیں سکتیں۔ کیونکہ ان ریسٹورانوں میں نہایت عمدہ بند چولھے اور تنور ہوتے ہیں۔ رہا کھانے کا مزہ اور اسکی بو اس تو عام طور پر پکائی جانے والی چیزوں کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ اپنے پانی میں بکھی چاہئیں۔ اور ان میں زائد نمک یا اور کوئی چیز نہ ڈالی جائے۔ اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ دوسری کے ساتھ ملا کر ان کا ذائقہ اور لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ قدرت نے ایسی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں جن کا آپس میں میل ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کھانے کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا کام صرف یہ ہے کہ

دوسری چیز کے ساتھ ملا کر پکائی جائیں۔ تاکہ یہ اسے اپنا ذائقہ اور اپنی مہک بخین
اسی طرح کھانے کی بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں (اور چینی ان کے برے نشانات ہیں) جن کا
ان ذائقہ اور مہک کچھ نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ دوسری چیزوں کے ذائقے اور مہک کی محتاج
ہوتی ہیں۔

چین میں بہت پر تلکات کھانوں کی تین خصوصیات قرار دی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ
یہ کھانے بے رنگ ہوں۔ دوسری یہ کہ ان میں کوئی یونہ ہو۔ اور تیسری یہ کہ ان میں کوئی
مہک نہ ہو۔ اس شے میں شاکرک پھلی کے پر۔ پرندوں کے گھونسلے اور سلورنگس، قسم
کی چیزیں آتی ہیں۔ انھیں بے انتہا احتیاط سے ایسے سوپ میں پکایا جاتا ہے کہ ان پر بید
زیادہ لاگت آتی ہے۔ ان میں کوئی بو۔ یا اس کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا
مرہ بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔

۸۔ مغرب کے کچھ عجیب دستور

مشرقی اور مغربی تہذیب میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مغرب کے لوگ جب کسی
دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ سے ملاتے ہیں۔ مشرقی لوگ چینی
اور ہندو خصوصاً جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرا
ہاتھ ملاتے ہیں۔ مغرب میں جتنے فضول رواج ہیں۔ ان سب میں زیادہ فضول رسم یہ
مصالحہ کرنے کی ہے۔ میں مغربی آرٹ۔ مغربی ادب مغربی عورتوں کی ایسی لٹری
جوابوں پیرس کی خوشبوؤں اور برطانیہ کے جنگی جہازوں تک کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہوتا
مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی کے متوالے مغربی لوگوں نے ایک اور سے ہاتھ

ملانے کی دھیانہ رسم اب تک چھوڑی کیوں نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مغرب میں بھی بہت سے لوگ اس رسم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے وہ سچا رہے ہیٹ پہننے اور کالر کا پھندا گلے میں ڈالنے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ مگر ان کی سنتا کون ہے۔ ان کے سلسلے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ فضول ہی رانی کا پرست اور سوئی کا بھالابنار ہے ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خواہ مخواہ وقت کھورہے ہیں۔ مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں ہمیشہ سے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے دل چسپی رہی ہے۔ اور چینی ہونے کی حیثیت سے میں مغربی لوگوں کی بہ نسبت اس مغربی رسم کے خلاف زیادہ شدت سے احتجاج کرتا ہوں۔ کیونکہ میں تو چین کے قدیم رواج کے مطابق لوگوں سے ملتے وقت یا ان سے رخصت ہوتے وقت ان کے یکلے اپنے ہاتھ جوڑ کر ہلانا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

شاید یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مصافحہ کرنا یورپ کے دھیانہ دور کی یاد کا ہے۔ جو اب تک قائم ہے۔ اسی طرح کسی کو ہیٹ اتار کر سلام کرنا بھی دورِ جمالت ہی کی یادگار ہے۔ جو ہم آج تک پہنچے ہے۔ اس میں مصافحہ کرنے اور ہیٹ اتار کر سلام کرنے کی ابتداء یوں ہوئی تھی کہ ازمینہ وسطیٰ میں یورپ میں بڑے بڑے جاگیردار اور امرا ہوتے تھے۔ ان میں اکثر کام محض غارتگری اور مار دھاڑ تھا۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ جب دوسرے پر یہ ظاہر کرنا ہو کہ ہماری نیت لڑائی کی نہیں۔ بلکہ ملاقات درستانہ ہو رہی ہے تو وہ اپنا خود اتار کر دوسرے کو اپنا چہرہ دکھا دیتے تھے یا اپنا سر اپنی دستاں دینے ہاتھ سے اتار دیتے تھے۔ آج کل نہ کوئی خود پہنتا ہے نہ آہنی دستاں پہننے کی کوئی تمکا ہے۔ لہذا ان دونوں کے اتارنے چڑھانے کی حرکتوں کا اعادہ آج کل کئے جانے میں کتنا فضول ہے۔ مگر دھیانہ رسموں کے نشان صدیوں کے مشا

سے ملتے نہیں۔ قائم رہتے ہیں۔

حفظانِ صحت کے اصول کی رو سے کبھی مجھے ہاتھ ملانے کے اصول پر غور ہے اس کے علاوہ ہاتھ ملانا انسانی جسم کے ملاپ کی ایک ایسی قسم ہے جس میں بہت سے درجے ہیں میں کہتا ہوں کوئی ذہین طالب علم مصافحہ کرنے کی میعاد اور ہاتھ ملانے کی حرکات کا مطالعہ کے عنوان سے ایک بڑا عمدہ مقالہ لکھ سکتا ہے۔ اور اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پیش کر سکتا ہے۔ اس میں وہ یہ بتائے کہ مصافحہ کرنے میں کتنا ہاتھ دبایا جاتا ہے۔ اسکی میعاد کیا ہوتی ہے۔ مصافحہ کی حرارت کیا ہے۔ جذباتی ردعمل کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مصافحے سے مصافحہ کرنے والوں کے قد و قامت کے اندازے۔ کھال کے رنگ۔ پیتے۔ سماجی منصب وغیرہ پر بھی بحث کر سکتا ہے۔ اگر اس مقالے میں کچھ چارٹ وغیرہ بھی بنا دے۔ اور کچھ اعداد و شمار بھی شامل کر دے تو مجھے یقینی ہے اُسے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مقالے کو ذرا پیچیدہ انداز میں لکھے۔ اسے طویل اور سخت غیر دلچسپ بنا دے۔ تاکہ اسے عالمانہ سمجھا جائے۔

خیر مصافحے کے بارے میں حفظانِ صحت والے اعتراض کو لیجئے۔ شنگھائی میں جتنے غیر ملکی بستے ہیں ان کا قول ہے کہ چین کے تلبے کے سکے جراثیم کے ذخیرے ہیں۔ وہ ان سکوں کو چھوتے تک نہیں لیکن یہی لوگ ہرزید۔ عمر۔ بکرے ہاتھ ملانے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتے۔ یہ رویہ بڑا نامعقول ہے۔ کیونکہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ جس شخص کے ساتھ آپ نے ہاتھ ملایا ہے ممکن ہے اس نے دہی تانبے کے سکے چھور کھے ہوں جنہیں آپ زہر سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی ایک بدتر مثال سنئے کسی بار آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک شخص جو بظاہر دق کا لہین نظر آتا ہے وہ کہنتے

ہوئے نہ کے آگے ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ کیونکہ اسے حفظانِ صحت کے اصول کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ مگر اگلے لمحے میں ہی شخص بڑی گرم جوشی سے آپ کے ساتھ وہی ہاتھ ملاتا ہے۔

اپنی لئے تو میں عرض کروں گا کہ چین کے رسم و رواج بہت زیادہ سائنٹفک ہیں۔ کیونکہ ہمارے یہاں ملاقات کے وقت ہر شخص اپنے ہاتھ سے ہاتھ ملاتا ہے۔ دوسرے سے مصافحہ نہیں کرتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس رسم کی ابتدا کیسے ہوئی۔ لیکن اس میں طبی اعتبار سے اور حفظانِ صحت کے لحاظ سے جو فوائد ہیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حفظانِ صحت کے لحاظ سے مصافحہ کرنے پر ان اعتراضات کے علاوہ بھی اس پر جا لیا تھی اور رد ماتی تو ع کے اعتراض بھی ہیں۔ آپ جب کسی سے ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو چھر آپ کا ہاتھ دوسرے کے رحم و کرم پر ہے۔ کہ وہ اسے جتنا چاہے دبائے۔ اور جب تک چاہے اسے گرفت میں رکھے۔ واضح رہے کہ ہاتھ جسم کے عمدہ ترین اور حساس ترین اعضاء میں سے ہے۔ اسلئے ہاتھوں پر ہر قسم اور ہر نوع کا رباؤ ڈالنا ممکن ہے۔ مثلاً مصافحہ کی ایک قسم ہے جسے میں 'وائی'۔ ایم۔ سی۔ سے قسم کہتا ہوں۔ اس میں دوسرا شخص ایک ہاتھ سے آپ کا شانہ تھپکتا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے اتنے زور کا مصافحہ کرتا ہے کہ آپ کے جسم کا بند بند اور جوڑ جوڑ ٹوٹنے والا ہو جائے۔ اگر وائی ایم۔ سی۔ اسے سکرٹری بیس بال کا کھلاڑی بھی ہو تو سبحان اللہ۔ پھر تو اس سے مصافحہ کرنے والے غریب کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ مصافحہ کب شروع ہوا۔ اور میرے جوڑ کب سے چٹخنے شروع ہو گئے۔ نہ ہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس حال میں چیخ مار کر رو پڑیں یا ہنسیں چاہئے ان کا مصافحہ زبان حال سے کہتا ہے۔ دیکھو اس وقت تم میرے قبضہ

قدرت میں ہو۔ ہذا اگر تم وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے اگلے جلسے کا ٹکٹ سے ہاتھوں
 خرید لو۔ یا فلاں فلاں کتاب لے لو میں تمہارا ہاتھ چھوڑوں گا۔ ایسی صورت میں
 میں تو فوراً اپنی جیب سے پیسے نکال لیا کرتا ہوں۔

خیر اس سے نیچے آئیں تو مختلف قسم کے مصانچوں کے سلسلہ میں ہاتھ کا مختلف
 دباؤ ملتا ہے۔ ایک تڑوہ بے پردائی کا مصانچہ ہے جس کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا
 پھر ایک ڈرتا جھکتا معذرت خواہ قسم کا مصانچہ ہوتا ہے۔ جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ
 ہاتھ ملانے والا آپ سے ڈرتا ہے۔ ان کے علاوہ ادنیٰ سوسائٹی میں پھرنے والی
 خواتین کا ہاتھ کا مصانچہ ہے جو بڑی شکل سے اپنی انگلیوں کے پورے آپ کی ٹھٹی میں
 دیتی ہیں۔ اور ان کے اندازہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہاتھ ملانے کے بجائے ان کی
 انگلیوں کے رنگین ناخن ہی ملاحظہ کریں تو مناسب ہے۔ گویا ہاتھ ملانے میں ہر قسم کے
 انسانی تعلقات کا عکس مل سکتا ہے۔ بعض ناول نویس کہتے ہیں کہ وہ کسی قسم کے مصانچے
 کے طریقے سے اسکے کردار کا پورا اہتمام بنا سکتے ہیں۔ کبیر نکہ بعض ہاتھوں کا مصانچہ
 زبردستی کا انداز رکھتا ہے بعض ہاتھ کچھ ڈرے ڈرے سہمے سہمے معلوم ہوتے ہیں بعض
 ہاتھ بددیانت ہوتے ہیں۔ اور بعض ہاتھ کچھ لٹھلے سے۔ گیلے سے ہوتے ہیں جن سے یکایک
 نفرت پیدا ہوتی ہے۔ مگر میری دلی خواہش یہ ہے کہ ان مصانچوں۔ ہاتھوں کے دیباچہ
 اس دیباچے ان کے جذبات کی گرمی یا ان کی سردی کی ہتھیاری کا اندازہ کرنے کی مجھے
 رحمت نہ اٹھانی پڑے اور نہ ان لوگوں کے کردار کے اندازے کرنے کی مجھے رحمت اٹھانی
 پڑے۔ مصلحتاً کہیں زیادہ نامعقول بات نہ بیٹا اتار کر سلام کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں
 مجلسی آداب کے بڑے فضول قاعدوں سے واسطہ پڑتا ہے مثلاً گرج میں نماز
 کے دوران میں خواتین کو اپنا ہیٹ نہیں اتارنا چاہئے۔ یا تیسرے پہر چاہے کے وقت

کمرے کے اندر بھی عورتوں کو ہیٹ سر پر رکھے رہنا چاہئے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ
 فضول رسم سینٹ پال کے اس حکم کی احمقانہ پیروی کی بدولت چل نکلی ہے کہ
 عورتوں کو گرجوں میں ننگے سر نہیں بٹھھٹھا چاہئے۔ اور مردوں کو اپنا سر ننگا رکھنا چاہئے
 اس حکم کی بنیاد ہی ایشیا کے اس فلسفہ پر ہے کہ عورت سر کا درجہ برابر نہیں۔
 حالانکہ مغرب ایک عرصے سے اس فلسفہ اور اصول کو جھٹلا چکا ہے۔ مردوں کیلئے یہ بھی
 ضروری ہے کہ اگر لفٹ میں خواتین بھی ہوں تو سر سے ٹوپی اتار لیں۔ اب بتائیے
 کہ اس بے معنی رسم کا کوئی جواز ہو سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ لفٹ بھی برآمدے کا ایسا
 حصہ ہے جو اونچے آجاسکتا ہے یعنی ہر لحاظ سے گزرگاہ ہے اب اگر برآمدے میں خواتین کی موجودگی
 میں ٹوپی اتارنا مرد کے لئے فرض نہیں تو پھر لفٹ میں کیوں پابندی ہے۔ دوسری بات یہ ہے
 کہ لفٹ آخر سواری کا ایک ذریعہ ہے جیسے موٹر کار ہے۔ موٹر کار میں آپ اگر خواتین کی موجودگی
 میں ٹوپی پہنتے رہتے ہیں تو پھر لفٹ میں ٹوپی سر پر رکھے رہنا کیوں ممنوع ہے؟

الغرض یہ ہماری دنیا بھی عجیب ہے۔ مگر اس پر مجھے تعجب نہیں ہوتا میں اپنے
 اردگرد انسان کی حماقتوں سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ انہیں آج کل کے بین الاقوامی
 تعلقات جیسی احمقانہ چیز بھی ہے اور موجودہ طرز تعلیم ایسے نامعقول نظام بھی۔ انسان
 آنا نہیں اسہی کہ اس نے ریڈیو اور دائر لیس ٹیلی فون اور ایٹم ایجاد کر لئے ہیں۔
 مگر انسان میں اتنی عقل نہیں کہ لوہائیوں کی روک تھام کر سکے۔ اور نہ یہ عقل انسان کو بھی
 آئے گی اسی لئے معمولی چیزوں کے سلسلے میں انسان کی حماقتوں کو دیکھتا ہوں تو اور ان
 سے لطف اٹھاتا ہوں۔ اور بس۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۹۔ مغربی لباس

مغربی لباس آج کل ترکی۔ مصر۔ جاپان اور چین کے علاوہ ہندوستان

تک میں بے حرج مقبول لباس ہے۔ ساری دنیا کے سفارت خانوں کا رسمی اور سرکاری
لباس بھی یہی ہے پھر بھی میں اپنے چینی لباس میں لگن ہوں۔ میرے کئی ایک اچھے دوستوں
نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں غیر ملکی لباس کی بجائے چینی لباس کیوں پہنتا ہوں۔ حیرت
اس بات پر ہے کہ یہ لوگ میرے مزاج سے اتنے ناواقف ہیں لیکن میرے دوست
کہلاتے ہیں۔ کل کو یہ ستم ظریف مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ میں دو ڈانگولوں پر کھڑا کیوں ہوتا
ہوں۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ دو ڈانگولوں پر چلنے اور اپنا قومی لباس پہننے میں گہرا
تعلق ہے۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ انسانی لباس پہننے کیلئے
وجہ بھی بتائی جائے۔ جو شخص گھر کے اندر یا باہر یا جامہ سلیپر پہنے بھرتا ہوا ہے یہ
بھی بتانا پڑے گا۔ کہ وہ کیوں کلا گھونٹنے والے کالروں اور چپت دھسکٹوں پہنی بنیاد
موزوں وغیرہ کا زندانی نہیں۔ مغربی لباس کہیں محض اسلئے معزز تو نہیں کہ اسے پہننے
والی گوری قوموں کے پاس اعلیٰ درجہ کے جنگی جہاز اور مشینیں ہیں۔ اہل یہ ہے کہ مغربی
لباس کی برتری اسی کمزور بنیاد پر قائم ہے۔ ورنہ اس لباس کا جواز نہ تو جالیاتی
محاط سے کوئی ہے۔ اور نہ اسے اخلاقی اصولوں اور حفظانِ صحت کے اصولوں
یا کفایت کے اصولوں کی روشنی میں اچھا لباس کہا جاسکتا ہے۔ اس کی برتری کوئی
سیاسی برتری ہے اور بس۔

آپ پوچھ سکتے ہیں میرا یہ رویہ مخلصانہ ہے۔ یا محض میں رہا ہوں۔ میرا
خیال ہے اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ میرے اس رویہ کی حمایت وہ تمام انہیں
کریں گے جو میرے ہم عصر ہیں۔ اور اصابت رائے رکھتے ہیں جن میں چینی شرفا کا لباس
چینی لباس ہے۔ اسکے علاوہ تمام اہل علم و فکر اور وہ لوگ جو کسی حیثیت کے
مالک ہیں۔ جن میں ہی لباس پہنتے ہیں۔ ان لوگوں نے یا تو کبھی مغربی لباس پہنا

ہی نہیں یا اگر بہنا ہے تو صورت اتنی مدت کہ وہ سیاسی - مالی یا معاشی لحاظ سے
 کچھ بن جائیں یہ مقام حاصل کرنے کے بعد وہ بڑی تیزی سے اپنے قومی لباس کی
 طرف پلٹ آئے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر پہنچ کر انہیں اپنے اوپر اعتماد
 پیدا ہو چکنا ہے۔ اپنے رتبے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور اب اپنی غلط انگریزی یا ادنیٰ
 صلاحیت کو چھپانے کے لئے انہیں غیر ملکی لباس کی آرڈر کی حاجت نہیں رہتی۔ تنگنائی
 میں اعزاز کرنے والے جو گروہ مشہور ہیں وہ کسی غیر ملکی لباس میں ملبوس جینی کو کبھی
 اعزاز کے نہیں لے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسامیاں اس قابل نہیں ہوتیں
 کہ انکی آزادی کی قیمت کے طور پر اعزاز کرنے والے ڈاکور دیر یہ کہا سکیں۔ آج چین
 میں غیر ملکی لباس میں کون نظر آتے ہیں۔ عام طور پر کالج کے طلبا کوئی سو روپے
 پانے والے کلرک لوگ۔ کچھ سیاسی قسم کے خواہ مخواہ لوگ جو ہر وقت کسی کسی لوگر
 کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی پارٹیوں کے ورکر لوگ نکھڑو اور نیکے لوگ اور
 کچھ بے دماغ بس غیر ملکی لباس انہی تک محدود ہے۔ انکے علاوہ ہنری پو پونی
 صاحب ہیں جو چین کے تخت کے حصار بنے پھرتے ہیں۔ اور ان کے ذوق اور عقل
 کی مثال یہ ہے کہ جناب نے غیر ملکی نام۔ غیر ملکی لباس اور ایک کالا چشمہ تک اختیار
 کر رکھا ہے۔ یہ حال اور یہ جلیہ سی چین کے تخت پر بیٹھنے کے تمام امکانات ختم کرنے
 کے لئے کافی ہے۔ چاہے ان کے پیچھے دنیا جہاں کی طاقتیں ہوں۔ آپ چینیوں
 کو کسی بھی جھوٹ سے دھوکا دے سکتے ہیں۔ مگر انہیں اس بات پر کبھی راضی نہیں
 کر سکتے کہ غیر ملکی نام اور لباس والا کوئی شخص ان کا حکمراں بنی ہو سکتا ہے۔
 چینی لباس اور مغربی لباس کی حکمت میں بڑا فرق ہے۔ مغربی لباس انسانی
 جسم عیاں اور ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ اور چینی لباس انسانی جسم کو چھپانے کے لئے

مگر انسانی جسم چونکہ بنیادی طور پر بندر کے جسم کی طرح ہے۔ لہذا یہ جتنا کم عیاں ہوتا ہے
 ہی اچھا ہے۔ مغربی لباس صرف اسی دنیا میں قابل برداشت ہے جس کی آنکھیں
 حسن کے لئے اندھی ہو چکی ہیں۔ یہ بات بالکل عام ہو چکی ہے کہ جو بصورتاً اور
 متناسب انسانی جسم بہت نمایاں ہے کسی کو ہمیں شک ہو تو سمندر کے ساحل پر جا کر
 بنانے والوں کے جسم کو دیکھیے۔ لیکن مغربی لباس اس طرز سے بنایا جاتا ہے کہ ہر شخص
 دیکھتے ہی بتا دے کہ آپ کی کمر ۲۲- انچ ہے یا ۳۸- انچ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کی کمر
 ۳۷- انچ ہے تو آپ اس کا اشتہار کیوں دیتے پھر یہ؟ یا اگر آپ کی کمر حقیقی ہوئی چلے اس سے
 موٹی ہے۔ تو بھی دنیا کو یہ کیوں معلوم ہو؟ یہ آپ کا بالکل ذاتی معاملہ کیوں
 نہیں ہے؟

اسی بنا پر میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ میں اور چالیس برس کی عمر کے درمیان کی مناسب
 جسم والی عورتوں کے لئے مغربی لباس موزوں ہے۔ یہ لباس ان بچوں کیلئے بھی اچھا
 ہے جن کے جسم ہماری غیر مہذب زندگی کے تابع نہ ہوئے ہوں۔
 مگر مغربی لباس کا یہ مطالبہ کہ ہر مرد ہر عورت دنیا کی آنکھوں کے سامنے اپنے
 جسم کی ساخت اور اس کے خطوط عیاں کر دے بالکل غیر مناسب ہے۔ ایک لڑکا جو غائب
 شام کے مغربی لباس میں رونق محفل نظر آتی ہے۔ وہ اس لباس میں اتنی اچھی لگتی ہے
 کہ شرفی لباس تیار کرنے والوں کے خواب و خیال میں کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی۔ مگر
 ذرا چالیس برس کی ایک عام عورت کا تصور کیجئے۔ جو ضرورت سے زیادہ کھاتی
 ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ سوتی ہے۔ یہ بیچاری شام کے لباس میں اگر کسی تفریح میں
 نظر آئے تو اتنی ہدی لگتی ہے کہ آہ ہی بھلی۔ یہ کمر یہ نظارہ منسوب کی حاصل کیا دے۔
 اس کے برعکس چینی لباس ایسی عورتوں کے لئے بڑا عیب پوش اور کرم فرما ہوتا ہے۔

موت کی طرح یہ لباس بھی بڑے چھوٹے جین اور کم رد کافرق بالکل مساوی ہے اس لئے چینی لباس مغربی لباس کی بہ نسبت کہیں جمہوری لباس ہے۔

یہ تو ہوا جہا لیا تھی پہلو۔ اب ذرا احتیاطان صحت اور عام معقولیت کے تقاضوں کی طرف آئیے۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی کالر جو کارڈ نیل ریشو اور سروالٹری کے وقتوں کی یادگار ہے جسم کی صحت کے لئے مفید ہو سکتا ہے اسی بنا پر مغرب میں ہر صاحب فکر نے کالر کے خلاف ضرور آواز اٹھائی ہے۔ مغرب کے نسائی لباس نے گردن کے سلسلے میں کافی حد تک آسائش و آرام کی وہ رعایتیں حاصل کر لی ہیں جو پہلے صرف نازک کو حاصل تھیں۔ مگر مرد کی گردن مغرب کی تعلیم یافتہ سڑک کے نزدیک اب بھی اتنی بد معیبت اور کریمہ سمجھی جاتی ہے کہ اسے مجلسی زندگی کی نظروں سے کمر تک چھپایا جاتا ہے۔ کالر کی شیطانی بندش کی بدولت جسم کو گرمی میں مناسب ہوا نہیں لگ سکتی۔ سردی میں اس کی بدولت جسم کو سردی سے مناسب طور پر بچایا نہیں جا سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی وقت بھی اسکی بدولت انسان مناسب طور پر سوچ بچا نہیں کر سکتا۔

کالر کے نیچے آئیے تو مغربی لباس معقولیت کے خلاف ایک مسلسل اور متواتر ظلم نظر آتا ہے۔ یہ ایک نہایت شرمناک زیادتی کا طویل افسانہ ہے نیز ہمیں اس ستر بھلی کی نت نئی ایجادات اور نت نئی مشینیں بنانے میں بڑے ماہر ہیں مگر انہیں اتنی عقل نہیں کہ ان کے لباس کی بدولت ان کے جسم کا صرف ایک حصہ یعنی سر آزاد ہے اور باقی مقید۔ زیادہ تفصیلات کا فائدہ نہیں مگر ملاحظہ ہو کہ سب سے نیچے تو نہایت صحت بیان اور جاچکے پہنے جاتے ہیں جو جسم تک ہوا اور روشنی کا گزر نہیں ہونے دیتے۔ پھر حیت صدری ہے۔ اور نہایت سخت قسم کی پیٹی یا گلیس میں یہ خیریں جسم کو تھکنے

دیتی ہیں اور نہ غذائیت حاصل کرنے کی مختلف حالتوں میں کسی قسم کے سکڑنے یا پھلنے کی اجازت دیتی ہیں۔ ان سب میں سے حد سے زیادہ نامستعمل چیز داسکٹ ہے جن لوگوں نے انسان کے ننگے جسم کی قدرتی حالتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ اگر انسانی جسم بالکل تیر کی طرح سیدھا رہے تو پشت اور سامنے کے خطوط برابر ہوتے ہیں۔ ورنہ کبھی اور کسی حالت میں یہ خطوط برابر نہیں ہوتے۔ جس کسی نے بھی کبھی کلفت لگی قمیص پہنی ہو اسے تجربہ نے بتا رکھا ہے کہ جب وہ ذرا آگے کو جھکے گا تو وہی قمیص فوراً آگے کو نکل آئیگی۔ مگر داسکٹ اس مفروضہ پر بنائی گئی ہے کہ انسانی جسم کے عقبی اور سامنے کے خطوط ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ چنانچہ اسکی وجہ سے ہمیشہ جسم کو تیر کی طرح سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ عملی طور پر اسے مسار بر کوئی پورا نہیں اترتا اسلئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داسکٹ کے کونے یا تو آگے کو نکلے رہتے ہیں یا اس جگہ ٹہری نہیں سی بن جاتی ہیں۔ جو پیٹ اور کمر کو ہمیشہ دباتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی سیاہ پارہ بھاری بھر کم جسم رکھتا ہو تو داسکٹ ایک ابھری ہوئی توس بن جاتی ہے اور اس توس کے اگلے حصے پر نہیں ہوا میں معلق ہوتے ہیں۔ اور اس جگہ سے جہاں پیٹ کا گھیر کم ہونا شروع ہو پٹی اور تیلون کی مصیبت شروع ہوتی ہے۔ اس نقشہ کو ذرا دہن میں رکھئے اور الفسان سے کہئے کہ انسانی دماغ نے اس سے بڑھ کر کوئی بہودہ اور مضحکہ خیز ایجاد کر رکھی ہے؟ تو پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ مغرب ہی میں الفاننگے رہنے کی تحریک نے اتنی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ تحریک انسانی جسم کی اسی مضحکہ خیز پابندی کے خلاف ایک رد عمل اور ایک احتجاج ہے۔

اب ذرا پیٹی کے بازے میں دیکھئے۔ اگر انسانیت اب بھی چادر ہاتھ پاؤں پر چلنے کے مرحلے پر ہوتی تو پیٹی کا بھر بھی کوئی جواز تھا اس صورت میں یہ پیٹی اسی طرح

ان فی جسم پر فٹ کی جاتی جس طرح گھوڑے کے زین کا سبز باندھا جاتا ہے۔ مگر انسان اگر چہ چار پاؤں پر چلنا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس کے لئے پلیٹی اس مفروضہ پر تیار کی گئی ہے۔ گویا ابھی تک وہ چوپایہ ہے۔ چوپایہ ہونے کی حالت میں انسانی جسم کا سارا بوجھ رڑھ کی ہڈی سے وابستہ رہتا تھا۔ انسان کے سیدھا کھڑا ہو جانے کی بدولت جو تباہ کن نتیجے ہوئے وہ یہ ہیں کہ انسانی مائیں ہمیشہ سٹاڈ اور بچہ ضائع ہونے کے خطرے سے دوچار رہتی ہیں۔ حالانکہ جانور اس خطرہ سے بالکل مبرا ہیں۔ دوسرا تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ مرد کے لباس کی پیٹی ہمیشہ نیچے کو کھینکتی رہتی ہے۔ کبھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کو اپنی جگہ پر رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پیٹی کو خوب کس کر باندھا جائے۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنٹوں کی لازمی قدرتی حرکت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مغرب کے لوگ جب غیر ذاتی کاموں میں زیادہ ترقی کر لیں گے۔ تو ایک نہ ایک دن وہ اپنے ذاتی کاموں میں بھی زیادہ دقت اور توجہ صرن کر سکیں گے۔ اس طرح لباس کے معاملہ میں وہ زیادہ سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں گے۔ لباس میں اپنی اس ہٹ دھرمی اور روایت پرستی کی بدولت مغربی مرد برکت نقصان اٹھا رہے ہیں۔ وہ اس میں تبدیلی سے ڈرتے ہیں۔ مگر مغربی عورتوں نے ایک مدت سے اپنے لباس میں سادگی اور معقولیت پیدا کر رکھی ہے۔ خیر آج سے اس سے بیس برس بعد کی بات چھوڑیے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی صدیوں میں مرد بھی اپنے لئے ایسا لباس ضرور بنالیں گے۔ جو ان کے دوپایہ ہونے کے ساتھ پوری مطابقت رکھے گا۔ جس طرح عورتوں نے اپنے لئے ایسا لباس تیار کر لیا ہے اور رفتہ رفتہ پلیٹی یا گلیس قسم کی تمام تکلیف دہ چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ اور مردوں کا لباس ایسا ہو گا کہ

وہ ان کے شالوں سے نہایت موزونی اور حسن کے ساتھ نیچے کو لٹکے گا۔ اور ان کے جسم پر پورا آئے گا۔ اب کی طرح پیڈو سے کرفٹ کئے ہوئے بے معنی شانے نہیں ہوں گے۔ کوٹ کے ہر رنگ ہر وضع کے فضول کالر نہیں ہوں گے۔ اور موجودہ ڈیزائن کی جگہ بیا بہت زیادہ آرام دہ ہو گا۔ اس وقت عورتوں اور مردوں کے لباس میں بڑا فرق یہ ہو گا کہ مرد تیلون پہنیں گے۔ اور عورتیں سکرٹ۔ جہاں تک جسم کے بالائی حصہ کا تعلق ہے عورتوں اور مردوں کے لباس میں ایک جیسی آرائش اور ایک جیسے آرام کا خیال رکھا جائیگا۔ مردوں کی گردنیں بھی کالرڈوں وغیرہ سے ویسی ہی آزاد ہوں گی جس طرح عورتوں کی گردنیں آج ہیں۔ واسکٹ غائب ہو جائے گی اور مردانہ کوٹ بس اسی قدر استعمال ہو گا جس طرح آجکل کی عورتیں اپنا کوٹ استعمال کرتی ہیں۔ گویا مرد بھی زیادہ تر کوٹ کے بغیر رہیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آجکل عورتیں زیادہ وقت کوٹ کے بغیر بسر کرتی ہیں۔

لیکن ان تبدیلیوں کے لئے ایک چیز ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قمیص کے بارے میں موجودہ تصور کو یکسر بد لونا ہو گا۔ اب قمیص ایک ایسا کپڑا ہے جسے دوسرے موٹے کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے نئے تصور کے مطابق قمیص ایک ایسی چیز ہوگی جو نیچے کے پیمانے دوسرے کپڑوں کے اوپر پہنی جائے گی۔ یہ گہرے رنگ کے کپڑے کی ہوگی۔ یہ ہلکی ساک سے لے کر موٹے ادنی کپڑے تک ہر قسم کے کپڑے سے بنائی جائیگی۔ موسم کے مطابق ہوگی۔ اور اس طرح ہی جائے گی کہ پہنی ہوئی اچھی معلوم ہو اس قمیص کے اوپر کوئی چاہے تو رسمًا نہیں موسم کے تقاضا کی وجہ سے کوٹ بھی پہننے کے لئے درجہ محکمہ زبردستی میں ہی قمیص تسلیم شدہ اندازوں میں لباس مانا جائے گا۔ ان پینوں اور گلیس قسم کی مصیبتوں سے بچنے اور چھڑانے کے لئے ایک قسم کی علی حللی قمیص

اور پتلون بنائی جائے گی۔ آج کل عورتیں جس طرح سر پر سے کھسکا کر اپنا ذراک وغیرہ پہن لیتی ہیں۔ اسی طرح یہ ملی جلی قمیص اور پتلون بھی پہنی جائے گی۔ اس میں کمر کے گرد کچھ بٹن کچھ حقیقی کچھ غیر حقیقی ڈنگ کی چیزیں ہوں گی۔ تاکہ وہاں سے ذرا اسے ڈٹ کیا جاسکے۔ اور اپنے جسم کی مناسب نمائش کی جاسکے۔

آج کل مردوں کے لباس کی جو وضع چل رہی ہے اس میں بھی مٹی اور گیسٹس ختم کرنے کی خاطر کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ بنیادی اصول یہ ہے۔ سارا وزن شانوں سے متعلق ہو۔ شانوں سے یہ وزن ہر طرف یکساں طور پر بٹا رہے ہیں۔ انسان کی شکم کی عمودی دیوار سے ٹھن چرکانے رگڑنے اور دبانیے کے بل پر ہرگز نہ کسا جائے۔ مرد کی کمر سے بوتل کے منہ کا جو کام لیا جاتا ہے اس سے اسے نجات ملے۔ نیچے پہننے کے کپڑے ایسے بنائے جائیں جو ڈھیلے ڈھالے اور آرام دہ ہوں۔ اگر داسکٹ سے نجات حاصل کر کے ہم تہتی کی اس راہ پر گامزن ہو جائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح بچوں کے شکر وغیرہ قمیص کے ساتھ بٹن لگا کر ہنٹے جاتے ہیں اسی طرح مردوں کی پٹاؤنیں بھی ان کی قمیصوں کے ساتھ بٹنوں سے دستبر ہوں۔ پھر دقت آنے پر قمیص اندر پہننے کے بجائے ہر چیز کے اوپر پہننے والا کپڑا بن جائے گی۔ اور اس کی تیاری میں آج کی نسبت کہیں بہتر کپڑا استعمال ہونے لگے گا۔ جو غالباً اسی رنگ اور اسی موٹائی کا ہو گا جس کی پتلون بنے گی۔ یا کم سے کم پتلون سے ہم آہنگ ہو گا۔ اگر داسکٹ کو برقرار رکھنا منظور ہے تو اصلاح کی گنجائش یوں نکلتی ہے کہ داسکٹ اور پتلون ملی ہوئی ہوں۔ ان کی طرز وہی ہو جو اب ہے۔ مگر دونوں ایک ٹکڑے کی ہونی ہوں۔ اور داسکٹ کی لپٹ پر پورے کپڑے کے بجائے ٹھن دو چوڑی بندیاں ہوں اور بس۔ اس کے علاوہ مٹی اور گیسٹس سے نجات پانے کی فی الحال ایک

صورت اور ہے کہ واسکٹ کے نیچے چھ چھوٹے چھوٹے لگے ہوں۔ چار سامنے اور دو پیچھے۔ اور ان تکمروں کو پتلون کے اندر کی طرف لگے ہوئے بٹنوں کے ساتھ لگا لیا جائے۔ اس طرح واسکٹ الگ کی الگ نظر آئے گی۔ کیونکہ یہ پتلون سے باہر ہوگی۔ ایک دفنہ یہ رہائیں اور تبدیلیاں شروع ہو جائیں اور مردوں کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ان کے لباس کی موجودہ وضع کا زمانہ کی طرح ٹل اور باقی ورعہ وید نہیں۔ تو پھر رفتہ رفتہ اس واسکٹ سے یوں پیچھا جھڑایا جاسکتا ہے کہ اوپر نیچے ایک ہی ملا جلا کپڑا پتلون اور واسکٹ دونوں کا کام دیں جو وضع میں آج کل کے اور آل سے بہتر ہو۔ مگر اسی اصول پر بنایا جائے

مختلف قسم کی آب دہوا کے ساتھ ہوں بوقت کے لحاظ سے بھی چینی لباس سب سے معقول لباس ہے۔ مغربی لباس کا یہ حال ہے کہ چاہے گرمی سوڈ گری سے زیادہ ہو۔ یا سردی صفر سے بھی نیچے ہو۔ پھر بھی مغربی لوگوں کو بنیان جانکنے کے اوپر ایک قمیص ایک واسکٹ اور ایک کوٹ ضرور پہننا پڑتا ہے۔ مگر صنی لباس میں ہر موقع محل کے لحاظ سے کمی بیشی کی ہر تگجائش ہے۔ چین میں یہ کہانی عام ہے کہ کوئی چینی ماں اپنے بچے کو بہت چاہتی تھی۔ چنانچہ جب وہ ایک بار تھینکتا تھا تو وہ اسے ایک چوہ نما کرنا پہنا دیتی تھی۔ دو بار تھینکنے پر دو کرتے اور تین بار تھینکنے پر تین کرتے پہنا دیتی تھی۔ کوئی مغربی ماں ایسا نہیں کر سکتی بلکہ تیسری چھینک آنے پر مغربی ماؤں کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ ان کی دوڑ ڈاکڑوں تک ہے۔

اور میرا تو اعتقاد ہوتا جا رہا ہے کہ ساری چینی قوم کو تپ دق اور نمونیا جیسی بیماریوں سے خفا ہونے سے جو چیز بچانی ہے۔ وہ ان کا استر دیا ہوا چفہ ہے

۱۰۔ مکان اور اس کی اراہش

لفظ "مکان" میں رہنے کے وہ تمام سامان یا مکان کا پورا گرد و پیش شامل ہے۔ مکان چنتے وقت یہ بات خاصی اہم ہوتی ہے کہ جب اس گھر کے اندر سے ہم باہر نکلیں گے تو کن چیزوں پر نظر پڑے گی۔ گویا۔ مکان کا ماحول اور گرد و پیش بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے شگھائی کے کسی امر کو دیکھا ہے کہ اپنے مکان کے گرد پھیلے ہوئے چھوٹے سے پلاٹ پر نماز کرتے ہیں۔ حالانکہ اس پلاٹ میں پھلیاں پالنے کا بس فٹ کا ایک تالاب ہوگا اور ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی ہوگی جس پر ایک چوٹی کو چڑھنے میں بھی تین منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگ سکتا۔ یہ لوگ ان بے شمار غریب لوگوں کا تصور نہیں کر سکتے جو کسی پہاڑی ڈھلان پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتے ہیں۔ مگر اس کٹیا سے سارا کوہستانی نظارہ۔ دریا اور جبل کے مناظر ایں نظر آتے ہیں۔ گویا وہ ان کا اپنا پائین بلع ہیں۔ ان دو قسم کے مکانوں میں مقابلے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسے بھی مکان ہوتے ہیں جو بے انتہا خوبصورت منظر میں واقع ہوتے ہیں۔ ایسی جگہ اپنے گھر کے ارد گرد باڑ لگا کر زیرے کا چھوٹا سا نظارہ مخصوص کر لینے میں۔ کوئی خوبی نہیں۔ کیونکہ جو شخص ایسے منظر میں زندگی بسر کرتا ہے وہ اس سارے نظارے کا مالک ہے۔ اس کا جہاں جی چاہے جائے۔ وہ اس نظارہ کی مادی چیزوں کے علاوہ ان بادلوں کا بھی مالک ہے جو پہاڑیوں کی جوٹیوں کو چھوٹے رہتے ہیں سان پر بند کا بھی مالک ہے جو ان فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔ ان نعموں کا بھی مالک ہے جو گرتے ہوئے جھریوں اور آڑے ہوئے طائرؤں کی منقاروں سے پیدا ہوتے ہیں۔

صحیح معنی میں یہی شخص امیر ہے۔ شہروں میں رہنے والے کروڑ پتی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آسمان میں تیرنے والے بادل شہر والوں کو بھی نظر آتے ہیں۔ مگر وہ انہیں دیکھتے کب ہیں۔ اور جب کبھی ان کی نظر ان بادلوں پر پڑتی بھی ہے۔ تو ان بادلوں کے پیچھے نیلی دھند میں لپٹی ہوئی پہاڑیاں نہیں ہوتیں۔ جن کے بغیر بادلوں کی طرف دیکھنے کا مزہ ہی کیا ہے؟

اس لئے مکان اور خانہ باغ کے بارے میں چینی تصور یہ ہے کہ مکان بڑا اور گھر د کے منظر کی ایک جزوی تفصیل ہے اور بس۔ اس کی مثال اس گینے کی ہے جو کسی زیور میں جڑا ہوا اور جو اس زیور کی مجموعی خوبی اور حسن کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اسی لئے مکان کے مسئلہ میں تمام چیزیں جو باہر سے مضحکہ اور بناوٹی دکھائی دین ہیں بڑی احتیاط سے چھپانا چاہئے۔ پہاڑوں کے متغیبات و خطوط و جڑوں کی کھجکی ہوئی شاخوں سے چھپی چھپائی طرح تمام مکان جو دیکھنے بہت ہی بگلی اینٹ کی طرح نظر آئے۔ کسی کارخانے کے اندر تو اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ کارخانے میں دقت اور روپیہ بچانا ہی اصل چیز ہے۔ لیکن رہنے کے لئے۔ یہ اینٹ نامکان چننا اپنے آپ پر ایسی زیادتی ہے جس کا جواز نہیں۔ چینیوں کے نزدیک رہنے کے مکان کا مثالی نمونہ یہ ہے جو ایک ادیب نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے

”باہر کے پھاگ سے داخل ہوں تو ایک فٹ پاتھ ہو۔ مگر یہ سیدھا نہ ہو بلکہ لازمی طور پر پیچ و خم کھاتا ہوا ہو۔ اس کے موڑ پر باہر کا پردہ ہو جو سائز میں چھوٹا ہونا چاہئے۔ اس پردے کے پیچھے ایک کھلا ہوا چبوترہ ہو جو بالکل ہموار ہو۔ اور اس کے

حاشیوں پر تازہ پھولوں کے پردے ہوں۔ ان پھولوں کی باڑ کے ساتھ ساتھ نیچے دیوار ہو۔ دیوار کے قریب

دیو دار کا ایک درخت ہو۔ مگر یہ درخت بہت پرانا اور
 کہن سال ہو۔ اس درخت کی جڑ کے پاس عجیب بے ڈھنگی
 وضع کی چٹانیں رکھی جائیں۔ اس سے آگے بانسوں کے چھڑکے
 درخت لگے ہوں۔ اور ان سے آگے ایک الگ تھلگ گھر ہو گھر کے پہلو
 میں ایک سڑک ہونی چاہئے۔ جو پھوٹ کر ایک طرف کو نکل جائے
 اور وہ جگہ جہاں کئی سڑکیں آکر ملتی ہوں وہاں ایک پل ہونا چاہئے
 جس پر سے گزرتا کافی ہیجان خیز ہو۔ پل کے اس پار دیکھے پڑ
 ہوں۔ اور ان پیڑوں کے سائے میں گھاس اُگی ہو جو بالکل سبز ہو
 اس گھاس کے قطعے سے اوپر بلندی پر پانی کی ایک نالی ہو جو بالکل
 پتلی ہونی چاہئے۔ یہ پانی کی نالی اوپر بلندی پر ایک چشمے پر ختم
 ہو جو شور مچاتا ہوا بہتا ہو۔ اس چشمے سے اوپر ایک پہاڑی ہو۔

پہاڑی کے دامن میں ایک مربع ہال ہو اور اس ہال کے ایک کونے
 کے قریب سبز یوں کی پھلواڑی ہو جو رقبے میں کافی بڑی ہو اس پھلواڑی
 میں ایک بگلا ہو جو ناچتا پھرے۔ اور اپنی قین قین سے یہ بتائے کہ گھر
 میں اب کوئی مہمان آیا ہے۔ یہ مہمان کوئی بازاری آدمی نہ ہو۔ جہاں آئے
 تو اسے شراب پیش کیا جائے اور وہ شراب سے انکار نہ کرے۔ پینے کی محفل لگے
 مدہوشی چھپا جائے اور اس مدہوشی میں مہمان یہ نہ کہے کہ مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔

مگر کارسار جن اکی انفرادیت میں پہناں ہے۔ نی نی ونگ نے اپنی کتاب صینی کافن
 میں مکانات اور ان کے اندرونی حصوں۔ کمروں اور آرائش وغیرہ کے بارے
 میں کئی باب لکھے ہیں۔ گھر کے سلسلے میں وہ اپنی بات ہمیں سے شروع کرتا ہے

کہ مکان ایسا ہو جس میں جنبیت محسوس نہ ہو بلکہ اپنائیت کا احساس ہو اور اس میں
انفرادیت ہونی ضروری ہے۔ میرے نزدیک انفرادیت سے کہیں اہم اپنائیت کی فضا ہے
کیونکہ مکان چاہے کتنا بڑا اور شاندار ہو لیکن گھر گھر میں صرف ایک کمرہ ایسا ہوا
کرتا ہے جس میں آدمی واقعی رہتا ہے۔ اور لازمی طور پر یہ کمرہ سادہ اور مختصر ہوتا ہے۔ اس
میں چیزیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی رہتی ہیں۔ مگر یہ اپنائیت کی فضا سے معمور ہونا چاہیے۔

”انسان جس طرح کپڑوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح گھر کے

بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ کپڑے گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم

چاہئیں۔ یہ اصول مکان پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک بہت بڑے گھر میں

رہنا واقعی شان کی بات ہوگی۔ مگر ایسا گھر صرف گرمیوں کے لئے مناسب ہوتا

ہے۔ سرما کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ کسی بہت بڑے سرکاری دفتر میں جا کر

کپکپی آجاتی ہے۔ کیونکہ اس کی وسعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ اسکی مثال سمجھو کہ

ایسے کوٹ کی ہے جو بہت بڑا ہو۔ اور جس کو کمرے گرو کس کر نہ باندھا جاسکے

اسکے برعکس ایک غریب آدمی کے مکان کو لیجئے جسکی دیواریں نیچی ہوتی ہیں

اور جس میں پاؤں پھیلانے تک کی وسعت نہیں ہوتی۔ مگر اس میں کفایت کا پہلو ہے

اور یہ مکان اپنے مالک کے لئے موزوں ہے۔ ہاں ہمانوں کے لئے موزوں نہیں

۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی غریب اہل علم کے چھوٹے میں جلتے ہیں تو ہمیں گھس

کا احساس ہوتا ہے میری آرزو ہے کہ حاکموں کے مکانات اتنے اونچا در اتنے

بڑے نہ بنائے جائیں کیونکہ مکان اور مکین کی ہم آہنگی اسی طرح ضروری

ہوتی ہے جس طرح ایک تصویر میں ان کی ہم آہنگی کا خیال رکھا جاتا ہے

جو مصور قدرتی مناظر کی تصویریں بناتے ہیں انھوں نے تصویر کشی میں تناسب

کا ایک فارمولا بنا رکھا ہے۔ جو کچھ اس طرح ہے کہ ایک تصویر میں اگر دس
 فٹ اونچے پہاڑ ہوں تو ایک فٹ اونچے درخت ہونے چاہئیں۔ اور
 ایک اونچے گھوڑے۔ اور ماش کے دانے کے برابر اونچے آدمی ہوں
 اسلئے یہ بالکل غیر متناسب اور غیر موزوں ہو گا کہ دس فٹ کی پہاڑی
 پر دو یا تین فٹ اونچے درخت بنائے جائیں۔ چنانچہ اگر سرکاری افسر
 کا قدر تو دس فٹ ہو تو وہ بیشک میں یا میں فٹ اونچے مکانوں میں
 رہیں۔ موجودہ حالات میں تو یہ ہوتا ہے کہ عمارت جتنی اونچی ہو آدمی اتنا
 ہی کوتاہ اور حقیر نظر آتا ہے۔ اور مکان میں جتنی وسعت ہو سکیں اتنا
 ہی دبلا اور مرل معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ان لوگوں کے
 جسم کچھ موٹے کر دئے جائیں اور ان کے مکان کچھ چھوٹے بنا دئے جائیں۔
 میں نے بڑے بڑے اعلیٰ عہدہ داروں یا ان کے عسکریوں
 کو دیکھا ہے کہ ایک باغ بنانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ اور
 باغ کی بنیاد ڈالنے سے پہلے ہی انجینئر کو ہدایت دیتے ہیں کہ ہتھابی
 کے سلسلہ میں فلاں فلاں ہتھابی کا ڈیزائن لے لو۔ یہی تالاب کے پاس
 والی بارہ دری تو اس کے لئے فلاں فلاں بارہ دری کا نقشہ کھینک لیا۔
 جب یہ سب مکمل ہو جاتا ہے تو اس کا مالک لوگوں کو بڑے فخر کے انداز میں
 یہ بتاتا ہے کہ میرے باغ اور نکلے کا سارا نقشہ عین میں فلاں مشہور باغ کا چرہ ہے
 اور اس میں خدا سا بھی اختلاف یا فرق نہیں۔ اس بات میں جو سوتیانہ
 بن اور رکاکت ہے خدا اس سے محفوظ رکھے۔
 اصل میں تعمیر میں جن چیزوں سے لاری طور پر بچنا چاہئے وہ یہی

فضول شان و شکوہ اور عیش پرستی کا انداز اور حد سے بڑھی ہوئی گتت
 ہیں۔ اگلی وجہ یہ ہے کہ سادگی کی جو بیوک کو اپنانا عام لوگوں کا ہی نہیں
 بلکہ شہزادوں اور صاحب اقتدار حاکموں کا بھی فرض ہے رہے کہ مکان کے
 لئے اہم چیز شان و شکوہ نہیں بلکہ نفاست ہے۔ لمبی چوڑی زیبائش نہیں بلکہ
 جدت اور حسن ہے۔ لوگ اپنے امیرانہ ٹھاٹ کی نمائش اس لئے نہیں
 کرتے کہ یہ نمائش میں پسند ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی نمائش کی وجہ محض یہ ہوتی
 ہے کہ نہیں جدت خیال اور اچھ موجود نہیں ہوتی۔ وہ کوئی نئی بات سوج
 نہیں سکتے کوئی نئی چیز اختراع نہیں کر سکتے۔ ان کی پرواز خیال اسی نمائش
 اور نمود تک محدود ہے۔ اور اسی پر انھیں اکتفا کرنی پڑتی ہے۔ ذرا دو آدمیوں
 سے کہئے کہ وہ دو نئے لباس پہنیں۔ ایک لباس سادہ مگر عمدہ اور اپنی
 وضع میں منفرد ہو۔ اور دوسرا بہت قیمتی۔ نمائشی مگر عامیانه ہو۔ پھر دیکھئے
 کہ لوگوں کی نظر کیا اس عامیانه لباس کی نسبت اس سادہ مگر منفرد لباس
 کی طرف زیادہ اٹکتی ہیں یا نہیں؟ ... ریشم اور کچھ ابا اور آباں سے قیمتی
 کپڑے کون نہیں جانتا اور کس نے انہیں نہیں دیکھا؟ مگر ایک سادہ سا لباس جو وضع
 میں نفیس اور منفرد ہو ہمیشہ تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بن کر رہے گا۔ کیونکہ
 انہوں نے اسے یوں پہنا ہوا کبھی نہیں دیکھا۔

لی لی دنگ نے اپنی تصنیف میں مکانوں کی طرز اور ان کی اندرونی آرائش پر بھی
 تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں اس نے کھڑکیوں جالیوں کے پردوں
 لمپ۔ میز کرسی۔ نادر اشیاء صندلی اور صندلیوں اور مسہروں تک یہ لکھا ہے وہ خود سجد
 منفرد اور طراز دہن کا مالک تھا۔ اور قدرت شانے اسے ایجاد کا مالک بھی عطا کیا تھا۔

چنانچہ اس نے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ نئی بات ضرور بتائی ہے۔ باقی رہی اسکی ایجاد
 تو وہ آج چینی روایات کا مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا عطیہ خط لکھنے کے
 کاغذ ہیں۔ جو اس کی زندگی میں ایک خاص نام کے خط لکھنے والے کاغذوں کی حیثیت
 سے فروخت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کھڑکیوں کی ایک کتاب وضع اور کمروں
 کو تقسیم کرنے والے پردوں کے خاص ڈیزائن ہیں۔ اس کی کتاب جینے کا فن آج
 کوئی ایسی معروف کتاب تو نہیں۔ مگر اسے مصوری کی ایسی ابتدائی کتاب کے سلسلہ
 میں آج تک یاد کیا جاتا ہے جو ہتدیوں کے لئے بہت مفید ہے۔ اسی طرح وہ اپنے
 دس طریقہ ڈراموں کے لئے بھی مشہور ہے۔ کیونکہ وہ بالکمال شخص بیک وقت ڈراما
 نگار۔ موسیقار۔ زندگی کا فنکار۔ لباس کا ڈیزائنر۔ انفرانش حسن کی ترکیبوں کا
 ماہر اور موجد تھا۔

مسہری اور بستر کے بارے میں کی کے خیالات بالکل نئے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ
 جب کبھی میں کسی نئے گھر میں منتقل ہوتا ہوں تو سب سے پہلے بستر اور مسہری کی طرف توجہ
 دیتا ہوں۔ چین میں مسہری پردوں سے گھری ہوئی فریم میں جکڑی ہوئی ایسی چیز ہے
 جو بڑے سے صندوق یا چھوٹے سے کمرے سے مشابہہ ہے۔ اس کے ساتھ ڈنڈے اور شیلیں
 اور دساز بھی ہوتے ہیں جو کتابیں۔ جوتے۔ چائے دانی اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے
 کے کام آتے ہیں۔ لی نے اس میں یہ اختراع کی کہ اسی مسہری میں بھول رکھنے کا
 ایک اسٹینڈ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس نے تیلی لکڑی کا ایک چھوٹا سا شیلی بنایا۔ جو
 ایک فٹ چوڑا مگر صرف دو تین انچ گہرا تھا۔ اور اسے مسہری کے منقش پردے
 کے ساتھ لگا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس چوبی بگدان کو اہل طرح کڑھے ہوئے نفیس نشیم
 سے منڈھ دینا چاہئے کہ یہ ساری چیز ایک آڑنی ہوئی بدلی معلوم ہو۔ اسی چوبی

بڑھاؤ پر وہ پھولوں کے موسم میں پھول رکھتا تھا۔ اور جب ان کا موسم نہ ہو تو مختلف قسم کی اعلیٰ چینی خوشبوئیں اور بخورات جلاتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے میرا جسم اب عام جسم نہیں رہا۔ بلکہ تسلی بن گیا ہے۔ جو پھولوں میں اڑتی بھرتی ہے۔ میں کھاتی ہے اور وہیں سوتی ہے۔ (چین میں امریکا دستور ہے کہ اگر محبوبہ کے ساتھ رتھلے کا شبن منار ہے ہوں۔ تو خادمائیں انھیں اسی مسہری پر شہاب اور کھانا پیش کرتی ہیں) اور اب میں عام آدمی نہیں رہا۔ بلکہ پری بن گیا ہوں جو جنت میں چلتی پھرتی اور آرام کرتی ہے۔ چنانچہ ایک نیم بیداری کی حالت میں مجھ پر شفقتاً تو کے خشکوفوں کی خوشبو چھا گئی۔ اور میرے گلے۔ میرے دانتوں اور میرے رخساروں پر یہ نازک باس جم کر رہ گئی۔ اور یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ ہرک باہر سے نہیں آتی بلکہ خود میرے سینے سے پھوٹ رہی ہے۔ میرا جسم اتنا لطیف اور ہلکا ہو گیا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میں اب اس فانی دنیا میں زندہ نہیں ہوں۔ بیدار ہونے پر یہ ماجرا میں نے اپنی بیوی سے بیان کیا۔ میں نے کہا۔ دیکھو ہمیں اسی مسرت محسوس کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا اس طرح ہمیں مسرت کا جو حصہ ہمیں دیا گیا ہے ہم اسے تو کم نہیں کر سکتے؟ میری بیوی نے جواب دیا شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ہمیشہ غریب اور محتاج رہتے ہیں سچ پوچھیں۔ تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں

چینی روایات میں آئی کا سب سے نمایاں حصہ کھڑکیوں کی اختراعات ہیں۔

۱۵۔ چین میں یہ عام خیال ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے اسے قدرت کی نظر سے مقدر یا خوشی کا ایک خاص حصہ ملتا ہے۔ جو کسی صورت میں بدل نہیں سکتا۔ اسلئے جو شخص اس چیز سے جی بھر کر لطف اٹھائے یا ایک معاملہ میں زیادہ خوش نصیب ہو تو دوسرے معاملوں میں اسکی قسمت میں کمی کر دی جاتی ہے۔ یا اسکی زندگی تھوڑی ہو جاتی ہے (حاشیہ: ارمینیا)

اس نے جھیلوں میں چلنے والے ماؤس بوٹا کے لئے نیکھے۔ جیسی کھڑکیاں۔ منظر بہ
 کھڑکیاں۔ اور خوبانی کے پھولوں جیسے دریچے وضع کے۔ ماؤس بوٹا کے دونوں
 طرف نیکھے جیسی کھڑکیاں رکھنے کا خیال چین کے اس قدیم دستور سے وابستہ
 ہے کہ نیکھیا پر تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ اور پھر ان مصور نیکھیوں کو جمع کر کے
 الہم میں رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ لی کا یہ خیال تھا کہ کشتی کی چوٹی دیوار میں جب
 نیکھے جیسی کھڑکی نکالی جائے تو اس کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ باہر کا
 نظارہ اور کتا روں پر چلنے والے لوگ کشتی کے اندر کے جشن سے یاد عورت چائے
 کا نظارہ اس طرح کریں گے گو یا وہ کسی چینی نیکھیا پر بنائی ہوئی کوئی تصویر دیکھ
 رہے ہیں۔ اس طرح یہ نیکھے جیسی کھڑکی اصل منظر کے لئے ایک قسم کے فریم کا کام لیتی
 کیونکہ دریچے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے باہر کے نظارے پر نظر ڈالی
 جائے۔ اسی لئے یہ محاورہ ہے کہ آنکھیں روح کے دریچے ہیں۔ چنانچہ کھڑکی
 اس طرح ڈیزائن کی کرنی چاہئے کہ باہر کا منظر عمدہ سے عمدہ زاویہ سے نظر آئے
 اسی لئے لی نے کہا ہے کہ باہر کے منظر کا بہترین ٹکڑا ادھار لیکر اسے دریچے کے
 ذریعہ سے گھر کے اندر منظر دکھانے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

آدمی جب ایسی کشتی میں بیٹھا ہو تو کشتی کی دیوار میں نیکھے جیسے دریچے
 میں سے جھیل کے پانیوں کی چمک اور پہاڑوں کا رنگ۔ مندر۔ بلوں
 اور دھند۔ بالنوں کے جھنڈ جھیل کے کناروں کے پتیر۔ کناروں پر کام
 کرتے ہوئے لکڑی کے گڈرے۔ پرائے خرابی اور سیر کرتی ہوئی عورتیں
 اس طرح نظر آئیں گی جس طرح کوئی تصویر ہوتی ہے۔ یہ تصویر بالکل قدرتی تصویر
 ہوگی جو دریچے کے فریم میں جڑی ہوگی۔ اسکے علاوہ یہ تصویر زندہ اور باہر کھڑکی
 جو ہر آن بدلتی رہے گی۔ کشتی کے چلنے سے تصویر بدل جائیگی

ہر لحظہ ہمیں چوہوں کی نئی حرکت اور لمبے پتواروں کا نیا منظر نظر آئیگا اور جب کشتی لنگر ڈال کر کھڑی ہوگی تو ہوا کے چلنے اور پانی کی نرم لہروں سے اسکی ہیئت اور ترکیب لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہے گی۔ اس طرح ہم ایک لمحہ میں اس پنکے جیسے درتچے کی بدولت پہاڑیوں اور پانی کی ہزاروں خوبصورت تصویروں سے دل کو بہلا سکیں گے۔

میں نے پہاڑوں کا منظر دیکھنے کے لئے بھی ایک درتچہ بنایا ہے۔ جسے میں نے منظر یہ درتچے کا نام دیا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں غیر آرائی تصویر کہہ سکتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے یہ درتچہ کیسے بنایا میرا کمرہ۔ سفید جھاگ والا کمرہ دروازے پر اب پینے سے ہے، اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جو کوئی دس فٹ اونچا اور سات فٹ چوڑا ہوگا۔ یہ (مصنوعی) ٹیلا چھوٹے پیمانے پر ایک پہاڑی گاؤں کی پوری تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں لال چٹانیں اور نیلے پانی کی ننھی سی جھیل ہے گھنا جنگل اور اونچے بانسوں کے جھنڈے ہیں گیت گاتے ہوئے پرندے اور گرتی ہوئی آبخاریں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کے جھونپڑے اور کھڑکی کے پل ہیں۔ اصل میں یہ سارا منظر اس طرح وجود میں آیا کہ مٹی سے مجھ نے بنانے والے ایک شخص نے میرا مجسمہ تیار کیا۔ اس مجسمہ کے چہرے پر بڑا عجیب تاثر تھا۔ میرا نام کی ذنگ کا مطلب ہے۔ ایک ایسا بوڑھا آدمی جس نے سر پر پانی کے تنکوں کا بڑا ہیٹ پہن رکھا ہوا۔ اسے مجھے کو بھی ایک ماہی گیری کی شکل دی گئی جس کے ہاتھ میں پھلیاں پکڑنے کی پٹی تھی۔ ڈور تھی اور جو ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس مجسمے کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ جب ایک چٹان موجود

ہے تو پھر سامنے پانی بھی ہونا چاہئے۔ اور پانی ہے تو پھر پہاڑی بھی ہونی
 چاہئے پھر چونکہ پہاڑی اور پانی دونوں موجود ہیں تو اس بانس کے ٹنگوں
 کا ہیٹا پہنے ہوئے بوڑھے شخص کے لئے ایک پہاڑی کٹیا بھی ہوتی چاہئے
 تاکہ وہ (روایتی طور پر) اپنے بڑھاپے کا وقت اس گوشے میں گزارے اور
 پھلیاں پکڑنے میں دل بہلائے۔ چنانچہ اس طرح بتدیج یہ سارا منظر ہم
 نے تخلیق کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی پہاڑی مٹی کے اس محبسے کی وجہ سے
 بنائی گئی۔ اور اس کے بنانے میں یہ خیال نہیں تھا کہ دریچے سے اس کا منظر
 نظر آئے گا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ پہاڑی اور اس کا سارا منظر اگرچہ بہت
 ہی مختصر اور ننھا منھا ہے لیکن جس کائنات کی طرف ان سے دھیان جاتا ہے
 وہ لاناہتا وسعت رکھتی ہے۔ اس سے میرے ذہن میں بوڑھوں کا یہ مشہور قول
 آیا کہ رانی کا دانہ اور ہمالیہ پہاڑوں کا ایک جتنے بڑے ہیں۔ چنانچہ میں دن بھر
 اس ننھی سی پہاڑی کو دیکھتا رہا اور کھڑکی بند نہ کر سکا۔ ایک دن ہیٹا
 کی ایک لہرائی اور میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس پہاڑی کو ایک
 تصویر میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس تصویر کو دریچے میں بند کیا
 جاسکتا ہے۔ - - - - - اس تصویر
 کو فریم میں بٹرنے کے لئے صرف اتنی لاگت آئے گی۔ جانے کی میں رازدرا
 پتیا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایک ملازم لڑکے سے کہا کہ وہ مولے کا قندکے
 لمبے اور چوڑے کئی ٹکڑے کاٹے۔ اور ان ٹکڑوں کو دریچے کے اوپر نیچے
 اور اطراف پر اسی طرح چپکا دے۔ جس طرح کسی سچ کی تصویر کا فریم لگایا
 جاتا ہے چنانچہ یہ فریم کسل ہو گیا اور عام طور پر فریم کے اندر اصلی تصویر کے لئے جتوں لگے

خالی ہوتی ہے وہ خالی رکھی گئی۔ اس خالی جگہ کو مصنوعی پہاڑی کے متطرنے پر کر دیا۔ اب بیٹھ کر دیکھا تو میرا دریچہ دوپہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک تصویر بن گیا تھا۔ وہ پہاڑی اب سچ مچ کی پہاڑی نہیں رہی تھی۔ بلکہ تصویر میں بنائی ہوئی ایک پہاڑی بن چکی تھی۔ اس پر میں تہقہہ مار کر مہنسا۔ بیوی بچوں نے میرے منہ کی آواز سنی تو آکر میرے تہقہے میں شامل ہو گئے۔ یہ ہے غیر ارادی تصویر۔ اور منظر یہ درجے کے وجود کی داستان۔

کرسیوں اور میزوں وغیرہ کے سلسلہ میں بھی آئی نے کئی نئی باتیں اختراع کیں۔ اس نے ایسی آرام کرسی ایجاد کی جو سردیوں میں گرم رکھی جاسکتی تھی۔ کہ اگر سردیوں میں مناسب طور پر گرم نہ رکھے جاسکیں تو یہ ایجاد بڑی مفید اور قابل عمل ہے۔ اس کی ایک لمبی چوڑی مسہری کی سی ہے۔ جو ایک چوٹی تخت میں بیٹھی ہے۔ یہ تخت دو ٹینٹ گہرا ہے۔ اور اس کی اطراف پر لکڑی کے تختے لگے ہیں۔ جو نیچے میز کے برابر اونچے ہیں۔ اس مسہری کے سامنے کی طرف دو چوٹی دروازے بنے ہیں۔ اس تخت پر چڑھ کر دروازہ بند کر دیجئے۔ یہ دروازے اطراف کے تختوں کے ساتھ مل کر میز کے بالائی تختے کے لئے عمدہ سہارا بن جاتے ہیں۔ جسے مرضی کے مطابق رکھا یا مٹایا جا سکتا ہے گویا مٹھنے والا اس میز کے سچھے بیٹھتا ہے۔ تخت میں ایک دراز بنا ہوتا ہے جس میں گرم رکھنا اور خوب جلے ہوئے کوئلے دہکا کر ڈالے جاتے ہیں۔ مسہری ایسی ہے کہ بیٹھ کر چاہیں تو کام کریں۔ اور تھک جائیں تو لیٹ جائیں۔ آئی کا دعویٰ تھا کہ سارا دن اس طرح سکے اور آرام سے کام کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ چار پانچ بڑے کوئلے چاہیں اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اگر اس ساری مسہری جیسی لکڑی کے ساتھ دو مضبوط بانس باندھ دجائیں تو باقاعدہ تمام جھام بجاتی ہے۔ اور سفر میں بھی کام آسکتی ہے۔ اس میں پاؤں

ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔ اور سفر کے دوران میں کھانے پینے کے وقت بھی سردی سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اس نے گرمی کے موسم کے لئے بھی ایک کرسی بنانے کا خیال کیا تھا۔ جو ایک غسل کے ٹب سے ملتی جلتی ہو۔ اور اس میں پکی مٹی کا ایک ٹب لگا ہو جس میں ٹھنڈا پانی بھر دیا جائے جو شرت کے عقب تک آئے اور اسے ٹھنڈا رکھے۔ مغرب کے لوگوں نے ہر قسم کی مسہریاں صوفے اور بال ترشوانے کے لئے بیٹھنے کی کرسیاں ایجاد کی ہیں۔ ان میں گھومنے والی مسہریاں مگنریاں اور صوفے ہیں۔ یہ ہو جانے والے اور جسم کے مطابق نیچے اوپر کر کے آرام دہ حالت میں بیٹھانے کیلئے کرسیاں اور صوفے بھی ہیں۔ ایسی مسہریاں بھی ہیں جن کو تہ کر کے کچھ کا کچھ بنایا جاسکتا ہے۔ مگر مغرب والوں کو نہ تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والی میزوں کی ایجاد کا خیال آیا ہے۔ نہ ایسے اسٹینڈ بنانے سوچے ہیں جن پر نادرات رکھے جائیں۔ اور جنہیں حسب ضرورت الگ الگ کیا جاسکے۔ چین میں یہ چیزیں ایک مدت سے رائج ہیں۔ اور ان کی بناؤٹ میں بڑی بڑی چائے کی دستیاں اور بھارت فن نظر آتی ہے جس میں میز کے حصے الگ الگ جاسکتے ہیں۔ اسے "ین چی" کہا جاتا ہے۔ ان کا اصول اس چینی کھیل سے لیا گیا ہے جو مغربی بچوں کے کھیل۔ لکڑی کے مربع ٹکڑوں کے کھیل سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں لکڑی کے مربع ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جن پر عجیب و غریب جانوروں۔ برتنوں وغیرہ کی شکلیں بنی ہوتی ہیں۔ اور ان ٹکڑوں کو باہم مختلف طریقوں سے ملانے سے کئی قسم کی شکلیں بنائی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ تین چی، قسم کے میز سے جس میں چھ حصے ہوں۔ ان چھ حصوں کو طائفے سے کئی شکلوں کا ایک میز بھی بنایا جاسکتا ہے اور انہیں چھ حصوں سے مختلف شکل کی کئی میز بھی بنائی جاسکتی ہیں۔ جو مربع، مستطیل یا ٹی (T) کی شکل کی ہوں۔ یا ان کے اوپر کے تختے مختلف زاویوں پر رکھے ہوں۔ ان چھ حصوں

سے تقریباً چالیس قسم کی میزیں جوڑی جاسکتی ہیں۔

اس قسم کی میزوں کی ایک اور قسم "تائے جی" ہے۔ "تتلی کے مشابہہ میز" اس کے ٹکڑے مثلث اور عمودی ہوتے ہیں۔ لہذا ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے سے جس قسم کی میزیں بن سکتی ہیں وہ شکل میں بہت زیادہ متنوع ہیں۔ "تین جی" قسم کی میزیں عام طور پر کھانا کھانے یا تاش کھیلنے کے لئے مختلف سائز کی میزوں کے طور پر ایجاد کی گئی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی ترکیب اور ساخت میں یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ عین دیکھا میں شمع ان کے لئے جگہ چھوڑ دی جائے۔ مگر تائے جی قسم کی میزیں نہ صرف کھانا کھانے کی میزوں کا کام دیتی ہیں۔ بلکہ ان کے ٹکڑوں کو مختلف طریقوں پر جوڑنے سے بھول اور نو اور رکھنے کے اسٹینڈ بھی بن جاتے ہیں۔ گویا اس کی ساخت میں زیادہ چیزوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ تتلی نما میز تیرہ حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کو باہم جوڑنے سے مربع شکل کی میزیں مستطیل میز اور شہت پہلو میز جن میں مختلف قسم اور تعداد کے سوراخ بھی ہوں بنائی جاسکتی ہیں۔ ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے کی گنجائش اتنی ہے اور ان سے ایسی عجیب عجیب چیزیں بنتی ہیں کہ انسان دیکھا کرے۔ سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ گھر کی مالکین ذوق سے کام لے کر ان ٹکڑوں کی باہمی ترتیب سے کیا کچھ بناتی ہے۔

کیا مشرق کیا مغرب ہر جگہ گھر کی مالک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر آرائش اور آسائش کی چیزوں کو نئے نئے انداز سے ترتیب دیتی رہے۔ یہ سلسلہ میں مندرجہ بالا قسم کی میزیں اسکے لئے لانا انتہا متنوع کا سامان مہیا کر سکتی ہیں۔ ایسی میزوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر جو شکلیں بنتی ہیں وہ بالکل جدید مذاق کے مطابق ہوتی ہیں کیونکہ جدید فرنیچر میں بھی نظم و پیچ کو چھوڑ کر سادگی اور خطوط کے سادگی اور

اور یہی خصوصیت چینی فرنیچر کی ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ سادگی بھی ملحوظ رہتی ہے اور اس میں بے شمار تنوع بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اپنے فرنیچر کی نئی ترتیب کیلئے سیدھا سادہ سانچہ یہ ہے کہ جب آپ کوئی گول یا مربع میز بنوانے لگیں تو یہ دو ٹکڑوں پر مشتمل ہو۔ مثلاً گول میز کے دونوں حصے نصف دائرے کی شکل کے ہوں اور مربع میز دو مثلثوں پر مشتمل ہو۔ یہ مثلثیں اپنے قاعدے پر مل کر ایک مربع بنائیں جب یہ گول یا مربع میز میں تاش کھیلنے کے لئے درکار ہوں تو ان کے دونوں ٹکڑے الگ الگ کر لئے جائیں اور ہاں کمروں کے کونوں میں اس طرح رکھ دیا جائے کہ مثلث کا بڑا ضلع یا نیم دائرے کا قطر دیوار کے ساتھ ہو۔ اب ان میزوں پر گلدان یا کتابیں یا نادر چیزیں رکھی جاسکتی ہیں۔ ایسی میزیں ضرورت کے مطابق چھوٹی یا بڑی بنائی جاسکتی ہیں۔ چائے کی میز اس طرح بنائی جاسکتی ہیں کہ وہ شکل میں دو ملحقہ مربعوں کی طرح نظر آئیں۔ جو ایک کونے پر آپس میں ملتے ہوں۔ یا وہ انگریزی حرف (T) یا یو (U) یا ایس (S) کی شکل کی میز کے گرد کھانے کے لئے بیٹھی ہو تو بڑی عمدہ نظر آسکی۔

ایسا بک کیس جس کے حصے الگ الگ کئے جاسکیں اس کا ایک نہایت عمدہ نمونہ جاپانگ شوئیں ملتا ہے۔ ویسے مغرب میں بھی ایسے بک کیس ہوتے ہیں۔ جن کے ٹکڑے الگ الگ ہوں۔ مگر اس چینی بک کیس کا کمال یہ ہے کہ اس کے ٹکڑے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ جب الگ الگ کئے جائیں تو ایک دوسرے کے اندر رکھے جائیں۔ اور سارے بک کیس کا حجم ایک بڑے سوراخ کیس سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ یہ قدیم چینی بک کیس اپنے انداز سے جدید زمانے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں ترمیم اور اصلاح کی جاسکتی ہے۔ تاکہ اس کے ٹکڑے جب الگ کئے جائیں۔ تو ان حصوں سے دو تین چھوٹے بک کیس بن جائیں۔ جو ۱۲ - ۱۸ - یا ۲۲ انچ لمبے ہوں۔ اور چھینیں

بستر یا صوفوں کے سر ہانے رکھ دیا جائے۔ پھر ان کی جگہ اس بڑے بکس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جو آج کل ہمیں ایسی جگہوں میں لامحالہ ہمیشہ نظر آتا ہے۔

اب کمرے کی اندرونی آرائش کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ اس سلسلہ میں چینی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سادگی اور گنجائش کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔ ایک عمدہ کمرے میں ہمیشہ فرنیچر کی چند چیزیں ہوں گی جو عام طور پر مہاگنی کی لکڑی کی ہوں گی ان کا پالش نہایت عمدہ ہوگا۔ اس کے خطوط سادہ ہونگے اور سروں پر تھوڑا سا خم ہوگا۔ مہاگنی کے اس فرنیچر کو ہمیشہ ہاتھ سے پالش کیا جاتا ہے۔ پالش کے اس فرق کے مطابق فرنیچر کی قیمتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ ہاتھ کے پالش پر بڑی محنت پڑتی ہے۔ پھر کمرے میں مہاگنی کی ایک لمبی میز جس میں دروازہ ہوں ایک طرف رکھی جاتی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں مہاگنی کے بنے ہوئے دو ایک اسٹینڈ ہوں۔ جن پر گلدان یا کچھ نادر چیزیں رکھی ہوں گی۔ دو ایک اسٹول بھی ہوں گے جو درختوں کی مڑی تڑی جڑوں جیسے پاؤں پر کھڑے ہوں گے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی الماری ہوگی جن میں نوادر یا کتابیں ہوں گی۔ اس الماری کے اندر کے تختے مختلف سائز کے ہوں گے جن سے ایک عجیب قسم کا جدید تاثیر پیدا ہوگا۔ دیواروں پر ایک یا دو قطعے ہوں گے جو یا تو خوش خطی کے کمالات کا نمونہ ہوں گے۔ یا ایسی تصویر ہوگی جس میں رنگ کم اور خالی جگہ زیادہ ہوگی اس تصویر کی طرح کمرہ بھی خالی خالی اور زندہ ہوگا۔ اسی لئے چینی گھروں کی امتیازی خصوصیت پیچر کے فرش کا صحن ہے۔ جو اپنے انداز میں مہاپاؤی ہانقا ہول سے ملتا جلتا ہے۔ یہی صحن سکون خاموشی اور طمانیت کا منظر ہوتا ہے۔

باب دوم فطرت کے مزے

- ۱- جنت گمشدہ
- ۲- عظمت آدم
- ۳- دو چینی خواتین
- ۴- چٹانیں اور درخت
- ۵- پھول اور پھولوں کی ترتیب
- ۶- گل دان
- ۷- چانگ چاؤ کے مقبولے

۱۔ جنت گمشدہ

ہماری اس زمین پر مخلوقات کا کوئی شمار نہیں مگر عجیب بات ہے کہ سارا عالم نباتات فطرت کے مظاہر کے بارے میں کوئی مخصوص رویہ نہیں رکھتا۔ عملی طور پر جان بھی قدرت کے بارے میں کسی رویہ پر عامل نہیں۔ بس ایک انسان ایسی مخلوق ہے جسے اپنی ذات کا بھی شعور ہے۔ اور جو اپنے ماحول کے بارے میں بھی باخبر ہے اسی لئے وہ ماحول اور گرد و پیش کے بارے میں ایک خاص رویے کا حامل ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی ذہانت کائنات کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتی ہے۔ کائنات کے چھپے بھیدوں کا کھوج لگاتی ہے۔ اور اس کائنات کا مدعا اور مقصد بیان کرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے بارے میں ہمیں ایک تو سائنسی رویہ اور دوسرے اخلاقی رویہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ سائنس کا آدمی اس سرزمین کی اندرونی تہ اور بیرونی تہ کی کیمیا۔ ہی ساخت اور ترکیب پر غور کرتا ہے۔ اس کائنات کے گرد جو فضا ہے اس کی موٹائی اور پھیلاؤ کا پتہ لگاتا ہے۔ اس فضا کی بالائی تہوں پر جو کائناتی شعاعوں کی چھوٹ پڑتی ہے ان کی مقدار ان کی ماہیت کی تحقیق کرتا ہے۔ اس زمین کی پہاڑوں اور چٹانوں کے اجزا کا پتہ چلاتا ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ زندگی کن تو انہیں کی عام طور پر پابندی کر رہی ہے۔ یہ سائنسی تحقیق اور دوسری سائنس کے بارے میں اخلاقی رویہ سے تعلق ضرور رکھتی ہے۔ لیکن اپنی جگہ یہ سرن معلوم کرنے اور تحقیق کرنے کی حوصلہ انگ کا نام ہے۔ اس کے برعکس کائنات کے بارے میں اخلاقی رویہ پوری

مختلف شکلوں میں ملتا ہے کبھی یہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کا نام ہے کبھی فطرت کو تسخیر کرنے اور اپنا محکوم بنانے کی ایک شکل ہے۔ کبھی فطرت پر قابو رکھنے اور اس سے مفید کام لینے پر مشتمل ہے۔ اور کبھی محض فطرت اور گرد و پیش سے ایک متکبرانہ تخیل ہے اور بس۔ اپنی دنیا سے یہ نجات پسندانہ تخیل۔ تہذیب اور مذہب کی ایک عجیب سی پیرا ہے۔ اسکا سرچشمہ اور منبع یہ کہانی ہے کہ ہم اپنی حیرت کو کھو کر اس دنیا میں رہنے پر مجبور کئے گئے۔ اور اس کہانی کا منبع مذہبی روایات ہیں جو اس کہانی کو آج بھی ثابت کر رہی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ آج تک کسی نے اس گم گشتہ بہشت کی کہانی کی سچائی پر اعتراض نہیں کیا۔ آخر وہ جنت عدن کتنی خوبصورت تھی۔ اور پھر ہماری یہ موجودہ دنیا کس حد تک بد صورت ہے۔ کیا آدم و حوا کی اس اولین لغزش کے بعد زمین پر پھولوں نے کھلنا چھوڑ دیا ہے۔ کیا اللہ نے ایک انسان کے گناہ کی پاداش میں سید کے درخت پر اپنی لعنت مقرر کر دی ہے کیا یہ درخت اب پھلتا پھولتا نہیں۔ کیا اسکے ٹکڑوں کے رنگ اب بڑے اور بے نور ہیں۔ کیا زمین پر اب بیل اور قریاں اور گلے والے پرندے نترہ سہرا نہیں رہے۔ کیا اب پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے محروم ہیں۔ اور ٹھیلوں میں ان کا سایہ نہیں پڑتا۔ کیا آج بھی عרב آفتاب پر شفق نہیں پھولتی؟ آسمانوں پر چاند نہیں ہوتی۔ پہاڑی گاؤں پر نیلی دھند نہیں ہوتی۔ آبتاریں اور چھرنے گرتے نہیں۔ چشمے گنگتے نہیں۔ اور درختوں کا سایہ ٹھنڈا نہیں ہوتا؟ پھر یہ کہانی کس طرح اتنے آسان ہے کہ جنت تو ہم سے چھین گئی۔ اور اب ہم ایک ملکہ بہیت دنیا کے باسی ہیں۔ بس یہ ہے کہ ہم خدا کی ہنایت ناشکر گزار اور بگڑی ہوئی مخلوق ہیں۔

اس بگڑنے پچے کے بارے میں ایک مثالیہ حکایت لکھنی لازمی ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ گاؤں کے ایک آدمی دنیا میں رہتا تھا۔ جس کا نام ہم آج بھی نہیں بتائیں گے وہ خدا کے

پاس آیا۔ اور شکایت کی یہ دنیا اس کے رہنے کے قابل نہیں۔ اس نے خدا سے کہا۔
 مجھے ایسی جزت چاہئے جس کے دروازے موتیوں کے ہوں۔ خدا نے آسمان پر چمکتے
 ہوئے چاند کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ کیا تمہارا دل پہلانے کو یہ کھلونا کافی نہیں
 انسان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر خدا نے اُسے دور نیلی پہاڑیاں دکھائیں اور پوچھا
 کیا ان کے خطوط دل آویز نہیں۔ انسان نے کہا یہ عام اور معمولی چیزیں ہیں۔ اس پر خدا
 نے اسے پھولوں کی پنکھڑیاں دکھائیں۔ اور کہا تم ان مٹھلی پنکھڑیوں کو چھو کر دیکھو اور
 بتاؤ کیا ان کے رنگ بے مثال نہیں؟ انسان نے جواب دیا جی نہیں، خدا نے اپنے
 بیکراں صبر سے کام لیتے ہوئے انسان کو اپنی آبی کائنات کا جائزہ دکھایا اور اس
 جگہ اس نے انسان کو جزیرہ ہوائی کی مٹھلیوں کے گہرے خوبصورت رنگ اور ان کی
 عجیب و غریب شکلیں بھی دکھائیں۔ انسان نے کہا یہ سب برکات ہے۔ مجھے اللہ سے کوئی
 دلچسپی نہیں پھر خدا انسان کو ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے لے گیا۔ اور ٹھنڈا
 ہوا کو چلنے کا حکم دیا۔ اور انسان سے پوچھا۔ کیا تمہیں اس کا مزہ نہیں آتا؟
 انسان نے کہا مجھ پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بعد خدا انسان کو
 ایک پہاڑی جھیل پر لے گیا۔ اس نے اس انسان کو جھیل کے پانی کی دمک دکھائی۔
 دیو دار کے شکل میں سے گزرتی ہوئی سنسناتی ہواؤں کا نغمہ سنوایا۔ چٹانوں کا گون۔
 اور جھیل میں ان کا اور کئی شان دار چیزوں کا عکس دکھایا۔ مگر انسان نے کہا ان باتوں
 سے میرے دل میں کوئی گرجو شمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس پر خدا نے سوچا کہ میری یہ مخلوق
 حلیم الطبع نہیں ہے۔ اس لئے اسے زیادہ سنسنی خیز نظارے چاہئیں۔ خدا اُسے راکی
 پہاڑیوں کی چوٹی۔ اور اتھاہ غاروں کے دہانوں پر لے گیا۔ اسے ریت کے بیکراں ٹیلے
 دکھائے جلتے ریگستانوں میں جھلسی ہوئی نباتات کے نظارے کرائے یہاں یہ کی لافانی برت

اور دریائے یانگسی کے دہانے کی چٹانیں دکھائیں۔ زرد پہاڑوں کی سنگین چوٹیاں اور نیاگرا آبشار کے خوفناک پابینوں کا نظارہ کرایا اور پھر پوچھا۔ کیا میں نے اس سرزمین کو تمھاری آنکھوں دکھارے گا تو اور تمھارے پیٹ کے لئے ایک خوبصورت ترین جگہ بنانے کے لئے ہر ممکن نعمت نہیں بخشی ہو مگر انسان نے پھر بھی شور مچایا مجھے تو موتیوں کے دروازوں والی جنت چاہئے اور بس۔ یہ سرزمین میرے لئے ٹھیک جگہ نہیں۔ اور نہ یہ میرے لائق ہے۔ خدا نے اس پر جلال سے کہا۔ کیوں ادا تکرے اور گستاخ چو ہے۔ میری یہ دنیا تیرے لئے اچھی جگہ نہیں؟ تو پھر میں تجھے دوزخ میں بھیجتا ہوں۔ جہاں تم کبھی آسمان پر تیرتے ہوئے بادل۔ شگوفوں سے لدے ہوئے درخت گھاتے ہوئے جھرنے اور آبشار نہ دیکھ پاؤ گے۔ نہ ان کے نغمے سنو گے۔ اور ہمیشہ اسی دوزخ میں رہو گے۔ چنانچہ خدا نے ابا انسان کو شہر کے ایک تنگ گمے میں رہنے کے لئے بھیجا۔ اس شخص کا نام عیسانی تھا۔

ظاہر ہے کہ اس انسان کو خوش کرنا بڑا مشکل ہے۔ خدا اگر اس کی مرضی کے مطابق ایک جنت کی تخلیق کر دے تو یہ جنت بھی اس انسان کو شاید ہی مطمئن کر سکے۔ انسان کو دولت کا جو جنون ہے اس کی بدولت وہ دوسرے ہفتہ کے اندر ہی موتیوں کے دروازوں والی جنت سے بے طرح اکتا جائے گا۔ اور خدا کو پھر اس ناشاکر گزارا در بگڑے بچے کو خوش کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ نئی تخلیق کرنی پڑے گی مگر یہ یاد رہے کہ موجودہ علم ہیئت نے آنکھ سے نظر آتی والی کائنات کے تحقیق کرنے کے سلسلے میں ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ خود یہ زمین بھی ایک جنت ہے اور ہم جس جنت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں وہ آخر کسی نہ کسی نضا اور مکان میں ہوگی لامکان نہیں ہو سکتی اس صورت میں یہ جنت نضائے آسمانی کے ان تاروں اور سیاروں ہی میں نہیں ہونی چاہئے۔

یہ حُزب کسی ستارے میں ہے جس کے ساتھ کچھ چاند بھی ہوتے ہیں۔ یا بعض ستاروں کے ساتھ ان کے اپنے چاند نہیں بھی ہوتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری اس زمین سے بہتر کونسا ایسا ستارہ ہے جس میں یہ حُزب ہو سکتی ہے۔ یہ ماننا کہ بعض سیاروں کے ساتھ کسی کئی چاند ہوتے ہیں۔ چلئے ہمارے برعکس وہاں ایک چاند کے بجائے ایک درجن چاند سہی۔ جو گلکابی۔ قرمزى۔ نیلے۔ ہرے۔ نارنجی غرض ہر رنگ کے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں کی طرح اس ستارے میں دھنک لیا نایاب نہیں ہوگی۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ باقیہ دھنک دکھائی دیا کرے گی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ جو انسان ایک چاند سے خوش نہیں ہوتا وہ ایک درجن چاندوں سے بھی اکتا جائیگا اور جو انسان یہاں کبھی کبھار دکھائی دینے والے ایک دھنک اور کبھی کبھار کی برفاری سے مطمئن نہیں ہوتا وہ بار بار دکھائی دینے والی دھنک سے تو بہت جلد تنگ آ جائیگا یہ بھی ماننا کہ جنت یا اس ستارے میں چار موسموں کی بجائے سالی میں چھ موسم ہوں گے۔ اور بہار اور گرما اور دن کا یہ حسین چکر بھی اسی طرح ہوگا۔ مگر اس سے فرق کیا پڑے گا۔ اگر ایک شخص اس دنیا کی بہار اور گرما سے لطف نہیں اٹھا سکتا تو وہ اس جنت کی بہار سے کیا اور کیسے لطف اٹھائے گا؟

ممکن ہے میری باتیں آیکو بڑی احمقانہ یا بچید و ناشمندانہ معلوم ہوں۔ مگر میں بودھوں یا عیسائیوں کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ جنت کو ایک لامکاں چیز اور خالصتاً فرح کی ایک لطیف تعبیر تصور کر لوں۔ اور انسانی جو اس اور زندگی کے تھوس حقائق سے فرار اختیار کر لوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے اس ستارے زمین پر رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ دنیا کا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہماری اس زمین کی زندگی غیر دلچسپ کساں اور بالکل بے مزہ ہے۔ اگر کوئی شخص زمین کے موسموں کے تنوع بہانے کے

بدلتے رنگوں مختلف موسموں میں باری باری سے بکتے ہوئے پھلوں کی لالائی مہلک
اور مختلف ہینوں میں کھلنے والے پھولوں کی شگفتگی سے مطلقاً نہیں ہے تو اسے خودی کر
چاہئے۔ ہمیں ناممکن جنت کے کھوج میں سرگرداں نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ جنت
خدا کو مطمئن کر دے تو گردے انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتی

ہر کیف زندگی کے حقائق سے ہمیں واسطہ ہے اور حقائق یہ ہیں کہ
فطرت کے نظاروں اور اس کی آوازوں۔ اس کی خوشبوؤں اور اس کے رنگوں
اور انسان کے دیکھنے۔ سننے۔ سو گھنے اور چکھنے کے حواس کے درمیان ایک نہایت مکمل
نہایت لطیف اور روحانی قسم کا تال میل موجود ہے۔ کائنات کے نظاروں
اور آوازوں اور انسان کے حواس کے درمیان یہ تالی میل اتنا مکمل اور ہمہ گیر
ہے۔ کہ اس سے غایت کے فلسفے رکہ کائنات کے تمام تغیرات کسی مقصد کے
تحت ہوتے ہیں، کے لئے ایک نہایت پکی دلیل مل جاتی ہے۔ نیز اس غایت
اور مقصد سے قطع نظر یہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے ان نعمتوں کے لئے ہمیں دعوت
دی ہو یا نہ دی ہو۔ چینی نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ ہم بلائے یا بن بلائے ہر طرح
شریک دعوت ہو کر رہیں گے۔ جب دعوت میں رکھے ہوئے کھانے اتنے عمدہ ہوں
اور ہمیں بھوک بھی لگی ہو تو پھر ان نعمتوں کا مزہ نہ لینا بڑی بے وقوفی کی بات
فلسفیوں کو اپنی مابعد الطبعیاتی تحقیقات میں لگے رہنے دیجئے۔ اور یہ معلوم کرنے
دیجئے کہ ان نعمتوں کے لئے ہماری حیثیت ہلانے ہوئے ہمالوں کی ہے۔ یا نہیں
عقل مند آدمی وہی ہو گا جو ان نعمتوں کے چھین جانے سے (کھانا ٹھنڈا ہونے سے)
پہلے ہنسیں چکھ لے گا۔ کیونکہ بھوک کا تعلق ہمیشہ عملی سوچ بوجھ سے ہوتا ہے۔
ہمارا یہ سارا یہ زین بہت اچھی جگہ ہے۔ پہلی خوبی اس میں ہے کہ یہاں

دن رات کا تغیر ہے۔ صبح اور شام میں فرق ہے۔ گرم دن کے بعد ٹھنڈی شام آتی ہے۔ ایک مصر و ن صبح سے پہلے ایک خاموش اور صاف صبح صادق ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ دوسری خوبی گرما اور سرما کا ادل بدل ہے جو اپنی جگہ مکمل ہے۔ ان دونوں موسموں کو رفتہ رفتہ بہار اور خزاں بدلتی ہیں۔ اور اس تغیر سے کوئی چیز عمدہ نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں خاموش اور باوقار درخت اگتے ہیں جن سے ہمیں چھاؤں ملتی ہے۔ یہ درخت سر ماس میں سورج کی روشنی کو روکتے ہیں۔ اور اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی جو کبھی کبھی یہ ہے کہ کھلتے ہوئے پھول ہیں۔ اور مختلف مہینوں میں مختلف پھول یک کر تیار ہوتے ہیں اور اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ پانچویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں ابر آلود اور دھند کے دن صاف اور ٹھیکے دنوں کے ساتھ باری بدل کر آتے ہیں۔ اور ان سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ چھٹی خوبی یہ ہے کہ یہاں ہمارے بارشیں اور گرمائی گرج اور جھک کے ساتھ مینہ کے برستے جھالے ہیں۔ پھر خزاں کا خشک اور کراہا موسم آتا ہے۔ اور ان کے بعد سر ماس میں برف باری ہوتی ہے۔ اور اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔ ساتویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں طوطے اور مور۔ بلبلیں مہرے اور کناری اپنے نغموں سے ہمیں رھلتے ہیں۔ اور اس سے بہتر اور کیا بات ہے؟ آٹھویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ یا گھر بھی ہے جس میں بندر شیر رکھو اور شاہ جہتی گینڈے مگرچھ۔ دریائی گھوڑے۔ گائیں گھوڑے کتے بلیاں۔ گیدڑ گھوڑے کھٹ بڑھی اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اور نہ جانے کیوں کن خوبیوں کا حامل ہے اور اس سے بہتر اور کیا چیز ہے۔ نویں بات یہ ہے کہ یہاں ہمارے ہونے والے مہینوں میں مختلف مہینوں کا لہر مہل جھینکا۔ صدنی اور نہ جانے کن کن مہینوں اور کن کن خوبیوں کی مہلیاں ہیں اس سے بہتر اور

ہوگا۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں تناور دیودار آگ گلتے ہوئے تشنشاں پہاڑ۔ مہیب غار شاندار چوٹیاں۔ بلند و پست پہاڑیاں خاموش پر سکون جھیلیں۔ بل کھاتے ہوئے دہلیا۔ سرسبز اور ٹھنڈے سایوں والے کنارے
 ... ہیں۔ اور اس سے کیا بہتر چیز ہوگی! اگر یا اس قدرت کی نعمتوں کی نہر سرت ایسی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور اس میں ہر مذاق اور ہر طبعیت کے شخص کے لئے پورا انتظام موجود ہے۔ بس عقل مندی اسی کا نام ہے کہ آگے بڑھ کر اس خوانِ نعمت میں شریک ہو جائیے۔ اور زندگی کی یکسانیت اور بے رنگی کی شکایت چھوڑ دیجئے۔

۲۔ عظمت آدم

فطرت اپنی جگہ ہمیشہ سے ایک سینی ٹوریم ہے۔ یہ چاہے انسان کی کسی اور بیماری کا علاج کرے یا نہ کرے اسے اپنی بڑائی کے خبط سے ضرور نجات دلوادیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو بھی اس کی حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے۔ اور انسان کی اصلی حد اس کی صحیح اوقات اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے فطرت کے پس منظر میں دیکھیں۔ اسی لئے چینی تصویروں میں جب مناظر فطرت دکھائے جاتے ہیں تو ان میں انسان کا پیکر بہت ہی چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ ایک مشہور منظر یہ تصویر برقیاری کے بعد پہاڑ کا منظر اکیٹالیر سے منظر ہے۔ اس میں وہ انسانی پیکر ڈھونڈنا دشوار ہو جاتا ہے جو برت باری کے بعد پہاڑ کا منظر دیکھ رہا ہے۔ بڑی احتیاط سے کھوج لگانے کے بعد یہ انسان ایک دیودار کے درخت کے نیچے نظر آتا ہے۔ اس کا پیکر زیادہ سے زیادہ ایک اچھ ہوگا حالانکہ یہ تصویر کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ سو لگ خاندان کے وقت کی ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ جزا کے دور میں چار اہل علم ایک جنگل میں پھر رہے تھے۔ اور سرسراٹھا کر عظیم الشان

تتا اور درختوں کی پہچان شاخوں کی طرف دیکھ رہے ہیں درختوں کے مقابلے
 انکے پیکر اتنے حقیر اور چھوٹے ہیں کہ کیا کہئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنے آپکو چھوٹا محسوس کرتے
 میں بعض دفعہ بہتری ہوتی ہے۔ اسی لئے چینی لوگوں کے نزدیک پہاڑوں کا ایک عظیم
 سلسلہ دیکھ کر انسان کے دل کی صفائی ہو جاتی ہے۔ اس کا مل فضل متبادل و
 غیر ضروری تشویش اور اپنی بڑائی کے فالتو خیالات سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔
 آدمی اکثر یہ بھول جایا کرتا ہے کہ وہ کتنا حقیر ہے اور کتنی بیکار مخلوق ہے
 سو منزل ادبھی عمارت کو دیکھ کر انسان کا دل غرور بھر جاتا ہے۔ اس ناقابل
 برداشت گمنام کو دور کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ اس نام نہاد عظیم عمارت کو ایک
 پہاڑ کے دامن میں تصور کیجئے۔ پھر آپکو معلوم ہو جائے گا کہ کس چیز کو عظیم کہنا چاہئے۔
 اور کسے عظیم نہیں کہنا چاہئے۔ جس طرح تالاب کے مقابلے میں سمندر کی بیکراں وسعت
 ہی ہمیں پسند آتی ہے۔ اسی طرح اس عمارت کے مقابلے میں پہاڑ کا بلند اور بڑا ہونا
 ہی ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ہوا نگ شان کے پہاڑوں اور رزد پہاڑوں میں ہی اسی جوہر
 ہیں جو سرتاپا ایک ایک ہزار فٹ کی تہنا چٹان پر مشتمل ہیں اور کوئی آدھا ڈھل
 پھیلاؤ میں چلی گئی ہیں۔ یہی وہ چوٹیاں ہیں جنہوں نے چینی آرسٹوں کے دل پر
 کئی انگ پیدا کی۔ ان چوٹیوں کی سنگین عظمت اور ان کی ظاہری لازوال صورت
 اور ان کے سکوت نے چینی تصویروں میں چٹانوں کے لئے اتنی جگہ اتنی محبت پیدا
 کی۔ جب تک ہوا نگ شان نہ جائیں یقین نہیں آتا کہ دنیا میں اتنی بڑی چٹانیں ہی
 ہوں گی۔ سترھویں صدی عیسوی میں چینی مصوروں کا ایک ہوا نگ شان سکول
 بھی ملتا ہے جس نے انہیں سنگین چٹانوں کے رسکوں و سکوت سے تخلیق کی تھی اور ہوا نگ
 حاصل کی۔ مگر فطرت کے ان عظیم مظاہر اور وسیع پہنائیوں کے ساتھ انسان اگر تعلق رکھے

نو اس کے دل میں بھی سچی عظمت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں پھر یہ نظر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پھیلی ہوئی قدرت کے مظاہر کو ایک متحرک تصویر سمجھے اور جو تصویر اس سے چھوٹے پیمانے پر نظر آئے اس سے مطمئن نہ ہو۔ افق پر دوڑتے ہوئے کالے بادلوں کو زندگی کے ایسٹج کا پس منظر خیال کرے۔ اور اس سے کمتر درجے کے پس منظر سے اسکی تسلی نہ ہو۔ پہاڑوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں کو اپنے خانہ باغ کے طور پر دیکھے۔ اور ان جنگلوں سے چھوٹے کسی باغ پر مطمئن نہ ہو۔ سمندر کی آڈنی گرجتی لہروں کو کسی سٹیج پر کھڑے مئے اور اسے کمتر اور ہلکی موسیقی اسے تسلی نہ دے سکے۔ پہاڑی ہواؤں کو کمروں کو کھنڈ کرنے والی مشینی ہوا کے طور پر خیال کرے اور پھر اسی نظام خنکی کے سوا اسے تسلی نہ ہو یہی عظمت ہے وہ عظمت جو پھیلی ہوئی زمین اور اوپر تے ہوئے آسمانی سائبان میں ہے۔ یوآن سی (۲۱۰ سے ۶۲۶۳) نے جو چین کا پہلا
رومانی شاعر تھا۔ اسی چیز کو اپنے انداز میں کہا ہے کہ اس عظمت کے بلجانے سے
ہم آسمان اور زمین کو اپنا گھر سمجھ کر آباد کرتے ہیں۔»

میں نے بہترین قدرتی منظر جو آج تک دیکھا وہ ایک شام بحر ہند میں نظر آیا تھا۔ یہ منظر حقیقی معنی میں لامحدود تھا۔ اس منظر کا ایسٹج ایک سویل چوڑا اور تین میل اونچا تھا۔ اس ایسٹج پر قدرت نے آدھے گھنٹے کا ایک ڈرامہ کھیلا۔ ہمیں کبھی تو بڑے بڑے اژدہا حصہ لیتے تھے۔ کبھی مہیب رنگینے والے جانور جو اب صفحہ مستی سے ناپید ہیں۔ اور کبھی بڑے بڑے شیر تھے۔ یہ سب آسمان پر پھر رہے تھے۔ کبھی شیروں کے سر بڑھتے بڑھتے بہت بڑے ہو جاتے ان کی ایالیں فضا پر بچھ بچھ جاتیں۔ اژدہوں کی کمریں عضد سے بل کھانے لگتیں اور کبھی سفید اور نکلی وردیوں کی پلٹنیں آسمان پر دوڑنے لگتیں۔ ان میں طلانی نشاؤں والے فخر بھی ہوتے

یہ فوجیں آپس میں ٹکرائیں۔ آگے بڑھ کر مارچ کرتیں۔ پھر سپاہی ہو جاتیں۔ یہ لڑائی اور یہ تعاقب جاری تھا کہ اسٹیج کی روشنیاں ایک ایک بدل گئیں۔ سفید وردیوں کی سپاہی اب نارنجی وردیوں میں ملبوس نظر آنے لگے اور خاکی وردیوں والی پلیٹیں سُرخ وردی میں آگے بڑھیں اس منظر پر گھلے ہوئے سُرخ سونے کا ایک لالتنا ہی پردہ آگیا۔ پھر قدرت کے اسٹیج کے کارکنوں نے رفتہ رفتہ اسٹیج کی روشنیاں مدہم کرنی شروع کیں۔ تو قرمزی رنگ بڑھ کر ہزار بجی اور سُرخ رنگ پر چھا گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ گہرے ارغوانی اور بھورے رنگوں میں گھلنے لگا۔ آخری پانچ منٹ میں اس رنگ نے ناقابل پیمانہ اکتیسے اور کھلے پر بادی کا نقشہ پیش کیا اور پھر دھیرے دھیرے اسٹیج کی روشنیاں بجھ گئیں۔ یہ زندگی کا سب سے عظیم سب سے شاندار ڈرامہ ہے۔ جو میں نے دیکھا اور اسے دیکھنے کے لئے میں نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

پھر پہاڑوں کا سکوت ہے جو ہر دکھ و لہر کو دور کر سکتا ہے خاموش چوٹیاں۔ خاموش چٹانیں۔ خاموش اشجار۔ ہر چیز کی خاموشی میں وقار اور عظمت ہے ہر اچھا پہاڑ اپنی جگہ ایک سینی ٹوریم ایک صحت گاہ ہے اسکی گرد میں ایک بچہ کی طرح رام کرنے میں ایک بڑی راحت اور سکون ملتا ہے۔ میں ویسے روحانی علاج کا قائل نہیں مگر میں چرانے تناور درختوں اور پہاڑی پر فضا مقامات کی روحانی صحت اور تاثیر کا سختی سے قائل ہوں۔ یہاں ٹوٹے ہوئے کندھوں کی ہڈیاں یا خاش زودہ کھال کا علاج نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیوی زندگی کی حرص و ہوا اور روح کی بیماریوں مثلاً بے ضرورت چوری کرنے کے خبط۔ اپنی بڑائی کے خبط۔ خود غرضی اور خود پسندی کے خبط۔ روحانی غلامی روحانی حکمرانی کے خبط۔ دوسروں کی زندگی کو اپنے ماتحت رکھنے کے جنون جیسا کہ جن نفرت تحفیر سماجی نمود نمایش کے جنون عام بے سمجھی اظہار کو دھڑکی اور ہر قسم کی بدتمیزی و بدرفتاری

کا علاج ہوتا ہے۔

دوپنی خواتین

فطرت کے مظاہر سے لطف اٹھانا ایک آرٹ ہے جس کا دار و مدار اپنے انداز طبیعت اور اپنی شخصیت پر ہے۔ ہر آرٹ کی تکنیک بیان کرنا مشکل ہوتا ہے یہی حال اس آرٹ کا ہے۔ لطف کی ہر چیز پر چستہ اور قدرتی طور پر پیدا ہوتی چاہئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی دل ہی سے بات اٹھنی چاہئے۔ اس لئے کسی پٹر یا پردے کو دیکھ کر خطا اٹھانے کا کوئی لگا بندھا قاعدہ بیان کرنا مشکل ہو گا نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ایک منظر سے ایک خاص وقت میں کیسے لطف لیا جائے کیونکہ کوئی سے دو قدرتی مناظر ایک سے نہیں ہوتے۔ جو لوگ فطرت کے رمز کو جانتے ہیں وہ بتائے بغیر بھی اس سے خطا اٹھانے سے بچا رہیں۔ خلوت میں میاں بیوی کے باہمی احتلاط اور پیار محبت کے بارے میں مشہور ماہر جنسیات ہیولاک ایلس۔ اور فان ڈر ویلڈ لکھتے ہیں۔ کہ اس احتلاط میں کون چیزوں کی اجازت ہونی چاہئے۔ اور کونسی چیزیں ممنوع یعنی چاہئیں۔ یا اس احتلاط میں ذوق سلیم کیا ہے۔ اور بد ذوقی کو کون چیزوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں قاعدوں۔ ضابطوں میں نہیں بتائی جاسکتیں بس ان کا فیصلہ اس جوڑے کے صحیح وجدان اور سوجھ بوجھ پر ہے۔ قدرت سے لطف اٹھانے کے بارے میں بھی یہ مثال بالکل صادق آتی ہے۔ شاید اس سلسلہ میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کے حالات عبور سے پڑھے جائیں۔ جو فنون لطیفہ کا صحیح ذوق لے کر پیدا ہوئے۔ تھے۔ اس افتاد طبع کا شخص کہیں چھپتا مخفوز ای ہے۔ اور جو ادیب قدرت کے مظاہر

کا صحیح ذوق رکھتا ہے۔ وہ اپنی کہانی کا سلسلہ یا پلاٹ کی ساری کڑیاں چھوڑ کر اکثر برف باری کے کسی خوبصورت منظر یا بہار کی شام کے تذکروں میں اپنے تفصیلی بیان میں کھو جایا کرتا ہے۔ عام طور پر اخبار نویسوں اور سماجی ہستیوں کے خود نوشت سوانح حیات میں پڑنے والی واقعات کی یادیں تازہ کی جاتی ہیں میرے نزدیک ادبی شخصیتوں کے خود نوشت سوانح حیات میں زیادہ تر کسی خوش گو اور بات کسی دوست کے ساتھ کسی حسین وادی کی سیر کے تذکرے ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجھے مشہور انگریز ناول نویس شاعر اور افسانہ نگار کپلنگ اور انشا پر داز چیمبرلین کی خود نوشت سوانح حیات سے بڑی مایوسی ہوئی تھی ان لوگوں نے اپنی زندگی کی اہم چیزوں اور واقعات کو غیر اہم کیوں سمجھا اور غیر اہم واقعات کو اہم کیوں گردانا۔ ان کتابوں میں ہر جگہ انسان انسان اور انسان انسان کا ذکر ہے۔ اور کہیں پھولوں پر ندوں کی پہاڑیوں اور شہر کا ذکر موجود نہیں چلتی ادیبوں کے تذکروں اور ان کے خطوط اس لحاظ سے بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بات اہم ہے کہ اپنے خط میں دوست کو ٹیلنار لکھنا بسیر کی ہوئی رات کا تذکرہ لکھا جائے۔ اور خود نوشت سوانح میں یہ لکھنا تو سچ لازم ہے کہ خوشی کا کوئی دن کیسے اور کس طرح گزرا۔ کچھ چینی ادیبوں نے تو خاص طور پر اپنی شادی کی متاہل زندگی کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان میں ماؤ پچیانگ کی کتاب میری محبوبہ کی یادیں اور سوانح شین شان کی کتاب رداں زندگی کے چھ باب۔ چلیک مان کی کتاب چراغ کی روشنی میں گزری ہوئی زندگی کی چند یادیں، اس قسم کی بہترین کتابیں ہیں۔ پہلی دو کتابیں شہر میں اپنی بیویوں کے انتقال کے بعد لکھیں۔ اور آخری کتاب صنعت نے اپنے بڑے باپ کی جیسی جیسی

زندہ تھی۔ ہم اسی آخری کتاب چرائی کی روشنی میں گزری ہوئی زندگی کی چند یادیں! سے اقتباس لیتے ہیں۔ ان سطور کا ردائے سخن ان کی ہیروئن مصنفہ کی بیوی۔ چچی یو کوئی طرف ہے۔ اس کے بعد میں ارواں زندگی کے چھ باب میں سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔ جس کی ہیروئن یون ہے۔ یہ دونوں خواتین طبع سلیم رکھتی تھیں۔ اگرچہ دونوں کی دونوں زیادہ تعلیم یافتہ یا اتنی اچھی شاعرہ نہ تھیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر کسی کو بھی غیر فانی شعر لکھنے پر ادھا نہیں کھالینا چاہئے بلکہ یہ سیکھنا چاہئے کہ کسی اہم لمحے کسی ذاتی موڑ کو نظم میں کیسے قلم بند کر لینا چاہئے یا یہ کہ نظم کی بدولت منظر ہر نظرات سے لطف اٹھانے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔
تو اب پہلا تذکرہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ چچی۔ یو نو

✓ مجھ سے کسی بار چچی۔ یو نو نے کہا۔ آدمی کی زندگی کل سو برس کی ہوتی ہے اور اس میں آدھا حصہ غنیمت اور سپینوں کا ہوتا ہے۔ بیماری اور عم کے اندیشے باقی آدھا حصہ لے جاتے ہیں۔ اور ہر آدھا حصہ تو پڑوں کے دنوں میں (شیر خوری) اور پھر سخت بڑھاپے کے دنوں میں نکل جاتا ہے۔ گویا ہمارے پاس ان سو برسوں میں سے صرف پانچواں۔ یا دسواں حصہ بچتا ہے۔ اس کے علاوہ اگرچہ ہمیں بیداری سے بنایا گیا ہے۔ لیکن ہمیں سو برس جینے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہئے۔

ایک رات خزاں کا چاند پورے جوہن پر تھا۔ چچی یو نو نے خادمہ سے کہا کہ رباب لے کر میرے ساتھ چل معزنی جھیل کے نیلوفر کے پھولوں میں کشتی چلائیں گے یہ

نہ یہ چینی حساب کچھ ایسا ہی ہوتا ہے پریشان ہونے کی بات نہیں (حاشیہ از مصنفہ)

اس وقت مغربی دریا سے گھر واپس آ رہا تھا۔ میں گھر پہنچا تو جی یو فونکشی کی سیر کو جا چکی تھی۔ میں نے کچھ خر بوزے خریدے اور اس کے پیچھے گیا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ پو کے کنارے دوسرے پل پر ہوئی۔ جی یو فونکشی میں خزاں کی آندھ کا ٹھکانہ نرساز پر بجا رہی تھی۔ میں نے چٹو سمیٹ لیا اور نغمہ سننے بھٹ گیا۔ اس وقت گرد و پیش بہاؤ شام کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور چاند تاروں کے ہلکے عکس پانی میں نظر آ رہے تھے کسی نغمہ طراز صدائیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میں امتیاز نہیں کر سکتا کہ یہ ہوا کے جھونکوں کا نغمہ ہے۔ یا سیپ کے ظروف کی جھنکار ہے۔ جی یو۔ نو کا نغمہ ختم ہونے سے پہلے کشتی گھومتے پانیوں کے باغ کے کنارے آگئی۔ ہم نے کشتی سے اتر کر ابر سفید کی خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹا یا۔ کیونکہ وہاں کچھ راہبہ خواتین کو ہم جلتے تھے۔ ان راہبہ خواتین نے جلد تیار کر کے ہمیں تازہ زرد نیلو فر کھلائے جو کھینی میں یکے ہونے تھے۔ ان کا رنگ اور ان کی خوشبو آنتوں کو سکون دینے کے لئے کافی تھی۔ اور ان کا مزہ دھیا بھر کے گوشت اور روغنی سالنوں سے بالکل مختلف اور بالاتھا۔ وہاں میں ہم تو ان کے پل پر کشتی سے اترے۔ یہاں کنارے پر ہم نے بائس کی چٹائی بچھائی اور بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شہر کا دورے آتا ہوا ہلکا سا شور کاؤں کو پریشان کرتا تھا۔ جیسے نکھیاں بھنبھناتی ہیں۔۔۔۔

پھر رفتہ رفتہ آسمان پر مارے ماند ہوتے گئے۔ اور جیل بر گہری سفید دھند چھا شہر کی فصیل سے نوبت بچی۔ اور ہمیں معلوم ہوا کہ چوتھا پہرہ صبح کے تین بجے کے لگ بھگ شروع ہو گیا۔ ہم نے سارا اٹھایا اور کشتی کھینتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

جی یو فونکشی کیلئے کا جو ذہن بویا تھا اس کے پتے خوب بڑے ہو چکے ہیں۔ اور ان کا سبز سا یہ جھللی پر پڑتا ہے۔ خزاں میں نکلنے کے سہارے لینے ہوئے

ان پتوں پر برستی بوندوں کا شور سن کر دل بے طرح بے کل ہو جاتا تھا۔ ہلکے میں
مذاق مذاق میں ایک دن ایک پتے پر لکھا۔

یہ پوچھا بویا کس نے؟

صبح کو مچا بے شور

شام کو بھی غوغا ہو!

اگلے دن میں نے دیکھا کہ اسی پتے پر تین اور مصرعے لکھے ہیں جو یہ تھے۔

تم ہوتہنسا جو بے کلی میں

کیلوں کے لئے یہ بیقرار رہی؟

کیلوں کے لئے یہ شرمساری؟

مصرعوں کے حروف نازک نازک تھے۔ اوان سے چی۔ یوفو کی شوخ طرز صفا

نمایاں تھی۔ لیکن اس شوخی سے بھی مجھے کچھ نہ کچھ حاصل ہو گیا۔

ایک رات ایسی آئی کہ ہم نے باہر ہواؤں اور بارش کا شور سنا اور بیکریں

اندھتہر کی ٹھنڈک سے محسوس ہوا کہ یہ خزاں کی خنکی ہے۔ چی یوفو رات کیلئے بس

تبدیل کر رہی تھی۔ میں پاس بیٹھا تھا۔ اور ایک الہم کو دیکھ چکا تھا جس میں سو بھول تھے

ان پھولوں کے لئے میں عنوانات تجویز کر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے کسی زرد پتوں کو

زمین پر گرتے سنا۔ اور اس پر چی پوچھنے پر مصرعے گا کر سنائے۔

کل کا دن آج سے بہتر ہی گزارا میں نے

میں بھی ہوں سال گزشتہ سے معمر اس سال

میں نے ان انگلیں مصرعوں پر اس کے دل کی تشفی کی ہیں نے کہا کوئی شخص ہر سال زندہ

نہیں رہتا۔ ہمیں دوسروں کے آنسو پوچھنے (خزاں زدہ پتوں کا گرنا) کا دستاویز ہی کیسے

سکتا ہے۔ اور میں نے ایک آہ بھر کر موقلم اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر رات زیادہ آگئی۔ اور چچی یونو کچھ پینا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ انگلیٹھی میں آگ سرد پڑ چکی ہے اور ساری خادماں نیند کی وادی میں کھو چکی ہیں۔ میں نے لیمپ کو میز پر رکھا اور اس پر چائے کی چھوٹی کیتلی پڑھا دی اور اس میں کنول کے بیجوں کا عرق گرم کیا اصل میں چچی یونو کو کوئی دس برس سے پھیپھڑوں کی تکلیف تھی۔ خزاں میں اسے کھٹکی آتی ہے۔ اس موسم میں وہ بہت بڑے تکیوں کے سہارے سوتی ہے۔ اس سال اس کی صحت کچھ بہتر ہے۔ اور ہم اکثر آٹھ منے کافی رات گئے تک بیٹھے رہتے ہیں۔ شاید اس کی صحت کی بہتری احتیاط اور اچھی غذا کی بدولت ہے۔ میں نے چچی یونو کے لئے ایک لباس تیار کیا جس پر شفتالو کے پھول بنائے تھے اور سارے جسم پر محط برف کا سا سماں تھا۔ دور سے وہ تنگوفوں کی پری نظر آتی تھی جو اس فانی دنیا میں کھیلی ہوئی اور بہار کے آخری دنوں تو یہ بھی ہوا کہ ایک دن وہ بالکنی میں کھڑی تھی اور اس کی باہیں بالکنی کے جھکے پر مکی تھیں یہ باہیں سبز کپڑے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس وقت تسلیاں اسے پھول سمجھ کر اسکے گرد منڈلائی تھیں۔ پچھلے برس (گرما کی نقیب) اباہیلین دیر سے واپس آئیں ان کے آنے تک تنگونے کھل بھی چکے تھے۔ ایک دن اتفاق سے ان کے گھونسلے کی مٹی گری اور ساتھ ہی ایک بچہ بھی زمین پر آ پڑا۔ چچی یونو کو خیال ہوا کہ کہیں کوئی بلی اس بچے کو ہیرا نہ کر جائے۔ اس نے اسے احتیاط سے اٹھا لیا اور اسکے لئے بانس کے تنکوں کا ٹھک گھونسلہ تیار کیا۔ اب کے سال وہی ننھی اباہیل بڑی ہو کر ہمارے یہاں گرما کی آمد کے ساتھ آگئی ہے۔ اور گھر بھر میں منڈلاتی اور چہچہاتی پھرتی ہے۔ کیا اسے اپنی جان بچانے والی یاد ہے؟

جی یو فو کو شرطیج کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر اچھا کھیل اسے نہیں آتا بہرہ آ
 وہ مجھے شرطیج (یعنی انگلیوں کا قلم) اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی
 تو یہ کھیل صبح تک جاری رہتا تھا۔ ایک دن میں نے چوہ چوہ چیا کا یہ مصرع دہرایا
 رہ بازیاں ہا ردیں تم نے دونوں؟ اور کہا۔ بولو آج کی رات ہا رکا کیا مساد صند ددگی؟
 جی یو فو نے میرے سوال سے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔ تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں
 جیت نہیں سکتی اچھا عقین کا یہ شیر میں شرطیج بدلتی ہوں۔ چنانچہ ہم نے کھیلنا شروع کر دیا
 بیس یا تیس چالوں کے بعد اس کی بازی مات ہونے لگی تو اس نے بتی سے شرطیج کا
 تختہ الٹوا دیا۔ میں نے کہا تم اپنے آپکو یا نگ کیوا ہی فی سمجھ رہی ہو گی جس نے شہنشا
 مانگ مانگ ہوا نگ کے ساتھ ہی چال چلی تھی۔ جی یو فو چپ رہی لیکن چاندی کے
 شمعہ ان کی روشنی اس کے پھول سے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد شرطیج کھیلنے
 کی کسے سوچتی۔

ہو پاؤ کے چشمہ کے پاس تیج کے کئی پٹریں جو چٹاؤں پر پھیلے ہوئے
 ہیں۔ بہار کے دنوں میں ان زرد زرد پھول چشمے کی سنگین میٹرھیوں پر چھاجاتے
 ہیں۔ اور ان کی خوشبو سے معلوم ہوتا ہے جیسے آسمانی خوشبوؤں کے وادی
 میں آگے ہیں۔ مجھے یہ پھول بڑے پسند ہیں۔ اور کئی دفعہ میں نے انھیں پھولوں
 کے بیچے چائے بناتی ہے۔ اس وقت جی یو فو یہ پھول توڑ کر اپنے بالوں
 میں گوندھتی تھی۔ مگر بعض دفعہ پھولوں کی شاخوں میں اس کے بال الجھ جاتے تھے یا ان
 شاخوں سے الجھ کر کھج جاتا کرتے اور اس میں چشمہ کے پانی کی نمی سے منگوا کرتا تھا۔ وہی پر
 ہم کچھ شاخیں اپنے ساتھ گاڑی میں رکھ لیتے تھے۔ تاکہ جب ہم بازاروں میں سے گزریں
 تو گوں کوئی خزاں کے بارے میں تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں۔

ب۔ یون

رداں زندگی کے بارے میں چھ باب اصل میں ایک گنام سے چینی مصنف کی آپ بیتی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی سہل زندگی اور اپنی محبوب بیوی یون کے بارے میں لکھا ہے۔ میاں بیوی دونوں سادہ مزاج مگر لطیف طبع لوگ تھے جو زندگی کی ہر اس خوشی کو جو انھیں حاصل ہو سکے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے یہ آپ بیتی نہایت ہی سادہ اور صاف انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اور اسے پڑھنے کے بعد مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ کتاب کی ہیروئن یون چینی ادب کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ یون اور اس کے میاں کی زندگی آرام سے بھرپور تھی۔ مگر یہی زندگی ایک عجیب طریقے سے نہایت خوش گوار اور پر مسرت تھی کیونکہ اس میں وہ سچی خوشی حصہ گیر تھی جو روح کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کے روحانی مشاہدات اور تجربات میں نظرات کے مناظر اور نیرنگیوں سے لطف اٹھانے کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں ذیل میں دو اقتباسات درج کرتا ہوں ایک میں ساتویں مہینے کی ساتویں کے چاند اور ساتویں مہینے کے پندرھویں کے چاند کے جشنوں کا ذکر ہے۔ دوسرے اقتباس میں مصنف نے بتایا ہے کہ دونوں میاں بیوی نے سوچ کے شہر میں گر میاں کیے گزاریں لیجئے پہلے ساتویں مہینے کی ساتویں کے چاند کا جشن ملاحظہ ہو۔

اس سال (۱۹۰۷ء) ساتویں مہینے کی ساتویں رات کو یون نے کہا

ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ سال بھر میں صرف ایک دن آسمان کے مشہور عاشق و معشوق یعنی لڑکان کے پوتے، اور دوسرے کو کہکشاں کے پاس ایک دربرے سے ملنے کی اجازت دیکھائی ہے۔ (مصنف)

عزیز و لویان کے بخومات کچھ شمعیں کچھ پھل وغیرہ مہیکے تاکہ ہم آسانی
 پوتے کی پریشانی کے لئے جائیں۔ میں نے دو مہریا کندہ کر کے ایک اپنے
 پاس رکھی اور ایک یون کو دی مہروں پر یہ عبارت تھی ہم دونوں ہم
 ایک دوسرے کے جیون ساتھی رہیں۔ یہ مہریا ہم نے اس لئے پاس
 رکھی تھیں کہ خط کتابت کے موقع پر کام آئیں۔ اس رات چاند
 پر بڑا جون تھا۔ اور جب میں نے خلیج کو دیکھا تو نرم روہریا چاندی
 سطح آب پر سنہری کار بجزیر بناتی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں نے ہلکے نرم
 کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور ایک کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ جہاں
 سے خلیج صاف نظر آتی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ تو
 ہلکے بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے۔ اور ہر آن نئی صورت نئی مہیت بدلتے تھے
 یکا یک یوں نے کہا۔ یہ چاند ساری دنیا کے لئے چمک رہا ہے۔ خدا جانے ہماری طرح
 اس وقت دو محبت بھرے دل دنیا میں کہیں اور بھی چاند کو تک رہے ہیں نہیں؟
 اور میں بولا۔ "اس ننگ شام کا لطف تو بہت لوگ اٹھا رہے ہوں گے۔ بہت
 سی عورتیں بھی ہوں گی جو اپنے کروں میں بیٹھی ان ہلکے بادلوں کا منظر دیکھ رہی ہوں گی
 یا انہیں سو سو عیب ڈال رہی ہوں گی لیکن جب کوئی شہر لور ہووی ایک ماٹھ چاند
 کو دیکھ رہے ہوں۔ تو میرے خیال میں گفتگو کا موضوع بادل نہیں ہو سکتے۔
 آہستہ آہستہ ساری شمعیں بج گئیں اور چاند بجا ڈوب گیا مجھے پھل سمجھا لیا کہ کھد اور گئے
 چاند کی پندرھویں کو ردوں کا دن تھا۔ یون نے فقور سا کھانا تیار
 کر لیا تاکہ اس کے بعد ہم چاند کی ہمراہی میں پی سکیں اور پیتے ہیں گریب

رات ہوئی تو آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ یونان اُداس ہو گئی اور بولی۔ اگر قدرت

کو یہ منظور ہے کہ ہم دونوں بال سفید ہونے تک ایک دوسرے کے ساتھ ہیں تو

آج رات چاند صورتِ ریشمنا چاہئے۔ میرا دل بھی بھاری تھا۔ کھڑکی میں سے قلعج

پر نظر ڈالی تو گلبنوں کی ہزاروں رویشیاں دھرا دھرتی بھتی نظرائیں جو

بید بچوں اور سرگندوں کے درمیان پھپھتی تھیں اور پھرتا ہر ہو جاتی تھیں درہم

نے ل کر ایک نظم لکھنی شروع کر دی۔ ہر ایک ایک وقت میں دو دو مصرعے کہتا

تھا۔ ان مصرعوں کی صورت یہ تھی کہ پہلا مصرع کہہ کر تو دوسرے شخص کے دئے

ہوئے مصرعے پر شعر پورا کرنا پڑتا تھا۔ اور دوسرا مصرعہ نئے شعر کا آغاز کرتا

تھا جس پر دوسرا شخص گرہ لگا کر شعر پورا کرتا تھا۔ بس چند قافے باندھے ہوتے

کہ شعر بے معنی ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ساری نظم جوں جوں کا مر یا ہو کر رہ گئی

یونان کا مارے بہنی کے بڑا حال تھا۔ آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہ رہا تھا اور

میرے سینے پر سر رکھ کر بہنی سے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی۔ مجھے اسکے بالوں کے

آئی ہوئی جنبیلی کی متوالی خوشبو نے مدہوش کر دیا۔ میں نے اسکا شانہ پھینکا۔

اور مذاق سے بولا میرا خیال تھا۔ جنبیلی کے پھول عورت کے بالوں کا حسن بڑھانے

کیلئے لگائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ پھول موتی کی طرح گول ہوتا ہے۔ مجھے معلوم

نہ تھا کہ اسکی خوشبو عورت کے بالوں کی بہک اور اسکے غارہ کی خوشبو کے

ساتھ مل کر اتنی متوالی بن جاتی ہے کہ ترنج کی خوشبو بھی اسکے سامنے بیچ ہے۔

یونان ہنٹے ہنٹے یکایک سنجیدہ بنگی اور بولی۔ ترنج خوشبو دار جھاڑیوں میں سب اعلیٰ درجہ پر

کیونکہ اسکی یاس اتنی لطیفہ و زمازک ہوتی ہے کہ شکل سے محسوس ہوتی ہے۔ رنجیبیلی تو وہ عام چیز ہے

کیونکہ یہ دوسروں سے خوشبو اُدھار بھی لے لیا کرتی تھی۔ اسلئے پھیلنے کی خوشبو کسی
سکراتے ہوئے خوشامدی کی طرح ہے۔ میں نے پوچھا تو پھر تم نے ترنج کی اعلیٰ اور
ارفع خوشبو کو چھوڑ کر ایک عام خوشبو کیوں لگا رکھی ہے؟ یہ تو نے جواب دیا
ایک عامیاد سطح کی چیز اعلیٰ چیز کے ساتھ دیکھ کر کچھ لطف سا آتا ہے وہ اعلیٰ چیز
سے مراد اسکی اپنی ذات تھی (

ہم اس طرح فقرہ بازی کرتے رہے اور آدھی رات آگئی۔ پھر باہر چلنے لگی
اور میں نے آسمان سے سارے بادل بھٹکا دئے۔ پورا چاند جو رتھ کے پہنے کی طرح
گول تھا ٹھکل آیا۔ ہم دونوں کے دل ملیوں اُٹھنے لگے۔ اور ہم نے اسی پرچہ
کے پاس بیٹھے شراب مینا شروع کر دی۔ ابھی تیس تیس جام بھی ختم نہ کئے تھے
کہ خلیج کے پل کے پاس سے شراب کی آواز آئی۔ جیسے کوئی پانی میں گر گیا ہو۔ درجے
سے جھانک کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ پانی کی سطح آئینے کی طرح صاف اور ساکت
تھی ہم نے محض ایک مرغابی کی آواز سنی تھی جو کنارہ کی دلدل اور پانی میں
پھرتی پھرتی پھر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سانگہ لانگ کے ایوان کے پاس ایک بار
کرتی شخص ڈوب گیا تھا۔ اور اب اس کی روح دباں پھرا کرتی ہے۔ لیکن یوں
نے یکا یکا ایک ہلکی سی آہ بھری اور پوچھا۔ ہائے افسوس یہ آواز کہاں سے آئی
ہے؟ اور ہم دونوں کانپ گئے۔ ہم نے جلدی سے درجے کے پٹ بند کر دئے
اور شراب کی صراحی اٹھا کر کمرے میں لے آئے۔ ابرقت لمبپ کی روشنی بہت ہلکی
سی تھی۔ نیم تاریکی میں پردے سرسرا رہے تھے۔ اور ہم دونوں لر رہے تھے
ہم نے روشنی بچا دی اور مسہری کے پردے ہٹا کر مسہری پر لیٹ گئے

یونان کو تیز بخار ہو چکا تھا۔ بہت جلد مجھے بھی تپ آگئی۔ اور ہم دونوں کو کافی
۲۰۔ دن بیمار رہے۔ سچ ہے جب خوشی کا جام لبالب بھر جائے تو مصیبت
آتی ہے۔ گویا یہ بھی ایک نالی بد بختی۔ کہ ہم دونوں بڑھاپے تک ایک دوسرے
کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔“

یہ کتاب ایسی ہی نازک اور حسین عبارتوں سے بھر پور ہے۔ اور ہر جگہ نظرت کے منظر ہر
کی محبت اس میں سے چمکی پڑتی ہے۔ مگر گرمیاں گزارنے کے اس اقتباس پر اکتفا
کرنی پڑے گی۔ ملاحظہ ہو۔

ہم نے سانگ می کے کوچہ میں مکان لیا اور اس میں منتقل ہو گئے ہم نے
اپنی اپنی خواہگاہ کا نام ”بہانوں کی خوشبو کا ایوان“ رکھا۔ اس میں یونان کے
نام کی رعایت مضمون تھی۔ رچینی زبان میں یونان ایک خوشبو دار بوٹی کو کہتے ہیں
اور سیاہنگ ہونگ اور منگ کو انگ کی کہانی کی طرف بھی اشارہ تھا جو شوہر اور بیوی
ہونے کی حیثیت میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ادب قاعدے سے پیش
آئے تھے جس طرح بہانوں کی ملاقات مقصود ہوتی ہے۔ ہمیں یہ گھر کچھ ایسا
پسند نہ تھا۔ اس کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور صحن بہت تنگ تھا۔ پشت
پر ایک اور مکان تھا جس سے لائبریری کو راستہ جاتا تھا۔ پشت پر ایک کھڑکی
تھی جس سے دکھیں تو تو صاحب کا اجڑا باغ نظر آتا تھا۔ اسی لئے یونان
کے خیالات ابھی تک سانگ لانگ کے ایوان کے خوبصورت مناظر پر ہی
مرکوز تھے۔

ان دنوں گینگ شیانگ کے شمال میں سہرے پل کے پاس ایک

بڑھی کسان عورت رہا کرتی تھی۔ اس کی جھونپڑی کے چاروں طرف کھیت
 ہی کھیت تھی۔ جن میں سبزیاں بوئی جاتی تھیں۔ جھونپڑی کا پھانک بیڈی کا
 کا تھا۔ اور اس پھانک کے پاس کوئی تیس گز لمبا ایک تالاب تھا جس کے روبرو
 طرف درختوں کا ایک جنگل سا تھا۔ جھونپڑی کے مغرب میں چند قدم پر کوئی ہونی
 اینٹوں کا ایک ٹیلا تھا جس پر چڑھ کر دیکھنے سے اس پاس کا سارا علاقہ نظر آسکتا تھا
 یہ علاقہ بمبار تھا۔ اور بیچ بیچ میں کہیں خود رو پیر گھاس پھوس اور بوٹیوں سے
 پٹے ہوئے رقبے بھی تھے۔ اس بڑھیلے اپنے جھونپڑے کا ذکر ایک دن یوں سے کیا تھا
 اور یوں کو رہ رہ کر یہی جھونپڑا یاد آتا تھا۔ چنانچہ اس نے مکان میں منتقل ہونے
 کے اگلے دن میں اس جھونپڑے کو دیکھنے کو گیا میں نے دیکھا تو اس میں صرف دو
 کمرے تھے جن میں پردے لگا کر چار کمرے بنائے جاسکتے تھے۔ ان کمروں میں اگر
 موٹے گتے کے درتکے کھولے جائیں۔ اور بانسوں کی چار پائیاں ہوں تو گرمیوں
 میں رہنے کے لئے یہ بڑی ٹھنڈی جگہ بن سکتی تھی۔

یہاں ہمارے واحد ہمسائے ایک بڑھا بڑھیا تھے۔ جزیبے کے لئے سبزیاں
 ترکاریاں اٹھاتے تھے۔ انھیں تیرہ چلا کہ ہم یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں تو وہ ہم سے
 ملنے آئے۔ اور بطور تحفہ تالاب کی پھلی اور اپنے کھیتوں کی تازہ سبزیاں بھی لائے
 ہم نے انھیں قیمت دینا چاہی۔ تو انہوں نے لینے سے انکار کیا چنانچہ یوں نے
 نئے لئے جو توں کا ایک جوڑا تیار کیا جو بڑی مشکل سے انھوں نے قبول
 کیا۔ یہ جولائی کا ذکر ہے جب درختوں کے سبز سائے اس جھونپڑی کو آغوش
 میں لئے ہوئے تھے گرما کی ہوائیں تالاب کے اوپر سے ہرگز آتی تھیں اور نغمہ بزر پر بند دن بھر وہاں

چہچہاتے تھے۔ ہوائیں ان نمنوں سے گونجتی تھیں ہمیں ہمارے بڑے سے ہمسائے نے پھلی پکڑنے کے لئے کانٹا اور ڈور بھی بنا کر دی۔ اور یوں اور میں دن بھر دختوں کے سائے تلے کلابایں اس مہنی ڈور سے پھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ دن ڈھلتا تو ہم دونوں مغربی ٹیلے پر چڑھتے اور غروب آفتاب کا منظر دیکھتے۔ اور جب طبیعت موزوں ہوتی تو شعر کہتے ایک شعر ابھی تک ذہن میں ہے۔

سورج کو نگل لیتے ہیں بادل کے درند

اور نہ کی کراں تاروں پہ ہے تیر چا پاتی

تھوڑی دیر بعد چاند کا عکس تالاب کے پانی میں نظر آنے لگتا۔ ہر طرف چھنگی اور دوسرے کیڑے مکوڑے شور مچاتے اور ہم باڑ کے پاس چار پائی بچھا کر بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے۔ پھر بڑھیا آکر کہا کرتی تھی۔ کہ شراب پینے کے لئے گرم کر دی گئی ہے۔ اور کھانا تیار ہے۔ اور پھر ہم چاند کی روشنی میں بیٹھ کر تھوڑی سی شراب پیتے۔ ہنسا دھو کر ہم اپنے اپنے سیلپر بیٹھتے۔ اور سنبھلا ہوا ہنس لکر اسی چار پائی پر بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے۔ اور ہمارا بوڑھا ہمسایہ ہمیں انتہام اور مزاجوں کی پڑائی دہستائیں سنا تا رہتا۔ آدھی رات کے لگ بھگ ہم سونے کے لئے اندھا کھڑا جاتے۔ ہمارے جسم خشک اور ہلکے پھلکے محسوس ہوتے۔ اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ ہم شہر میں رہتے ہیں۔

ایک دن ہم نے اپنے بڑے سے ہمسائے سے کہا کہ باڑ کے ساتھ ساتھ گل داڑھی لگا دے۔ یہ پھول سال کے نویں مہینے میں کھلتے ہیں! در پھنیں کے لئے ہم نے دس دن تک اس جھونپڑے میں مزید قیام کیا یہیں سیری والہ بھی مجھ سے ملے ہیں اور اس فضا سے بہت خوش ہوئیں۔ ہم نے ان کا کھانا بھی

ابھیں پھولوں کے تختوں میں بٹھ کر کھایا۔ اور سارا دن وہیں گزارا۔ یوں کہ
 یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے کہا۔ ہم بھی ضرور ایسی ہی ایک کٹیا بہان بنائیں گے
 بس دس مرلے زمین کافی ہوگی۔ کٹیا کے ارد گرد ہم سبزیاں بوئیں گے اور
 خربوزے بھی۔ تم تصویریں بنانا اور میں کشیدہ کاری کروں گی۔ بس ان دونوں
 چیزوں سے ہمیں شراب خریدنے کے لئے کافی رقم مل جائے گی۔ اور کھانا پینا تو
 گھر کا ہوگا۔ اس طرح موٹے بھوٹے سادہ کپڑوں میں سادہ غذا پر ہم خوشی خوشی عمر
 گزار دیں گے۔ اور کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں اس سے پوری طرح
 متفق تھا۔

یہ جھوٹا اب بھی وہی ہے۔ مگر وہ جو میرے دل کی گہرائیوں سے واقف
 تھی۔ اب اس دنیا میں نہیں۔ آہ زندگی شاید اسی کا نام ہے۔»

۴۔ چائیں اور درخت

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ہم قطار در قطار مربع نما مکان بناتے ہیں۔
 اور نہایت سیدھی ٹرکین بناتے ہیں۔ اب کہیں ٹیڑھے بیڑھے بازائیں نظر آتے۔
 پڑانے مکان نظر نہیں آتے۔ باغوں میں کنوئیں دکھائی نہیں دیتے اور شہروں میں
 جو ذاتی باغ ہیں وہ باغ تو کیا باغ کا منہ چڑانے کے برابر ہیں ہم نے فطرت کو اپنی
 زندگی سے بالکل اور بڑی کامیابی سے جلا وطن کر دیا ہے۔ مکانوں کا یہ حال ہے کہ
 جھیس عجیب شکل بہت کی ہوتی ہیں۔ کیونکہ چھتوں سے صرت برچھپانے کا کام لیا جاتا
 ہے۔ یوں بھی چھتوں کی باری کتے آتے آتے ٹھیکے دار بھی تنگ آچکا ہوتا ہے۔

اور وہ اپنا کام جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہے۔ آج کل کے مکانات کھیل سے اکتانے ہوئے بد مزاج بچے کے بنائے ہوئے لکڑی کے درجے معلوم ہوتے ہیں۔ مکمل ہونے سے پیشتر ہی جن سے بنانے والے کی طبیعت بھر چکی ہے۔ موجودہ دور کے ہندب انسان کو روح فطرت تیاگ چکی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انسان نے درختوں کو بھی ہندب بنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اگر ہمیں کبھی یاد آجائے کہ سڑکوں پر درخت لگانے چاہئیں۔ تو ہم انہیں نہایت سیدھی قطار میں لگائے ہیں۔ ان پر نمبر لگاتے ہیں۔ ان پر دو آئیں چھڑک چھڑک کر جراثیم مارتے رہتے ہیں انہیں کاٹ چھانٹ کر ایسی شکلیں اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو ہم انسانوں کے نزدیک دلکش اور حسین ہوتی ہیں۔

دیسے ہم بھول بھی لگاتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ گھاس کے ایک نطعے میں پھولوں کا تختہ یا تو گول دائرے کی شکل کا ہوگا۔ ایک ستارا بنا ہوگا۔ یا کسی حرف تہجی کی شکل کا ہوگا۔ اور جب ہمارے لگائے ہوئے پھولوں کے پودے سیدھی قطار میں نہ لگیں تو ہمیں بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ بالکل ویسا ہی صدمہ جو لٹری اکیڈمی کے کسی زیر تربیت نوجوان افسر کو قدم ملا کر نہ چلتا دیکھ کر ہمیں محسوس ہو سکتا ہے۔ اور ہم ان بے راہ روپوں کو تینچوں سے کاٹتے پھرتے ہیں۔ میں نے پرس کے پرنے دار الحکومت درمائی میں یہ غضب بھی ہوتے دیکھا ہے کہ ایک گول دائرے کے گرد اگر ایک مستطیل کے چاروں ضلعوں پر مخروطی وضع کے کاٹے ہوئے درختوں کا جوڑا جوڑا لگایا جاتا ہے۔ تاکہ تناسب قائم رہے اور دیکھ کر کوئی فوجی دستہ یاد آجائے گو یا دردی پوش سپاہیوں کو منظم کرنے اور تربیت یافتہ بنانے کے بعد انسان کی شان اسی میں ہے کہ وہ درختوں کو بھی منظم کرے انہیں بھی سپاہیوں کی طرح

تربیت یافتہ بنائے۔ درختوں کے ان جوڑوں میں اگر ایک درخت راسا اونچا ہوگا تو ہمارے ہاتھ کھجانے لگتے ہیں کہ اس کی اونچی پھنگیں کاٹ چھینکیں۔ تاکہ ہمارے تناسب کے احساس۔ ہمارے اختیار اور ہماری شان کو ٹھیس نہ پہنچے اسے بٹانہ لگ جائے دوسرے لفظوں میں اب جو بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ فطرت کو اس مصنوعی فضا سے آزاد کرایا جائے۔ اور اسے اس کے صحیح مقام پر واپس لایا جائے۔ یہ مسئلہ کافی درد سہی کی بات ہے کیونکہ اگر شہر کے ایک فلیٹ میں رہنا ہو اور طبع شاعرانہ پائی ہو تو پھر کیا کیا جائے۔ اور پھر اس عمارت کا کیا ہو گا کہ جائیدادیں کرایہ پر چڑھی ہیں۔ مگر دیکھنے کو ایک کنواں۔ ہرے بالنوں کا ایک جھنڈ یا مینر گھاس کا تختہ نہیں۔۔۔ اصل یہ ہے کہ یہ سارا نظام ہمارے سے اتنا غلط ہے کہ اسکا کوئی مداوا نہیں۔ اس کی بدولت ہمیں دیکھنے اور عیش عیش کرنے کو دن میں فلک بوس عمارتیں ملتی ہیں۔ اور رات کو ایک قطار میں روشن کھرکیاں نظر آتی ہیں۔ اور وہ ہی کیا گیا ہے، ان فلک بوس عمارتوں کو راتوں کو قطار اندر قطار جگمگاتے ہوئے ان درجوں کو دیکھ کر انسان غرور سے پھولتا ہے۔ اپنی تہذیب کی طاقت اور اختیار پر نازاں ہوتا ہے۔ اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کتنا حقیر اور کس قدر بے حقیقت ہے۔ اسی لئے تو میں اس مسئلہ کو ناقابل حل سمجھتا ہوں۔

لہذا بحث کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر شخص کے پاس کافی زمین ہونی چاہئے۔ حیلوں اور اسباب کو چھوڑنے جو تہذیب انسان کو زمین سے محروم کرتی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ فرض کر لیجئے کہ آئندہ کسی تہذیب کے ماتحت ہر شخص کے پاس ایک ایکڑ زمین ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اس ایک ایکڑ زمین کی بدولت اس کے پاس اپنے درخت ہوں گے۔ اپنے پتھر اور چٹانیں ہوں گی۔ اور ایسی زمین جسے گلاب جہاں پہلے

سے قد آدر جو ان درخت موجود ہوں۔ اور اگر اس رقبہ میں ایسے درخت موجود نہ ہوں۔ تو وہ خود ایسے درخت لگائے گا جو بہت جلد بڑھتے ہیں مثلاً بانس اور بید محو کے پیڑ۔ پھر اسے آج کل کی طرح پرندوں کو پتھروں میں قید کر کے رکھنے کی صورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ پرندے خود بخود اس کے پاس آیا کریں گے۔ اور وہ یہ انتظام لگا کر ان پرندوں کے لئے اس پاس مینڈک چھپکلیاں۔ کیرے مکڑے وغیرہ موجود ہوں صرف اسی صورت میں اس شخص کے بچے نظرت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکیں گے اور نظرت کو عجائب خانے کی شیشہ والی الماریوں میں نہیں رکھیں گے۔ کم سے کم یہ بچے یہ تو جان سکیں گے کہ انڈوں سے بچے کیسے نکلتے ہیں۔ وہ جنس اور جنسی معاملات اور بچوں کی بیداش کے بارے میں اتنے کم علم اور ناواقف نہیں ہونگے۔ جس طرح آج کل کے ادبچے اور مہذب خاندانوں کے عام بچے ہوتے ہیں۔ یہ بچے چھپکلیوں اور مکڑیوں کی باہمی لڑائی دیکھیں گے کچھ گندے مندے پھریں گے۔ اور خوش رہیں گے۔

جینیوں کو چٹانوں سے جو دلی لگاؤ ہے وہ اسی باب کی دوسری فصل میں عرض کر چکا ہوں۔ اسی کی بنا پر چینی مصوروں کی منظر یہ تصویروں میں چٹائیں اور چٹیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں اتنی بات تو سمجھ میں آگئی لیکن اس سے یہ وضاحت نہیں ہو سکی کہ چین میں مصنوعی پہاڑیوں کے باغات اور عام چٹانوں سے اتنی رغبت کیوں ظاہر کی جاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ چٹائیں اتنی عظیم اور ٹھوس ہوتی ہیں کہ ان سے ابدیت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ چٹائیں خاموشی اور سکوت کی منظر میں نہیں حرکت دینا ممکن نہیں۔ ان میں کرنا کی وہ قوت اور مضبوطی ہے جو بہت بڑے سناٹوں میں کڑی چٹائیں اپنی مختار دالک آپ ہیں اور اہل علم لوگوں کی طرح عام زندگی سے دور رہتی

ہیں۔ چٹانیں ہمیشہ کہنہ و قدیم ہوتی ہیں۔ اور چینیوں کو ہر قدیم اور کہن سال چیز سے بڑی محبت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرٹسٹک نقطہ نظر سے چٹانوں میں عظمت اور شوکت ہے۔ ان میں ایک مخصوص کڑھنگی اور سنگلاخی ہے۔ ندرت اور یکسانی کی شان ہے۔ چینیوں کے نزدیک چٹانوں میں "واقی" کا جذبہ جس کے لفظی معنی تو پر خطر ہیں۔ مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔ ذرا ایک ادنیٰ چٹان کا خیال کیجئے جو عام سطح زمین سے ایک دم تین سو فٹ ادنیٰ کھڑی ہو۔ اس میں مخصوص دل کشی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ پر خطر ہونے کا خیال وابستہ ہے۔

مگر اس سے ذرا آگے چلنے۔ ہر روز ہر شخص پہاڑوں کو دیکھنے نہیں جاسکتا۔ گویا پہاڑوں کی چٹانوں کو اپنے گھر میں لے آنا لازم ہوا۔ چنانچہ چین میں یہی وطیرہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مغربی سیاح چین جاتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چینی خانہ باغ میں پتھروں کے مصنوعی غار۔ پہاڑیاں اور پہاڑی باغیچے کیوں ہوتے ہیں۔ انکی تہہ میں بنیادی خیال یہ ہوتا ہے کہ ادنیٰ چٹانوں کی پر خطر سنگلاخی اور کڑھنگی کا ہلکا سا عکس پیش نظر ہے۔ ان کی عظمت کا نقشہ سامنے ہو۔ اصل میں مغربی سیاحوں کا بھی اتنا تصور نہیں۔ کیونکہ مصنوعی پہاڑیاں عام طور پر بڑی بد ذوقی سے بنائی جاتی ہیں۔ اور ان سے کبھی پہاڑوں کی قدرتی عظمت اور شوکت کا خیال ذہن میں نہیں آسکتا۔ مصنوعی غار اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ بڑے بڑے پتھروں کو سیمینٹ سے چنا جاتا ہے۔ اور اس چٹانی میں سیمینٹ صاف نظر آتا ہے۔ لہذا بات نہیں بنتی۔ ان مصنوعی پہاڑیوں کے حسن کا اتنا سبب بھی اسی انداز کا ہونا چاہئے جس طرح ایک تصویر میں تناسب اور تفارقت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان مصنوعی پہاڑیوں سے اور منظر یہ تصویروں سے اصل پہاڑوں کے حسن کو جو احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت ایک ہی ہوتی

چاہئے۔ سونگ خاندان کے عہد میں مصور می فائی نے تو خاص خاص پتھروں کا
تفصیلی بیان بھی ایک کتاب میں لکھا ہے۔ اور اسی عہد کے ایک مصنف تو کو
آنکے اپنی کتاب میں کوئی سو قسم کے پتھر بتائے ہیں۔ جن سے مصنوعی پہاڑیاں
انسانوں کے محبتوں کی طرح فطرت کے مناظر کے محسوس تھیں۔

پہاڑوں کی جو ٹیچوں پر عظیم سنگی چٹانوں کے لئے چینی مصوروں کے دل
میں قدر کا جو احساس پیدا ہوا اس کے ساتھ ساتھ باغوں میں بھی مصنوعی پہاڑیاں
بنانے کا شوق بڑھا۔ اور اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ ان پہاڑیوں کا
رنگ کیسا ہو۔ انکی ترکیب اور سہیت اور رنگ پر اتنی ہی زیادہ توجہ دیکھتی۔ چنانچہ
نفاست پتھروں کے رنگ انکی خوبی اور ان کی رنگت میں ہلکے اور گہرے قدرتی
کے امتزاج کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ آگے چل کر ان پتھروں کے بارے میں
ستھرے ذوق کی بدولت سیپ اور شیب کی بنی ہوئی نسوار کی شیشی میں یہی نفاست
ملحوظ رکھی گئی۔ چنانچہ کسی عمدہ مہر یا نسوار رکھنے کی کسی عمدہ شیشی کی قیمت اڑھائی لاکھ
تین تین ہزار روپے تک اٹرنے لگی۔

مکانوں کی تعمیر اور باغات میں پتھروں کے استعمال کے بارے میں
پورا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں چینی خوش نویسی پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔
خوش نویسی بھی خطوط کی ہم آہنگی اور تناسب اور حروف کی ترکیب
اور نشست کا نام ہے۔ چنانچہ چائیں وہ ہیں جو عام زندگی کے دہائے
سے ایک رفعت ایک علیحدگی کا احساس دیکھنے والے میں پیدا کریں۔
اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان چٹانوں کے خطوط تناسب کے
اعداد سے بالکل صحیح ہونے چاہئیں۔ ————— خطوط سے مراد دید

یہ مستقیم خطوط نہیں یا ایک دائرہ یا مثلث مراد نہیں بلکہ فطرت کے بنائے ہوئے گھردے اور سخت گوش خطوط مراد ہیں۔ چینی فلسفی لاوتزے نے اسی لئے کہا تھا کہ فطرت کے مظاہر اپنے اصلی رزپ میں ہی خوبصورت ہیں اور وہ ان گھڑ پتھر کے حسن و خوبی پر اسی لئے اتنا زور دیتا تھا۔ ہمیں فطرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں اپنی طرف سے ترمیم یا تبدیلی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ انسانی سوشلسٹوں کے حباب سے بھی بہترین فن پارہ مثلاً کوئی شاہکار نظم یا انشا کا نمونہ وہی ہے جس پر محنت اور عرق ریزی کا گمان تک نہ گزرے۔ وہ اسی ہی رداں برجستہ اور فطری چیز نظر آئے۔ جس طرح بل کھاتی ہوئی ندی یا آوارہ پھرتے ہوئے ایک لکڑی بر میں ہمیں فطری حسن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ اسی چیز کو چینی نقادوں نے یوں کہا ہے کہ فن کے شاہکار وہ ہیں جن سے یہ گمان نہ ہو کہ اسے انسانی ہاتھوں یا کوشش نے اتنا شستہ اور صاف کیا ہے۔۔۔ یہ قول آرٹ کے تمام پہلوؤں پر صادق آتا ہے۔ گویا فن کی صحیح قدر اور صحیح ذوق یہ ہے کہ بے قاعدگی میں حسن ڈھونڈ لیا جائے۔ ان خطوط میں بھی آہنگ اور حرکت اور نرمی کا لطف پایا جائے جو بلا تا عداہ ہیں۔ اسی لئے بہت سے چینی باغوں میں جو مصنوعی پہاڑیاں اور ٹیلے نظر آتے ہیں وہ ان گھڑ پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ پتھر بھی وہ جھیلوں اور غاروں میں ملتے ہیں۔ جن میں ننھے ننھے ہزاروں سوراخ ہوتے ہیں اور جنکی سہیت نہایت ٹیڑھی بیڑھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ سنگیانی اور سوہ پاؤ میں آس پاس باغوں میں یہ مصنوعی پہاڑیاں ان پتھروں سے بنائی جاتی ہیں جو تائے ہو جھیل میں ملتے ہیں۔ ان پتھروں پر صدیوں پہلے کے سمندری لہروں کے نشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ جھیل بھی سمندر کا ایک حصہ تھی یہ پتھر اس جھیل کی تہ سے لی جاتے ہیں۔ اور جب کبھی ان کے خطوط کو ٹھیک کرنے میں ضرورت پڑتی ہے تو انہیں

تراش تراش کر من سب قیمت دی گئی۔ اور سال دو سال کے لئے پھربل میں کھڑا
 گیا تھا۔ تاکہ ان کی سطح سے تراشنے کے نشانات پانی کی لہروں سے مٹ جائیں
 یہ تو تھی چٹانوں اور پتھروں کے لئے چینی مزاج کی جذباتی کمزوری کی ایک
 جھلک۔ رہے درخت تو ان کے لئے انسان کی پسندیدگی کو سمجھنا آسان ہے
 کیونکہ یہ پسندیدگی عالمگیر ہے۔ جن مکانوں کے ارد گرد درخت ہوں وہ عجیب رنگے
 مینگے نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی جیسے مرد عورت کپڑوں کے بغیر ہوں۔ لیکن مکانوں
 اور درختوں میں ایک فرق یہ ہے کہ مکان خود تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اور درخت زمین
 کے سینے سے اُگتے ہیں۔ اور جو چیز اگی ہے وہ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کی ہوئی
 چیز سے کہیں زیادہ حسین ہوتی ہے۔ ان مکانوں کا معاملہ عجیب ہے۔ یہ مانا کہ
 عملی اعتبار سے کچھ مصلحتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہمیں مکانوں کی دیواریں اور ان کی
 مختلف منزلیں بالکل سیدھی تعمیر کرنی پڑتی ہیں۔ مگر مکانوں میں مختلف کمروں کے
 فرش ایک ہی سطح پر کیوں بنائے جائیں؟ کیوں نہ ہر کمرے کے فرش کی سطح درج
 کمرے سے مختلف ہو۔؟ بہر کیف مکانوں کی تعمیر میں مستقیم خطوط اور مربع شکلوں کی
 یکساہی درختوں کی موجودگی سے بڑی خوبی سے کم ہو سکتی ہے پھر جہاں تک مکانوں
 کے رنگ کا سوال ہے ہم ان پر سبز رنگ پھیر دیں تو لوگ شاید حینے نہ دیں گے۔ لیکن
 قدرت کا یہی رنگ ہے اور اس لئے اس نے اپنے درختوں کو ہر سے رنگوں میں
 پیدا کیا ہے۔

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ہنرمندی اور کاوش تھپ جلتے مگر ہم میں کہناش
 پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں ماچھند کے زبردست ناول یوان یوان کہ

خراج عقیدت پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جب اپنے علاقہ کا گورنر تھا تو اس نے مغربی جھیل کے عین درمیان ایک چھوٹا سا مصنوعی جزیرہ بنایا۔ مگر اس جزیرہ پر اس نے کوئی تعمیر۔ کوئی ایوان۔ مگرہ بلکہ کوئی یادگاری مینار تک نہیں بنوایا۔ اس نے ایک معمار کی حیثیت سے اپنی حیثیت کو لازوال بنانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن آج یہ جزیرہ گورنریوآن کے جزیرہ۔ کے نام سے مشہور ہے۔ اور مغربی جھیل کے ساکت پانیوں کے عین وسط میں نظر آتا ہے۔ اس جزیرہ کا رقبہ مشکل سے کوئی سو گز ہوگا پانی کی سطح سے اس کی اونچائی ایک فٹ سے زیادہ نہیں۔ اور اس میں بہتر بنا سید مجنوں کے پیر ہیں جب کسی کمر بھرے دن کو اس جزیرے پر نگاہ ڈالیں تو یہ طلسماتی جزیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی پانی کے سینے سے ابھرا ہے۔ یہ مجنوں کے چھند جھیل کی سطح پر اپنا سر نیزہ عکس ڈالتے ہیں۔ اس ساکت سطح کی یک رنگی اور یکسانیت کو دور کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں گویا گورنریوآن کا جزیرہ قدرت کے ساتھ پوری ہم آہنگی اور مطابقت کا منظر ہے۔ آنکھوں پر بار نہیں ہونا لیکن اسی کے پاس امریکہ کے تعلیم یافتہ ایک صاحب نے روشنی کے مینار کی شکل کا ایک یادگاری مینار تعمیر کر رکھا ہے۔ اور جب بھی میری نگاہیں اس پر پڑتی ہیں تو آنکھوں کے پوٹوں میں سوزش اور چھین شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے علانیہ طور پر یہ عہد کر رکھا ہے کہ اگر کبھی میں ڈاکو جرنیل بن گیا (جو کمیونسٹ چین کے قیام سے پہلے عام تھے مترجم) اور بانگ چاؤ پر میرا قبضہ ہو گیا۔ تو میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اس مینار کو توپ سے اڑا کر ریزہ ریزہ کر دوں گا۔

درختوں کی قسموں کا شمار نہیں۔ ان میں سے چینی نقادوں اور شاعرانہ سرن چند ایک کو چنا ہے۔ جن کی شکل سے ذہنی خطا اٹھایا جاسکتا ہے ان درختوں

کی ہیئت اور ان کے خطوط ایسے ہیں کہ وہ صہبی خطاطی کے نقطہ نظر سے فنی طور پر بہت ہی خوبصورت ہیں۔ بات یہ ہے کہ یوں تو تمام درخت خوبصورت ہوتے ہیں۔ مگر چند ایک درخت ایسے ہیں جن کو دیکھ کر خاص نقاسرت اور خوبی اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ایمانی کیفیت کچھ انہیں سے مخصوص ہے۔ انہیں درختوں کو باقیوں سے ممتاز کر لیا گیا ہے۔ اور ان کے ساتھ مخصوص جذبات وابستہ کئے گئے ہیں مثلاً یہ ظاہر ہے کہ زیتون کے درخت کی ہیئت اور شکل میں کوئی کرخنگی نہیں ہوتی۔ اور صنوبر کا درخت ہے کہ اس کے سارے خطوط ہی کرخنگی اور کھر درے پن کا پہلوئے ہوئے ہیں۔ بید مخبول کا درخت اپنے باکلین کیلئے مشہور ہے اسے کسی عنوان عظیم الشان یا پرشکوہ نہیں کہا جاسکتا۔ گو یا چند ہی درخت ایسے ہیں جو تصویروں میں نظر آتے ہیں۔ اور جن کا ذکر بار بار انطون میں بھی ملتا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم صنوبر کا درخت ہے جس کا جالیاتی خط اس کی شان اور سر بلندی میں مضمر ہے۔ پھر آلوچے کا پتھر ہے جس میں خاص قسم کا رومانی حسن ہے۔ بانس کا درخت ہے کہ اس کے خطوط بڑے نازک ہوتے ہیں اور اس کو دیکھ کر گھر کا خیال آتا ہے۔ بید مخبول ہے جس کا باکلین نازک اور کھلی نازک نینوں کی یاد دلاتا ہے۔ صنوبر کے درخت کو دیکھ کر جو سرور دل میں پیدا ہوتا ہے وہ بید و واضح ہے۔ اور شاعرانہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ درخت دوسرے درختوں کے مقابلہ میں بالکل الگ انداز کی عظمت کا حامل ہے۔ کیونکہ درختوں میں بھی انسانوں کی طرح عظمت، انداز، وقار کبھی ہوتا ہے۔ اور بے مانگی اور کم سوادی بھی۔ صہبی آرٹسٹ ہمیشہ سے صنوبر کی عظمت انداز کے مداح رہے ہیں۔ انکا مطلب اور انکی توصیف کا لہجہ وہی ہے جو انگریز نقاد اور شاعر ملٹیو آرنلڈ کا ہے۔ جب وہ یونان کے اندھے شاعر ہومر کے انداز کی عظمت اور شوکت اسلوب کے گن گاتا ہے۔ یہ عظمت بید مخبول کے درخت میں نا پید ہے

اسی طرح جس طرح انگریز شاعر سون برن کی نغمہ طرازی میں انداز کی عظمت ٹھونڈنی مخصوص ہے۔ اصل یہ ہے کہ حسن کے انداز اور اس کی قسمیں ان گنت ہیں۔ نزاکت میں اپنا حسن ہوتا ہے۔ بانگین اور لطافت کا اپنا حسن ہے۔ شوکت اور عظمت کا حسن الگ ہے سادگی میں بھی حسن ہوتا ہے۔ کرسنگی اور سنگلاخی۔ قوت اور قدمت ان سب میں بھی اپنا اپنا مخصوص حسن ہے۔ اسی قدمت کی بنا پر صنوبر کے درخت کو باقی سب درختوں میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں گوشہ نشین عالموں کی قدمت پسندی کا پرتو ہے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ پُرانا فاضل ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے۔ ہاتھ میں بالسن کی چھڑی لئے کسی پہاڑی راستہ پر جا رہا ہے۔ جس طرح کسی عالم کی عزت نشینی اور عظمت اسے عام انسانوں کی دنیا میں ایک مثالی انسان بنا دیتی ہے وہی حال صنوبر کا ہے۔ لی لی تنگ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ناشپاتیوں اور بیہ مخروبا کے درختوں سے بھرے ہوئے ایک باغ میں بیٹھتا جہاں اس پاس کوئی صنوبر نہ ہو ایسا ہے کہ پانچوں اور عورتوں کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔ اور کوئی بزرگ پاس نہیں جو ہماری رہنمائی کے قابل ہو۔ چنانچہ چینی لوگ صنوبر کو اچھا سمجھنے کے سلسلہ میں صنوبر کے کہیں سال درختوں پر لوگوں کو یا جان دینے ہیں کیونکہ جتنا پُرانا صنوبر ہو گا اتنا ہی بر شوکت ہو گا۔ صنوبر کے درخت کے ساتھ دیوار کا بھی نام لیا جاتا ہے جب اس درخت کی شاخوں کا رنج آسمان کی طرف ہوتا ہے اور جوانی کا اسم نظر آتے ہیں۔ اور جب شاخیں زمین کی طرف مڑی ہوں تو وہی درخت بوڑھے بزرگ بن جاتے ہیں۔

صنوبر کے درخت کو دیکھ کر جو جایا تیں تسکین ہوتی ہے وہ انہی اہم اس لئے ہے کہ صنوبر خاموشی اور شوکت اور زندگی کے شور و شغب سے علیحدگی کی علامت ہے یعنی اس میں درویشی کی تمام صفات ہیں۔ اس لئے چینی تصویروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ چائوں

کے پاس صنوبر کے سائے میں بڑھے لوگ چپ چاپ کسی سوچ میں لگن ہیں۔ یاد دھردھر پھر رہے ہیں۔ اس کے سایہ میں کھڑے ہو کر یہ خیال آتا ہے کہ یہ درخت کتنا کہن سال کتنا پر شوکت اور اپنے حال میں کتنا لگن ہے۔ لاؤ تڑے کہتا ہے کہ قدرت باتیں نہیں بناتی۔ صنوبر کا پیر بھی باتوں کا قائل نہیں۔ یہ اپنی خاموشی اور اتھاہ سکوت میں سرٹھائے کھڑا رہتا ہے۔ اپنی رفعت سے یہ ہم پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے۔ سوچا ہے میں نے ان گنت بچوں کو اور میٹر ہوتے اور ادھیڑ لوگوں کو بوڑھا ہوتے دیکھا ہے۔ پرانا داناؤ کی طرح یہ پیر ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اور رب کچھ سمجھتا ہے۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ ہی اس کی پر اسرار رفعت کا راز ہے۔

آلوچے کے درخت کا رومانی حسن اس کی شاخوں کی ساخت اور اسکے پھولوں کی خوشبو میں پنہاں ہے۔ عجیب بات ہے کہ شاعرانہ ذوق کی لسیکن کیلئے جو درخت چنے گئے ہیں۔ ان میں سے صنوبر۔ آلوچے اور بانس کے پیڑوں کا تعلق موسم سرما سے رکھا گیا ہے۔ اور انہیں سرما کے تین درست کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بانس اور صنوبر تو سردا بہار ہوتے ہیں۔ اور آلوچے کا درخت سرما کے ختم ہونے پر بہار کی آمد آمد کے ساتھ خشکونے لاتا ہے۔ اس لئے آلوچے کا پیر خاص طور پر کردار کی پاکیزگی کا منظر ہے۔ وہ پاکیزگی جو ہمیں سرما کی کراہی اور ٹھنڈی ہو اس میں ملتی ہے۔ اس کی شان میں سرد مہری نمایاں ہے۔ جتنی نعمت ٹھنڈی ہوگی اتنا ہی یہ پھلے پھولے گا۔ دوسرے لفظوں میں عاقبت اور تنہائی کی دلنوازی اس کے رگ دریشہ سے سُکی پڑتی ہے۔ سونگ ہمہ کے گوشہ نشین شاعر نین ہو چنگ نے اسی لئے کہا تھا کہ میں نے آلوچے کے درختوں سے شادی کر رکھی ہے۔ اور میرا بیٹا ایک بگلا ہے۔ آج کو شان پہاڑوں میں اس کا حجرہ تنہائی شاعروں اور اہل علم کی زیارت گاہ ہے۔ اور اس کی قبر کے پاس اس کے بیٹے

یعنی بگلے کی تہ ہے۔

آلوچے کے پیر کی خوبی اس کی خوشبو ہے۔ اس کی ہیئت پر ایک چینی شاعر نے سات لفظوں کا ایک مصرعہ لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اس کی بھینی باس ہو میں ریح جاتی ہے۔ اور اس کا سایہ زمین کا سہارا لیتا ہے۔“

بالنس کے پیر کو اس لئے پسند کیا جاتا ہے کہ اس کا تنہ اور اس کے پتے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اسی نراکت کی بنا پر اس سے لطف اٹھانے کی صحیح فضا گھر کی ماؤں فضا سمجھی جاتی ہے۔ اس کا حسن مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا حسن ہے۔ اور اسے دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ بڑی معتدل اور ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ بالسنوں کو دیکھنے کا لطف اسی وقت ہے جب وہ پتلے اور نازک ہوں۔ اسی لئے دو تین پیڑ سی بالسنوں کے چھنڈ کا کام دیکھتے ہیں۔ چاہے ان کی عکاسی تصویر کے پردے پر ہو یا چلتی جاگتی زندگی میں ان کی موجودگی سے دل کو طراوت دینا مقصود ہو تصویروں میں محض اس کی دو تین شاخیں دکھادی جاتی ہیں۔ اور اس کے پتلے پتلے نازک خطوط چٹانوں کے کرخت خطوط کے ساتھ بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے چینی تصویروں میں بالسنوں کے چند پیڑوں کے ساتھ دو تین چٹانیں ضرور دکھائی جاتی ہیں۔ اور ان چٹانوں میں بھی اذمی طور پر چہرہ اپن ہوتا ہے۔ موٹائی اور ضخامت نہیں ہوتی۔

رہا بید کا درخت تو یہ ہر جگہ اُگ سکتا ہے۔ خاص طور پر دریاؤں وغیرہ کے کناروں پر نظر آتا ہے۔ یہ سرسبز سائیت کا عکس ہے۔ اسی لئے چائنگ چاؤ نے کہا تھا کہ اس کائنات میں جو چار چیزیں مرد کے دل پر بہت گہرا اثر رکھتی ہیں ان میں بید کا درخت بھی شامل ہے۔ اس درخت کو دیکھتے ہی مرد جذباتی ہو جاتے ہیں چینی نوا تین کی پستلی کمروں کو ہمیشہ ”بید کی سی کمر“ سے تشبیہ دیکھتی ہے۔

اور چین کی رقصہ لڑکیاں ڈھیلے ڈھالے دامنوں اور آستینوں والے لباس پہن کر اپنے ناچ میں اسی طرح اپنے جسموں کو لہراتی اور جھکاتی ہیں۔ جیسے بید کی شاخیں ہوا کے جھونکوں میں لہراتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بید کا پتہ آسانی سے اُگ آتا ہے۔ اس لئے چین میں بہت جگہوں پر میلوں تک بید ہی بید کے درخت نظر آتے ہیں۔ ان سے جب ہوا گزرتی ہے تو ہوا کی لچک اور بید کی شاخوں کا جھکاؤ مل کر چینی زبان میں لیو لانگ کہلاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے «بید کی لہریں» یا بید کے جھونکے۔ اس کے علاوہ بید کی شاخوں میں زرد اور سیاہ پرول والے ادھی اول بھولا جھولتے رہتے ہیں۔ اس لئے کیا تصویر کیا حقیقت بید کو ہمیشہ انھیں پرندوں کے ساتھ دیکھا دکھایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی درخت ہیں۔ جنہیں پسند کیا جاتا ہے اور اس پسندگی کی وجوہ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً: توئیگ کا پیڑ ہے جس کی چھال بڑی عمدہ اور صاف ہوتی ہے۔ چینی لوگ اسے سٹک بھی پسند کرتے ہیں۔ کہ اس پر چاقو کے ساتھ بڑی آسانی سے شعر کندہ کئے جاسکتے ہیں۔ چینوں کو پرائی اور بڑی بڑی بیلوں سے بھی بڑی محبت ہے جو تناور درختوں کے ساتھ لہتی رہتی ہیں۔ ان کے لپٹنے کے انداز اور گولائیاں درختوں کے سیدھے تنوں کے ساتھ ایک تفاوت پیش کرتی ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کسی چھی سی گھنی بیل کو دیکھ کر سونے ہوئے اژدہے کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ چنانچہ اس بیل کو اسی اژدہے کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی باعث وہ کہنے پڑ جن کے تنکے مڑے مڑے ہوں یا جھکے ہوں بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ سو چاؤ کے ہیں تانے ہو جھیل پر ایک مقام مود ہے یہاں ایسے ہی چار سرد کے پیڑ ہیں جنہیں باکیزہ نامہ قدیم اور عجیب کے نام دئے گئے ہیں۔ — باکیزہ نام کے درخت کا تنا

بالکل سیدھا اور لمبا ہے اور بالکل چوٹی کے قریب پتوں کی ایک چھتری سی ہے۔ مادہ کی یہ شکل ہے کہ اس کے تین ٹیڑھے ٹیڑھے تے زمین پینڈیڈر (ح) کی شکل میں کھجے پڑے ہیں قدیم کی چوٹی پر پتے بہت کم ہیں۔ یہ درخت چوڑا اور کوتاہ قد ہے اور اس کی شاخیں نیم خشک ہیں جس طرح بوڑھے آدمی کی انگلیاں ہوتی ہیں۔ عجیب کا تبادل کھاتا ہوا ایک مخر دھ کی شکل میں اپنی ادھی ادھی پھینگوں تک پہنچتا ہے۔

— درختوں کا مزہ لینے اور ان سے لطف اٹھانے کا راز درختوں کی دتا

ہی میں مضمر نہیں بلکہ درخت۔ نظرات کے دوسرے منظر ہر مثلاً چائوں۔ بادلوں۔ پرندوں۔ کیڑوں اور انسانوں کے ساتھ اپنی لسیگی کی وجہ سے پسند آتے ہیں۔ چانگ جاتا کہتا ہے۔ ”بھریوں کے پردے لگانے کا مطلب تیلیوں کو دعوت دینا ہے پتھر جوڑ جوڑ کہ پہاڑیاں بنانا بادلوں کو بلانے کا یہاں ہے۔ درخت لگاؤ تو ہوائیں آتی ہیں۔ کیلوں کے درخت بارش کو دعوت دیتے ہیں۔ اور میدان کے درخت لگاؤ تو گلنے والے طيور آتے ہیں۔ گویا درختوں کے ساتھ پرندوں کے نعروں سے بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ چائوں کے ساتھ چھینگرؤں کے سنگیت کا مزہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ پرندے وہیں نعمر پزیر ہوں گے جہاں درخت ہوں۔ اور چھینگرؤں میں بولیں گے جہاں پانی اور پتھر ہوں۔ چینی لوگ میں بکوں چھینگرؤں اور پرندوں کے نعروں سے جتنا لطف اٹھاتے ہیں اتنی خوشی انھیں بلیوں۔ کتوں یا ایسے ہی بالبو جالوروں کی محبت سے حاصل نہیں ہوتی جانوروں میں انھیں صرف لعلق سے محبت ہے۔ وہ اسکو سی زمرہ میں جگہ دیتے ہیں صبور اور شہزاد کے پیر ہیں کیونکہ تو توں بھی گوسٹہ نشینی کی علامت مانا جاتا ہے۔ کسی تو توں بالنگے کو کسی تہنا تالاب کی دلدل میں زمین میں بے حس و حرکت کھڑا رکھئے۔ وہ دکھ اور خوش و غمی کی تصویر نظر آئے گا چینی اصل علم کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ لعلق کی یہ خوبیاں ہمیں آجی۔

انسان کی نظرت کے ساتھ ہم آہنگی۔ اور اس کی پرسترت زندگی کی آخری تصویر۔

چنگ پانچپاؤ کے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے۔ چنگ (۱۶۹۳-۱۷۵۷ء) نے یہ عبارت ایک خط میں لکھی تھی جس میں اس نے پرندوں کو بچروں میں قید رکھنے پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ خط اس کے چھوٹے بھائی کے نام ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

”میں نے لکھا ہے کہ پرندوں کو بچروں میں بند کر کے نہیں رکھنا چاہئے

یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پرندوں سے محبت نہیں۔ لیکن چاہت کا بھی ایک دستور

ہوا کرتا ہے۔ پرندے رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گھر کے ارد گرد کوئی سو

ایک درخت لگا دیے جائیں اور پرندوں کو ان کی سرسبز چھاؤں میں اپنی

انگ بادشاہت قائم کرنے۔ اپنے کھلے گھر بنانے کی کھلی چھٹی دیدی جلنے

چنانچہ جب اس صورت میں ہم صبح کو نیند سے بیدار ہوں گے۔ اور ابھی بستر

پر کروٹیں ہی بدل رہے ہوں گے تو ہمیں آسمانی نغمے کی طرح پرندوں کے ان

گزرت چہچہے منافی دیں گے۔ بستر سے اٹھنے کے بعد منہ دھوتے ہوئے یا کپڑے

پہنتے ہوئے۔ یا صبح کی چائے پیتے ہوئے ہمیں اذھرا اذھرا اڑتے ہوئے پرندوں

کے شان دار بال دہر نظر آئیں گے۔ ایک پر نظر نہیں جم جائے گی۔ کہ دوسرا

سامنے آجائے گا۔ اور یہ وہ لطف ہے جو کسی ایک پرندے کو بچرے میں

بند کر کے رکھنے سے کسی طور حاصل نہیں ہو سکتا۔

زندگی کا لطف عام طور پر اس انداز نظر سے حاصل کرنا چاہئے

گویا یہ کائنات ایک باغ ہے۔ دریا اور جھیلیں اس باغ میں چھوٹے چھوٹے

تالابوں کے مانند ہیں۔ اور اس باغ میں ہر ذی روح اپنی نظرت کے تقاضوں

کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ صورت اسی طرح گہری، درستی خوشی حاصل

ہو سکتی ہے۔ ذرا اس کا مقابلہ اس بے رحمی سے کیجئے جس کے ماتحت پرندوں کو پجرے میں بند کر کے یا زندہ مچھلیوں کو شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ان کے بال دیر-رنگ اور چہچہوں سے لطف حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“

۵۔ پھول اور پھولوں کی ترتیب

پھولوں سے لطف اٹھانے اور پھولوں کی ترتیب کے بارے میں آجکل بڑی بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ درختوں میں سے ہم نے چند ایک اعلیٰ درجے کے درخت اپنی پسندیدگی کے لئے الگ کر لئے تھے۔ اسی طرح پھولوں کی چند اعلیٰ قسمیں بھی الگ کر لینی چاہئیں۔ اور اپنی پسندیدگی کا آغاز انہیں سے کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں اپنے آپ میں ان قسموں کی درجہ دار منزلت کا احساس پیدا کرنا ہو گا۔ اور خاص پھولوں کے ساتھ جو مخصوص جذبات اور مخصوص نصابہ ہوتی ہے اس کا احساس کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلی بات تو خوشبو کی ہے۔ بعض پھولوں کی خوشبو بہت تیز۔ اور بڑی واضح ہوتی ہے۔ اس کی مثال چنبیلی ہے۔ بعض کی خوشبو بڑی نازک ہوتی ہے۔ جیسے چینی نسترن کی۔ پھر چینی نرگس کی طرح نہایت نفیس اور بے حد نازک نفیس خوشبو بھی ہوتی ہے۔ تو معیار یہ قرار پایا کہ جس پھول کی خوشبو اتنی لطیف ہو اور باسانی معلوم نہ ہو سکے وہ پھول اتنا ہی ارفع داعی سمجھا جائے۔ خوشبو کے بعد دوسرا خیال رنگ شکل اور پھول کی لکڑی کا ہے ان خصوصیات کے اعتبار سے پھولوں میں بہت زیادہ تنوع ملتا ہے۔ بعض پھول صحت مند جوان لڑکیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض بید نازک اور شاعرانہ مزاج کی خاموش

طبع خواتین کی طرح نظر آتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جیسے تمام شایئوں کے لئے اپنے جلوے لٹا رہے ہوں۔ بعض اپنی ہی خوشبو میں متوالے ہو کر اپنی مختصر زندگی کی گھڑیاں ابوں میں گزارتے نظر آتے ہیں بعض کا رنگ شروع ہوتا ہے۔ اور بعض رنگ کے معاملہ میں سنجیدہ ذوقی کے قائل ہیں۔ خوشبو۔ رنگ اور شکل کے علاوہ ایک اور بات یہ ہے کہ پھولوں کو ہمیشہ اس کی کی فضا اور کھلنے کے موسموں کے ساتھ دستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کا تعلق بہار کے ایک صاف اور جھکے دن کے ساتھ ہے۔ کنول کو گرما کی ایک خفک صبح سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ تیج کے پھولوں کی سنگت فصلیں کاٹنے کے مہینوں اور موسم خزاں کے جشنوں کے ساتھ ہے۔ گل داؤدی کو خزاں کے آخری دنوں سے دستہ خیال کیا جاتا ہے۔ آلوچے کے پھول کا ربط برن کے ساتھ ہے۔ اور نرس اور آلوچہ کا پھول دونوں نئے سال کے جشن کا ایک حصہ ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ہر پھول اپنے قدرتی ماحول میں ہی مکمل ہوتا ہے۔ اسی لئے جو لوگ پھولوں سے محبت کرتے ہیں ان کے نزدیک پھول مختلف موسموں کی زندہ علامتیں بن جاتے ہیں۔ اسکی مثال ہالی کا پھول ہے۔ جو کرسمس کا منظر سمجھا جاتا ہے۔

صنوبر اور باسل کے درختوں کی طرح گل داؤدی کنول اور نستر کے پھولوں کو ان کی مخصوص خصوصیات کی بنا پر پھولوں میں ممتاز قرار دیا جاتا ہے۔ چینی ادب میں یہ تینوں پھول شرافت اور عالی نشی کے منظر خیال کئے جاتے ہیں۔ خاص طور پر نستر کے والہا حسن کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ چینی شاعروں کو آلوچے کے پھولوں سے بیحد لگاؤ رہا ہے۔ اور اس پر میں پھلی فصل میں کچھ باتیں لکھ ہی چکا ہوں۔ آلوچے کے پھول کو پھولوں میں اول کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نئے سال کے ساتھ آتا ہے۔ اور اس طرح سال بھر میں جو پھول کھلتے ہیں۔ یہ پھول ان کے جاس کا

گو یا رہنما ہے۔ پھر بھی پسند اور رائے کا اختلاف عام ہے شقائق (پی اوئی) کے پھول کو بھی پھولوں کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ خاص طور پر مانگ خاندان کے عہد حکومت میں یہی پھول سب سے عمدہ اور اعلیٰ مانا جاتا تھا۔ اس کا رنگ سرخ اور پتیاں گھنی ہوتی ہیں۔ اور اسے امیر اور خوش باش شخص کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسکے برعکس لوگ

کا پھول شاعروں کا محبوب ہے کیونکہ یہ خاموش طبع اور غریب اہل علم کا نمونہ ہے گو یا شقائق کا پھول اگر مادیت کا منظر ہے تو آلوچے کا پھول روحانیت کا۔ چین کے صرف ایک عالم نے شقائق کے لئے ہمدردی ظاہر کی ہے اور وہ بھی اس بنا پر کہ مانگ خاندان کی ایک ملکہ دوانے سے اپنے باغات اور دار الحکومت سے جلا وطن کر دیا تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ یہ ملکہ بڑی خود پسند اور مغرور تھی۔ ایک دن اپنے اجتہادات کے غرور میں اس نے حکم دیا کہ شاہی باغوں کے تمام پھول ایک خاص وقت تک کھل جائیں۔ یہ عین سردیوں کا زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف شقائق کا پھول اتنا گستاخ ثابت ہوا کہ وہ اس مقررہ وقت سے چند گھنٹے بعد کھلا۔ ملکہ سخت برہم ہوئی اور اس نے اس پھول کے ہزاروں گلابوں کو شاہی فرمان کے ذریعہ سے اپنے دار الحکومت سیان سے جلا وطن کر کے لویانگ بھیج دیا۔ شاہی نظروں سے گرجانے کے باوجود اس پھول کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔ لویانگ کا شہر اس پھول کا گہوارہ بن گیا رہا گلاب تو چینی لوگ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ رنگ اور شکل میں یہ بھی شقائق کی طرح ہوتا ہے لیکن شقائق کے پھول کی شان اور رعنائی گلاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے گلاب زیادہ اہم نہیں رہا۔ چینی ادب اور ثقافت میں شقائق کے پھول کی بہت بھرمار نظر آتی ہے۔ مثلاً بہت قدیم زمانے کی کتابوں سے بھی بتہ جلتا

ہے کہ شقائق کی کوئی نوے قسمیں ہوتی ہیں۔ ہر قسم کو نہایت شاعرانہ نام بھی دیا گیا ہے۔

شقائق کے برعکس نستران عورت اور تہنائی کی دل کشی کا مظہر ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ ایسی دادیوں میں ملتا ہے جو الگ تھلگ اور سایہ دار ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی دلکشی میں مست رہتا ہے۔ اور اسے یہ پر و انہیں ہوتی کہ لوگ اس کی طرف دیکھتے ہیں یا نہیں۔ یہ پھول شہروں میں لائے جانے پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر لایا بھی جائے تو یہ اپنی شرائط پر ہی پھول سکتا ہے۔ اور ان میں ذرا سی ترمیم بھی کی جائے تو فوراً سوکھ جاتا ہے۔ اسلئے چینی زبان میں یہ محاورہ عام ہے کہ فلاں حسینہ نستران کی طرح عورت نشین ہے۔ یا فلاں فضل دنیوی شہرت اور عزت سے بے نیاز بہانے کسی پُرسکون گوشے میں اُگے ہوئے نستران کے پھول کی طرح خاوت نشین ہے۔ اسکی خوشبو جتنی لطیف ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ اپنی خوشبو سے سونگھنے والے کو خوش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن حبیب اسکا ذوق پیدا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر دنیا کی کوئی خوشبو لطیف اور حسین نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہ پھول سچی دوستی کی بھی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ چین کی ایک نہایت قدیم کتاب میں لکھا ہے کہ اگر کسی گھر میں چل ہو کر نستران کے پھولوں کے ساتھ کافی دیر رہیں تو ان کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ خوشبو انسان کی ہستی پر ہی طرح غیر محسوس طور پر چھا جاتی ہے جس طرح سچی دوستی۔ لی کی رنگ لے کہا ہے کہ نستران کے پھولوں کا لطف اٹھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے ہر کمرے میں نہ رکھا جائے۔ بلکہ صرف ایک کمرے میں پھول رہیں اور اس کمرے میں آتے جاتے ان پھولوں کی نفیس خوشبو سے مشام جاں کو معطر کیا جائے۔ امریکی نستران میں نفیس اور نازک خوشبو نہیں ہوتی مگر امریکی نستران چینی نستران سے بڑا ہوتا ہے

اس کی شکل زیادہ شان دار ہوتی ہے۔ اور اسکے رنگ زیادہ نظر فریب ہوتے ہیں پھر آبیانی شہر اور صوبہ میں بہترین قسم کا نسترن ہوتا ہے۔ اسے فیوگن کا نسترن کہتے ہیں۔ اسکا رنگ لہکا سبز ہوتا ہے اور اس میں قرمزی رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ عام نسترن چھوٹا ہوتا ہے اور اسکی پنکھڑیاں ایک انچ سے ذرا سی زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ نسترن کی بہترین قسم کو چن رنگ لینگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسکا رنگ اتنا نفیس ہوتا ہے کہ جب اسے پانی میں ڈبو یا جلے تو نظر نہیں آتا۔ اسکا رنگ پانی کے ہم رنگ ہے۔

نسترن کا نا بڑا مشکل ہے۔ یہ پھول اتنا نازک اور نفیس ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسکے کھلنے سے پہلے مرجھانے یا سکے بالکل نہ پیدا ہونے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ شاید اسی بنا پر کردار کی نفاست اور عالی ظرفی اس پھول سے وابستہ کی گئی ہے۔ تمام پھولوں میں یہی پھول ہے جو ذرا سی بے احتیاطی یا سخت ہاتھ لگنے سے مرجھا جاتا ہے۔ اور بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جن لوگوں کو اس پھول کا ذوق ہے۔ وہ اس کی ذاتی طور پر نگہداشت کرتے ہیں۔ اور اسے نوکروں پر نہیں چھوڑتے۔ میں بعض شوقینوں کو دیکھتا ہوں کہ اس پھول کی حفاظت اور نگہداشت اس جانسوزی سے کرتے ہیں جس طرح اپنے والدین کی خدمت کرتے ہیں۔ اس پھول کا تادریقہتی قسم کا پودا دوسروں کے لئے اتنا ہی عیث رشک ہے جتنا کالسنی کا کوئی نادر بیت یا گلخانہ باعث رشک ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص دوست کی درخواست پر اس کی کونپلیس نہ وے تو سمجھ لیجئے کہ گہری نفرت کا بیج اس کے دل میں بویا گیا۔ چینی روایات میں یہ حکایت موجود ہے کہ اگر چینی عالم کو اس کے دوست نے نسترن کی نئی کونپلیس مانگنے پر نہیں دیں تو اس نے یہ کونپلیس چورا لیں۔ اور اس چوری کی پاداش میں قید کی سزا اٹھاتی۔ سن فونے مردوں کی زندگی کے بارے میں چھ باب ہیں ان جذبات کا اظہار بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

مد نستر ن سب پھولوں سے زیادہ محبوب اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی خوشبو
 بھینی اور اس کا حسن بہت پاکیزہ ہے۔ لیکن اس کی عمدہ قسمیں مہیا کر لینا
 بہت مشکل ہے۔ جب لان پو کا انتقال ہوا تو اس نے مرتے وقت مجھے
 بہار کے نستر ن کا ایک گملا تحفہ دیدیا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں نیلوفر کی پتیوں
 کی طرح تھیں۔ پھولوں کا مرکزی حصہ بڑا اور سفید تھا۔ پنکھڑیاں بڑی
 پاکیزہ تھیں اور دھنسل بڑے ہی نازک تھے۔ یہ قسم پرانی اور نکسالی تھی
 میں نے اسے سیپ کے قدیم نوادر کی طرح سینے سے لگا کر رکھا جب میں
 گھر سے باہر ہوتا تو میری بیوی یون ذاتی طور پر اس کا خیال رکھتی یہ
 پودا بہت اچھی طرح پھیلا پھولا۔ مگر دو ہی برس بعد ایک دن یکا یک سوکھ
 گیا۔ میں نے کھو کر اس کی جڑیں دیکھیں تو مرمر کی طرح سفید ہو چکی تھیں۔ مگر
 انہیں کوئی خرابی نہ تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نادر نستر ن کس طرح سوکھ
 کر رہ گیا۔ میں نے اسے اپنی بد بختی پر محمول کیا کہ قدرت نے مجھے ایسے پھول گلنے
 اور انکی نگہداشت کے قابل نہ سمجھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ کسی نے اس پودے
 کے کچھ پھول مانگے تھے جو اسے نہیں دئے گئے تھے۔ اس نے استقامت کھولتا ہوا

پانی ڈال کر اس پودے کو ہی مار دیا تھا۔»

شاعر تانویوان منگ کا محبوب پھول گل داؤدی تھا۔ اور شاعرین ہو چنگ کا پسندیدہ
 پھول آلویچے کا پھول تھا۔ اسی طرح کنفیوشس فلسفے کے ماہر چانگ چن کو نیلوفر سے
 بڑی محبت تھی۔ گل داؤدی کے حسن میں جو شان نہ وہ شقائق کے پھول کے حسن سے بہت
 مختلف ہے۔ اس کی ہزاروں قسمیں پائی جاتی ہیں سو منگ عہد کے ناموزنائل فان
 چنگ تانے یہ رواج شروع کیا کہ گل داؤدی کی مختلف قسموں کو خوبصورت نام

دے دے کر ان کا باقاعدہ رکھا رکھا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنوع اور رنگارنگی گل داؤدی کا جان ہے اس کے کئی رنگ اور ان گنت شکلیں ہیں۔ ان میں سے سفید اور پیلے گل داؤدی کو ٹنگالی قسم کہا جاتا ہے۔ قرمزی اور سرخ کو ٹنگالی باہر کی قسمیں سما کیا جاتا ہے۔ سفید اور پیلے ہونے کی وجہ سے ان قسموں کے بڑے شاعرانہ نام رکھے گئے مثلاً جام سلیمیں، سیم خام کی گھنٹی، "زرین گھنٹی" وغیرہ۔ بعض قسموں کو مشہور مازنیوں کے نام سے موسوم کیا گیا مثلاً "یا نگ کیوٹی" اور سی شی گل داؤدی کی شکل بدلتی بھی رہتی ہے۔ بعض دفعہ یہ خواتین کے چھوٹے چھوٹے بالوں کے نشین سے مماثل ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کی شکریاں لہرائی ہوئی زلفوں پر چھلی کھاتی ہیں۔ بعض قسموں میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی بہترین قسموں میں مسک کی خوشبو ہوتی کنول یا آبی نیلو فر اپنی نظیر آپ ہے۔ میرے نزدیک یہ دنیا کا حسین ترین پھول ہے یعنی پورے پھول کو اگر دکھیں جس میں اس کا بانگا پھل اور پاتی کی سطح پر اس کی تیرتی پتیاں بھی ہیں۔ تو اس کے حسن کا مقابلہ کوئی پھول نہیں کر سکتا۔ گریبوں کا مزہ کنول کے بغیر نہیں آسکتا۔ اگر گھر کے پاس کنول کے پھولوں کے لئے بڑا تالاب موجود نہ ہو تو یہ پھول پانی کے بڑے بڑے مسکوں میں اگلے جاسکتے ہیں۔ اس طرح وہ خوبی تو پیدا نہیں ہوگی جو کنول کے پھولوں کے آدھیل لیے آبی تختے میں ہوتی ہے۔ کیونکہ کھلے پانی میں تو اس پانی کی خواہش سے فرابور ہوتی ہے۔ اس کی سفید اور سرخ کلیاں چوڑے چوڑے میزبتوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب نظارہ پیش کرتی ہیں۔ اور ان پتیوں پر پانی کے سفید موتیوں کا حسن تو بیان سے باہر ہے۔ سو نگ عہد کے مشہور نال چاؤ نے ایک پورا مضمون لکھا تھا۔ جس میں اس نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اُسے کنول کا پھول کیوں سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کنول کا پھول شریفانہ راہ

کی طرح گندے پانی سے ملوث نہیں ہو سکتا۔ اپنی ماہریت میں یہ قول کنفیوشس کے فلسفے کے عین مطابق ہے مگر افادی زاویہ نگاہ سے بھی کنول کا پھول سرتاپا مفید ہی مفید اس کی جڑ سے ٹھنڈا شربت بنتا ہے۔ چوڑے پتوں میں پھل یا پکانے کی پتیریں باندھ کر بھاب میں پکائی جاسکتی ہیں۔ اس کے پھول اپنی خوشبو کے اعتبار سے بے حد دلنواز ہیں۔ اور اس کے بیج دزرنیلوفر (کوہینی) لوگ حوروں کی غذا قرار دیتے ہیں جسے یا تو بالکل کچا کھانا چاہئے۔ یا خشک کر کے شکر کے ساتھ نوش جان کرنا چاہئے۔

چینی پھول ہائے تانگ جو صیب کے شگوفوں سے ملتا جلتا ہے۔ شاعروں میں بہت مقبول ہے۔ مگر اس کی کسی وجہ بیان کی جاتی ہیں۔ کہ آخر شاعر تو فونے اس کا کیوں نام نہیں لیا۔ حالانکہ یہ پھول اس کے وطن میں عام ہے۔ غالباً یہ وجہ قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس کی ماں کا نام ہائی تانگ تھا۔ اور اس نے ماں کے نام کے احترام کی وجہ سے اس کا نام نہیں لیا

دو پھول ایسے ہیں جن کے لئے خوشبو کے لئے میں لندن سے بھی ہاتھ اٹھا لینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ ہیں تیج کا پھول اور نرگس۔ نرگس میرے شہر کا خاص تحفہ ہے۔ کبھی اس کی لاکھوں کی مالیت کی پنیری امریکہ بھی جاتی تھی۔ مگر پھر ہمارے محکمہ زراعت نے یہ برآمد کر دی۔ اس کا جڑیں بڑی سفید۔ بڑی پاکیزہ اور نکھری ستھری ہوتی ہیں۔ اور پھول کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ چین میں ازبلا کے پھول کو المناک پھول سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا حسن سراسر تقسیم ہی تقسیم ہے۔ مگر روایت یہ ہے کہ یہ پھول کونسل کے آئسوؤں سے پیدا ہوا تھا۔ اور کونسل میں ایک ننھا سالڑا کھسی۔ جسے سو تیلی ماں نے گھ سے نکال دیا تھا۔ اور جو اپنے گم شدہ بھائی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

پھولوں کا انتخاب اور ان کی درجہ بندی جتنی اہم ہے۔ اتنی ہی اہم یہ بات ہے

ہے کہ ان پھولوں کو گلدانوں میں کیسے سجایا جائے۔ پھولوں کی تربیت دیکھنا ہے جو چین میں گیا رھویں صدی سے رائج ہے۔ رواداں زندگی کے بارے میں چھ باب کے مضمون نے بتایا ہے کہ پھولوں کی ترتیب اس طرح کرنی چاہئے۔ کہ وہ ایک عمدہ تصویر نظر آئیں۔ اس کتاب کے باب زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں میں وہ لکھتا ہے۔

ہر سال خزاں کے دنوں میں گل داؤدی سے مجھے جیسے عشق ہو جاتا تھا۔ میں ان پھولوں کو سوسو طرح سے گل انوں میں سجاتا میں انہیں کبھی گلدانوں میں ڈاکاتا تھا۔ میرے گھر میں اتنی جگہ نہ تھی کہ باغ لگ سکتا۔ اور گلدانوں میں گونا گونا جھت سے خالی نہ تھا۔ بازار سے جو پھول خریدتا وہ قسم کے لحاظ سے عمدہ نہ ہوتے۔ اور مجھے پسند نہ آتے۔ خیر گل داؤدی کو گلدانوں میں سجاتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ گلدانوں کی تعداد طاق ہو۔ جفت نہ ہو۔ اور ایک گلدان میں صرف ایک رنگ کے پھول رکھنے چاہئیں۔ گل ان کا منہ کھلا ہونا چاہئے۔ تاکہ پھول آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ رہیں۔ ایک گلدان میں چاہئے دو طرح کے پھول ہوں یا تیس چالیس سے بھی زیادہ ہوں انہیں اس طرح سجانا چاہئے کہ وہ گلدان کے دہانے سے ایک ساتھ باہر نکلیں۔ نہ تو پھولوں کی بھرمار ہو۔ نہ وہ زیادہ بکھریں۔ نہ گلدان کے منہ پر پڑے ہوئے نظر آئیں۔ اسے فن کی اصطلاح میں پھولوں کے ڈنٹھل پکے رکھنا کہتے ہیں۔ بعض دفعہ انہیں پھول رکھنے کے بالکل سیدھے کھڑے رہیں۔ اور بعض کو پھول سجائیے کہ ایک خوشنما چھتری سی بن جائے۔ یکسانیت دور کرنے کے لئے پھولوں میں کلیاں شامل کیجئے۔ اور اس طرح سجائیے کہ ترتیب میں بے ترتیبی چھلکے۔ بناوٹ کا شائبہ نہ ہو۔ پھولوں کے ساتھ سخت پتے نہ ہونے چاہئیں۔

اور ڈنٹھل بھی سخت نہیں ہونے چاہئیں۔ ایک مینز پر تین سے لیکر سات گلدان رکھے۔ ان کی تعداد مینز کے سائز پر منحصر ہے۔ کیونکہ اگر ایک مینز پر زیادہ گلدان ہوں گے تو مینز پر انبار لگانا نظر آئے گا جس طرح پھول منڈی میں ہوتا ہے۔ گلدان رکھنے کے پائے مختلف سائز کے ہوں تو بہتر ہے۔ یہ پائے تین چار انچ سے لے کر دس تین فٹ کے ہو سکتے ہیں تاکہ مختلف گلدان مختلف اونچائی پر نظر آئیں۔ اور سارے منظر میں توازن اور ویسی ہم آہنگی پیدا ہو جانے جیسی کسی تصویر میں ترکیبی اکائی اور وحدت مضمون کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ یہ دیکھا ہے کہ درمیانی گلدان کو اونچا رکھا جاتا ہے۔ اور اس کے دونوں طرف دار گلدان نیچی سطح پر رکھے ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ سامنے نیچی سطح پر ایک گلدان ہو۔ اور اس کے پیچھے ایک کو اونچا رکھا جاتا ہے۔ یا یہ کہ گلدانوں کو تناسب کے اعتبار سے جوڑا جوڑا کر کے رکھا جاتا ہے۔ یہ سارے دستور آہیں جنہیں عامیانا زبان میں شاندار فنونیات کہا جائے تو بجا نہیں۔ گلدانوں کو مناسب جگہ پر رکھنے اور انہیں سجانے کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ آپ میں کسی تصویر کے ترکیبی عناصر کو ہم آہنگ کر نیکانہذا ہے نہیں بعض اوقات پھولوں کو کھلے سیالوں اور پتھریوں میں سجایا جاتا ہے۔ ان پھولوں کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کا عام طریقہ ہے کہ مصفا بروزے کو خاص قسم کی چھال نیل اور میدے میں ملائیں اور گرم راکھ پر گرم کریں حتیٰ کہ یہ ایک قسم کی سرش بن جائے اس سرشے تانے کے ایک ٹکڑے پر چند کیلیں چکائیے۔ اس طرح کہ کیلوں کو ٹوپوں کی طرف سے چکایا جائے۔ اور ان کی ٹولیں

پھول اور ترتیب

کھلی رہیں۔ پھر اس تانے کے ٹکڑے کو گرم کر کے سریش کے ساتھ
 پھولوں کی طشتری یا پیالے میں چکا دیجئے۔ ٹھنڈی ہو جانے پر
 پھولوں کو ایک ایک کیل کے ساتھ تار سے باندھ دیجئے۔ یا ان کیلوں
 پر اس دیجئے۔ پھولوں کو ایک طرف جھکا رہنے دیجئے۔ عین درمیان سے
 ان کا سیدھا تن کر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ضروری ہے
 کہ پھولوں کے ڈنٹھل اور ان کے پتے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ
 ملے ہوئے نہ ہوں۔ پھولوں کو اس طرح باندھنے کے بعد اس پیالے میں کچھ
 پانی ڈال دیجئے اور نیچے کی تانے کی پلیٹ کو صاف ریت سے چھپا دیجئے
 اس صورت میں پھول پیالے کے پلندے سے اُگے ہوئے معلوم ہونگے
 پھول اور درختوں کی شاخیں گلہ انوں میں سجانے سے پہلے ان شاخوں
 کو کاٹنا چھٹنا ضروری ہے۔ کیونکہ آپ خود ایسی شاخیں درخت سے کاٹ کر
 لانے سے نور ہے۔ اور دوسروں کی لائی ہوئی شاخیں عام طور پر پستی بخش
 نہیں ہوتیں۔ بہتر یہ ہے کہ پھولوں سے ہدی ہوئی شاخ کو ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر
 گھما کر دیکھئے۔ خیال رکھئے کہ کس طرف سے یہ دیکھنے میں زیادہ تاثر انگیز نظر
 آتی ہیں۔ جب یہ زاویہ ملے ہو جائے تو تمام فالتو ٹہنیاں چھانٹ دیجئے۔ یہ خیال
 رکھئے کہ یہ شاخ نیم سنگفتہ اور کچھ عجیب سی خوبی اور تاثر کی حامل بن جائے۔ پھر
 یہ سب چھلے کہ شاخ کا زیری حصہ گلہ ان میں کیسے رہے گا۔ کس زاویہ پر جھکا ہو گا
 کہ جب اسے گلہ ان میں رکھا جائے تو شاخ کے پتے اور پھول عمدہ سے
 عمدہ تاثر پیدا کریں۔ اگر دو پار شاخوں کو پونہی اٹھا کر ایک
 گلہ ان میں ٹھونس دیا جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے ڈنٹھل تنے میں گئے۔ شاخیں

آپس میں ملی ملی رہیں گی پھول اور پتے غلط زاویوں پر ہوں گے اور کوئی حسن پیدا نہیں ہوگا۔ اگر بالکل سبھی شاخ کو ذرا سا ٹیڑھا کرنا ہو تو اس کے تنے کے عین وسط میں چاقو سے ایک ذرا سا ترکانہ بچھے۔ اور اس میں ننھا سا پتھر پھینا دیجئے۔ یہ شاخ بڑے انداز سے جھک جائے گی۔ اگر شاخ بہت نرم و نازک ہو تو اس جگہ مضبوطی کے لئے ایک دھپن لگا دیں۔ اس طریقے سے بانس کی شاخیں۔ گھاس کی عام لمبی پتیاں اور جھاڑیوں کی شاخیں تک گلدانوں میں سچی نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ہرے بانس کی کسی شاخ کے ساتھ گوندنی کی شاخیں یا انگور کی ایک دو شاخیں۔ اور گوکھڑا اور گھاس کے پتوں کو نہایت خوبصورتی سے سجایا جا سکتا ہے۔ اور اگر ان کی ترتیب ٹھیک ہو تو نہایت شاعرانہ تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ یوآن چنگ لانگ کے گلدان

پھول سجانے کے بارے میں چینی زبان میں بہترین کتاب یوآن چنگ لانگ کی ہے۔ سو لھویں صدی کے اوائل کا مصنف کئی اعتبار سے میرا محبوب مصنف ہے۔ پھول سجانے کے بارے میں اس نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام پنک شیبہ ہے۔ جاپان میں اس کتاب کی بڑی قدر ہے۔ بلکہ وہاں تو پھولوں کی ایک خاص طرز آرائش ہے۔ جو یوآن اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی کتاب کے دباؤ میں وہ لکھتا ہے کہ خوش قسمت سے پہاڑ۔ دریا پھول اور بانس کے ہرے بھرے پیر تھرت اور آفتاب کے بھوگول کی زد سے باہر ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں۔ دریاؤں پھولوں اور پیروں

سے لطف اٹھانے کی نعت سے اپنی مصروفیات کی بنا پر محروم ہو جاتے ہیں۔ لہذا قدر
 کی ہر مانی ہے کہ گزشتہ نشین اہل علم کو ان سے لطف اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بلکہ
 ان کا تماشہ حسن و خوبی اہل علم ہی کے لئے مخصوص ہے۔ یوآن نے یہ تشریح بھی کر دی
 ہے کہ گلہ انوں میں سب سے پھولوں کا لطف اٹھانا کوئی قدرتی چیز نہیں۔ چونکہ جو لوگ شہر و
 میں رہنے پر مجبور ہیں وہ پودوں پر لگے پھولوں کا لطف اٹھانے سے محروم ہیں۔ اس لئے
 وہ گلہ انوں کے پھولوں پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ گلہ انوں سے لطف اٹھانے میں
 انسان کو پہاڑوں اور تھیلوں کی جنت کا نظارہ بھول نہیں جانا چاہئے جو اہل چترتے
 وہ کہتا ہے کہ اپنے کمرے میں پھول سجانے کے بارے میں بڑی احتیاط سے کام لینا
 چاہئے۔ بہت سی قسموں کے پھول کمروں میں رکھنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ کمرہ پھولوں
 سے عاری رہے۔ اس لئے ان ابتدائی شرطوں کے بعد یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے
 کہ پھولوں کو کالسنی اور مٹی کے کس کس قسم اور کس کس نوع کے گلہ انوں میں سجانا چاہئے
 ان میں دو قسمیں ممتاز کی گئی ہیں۔ کہ جو لوگ صاحب حیثیت ہوں اور جن کے پاس
 ہان خاندان کے وقتوں کے تادر اور منقش گلہ ان موجود ہوں اور جن کے گھروں میں
 بڑے بڑے کمرے بھی ہوں انہیں لازم ہے کہ بڑے بڑے پھول اور لمبی لمبی شاخیں
 بڑے بڑے گلہ انوں میں سجاکر رکھیں۔ اس کے برعکس اہل علم لوگوں کے یہاں
 چھوٹے گلہ انوں کے اندر چھوٹی شاخیں اور مختصر پھول ہونا چاہئیں۔ اور لگا
 انتخاب بھی نہایت احتیاط سے کرنا چاہئے۔ یوآن نے صرف شقائق اور کنول کو
 مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں پھول بڑے ہیں اس لئے ان کو بڑے
 گلہ انوں ہی میں رکھنا مناسب ہے۔

پھولوں کو گلہ انوں میں سجانے میں یوآن کے نزدیک ان باتوں کا خیال رکھنا لازم ہے۔

پھولوں کے سجانے میں زیادہ فراخندی، درختوں دو ٹوں سے احتراز لازم ہے ایک گلہ ان میں زیادہ سے زیادہ دو یا تین قسم کے پھول رکھے جائیں۔ ان پھولوں کی باہمی بلندی اور پستی میں حسن ترتیب ایسا ہو جیسا کسی عمدہ تصویر میں ہوتا ہے۔ گلہ انوں کو جوڑوں میں یا ایک ہی بلندی پر یا ایک ہی سیدھی قطار میں ہرگز رکھئے پھولوں کو دھاگے سے باندھنا بھی نہیں چاہئے۔ کیونکہ پھولوں کا حسن ان کی بے ترتیبی اور ان کے قدرتی انداز ترتیب میں ہے۔ گویا پھولوں کی ترتیب تو منگنے کی نثر کی طرح ہے۔ جسکی روانی اپنی ہے اور جو جہاں چاہتی ہے رک جاتی ہے۔ یا پھر کی پو کی نظموں کی طرح جن میں ضروری نہیں کہ قافیہ بند شعر ہی ہوں۔ پھولوں کی ترتیب میں اصلی نفاس ت اسی کا نام ہے۔ اگر محض تے اور شاخیں ہی ایک دوسرے سے مطابقت رکھیں لیکن رنگوں کا لحاظ نہ کیا جائے مثلاً سرخ کو سفید کے ساتھ رکھ دیا۔ تو ترتیب میں نفاس ت کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

شاخوں کے انتخاب میں یہ لحاظ رکھئے کہ شاخیں اعلیٰ اور نازک ہوں۔ اور انکو باہم گتھم گتھا کر کے نہ رکھئے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی خیال رہے کہ کوئی ایک پھول والی شاخ گلہ ان میں لگائیے۔ اگر دو قسم کی دو شاخیں ایک گلہ ان میں رکھنی ہیں تو یوں رکھئے کہ دو قسم کے پھول ایک ہی شاخ پر کھلے معلوم ہوں پھولوں کی مناسبت۔ گلہ ان کی وضع وزنگ کے ساتھ بھی ہر ذریعہ ہے۔ پھولوں کے پھل اتنے بے ہوں کہ گلہ ان سے چار پانچ پنج بڑے ہوں۔ یوں فرض کیجئے کہ گلہ ان دو ڈنٹ ادبچا ہے۔ اس کی کمر جوڑی ہے۔ اور پینڈا بھی جوڑا ہے تو پھر پھول کی پوری لمبائی دو ڈنٹ چھ پنج یا سات پنج ہونی چاہئے۔ اگر گلہ ان لمبا اور تپلا ہے۔ تو دو شاخیں لیجئے۔ ایک لمبی اور ایک چھوٹی۔ جو اس سے تواس کی

شکل میں لہراتی ہوئی نکلیں۔ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ پھولوں کے ڈنٹھل گلدان کی لمبائی سے کچھ چھوٹے ہوں۔ ایک بات سے ہر حال میں احتراز لازم ہے کہ گلدان پھولوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ لگیم نظر آئے۔ پھولوں کا اپنا لگا دینا بھی ٹھیک نہیں چھوٹے گلدان میں پھول مچانے کے سلسلہ میں خیال رکھئے کہ پھول گلدان سے کوئی دو دو اچ یا ہر نکلے نظر آئیں لیکن ان کے ڈنٹھل گلدان کی لمبائی سے دو اچ کم ہوں مثلاً آٹھ اچ کے تنگ ساخت کے گلدان میں جو پھول لگائے جائیں ان کے ڈنٹھلوں کی لمبائی چھ اچ ہوئی چاہئے۔ لیکن اگر گلدان کی ساخت چوڑائی پر مائل ہو تو پھولوں کے ڈنٹھل اس سے کوئی دو اچ لمبے ہونے چاہئیں۔

جس کمرے میں پھول رکھے جائیں اس میں صرف ایک سادہ میز اور بید کا کوچ ہو۔ میز چوڑی ہو۔ موٹی اور عمدہ لکڑی کی ہو۔ اور اس کی سطح نہایت صاف اور ہموار ہو۔ منقش میزیں جن کی جدولوں پر مینا کاری ہوئی ہو سہرے کام کے کوچ اور وہ اسٹنڈ جن پر گل بوٹے بنے ہوں ایسے کمرے میں ہرگز نہیں رکھنے چاہئیں۔

پھولوں کو نہلانے یعنی ان کو پانی دینے کے سلسلہ میں ای مصنف نے پھولوں کے موڈ اور ان کے جذبات سے جس طرح گہری اور محبت بھری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

”پھولوں پر خوشی اور غم کے موقعے آتے ہیں۔ اور پھولوں کے سونے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ اگر پھولوں کو صبح اور شام کو مناسب وقت پر نہلا جائے۔ تو یہ پانی ان کے لئے ابر رحمت بن جاتا ہے۔ ہلکے بادلوں اور ہلکی دھوپ کا دن غروب آفتاب اور چاندنی یہ سب ان کی ٹھسوں میں ہیں۔ مثلاً

طوفان - مینہ کے برستے جھالے۔ سورج کی بے رحم تپش اور شدید
 سردی یہ پھولوں کے لئے شامیں ہیں۔ جب ان کے ڈنٹھل پیاری
 دھوپ میں ہناتیں اور ان کے نازک جسم تیز ہوا سے محفوظ ہوں تو
 یہ پھولوں کی خوشی کا وقت ہوتا ہے۔ جب وہ مخمور یا خاموش اور تھکے ہوئے
 نظر آئیں یا جب دن بھر ہوا ہو تو یہ پھولوں پر غم کا وقت ہوتا ہے۔ اور جب آ
 ڈنٹھل ایک طرف جھک جائیں اور اس طرح لچکے رہیں جیسے وہ سیدھے کھڑے
 نہیں رہ سکتے تو سمجھ لیجئے کہ پھول سپنوں کی دنیا میں کھینے ہوئے ہیں۔
 رب پھول مسکراتے نظر آئیں اور اپنی چمکتی ہونے آنکھوں سے ادھر ادھر
 رکھتے معلوم ہوں تو یہ جانئے کہ پھول نیند سے بیدار ہو گئے۔ تو گویا ان کی
 صبحوں میں انہیں بڑے بڑے خالی ایوانوں میں رکھئے۔ ان کی شاعروں
 میں انہیں چھوٹے کمروں میں یا تنہا گوشوں میں رکھئے۔ جب وہ معموم ہوں
 تو انہیں چپ چاپ دم سادھے بیٹھنا چاہئے۔ جب خوش ہوں تو انہیں مسکرائے
 اور شور مچانا اور ایک دوسرے کو ستانا چاہئے۔ جب وہ نیند سے اٹھیں
 تو انہیں اپنا سنگار کرنا چاہئے۔ یہ سب کچھ اس لئے ضروری ہے کہ
 پھول خوش و خرم رہیں۔ اور ان کے جاگنے اور سونے
 کے وقت باقاعدہ ہو جائیں۔ ان کی صبحوں میں ان کا ہنلانا
 سب سے بہتر ہے۔ اس سے دوسرے نمبر پر ہنلانے کا اچھا
 وقت وہ ہے جب پھول سو رہے ہوں اور سب سے آخری وقت
 وہ ہے جب پھول خوش ہوں۔ ان کی شاموں میں انہیں ہنلانا
 یا ان کی گلینی یا اداسی کے لمحوں میں انہیں غسل کرانا انکو سزا دینے کے برابر ہے

پھولوں کو ہنسلانے کا طریقہ یہ ہے کہ چشمے کا تازہ اور ٹھیک پانی لیجئے اور اسے دھیرے دھیرے ان پر ٹپکائیے۔ جس طرح ایک ہلکی بو چھار پا پھوار کسی بدست کو جگانے کے لئے اس پر ڈالی جاتی ہے۔ جس طرح ہلکی شبیم رات کو پودوں پر کے پھولوں کے نازک جسموں کے گل پوے میں آہستہ آہستہ چھتی جاتی ہے۔ پھولوں کو ہاتھ سے چھونا نہیں چاہئے۔ نہ انھیں انگلیوں سے توڑنا چاہئے۔ یہ کام بے وقوف نوکروں یا گندی ماماؤں کے چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ آلوچے کے پھولوں کو گوشہ نشین اہل علم نہلائیں تو ہر شے مانی تانگ کے پھولوں کو خوشبو مہان غسل دیں۔ سقائن کے پھولوں کو خوبصورت لباس والی نوجوان لڑکیاں۔ انار کے شگوفوں کو مرہبین لونڈیاں۔ تیج کے پھولوں کو زہین بچے۔ اور کنول کے پھولوں کو دلربا داشتہ عورتیں نہلائیں۔ گل داؤدی کو غسل دینا ان اہل کمال کا فرض ہے جنھیں قدیم بزرگوں سے محبت ہو۔ مگر جو پھول سر یا میں کھدیں انھیں نہلاننا نہیں چاہئے۔ بلکہ انھیں رشیم کی تسلی جانی اور ڈھاکر رکھنا چاہئے۔

یہ آن کا خیال ہے کہ پھول دوسرے پھولوں کے ساتھ ایک گلدان یا ظرف میں ان کے معادن یا ان کی لونڈی بن کر مناسب نظر آتے ہیں۔ قدیم چین کی ایک معاشرتی خصوصیت یہ بن گئی تھی کہ کسی عالی فاندان کے ساتھ اسکی لونڈی عمر بھر بناہ کرتی تھی اسی بنا پر یہ تصور پیدا ہوا کہ خوبصورت خواتین اسی وقت حسن کا کس نمونہ نظر آتی ہیں جب خوش شکل لونڈیاں بھی لازم طور پر ان کے جلو میں ہوں۔ گویا شرط یہ ٹھہری کہ بیگمات اور لونڈیاں دونوں حسین ہوں۔ مگر اس میں ذرا سایہ بل تھا کہ بعض نسیم کان اور دلربائی بیگم سے نہیں لونڈیوں سے مخصوص سمجھی جاتی تھی جو لونڈیاں پنا انداز اور اپنی صورت کے اعتبار

قسم موجود ہے۔ تو وہ بلند پہاڑیاں اور گہرے کھڈوں کو طے کرتے
 کی صعوبتیں خوشی سے برداشت کرتے۔ انہیں تھکن۔ گرمی یا سردی
 کا کوئی خیال نہ ہوتا۔ وہ اپنے جسموں سے بے پروا۔ کپڑے اور مٹی میں
 لت پت سفر کرتے رہتے۔ جب کسی پودے میں کلیاں پھولتیں تو پرائے
 قدر دان اس پودے کے پاس چار پائی بچھا کر سوتے۔ یا اسی پودے کے نیچے
 محض ایک تکیہ لے کر آرام کرتے۔ اور یہ دیکھتے رہتے کہ پھول پھولتی ہے یا
 شگفتہ اور جوان ہونے تک کن منزلوں سے گزرتا ہے! وہ پھر کیسے اس پر کھلا ہوا
 رفتہ چھا جاتی ہے اور یہ بالکل مر لہ کب ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ انیس سے تھے جو باؤنڈ
 قسم کے پھول اپنے باغوں میں لگائیں گے۔ اور یہ مطالعہ کریں گے کہ ان میں کیا
 اختلاف۔ کیا کیا مشابہت ہے۔ یا اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اپنے کمرے میں مختلف
 قسم کے پھول رکھیں گے۔ ایسے بھی لوگ تھے جو سو نگہ کر پھول کا ساڑتیا دیتے
 تھے۔ اور بعض لوگ تو پودے کی جڑیں دیکھ کر حکم لگا سکتے تھے کہ اس پودے
 پر کس کس رنگ کے پھول آئیں گے۔ یہ لوگ پھولوں کے سچے شیدا تھے
 اور اصلی قدر دان تھے۔

— پھولوں کی قدر دانی کے بارے میں وہ لکھتا ہے۔

» پھولوں کا لطف چائے پینے کے وقت آتا ہے۔ اس کے بعد گفتگو کا
 ممبر ہے۔ اور آخری درجہ پر شراب ہے کہ مے نوشی کے ساتھ پھولوں کا مزہ
 ہر قسم کا بے مطلب مشورہ وغوغا۔ اور عامیانه قسم کی فضول گفتگو پھولوں کی
 توہین ہے۔ اور پھولوں کو ناراض کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ بے وقوف
 بن کر چپ چاپ بیٹھے رہو۔ پھولوں کا مزہ لینے کے لئے مناسب

جگہ اور مناسب وقت ہوتا ہے۔ مناسب نضا اور حالات کے بغیر پھولوں سے لطف اٹھانے کی کوشش کرنا پھولوں کی بے حرمتی کرنا ہے۔ سرما کے پھولوں کا لطف برفباری کے آغاز میں آتا ہے۔ یا جب برت گرنے کے بعد مطلع کھل گیا ہو۔ یا جب چاند تازہ تازہ نکلا ہو۔ یا پھر ان پھولوں کا مزہ گرم کرے میں آتا ہے۔ بہار کے پھولوں کا لطف صاف دنوں یا ذرا سے خشک دنوں میں کسی خوبصورت کمرے میں آتا ہے مگر ملک کے پھولوں سے باش کے بعد ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں عمدہ درختوں یا بانس کے پیڑوں کے سائے تلے یا لب آب جو لطف اٹھانا چاہئے۔ موسم خزاں میں خشک چاندنی یا سنگین کمرے کے ایک سرے پر بیٹھ کر یا باغ کی کسی بگڑندھی پر بیٹھ کر یا سنگین چٹانوں اور سیلوں کے پاس بیٹھ کر پھولوں کا لطف اٹھانا چاہئے۔ آپ اگر پھولوں کو اس وقت دیکھیں جب آپ کو ہواؤں سورج اور مختلف مقامات کی موزون کاکرتی خیال نہ ہو۔ یا آپ کے جانتا کہیں اور ہوں تو پھر سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بھر تھب خانوں اور سرا خانوں کی نضا میں پھولوں کا لطف اٹھانے کی کوشش کرنے اور اس حالت میں کیا فرق کیا؟

یوآن کے اپنی سناسی میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ شرطیں اور حالات کیا ہیں جن سے پھول خوش ہوتے ہیں۔ یہ چودہ نکات ہیں۔ پھر اس نے وہ ۲۳ نکات بھی بیان کئے ہیں جن سے پھولوں کی توہین برتی ہے۔ پہلے پھولوں کے لئے پسندیدہ ماحول کی ۱۴

شرائط ملاحظہ ہوں۔

۱۔ روشن دریکہ

۲۔ صاف مگرہ،

- ۳۔ قدیم تپاسیاں،
 ۴۔ سوگ ہمد کے خاص پتھر۔
 ۵۔ شمشاد کے درختوں پر ہوا کی لہریں۔ اور دریا کا ہلکا شور۔
 ۶۔ گھر کا مالک مشغلیں کارسیا اور شعر و سخن کا شیدا بنی ہو۔
 ۷۔ وہ چلتا پھرتا درویش اس گھر میں آئے جسے چلنے کا صحیح ذوق ہو۔
 ۸۔ چن چاؤ پتھر کا باشندہ عمدہ شراب لے کر اس جگہ آئے۔
 ۹۔ کمرے میں جو مہمان موجود ہوں وہ نہایت نفیس مزاج اور صورت دار ہوں۔
 ۱۰۔ بہت سے پھول پوری طرح کھلے ہوں۔
 ۱۱۔ گھر میں ایسا دوست آیا ہو کہ رنج اس کے پاس نہ کھلے۔
 ۱۲۔ گھر کے لوگ ان بڑائی کتابوں کی نقلیں تیار کریں جن میں پھولوں کی کشت کا ذکر ہو۔

- ۱۳۔ رات کے پچھلے پہر تک چائے کی کیتلی گنگناتی رہے۔
 ۱۴۔ گھر کی بیوی یا دہشتہ پھولوں کی کہانیاں مرتب کرتی ہو۔
 رب ذرا وہ حالتیں ملاحظہ ہوں جو پھولوں کی ناراضی اور توہین کا موجب ہو سکتی ہیں۔

گھر کا مالک ہمہ وقت مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگا رہے

لے جینی ادباً معمولی حساب کی ہوا نہیں کرتے تعداد کا جب ذکر کرتے ہیں تو تھین اور انداز ہی سے لکھے ہیں
 میں نے یہ کتاب کی اس کتاب کے قریب قریب ہر اس نسخہ کو دیکھا جو مجھے دستیاب ہو سکا لیکن یہ ۲۲ نکات گنتی
 میں پورے نہ ہو سکے۔ اور گنتی اتنی ہم چیز ہی نہیں کیونکہ حسابی تعین چھوٹے طرف اور گھٹیا دماغ کو ہی
 ستا ہے۔ عالی طرف لوگ اسکی بردا نہیں کرتے۔ (مصنف)

کوئی بے وقوف تو کوکر گلہ ان میں کچھ اور پھولوں والی شاخیں اڑس دے اور
 پھولوں کی ساری ترتیب خراب کر دے۔
 گھر میں آمد و خرچ کے حسابات کئے جائیں۔
 گھر میں کوئی شخص ایسا ہو جو قافیے لخت کی کتاب سے دیکھ دیکھ کر تک بندی
 کرتا ہو۔

گھر میں ادھر ادھر کی کتابیں بڑی حالت میں بکھری پڑی ہوں۔
 عام قسم کے عبادت گزار بھی معرفت کی باتیں کریں۔
 درتچے کے باہر کتے لڑتے ہیں۔
 آوارہ لڑکے گلی میں گاتے پھریں۔
 باہر سے عامیانہ گانوں کی آواز آتی رہے۔

بہ صورت عورتیں پھول توڑ توڑ کر ٹھنڈیں اپنے بالوں میں سجائیں۔
 پھولوں کی موجودگی میں لوگ منصبی ترقی اور منزل کی بات چیت کریں۔
 پھولوں کی موجودگی میں جھوٹا اظہار محبت کیا جائے۔
 پھولوں کی موجودگی میں فرمائشی نظریں کہی جائیں۔
 پھول کھلے کا موسم آجائے اور مالک مکان نے اپنے قرض نہ اتارے ہوں۔
 پھولوں کے سامنے کیا ننگ سوزی جعلی اور نقلی نقویریں رکھی جائیں۔
 پھولوں کے سامنے چوہے اپنی منجوس تھوتھیاں دکھائیں۔
 کمرے میں کیڑوں کے رنگنے کے گندے نشانات ہوں۔

پھولوں کی موجودگی میں بد تمیز نوکر کمروں میں لیٹے رہیں۔
 شراب کی محفل میں تفریحی کھیل شروع ہوں اور شراب ختم ہو جائے۔

اس کمرے میں پھول رکھے جائیں جو شراب کی دکان کا اہم دیوار ہو۔
کمرے میں ایسے قصیدے آویزاں ہوں جن میں چھوٹی خوشامد کی گئی ہو۔

۷۔ چانگ چاؤ کے مقولے

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ فطرت کے مظاہر سے لطف اٹھانا صرف آرٹ اور مصوری تک محدود نہیں کیونکہ فطرت انسان کی ساری زندگی میں حصہ گیر ہے۔ فطرت گل کے بازووں رنگوں، صورتوں، کیفیتوں اور فضاؤں کا مجموعہ ہے۔ انسان مشاہد کرنے والا یہ فن کار اپنی طبیعت کے مطابق فطرت کا کوئی منظر اس کی کوئی آواز اس کا کوئی رنگ ڈھونڈ لیتا ہے جو اس کی طبیعت کے ساتھ میل کھائے۔ اور پوری طرح اس سے ہم آہنگ ہو جائے۔ چین کے نثر نگاروں اور شاعروں کا نظرت کے بارے میں یہی نظریہ ہے۔ میرے نزدیک اس نظر یہ کا بہترین اظہار چانگ چاؤ کے اقوال اس کی انشا میں ملتا ہے۔ برتر تھو یہی صدق کے درمیانی برسوں کا یہ ادیب اپنی کتاب یومن جگ ریٹھے سپنوں کے سائے میں اسی انداز نظر کے شاہکار پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب ادبی مقولوں کا مجموعہ ہے۔ ایسے کئی اور مجموعے بھی چینی زبان میں ملتے ہیں۔ مگر چانگ چاؤ کا کوئی حریف نہیں۔ اس کی یہ کتاب چینی ادب میں اتنی مقبول ہے۔ کہ بہت سے چینی عالموں نے اس پر اسی کے انداز میں حاشیے لکھے ہیں۔ اور یہ حاشیے بھی شگفتگی اور سادگی کے شاہکار ہیں۔ میں آپ کے سامنے چانگ چاؤ کے بہترین مقولوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ مقولے خاص طور پر فطرت کے مظاہر کا لطف اٹھانے سے متعلق ہیں۔ انسانی زندگی کے بارے میں بھی اس کے کچھ مقولے بڑے خوبصورت ہیں۔ اور میرے موضوع سے۔

گہر تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں آخر میں ان کا ترجمہ بھی درج کر رہا ہوں۔

۱۔ کیا کیا مناسب؟

یہ بے حد ضروری ہے کہ پھولوں کے پاس تسلیاں۔ پہاڑوں سے چشمے اور چھبر نے پھولیں اور چٹانوں پر کائی کی تہیں ہوں اونچے درختوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی ملیں لپٹی ہوں۔ اور ہر انسان کسی نہ کسی مشغلے کا مالک ہو۔ کوئی نہ کوئی شوق رکھتا ہو پھولوں کا لطف حسینوں کے مجھڑ میں اٹھانا چاہئے۔ دلنواز دوستوں کی صحبت میں چاندنی رات ہی کو شراب پینی چاہئے۔ اور عالی خیال علما کی صحبت میں برون کی چمک و مک کا لطف اٹھانا چاہئے۔

پھولوں کے پودے لگانا تسلیوں کو قریب آنے کی دعوت دینا ہے۔ چٹانوں کے انبار لگا دیں تو بادل آتے ہیں۔ شمشاد اور صنوبر کے درخت لگائیں تو ہواؤں کو آنے کا موقع ملتا ہے۔ پانی کا تالاب بنائیں تو مرغابیوں کے چھپنے کے لئے سرگنڈے آگئے کا سامان ہو جاتا ہے۔ کیلے کا درخت بارش کے لئے دعوت نامہ ہے اور بید مجنون کا پودا لگانا فغمہ سنج پر نڈوں کو بلانے کا بہانہ ہے۔

کسی مینار کی چوٹی پر چڑھ کر پہاڑیوں کو دیکھیں۔ تو ان کے متعلق اس وقت ہمارا تاثر بالکل مختلف ہوگا۔ شہر پہاڑ سے برفاری کو دیکھنا۔ شمع کی روشنی میں سے چاند کو دیکھنا۔ کشتی میں بیٹھ کر رنگین بادل دیکھنا۔ کمرے میں کسی خوبصورت عورت کو دیکھنا عام حالات کی نسبت بالکل مختلف جذبات پیدا کرتا ہے۔

آلوچے کے پیر کے پاس جو چٹانیں رکھی جائیں۔ وہ اگر دیکھنے میں بڑی پرانی معلوم ہوں تو مناسب ہے۔ جو چٹانیں صنوبر کے درخت کے پاس ہوں وہ دیکھنے میں

سیدھی سادی نظر آنی چاہئیں۔ بانسوں کے پٹر کے پاس چٹانیں کچھ لمبی اور چھری معلوم ہوں تو ٹھیک ہے۔ اور بھولوں کے بڑے گیلے میں پتھر کے جو ٹکڑے رکھے جائیں وہ نہایت خوبصورت معلوم ہونے چاہئیں۔

سر بنز پہاڑیوں سے نیلا پانی آتا ہے۔ کیونکہ یہ پانی انہیں پہاڑیوں سے اپنا رنگ مستعار لیتا ہے۔ عمدہ شراب اچھی نظیں پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ شاعری سرا سے وجدان حاصل کرتی ہے۔

آئینہ جب کسی بد صورت کا سامنا کرتا ہے۔ کوئی ناپا ب پتھر جب کسی فضول اور ناداری شخص کے متھے چڑھ جاتا ہے۔ اور جب عمدہ تلوار کسی گھٹیا جرنیل کے ہاتھ میں آتی ہے۔ تو ان حالات کا کوئی مداخلت نہیں ہو سکتا۔

ب۔ پھول اور عورتیں

پھول کو کھلاتے۔ چاند کو افق کی گہرائی میں ڈوبتے اور خوبصورت عورتوں کو جوانی میں مرتے نہیں دیکھنا چاہئے۔

پھولوں کو اس وقت دیکھنا چاہئے جب وہ پوری طرح شگفتہ ہوں۔ چاند کے پورے ہونے کا انتظار کر کے اسے کامل صورت میں دیکھنا چاہئے۔ کتاب کھنی شروع کر دو تو اس کی تکمیل کا مرحلہ بھی دیکھو۔ اور یہ لقا عورتوں کی دید کا صحیح وقت وہ ہے جب وہ خوش ہوں۔ ورنہ سارا مزہ ہوا ہو جاتا ہے۔

حسین عورتوں کو صبح کے وقت سنا کر کرتے دیکھو جب انہوں نے رخساروں پر غازہ مل لیا ہو۔

ایسے چہرے بھی ہوتے ہیں جو بد صورت ہونے کے باوجود نظروں پر بار نہیں

گزرتے۔ ایسے چہرے بھی ہیں جو کہ یہ تو نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں جاسکتا
ایسی تحریریں بھی ہیں جو گرامر کی پابند نہ ہوتے ہوئے بھی بڑی پیاری اور دلاویز
ہوتی ہیں۔ اور ایسی تحریریں بھی ہیں جو صرف و نحو کے اعتبار سے بالکل درست ہوتی ہیں
لیکن ان سے گھٹن آتی ہے۔ یہ نکتہ سطحی لوگوں کو کیونکر سمجھاؤں۔

✓ اگر آپ بھولوں سے بھی اسی طرح پیار کریں جس طرح حسین عورتوں کو چاہا
جاتا ہے۔ تو پھولوں میں خاص دل آویزی محسوس ہونے لگے گی۔ اور اگر حسین عورتوں
سے اسی طرح پیار کیا جائے جس طرح بھولوں سے کیا جاتا ہے تو انسان کے دل
میں خاص قسم کی نزاکت کا احساس۔ نرمی اور شفقت پیدا ہو جائیگی۔

✓ حسین عورتیں پھولوں کے ہیں بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی زبان تو سمجھی ہیں
اور پھول حسین عورتوں سے اچھے ہیں کہ خوشبو دیتے ہیں۔ اگر ایک ہی وقت میں
یہ دونوں حاصل نہ ہو سکیں تو خوشبودار حسن کے بجائے مشکم حسن کو ترجیح
دیکھئے۔ اور اسے اپنائیے۔

✓ اگر پھولوں کو گہرے قرمزی رنگ کے ظروف اور گلدانوں میں سجانا
ہے تو اس طرح سجائیے کہ گلدانوں کے سائز اور ان کے رنگ اور ان کی بلندی
سے پھولوں کو مناسب ہو۔ اور ان کا رنگ پھولوں کے رنگ کے عین عکس ہو
بہت سے پھول دلفریب اور حسین ہوتے ہیں۔ مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی
جن پھولوں میں پتیوں کی تہوں پر تہیں ہوں وہ عام طور پر بناوٹ کے اعتبار
سے خوش منظر نہیں ہوتے۔ ان سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ کمال چیز بہت نایاب ہے صرف
کنول کے پھول میں یہ دونوں خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔

✓ آلوچے کے پھول انسان کو عالی خیال بناتے ہیں۔ نثرن تہنائی کا جسا

دلاتا ہے۔ گل داؤدی ہمیں سادہ مزاج بناتا ہے۔ اور کنول کو دیکھ کر انسان میں
اطمینان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بہار میں کھلنے والا ہائے تانگ شہواتی جذبات
بیدار کرتا ہے۔ گل شقائق آدمی کے دل میں عورت کا احترام اور اس کی قدر پیدا
کرتا ہے۔ بانس اور کیلے کے پیر انسان کو دلنواز بناتے ہیں۔ خزاں کا ہائے تانگ
میں بانگین پیدا کرتا ہے۔ صنوبر کا درخت انسان کے دل میں گوشہ نشینی کے خیالات
کو جگہ دیتا ہے۔ بیہ مجنوں آدمی کو جذباتی بنا دیتا ہے۔

✓ اگر کسی مرد لقا عورت کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ۔ اس کی آواز پرندے کی
طرح نغمہ ریز۔ اس کی روح چاند کی طرح حسین۔ اور اس کے چہرے مہرے چال ڈالیں
بید مجنوں کا سا بانگین اور لچک ہو۔ اس میں وہ دلفریبی ہو جو خزاں کے
موسم میں اتھاہ جھیلوں میں نظر آتی ہے۔ اس کی ہڈیاں سیب کی طرح
زنگین۔ اور اس کی جلد برت کی طرح سفید اور پاکیزہ ہو۔ اور اس کا دل
شعر کی طرح لطیف ہو تو میں کمال طور پر مطمئن ہو جاؤں۔ چینی عالموں کی طرح اور اس
کتاب پر حاشیہ لکھنے والوں کی طرح میں بھی یہ کہوں گا کہ میرا بھی صاد ہے بالکل بجا سنسرایا
آپ نے (مصنف)

✓ اگر اس دنیا میں کتابیں نہ ہوتیں تو خیر دوسری بات تھی۔ مگر کتابیں چونکہ موجود
ہیں۔ اس لئے ان کا پڑھنا ضروری ہے۔ اگر دنیا میں شراب نہ ہوتی تو کیا کہا جاسکتا تھا
مگر دنیا میں چونکہ شراب موجود ہے۔ اس لئے اسے پینا چاہئے۔ اگر دنیا میں مشہور پہاڑ
نہ ہوتے تو بات اور تھی۔ مگر اب کہ یہ پہاڑ موجود ہیں تو ان کو جا کر دیکھنا لازم ہے۔
اگر دنیا میں پھول اور چاند نہ ہوتے تو کچھ کہنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مگر دنیا میں
پھول بھی ہیں اور چاند بھی اسلئے دونوں کا لطف اٹھانا چاہئے۔ اگر دنیا میں حساب کمال اور ذی نہم مرد

اور حسین عورتیں نہ ہوتیں تو کیا عرصن کیا جاسکتا تھا لیکن دونوں کا وجود چونکہ اس دنیا میں ہے اسلئے ان عورتوں سے محبت اور ان مردوں کی حفاظت لازم ہے۔
 آئینہ بصورت عورتوں کا دشمن کیوں نہیں؟ اسلئے کہ آئینہ جذبات سے عاری ہے
 اگر اس میں جذبات ہوتے تو اس کے ٹڑے ٹکڑے کر جاتے۔
 گلے میں لگا لگایا اچھا پھول خریدیں تو اس کے لئے بھی دل میں جگہ ہوتی ہے تو پھر
 "تمسکم پھولوں کو عورتوں" کے لئے دل میں کتنی جگہ کتنی نزاکت احساس ہونی چاہئے۔
 شراب اور شعر کے بغیر پھول اور چاندنی دونوں بے مصرت تھے۔ وہ لوگ جن میں
 جوہر ہو۔ اور جنہیں خدا نے حسن صورت بھی عطا کیا ہو۔ اور وہ خوبصورت عورتیں
 جو عالم بھی ہوں۔ کبھی زیادہ عمر نہیں پاتیں۔ نہ صرف اسلئے کہ دیوتا ان سے حد کرتے
 ہیں۔ بلکہ اسلئے بھی کہ ایسے لوگ ایک نسل کے لئے۔ اور ہر زمانے اور ہر دور کے لئے
 بھی مایہ ناز ہوتے ہیں۔ اسلئے خدا انہیں دنیا میں زیادہ دیر رہنے نہیں دیتا۔
 سادہ انکی توہین یا بے حرمتی ہو۔

ج۔ پہاڑ اور پانی

کائنات میں جو چیزیں انسان پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ ہیں۔
 آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور سورجی۔ پندوں میں کو کو کرنے والی کوئل اور پردوں
 میں بید مجنوں کا پڑ۔
 چاند نے ساتھ مل کر باروں کا اندازہ کرنا کتابوں کے ساتھ ایک ہو کر کاغذ
 چائے والے کپڑے کی فکر۔ پھولوں کے ساتھ مگر طرفالوں کا ڈرا د صاحب جوہر

آدمیوں اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ تفریح کی گریڈیشن کا خون کرنا اپنے سینے میں ہماتا ہوا کا دل لکھنے کے برابر ہے۔

اگر دنیا میں ایک بھی ہم نفس درست یا ہمدرد دہمرد و عیسرا جاتے تو انسان اطمینان سے مر سکتا ہے۔

ایک پرانے ادیب کا قول ہے کہ اگر دنیا میں پھول اور خوبصورت عورتیں ہوتیں تو میں اس دنیا میں پیدا ہونے کی خواہش ہی نہ کرتا۔ میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر دنیا میں قلم و دوات شطرنج اور شراب نہ ہوں تو مجھے مرد پیدا ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ پہاڑوں کی سرسبزی۔ پانی کا گلگانا۔ چاندنی کارنگ پھولوں کی خوشبو اور بیل کی دلفریب شخصیتیں اور حسین عورتوں کا حسن دید ایسی چیزیں ہیں جو لفظوں میں نہیں سکتیں اور نہ اظہار ہی میں آسکتی ہیں۔ آدمی ان کا خیال کرتے کرتے انہیں کے سینے دیکھنے میں کھو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور ان کے تصور میں اس کی بھوک اور پیاس بھی مرٹ جاتی ہے۔

برن کو دیکھ کر ذہن میں عالی خیال عالم کا خیال آتا ہے۔ پھول حسین عورتوں کی یاد دلاتے ہیں۔ شراب تلوار کے دھنی کی یاد دلاتی ہے۔ اور چاندولی دوستوں کی یاد دلاتا ہے۔ پہاڑ اور بہتا پانی عمدہ شعر اور اچھی نثر کی یاد دلاتے ہیں۔ قدرتی مناظر اس زمین پر بھی ہیں تصویروں میں بھی ہیں۔ ہمارے خوابوں میں بھی ہیں۔ اور ہمارے سینوں میں بھی ہیں۔ اس سرزمین کے قدرتی مناظر کا حسن گہرائی اور خطوط کی بے قاعدگی میں پہنا ہے تصویروں میں قدرتی مناظر کا حسن آزادی اظہار اور رنگوں۔ موقلم اور سیاہی کی شوخی ادا اور شکوہ انداز میں پہنا ہے سینوں میں قدرتی مناظر کے حسن کا لازہ ہر آن بدلتی ہوئی کیفیت میں ہے۔ اور جو قدرتی مناظر

ہمارے سینوں میں ہیں ان کا جن اس بات میں مضمر ہے کہ ہر چیز اپنی اپنی مناسب جگہ موجود ہے سفر کرتے ہوئے جن مقامات سے گزریں ان کے حسن و خوبی کے سلسلے میں زیادہ میں میخ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جہاں زندگی بھر رہنا ہو ان جگہوں کے حسن و خوبی کو بڑے اعلیٰ معیار پر پرکھنا چاہئے۔ کیونکہ ان جگہوں کا تو ہر وقت سامنا رہے گا۔

بالنس کی کونسل سبزے میں اپنی نوعیت کی واحد چیز ہے۔ لہجی کا پھل پھلوں میں منفرد ہے۔ آبی جاتوروں میں کیڑا انوکھی چیز ہے۔ کھلے پینے کی چیزوں میں شراب عجیب و غریب چیز ہے۔ آسمان پر چاند اپنی وضوح کا تنہا مالک ہے۔ پہاڑوں اور پانیوں میں مغربی تھیل منفرد ہے۔ ٹونگا عہد کار باب آلات سستی میں۔ اور لیجان کی ڈرامائی نظیں ادب میں انوکھی چیزیں ہیں۔

مشہور پہاڑوں اور دریاؤں کو دیکھنے کے لئے تہمت چلے جب تک مقدر کو منظور نہیں ہوتا ہمیں ان کو دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ چاہے یہ چیزیں ہم سے صرف دس بارہ میل دور ہوں۔

آئینے میں جو عکس پڑتے ہیں وہ پورے رنگوں کی تصویریں ہوتی ہیں لیکن عکس (یعنی سائے) چاندنی میں پڑتے ہیں وہ ایک رنگی تصویریں ہوتی ہیں۔ آئینے میں نظر آنے والے عکس ایسی تصویریں ہیں جن کے خطوط ٹھوس ہوتے ہیں۔ اور چاند کی روشنی میں نظر آنے والے عکس بے ہڈی کی چیز (غیر مرئی) تصویریں ہیں۔ چاند کی روشنی میں پہاڑوں اور دریاؤں کے عکس۔ آسمان پر جغرافیے کے باب ہیں۔ اور پانی میں چاند تاروں کے عکس زمین پر فلکیات کا مطالعہ۔

د بھار خزاں - بہار آسمان کی طبیعت کا قدرتی رنگ ہے اور خزاں اس طبیعت کے

تذوق کا ایک کرشمہ ہے۔

✓ پڑانے لوگ سرما کو باقی کے تین موسموں کے لئے فال تو یا زائد (یعنی آرام کا) موسم گردانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ گرمیوں کو تین فال تو موسموں کا موسم سمجھنا چاہئے۔ گرمی صبح کو اٹھنا۔ رات کا فال تو حصہ ہے۔ گرمی رات کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے اور نہ سونے کو دن کا زائد حصہ گردانتا چاہئے۔ اور سہ پہر کی نیند سماجی میل جول کا زائد حصہ ہے مجھے واقعی بقول شاعر گرمی سے محبت ہے۔

✓ اپنے آپ پر خزاں کی مانند قابو ہونا چاہئے۔ اور ہر معاملے کو بہار کے انداز میں سلجھانا چاہئے۔

✓ اچھی نظر اور نظریں خزاں کی روح سے خراب ہونی چاہئیں۔ اور اچھے سازوں اور ڈرامائی نظموں میں بہار کی روح بھاتی ہوئی ہونی چاہئے۔

س۔ آوازیں

پرندوں کا نغمہ بہار کے موسم میں۔ اور چھینگر دوں کا گیت گرمیوں میں سنتا چاہئے۔ خزاں میں ننھے منے کیرٹوں کی آوازیں اور سرما میں برفباری کی صدا سننا چاہئے۔ دن میں شطرنج کھیلنے کی آواز۔ چاندنی رات میں بالنسری کا نغمہ۔ بہاروں پر صنوبر کے درختوں کی سرسراہٹ اور لب دریا لہروں کے ہلکے رول کی آواز سننی چاہئے۔ اگر یہ صدا نہیں آپ سن لیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا جینا اکارت نہیں گیا۔ لیکن جب کوئی بازار میں شخص بازار میں جھگڑا کرے اور شور و غوغا مچائے۔ یا جب گھر کی بیوی میاں کی خبر سننی شروع کرے تو ان آوازوں کو سننے کے بجائے بہرہ بھانا بہتر ہے۔

مرغابیوں کی صدا نہیں سننے سے یہ احساس ہوتا ہے گویا ہم ناکنگ میں ہیں۔

چوڑوں کے شاپس سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کھیل کے کنارے کے شہروں
مثلاً سوچاؤ چانگ چاؤ اور ہو چاؤ میں بیٹھے ہیں۔ ساحل پر موجوں کا شور سن کر ایسا
خیال آتا ہے۔ کہ ہم جی کیا ننگ میں ہیں۔ اور دُبلے گھوڑوں کے گلے کی گھنٹیاں
بجتی سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سیان کی سڑک پر جا رہے ہیں۔

ساری آوازوں کو ذرا فاصلے سے سنا چاہئے۔ صرت سنانکی آواز ایسی

ہے جسے دور و قریب دونوں طرح سنا جاسکتا ہے۔

صنوبر و شمشاد کے سایہ تلے سنانکی موسیقی سنانا کانوں میں امرت ڈالنے

کی طرح ہے۔ چاندنی رات میں بانسری کی مٹھی آواز چشمے کے پاس آبشار کا شور

اور پہاڑوں میں بودھوں کے مذہبی گھنٹن سنانا بھی یہی کیفیت رکھتا ہے۔

اپنی کی آواز چار طرح کی ہے۔ آبشاروں کا شور۔ پھلتے چمنوں کا شور۔

جھرنوں کا شور اور نالوں کا شور۔ ہوا کی صدائیں تین قسم کی ہیں۔ صنوبر کے

درختوں پر سرسراہٹ۔ خزاں زدہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور دریا پر آندھی کا طونکا

باش کی صدا دو طرح کی ہے۔ پتوں اور کنول کے پھولوں پر برستی بوندوں کی

آواز۔ اور مکان کے گھجوں سے بانس کی بانٹیوں میں پلنے کے گرنے کی آواز۔

س۔ بارش

یہ چیز جسے بارش کہتے ہیں اس سے دن چھوٹے اور راتیں طویل

معلوم ہونے لگتی ہیں۔

— بہار کی بارش اس شاہی فرمان کی طرح ہے۔ جو انسان کو اعزاز بخشتی۔

گرما کی بارش واجب القتل مجرم کے لئے جیسے معافی کا پروانہ ہوتا۔ درختوں کی بارش

بین اور مرثیے کی مثل ہے۔

بہار کے موسم میں برشکال کا دن مطالعہ کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ گرمائی برستی بارش کا دن شطرنج کھیلنے کے لئے مناسب ہے۔ اور خزاں کی برکھلے دن میں پٹانے صندوق اور سامان کے کمروں میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینا انہیں ترتیب دینا موزوں ہوگا۔ سرما میں بارش کا دن صرف شراب پینے کیلئے موزوں ہے۔ — میں میگھ دیوتا کو خط لکھوں گا۔ اور اُسے بتاؤں گا کہ بہار میں بارش پہلے چاند کی پندرھویں تاریخ کے بعد ہونی چاہئے۔ رجب شہموں کا جشن ختم ہو چکا ہو جو دس دن متواتر ہوتی رہے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً تیسرے چاند کے تیسرے دن تک ہی رہے۔ تاکہ اس وقت تک شفتالو کے رنگوں نے کھل جائیں۔ پھر چاول بولے کے وقت بھی بارش ہونی چاہئے۔ ادریہ کہ گربا میں ہر مہینے کے پہلے دس دنوں اور آخری دس دنوں میں پاتی ضرور برستار ہے۔ (درمیانی دنوں میں اس نے نہیں کہ ہم پورے چاند کی تابانی سے لطف اٹھا سکیں۔) خزاں کے موسم میں ساتویں اور نویں مہینے کے پہلے اور آخری دس دن بارش ہونی چاہئے۔ آٹھواں مہینہ فصل کی کٹائی کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن سرما کے تین مہینوں میں بارش کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

شش۔ چاند ہوائیں اور پانی

پہلی رات کا چاند جلد ڈوب جاتا ہے۔ اور یہی اس پر غصہ آتا ہے۔ تیسرے مہینے کے زوال نیز چاند پر اسلئے غصہ آتا ہے کہ وہ اتنی دیر سے طلوع ہوتا ہے۔ چاندنی رات میں بد تعلیمات کا لحاظ سننا انسان کے ذہن میں بے لوثی اور ہر چیز سے علیحدگی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ چاندنی میں شیشہ بازی

کے تذکرے جو اُت آموز ثابت ہوتے ہیں۔ چاندنی میں شعر و سخن کی باتیں تہنائیوں میں زیادہ رنگ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور چاندنی میں حسین عورتوں کے دیکھنے سے یہ جانی جذبات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

چاند کے ساتھ ٹھیلنا یہ ہے کہ نیچی جگہ بیٹھ کر صاف اور چمکیلے چاند کی طرت سر اٹھا کر دیکھا جائے۔ اور جب چاند دھند میں لپٹا ہو اور مگر ہو تو اسے اونچی جگہ سے دیکھا جائے۔

بہار کی ہوائیں شراب کی طرح ہیں۔ گرمائی ہوا چانے کی طرح ہے۔ خزاں کی ہوائیں دھوئیں کی مثل ہیں۔ اور سرما کی ہوائیں ادراک کی طرح تیز اور تند ہیں۔

ص۔ فراغت اور دوستی

جو لوگ ان کاموں پر توجہ نہیں دیتے جن پر دوسرے لوگ دن رات توجہ دیتے ہیں۔ صرف ذہنی لوگ ان کاموں پر دن رات توجہ دے سکتے ہیں جن پر دوسرے لوگ توجہ نہیں دیتے۔

فراغت سے بڑھ کر کوئی چیز انسان کو مرغوب نہیں۔ فراغت کا یہ مطلب نہیں کہ فراغت کے لمحوں میں انسان بالکل بے کار ہوا کرتا ہے۔ فراغت کی بدولت انسان کتابیں پڑھتا ہے۔ مشہور مقامات کا سفر کرتا ہے۔ اور اچھے لوگوں سے عمدہ دوستی کر سکتا ہے۔ فراغت ہی کی بدولت انسان شراب پی سکتا ہے۔ اور کتابیں لکھ سکتا ہے۔ اور ان سے بڑی مسرتیں اور کھنچا ہو سکتی ہیں۔؟

بادل پر سورج کی کرنوں کی چھوٹا پڑے تو بادل رنگین ہو جاتا ہے۔ بہار کا چشمہ چٹان سے ہو کر بہے تو آبشار بن جاتا ہے۔ گو یا نئے تعلق سے نام بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوستی اتنی گراں مایہ چیز ہے۔

پہلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو شمعوں کا جشن مناتے ہوئے آدمی کو لانا باقی دوستوں کے ساتھ شراب پینی چاہئے۔ پانچویں مہینے کی پانچویں تاریخ بخروں کا جشن مناتے وقت خوش وضع اور وجیہ دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرتی چاہئے۔ ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو آسمانی گوالے اور آسمانی درخیزہ کے ملاپ کی تقریب کے موقع پر دلنوازا اور دلکش دوستوں کی معیت میں نوشی کرنی چاہئے۔ خزاں کے وسط میں جشن خزاں کے موقع پر جب کٹائی کا چاند پورا چمک رہا ہو تو خاموش طبع اور حلیم دوستوں کی معیت میں شراب پیو۔ اور نویں مہینے کے نویں دن اپنے پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے رومانی مزاج کے دوستوں کے ساتھ نوشی کا لطف ہے۔ فاضل دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنا تا دیر کتابیں پڑھنے کی طرح ہے۔ شاعر مزاج دوستوں کے ساتھ گفتگو کرنا۔ بلن پایہ شاعروں کی نظموں اور عمدہ نثر نگاروں کی انشا کا مطالعہ کرنے کے برابر ہے۔ محتاط اور نہایت مہذب اکثر ستم دوستوں کے ساتھ بات کرنا ایسا ہے جیسے پڑنے والے ہار فون اور حکما کی ادبیات عالیہ پڑھی جا رہی ہوں اور ظریت طبع دوستوں کے ساتھ باتیں کرنا کوئی عمدہ ناول یا رومانی داستان پڑھنے کی طرح ہے۔

ہر خاموش طبع گو شہ گیر۔ اہل علم کے چند تریبا دولت ضرور ہوتے ہیں۔ قریبی دوستوں سے میری مراد یہ نہیں کہ ان لوگوں نے عمر بھر کی دوستی اور نباہ کی قسمیں ہی اٹھا رکھی ہوں۔ عام طور پر دلی دوست وہ ہوتے ہیں جو اگرچہ ہم سے ہزاروں میل کے

فاصلے پر ہوں۔ پھر بھی انہیں ہماری ذات پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ اور وہ ہمارے
 غلات کسی قسم کی افواہ پر یقین نہیں کرتے۔ اور جب وہ کوئی افواہ سُننے ہیں تو ہر ممکن
 طریقے پر اس کی وضاحت اس کا جو ازسببیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ وقت
 پڑنے پر ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے۔ اور ہمیں کس بات سے احتراز لازم ہے
 یہ لوگ ضرورت کے وقت ہماری امداد لگاتے ہیں۔ اور بعض وقت ہمارے علم کے بغیر اپنی فضا
 درخبت سے ہمارا کوئی قرضہ بیباق کر دیتے ہیں۔ کوئی تصفیہ کر دیتے ہیں۔ اور انہیں یہ گمان
 بھی نہیں ہوتا کہ ایسا کرنے میں کہیں ان پر یہ الزام عائد نہ کر دیا جائے کہ وہ ہمارے مفاد
 کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو رہے ہیں۔

✓ علامہ دوستوں میں سے دلی دوست (جو ہمارے دل سے واقف ہوں) ڈھونڈنا
 آسان ہے۔ لیکن بیوی اور مجبور باؤں کے جھرمٹ میں سے دلی دوست ڈھونڈنا
 مشکل ہے۔ حاکم اور وزیر کے تعلق میں دلی دوست کی تلاش مشکل تر ہے۔
 "غیر معمولی" یا ممتاز کتاب دہا ہے جس میں ایسی باتیں ہوں جو پہلے نہیں کہی گئیں۔
 اور دلی دوست وہ ہے جو ہمیں اپنے سارے خاندانی معاملات اور راز بتا سکے۔
 ✓ دیہات میں رہنے کا لطف صحیحی ہے کہ اچھے دوست بھی ساتھ ہوں۔ ان علاقوں
 میں آدمی کا سابقہ کسانوں اور کلڑ ہاروں سے پڑتا ہے۔ اور ان سے آدمی بہت جلد
 تنگ آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ پچھلے زیادہ سے زیادہ مختلف قسم کے اناج پہچان سکتے
 ہیں۔ یا موسم کے بدلے میں کچھ اندازے کر سکتے ہیں۔ دوستوں کی بھی متعدد قسمیں
 ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اچھی قسم کے دوست وہ ہیں جو نظر میں لکھ سکیں۔ ان سے
 دوسرے درجہ پر اچھی باتیں کرنے والے دوست ہیں۔ تصویر بنانے والے دوست
 تیرے خبر میں لگانے والے دوستوں کا لبر چو تھا ہے۔ اور جب دوستوں کو مے نوشی کی محفل میں

مختلف قسم کے کھیل آتے ہوں۔ ان کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے۔

ط۔ کتابیں اور ان کا مطالعہ

جرمانی میں کتابیں پڑھنا ایسا ہے جیسے آپ کسی درز میں سے چاند کو دیکھ رہے ہوں۔ ادھیڑ عمر میں کتابوں کا مطالعہ ایسا ہے جیسے کھلے آنگن میں چاند کو دیکھا جائے اور بڑھاپے میں کتاب بینی ایسی ہے جیسے ادھیڑ عمر جگہ سے چاند کا نظارہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں انکی گہرائی اپنے ذاتی تجربے کی گہرائی کے تناسب سے بدلتی رہتی ہے۔

جو شخص بے لفظ کتابیں پڑھ سکے (یعنی کتاب زندگی کا مطالعہ کر سکے) صرف وہی شخص حسین اور لا جواب باتیں کر سکتا ہے۔ وہ سچائی جو لفظوں میں سما نہیں سکتی اگر کسی کی سمجھ میں آجائے تو صرف وہی شخص بدھ مت کی حکمت علی کا ادراک کر سکتا ہے۔

پر لے باکالوں اور موجودہ ادیبوں کی لکھی ہوئی غیر فانی کتابیں خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہیں۔

شو اسی ہو کی کتاب "سارے انسان بھائی بھائی ہیں" غریب و غنیمت کا آئینہ ہے سی یو جی کی تصنیف "بندر کی رزمیہ داستان" روحانی بیداری کا افسانہ ہے۔ اور جن پی رنگ منی کا بخش ناول "طلانی گلدران اور آلوجے کا پھول" انسانی آلام کی داستان ہے۔

ادب وہ منتظر ہے جو میز پر رکھا ہے۔ اور منتظر وہ ادب ہے جو زمین پر بکھرا ہوا ہے مطالعہ سب سے بڑی مسرت ہے۔ پھر بھی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ نا انصافیوں پر غصہ آتا ہے۔ لیکن اس غصہ میں بھی کتنا مزہ ہے

ادبیات عالیہ کی کتابیں سردیوں میں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ ان دنوں ذہن اور توجہ دونوں ان پر مرکوز ہو سکتی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ گرمیوں میں کریں کیونکہ ان دنوں آدمی کے پاس دقت کافی ہوتا ہے۔ پڑانے فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ خزاں میں کریں۔ کیونکہ ان کے خیالات دلکش ہوتے ہیں۔ اور بعد کے ادیبوں کی تمام کتابیں بہار میں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ ان دنوں نظرت میں پھر جان جاتی ہے۔ جب ادیب لوگ فوجی معاملوں پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ کمرے میں بیٹھ کر جنگی رائٹس پر بحث کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہے کہ کاغذ پر سپاہیوں کی بات حیت کرتے ہیں۔ مصنف (اور جب فوجی جرنیل ادب پر بات کرتے ہیں تو ان کی باتیں سنی سنائی انواہوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔

جو شخص مطالعہ کرنا جانتا ہے وہ جہاں جاتا ہے اس کے لئے ہر چیز کتاب بن جاتی ہے۔ پہاڑ اور دریا بھی کتابیں ہی ہیں۔ شطرنج اور شراب بھی کتابیں ہیں۔ اور چاند اور پھول بھی کتابیں ہیں۔ سفر کارسیا یہ جانتا ہے کہ جہاں کہیں وہ جائے ہر چیز نظرت کا ایک نادر نظارہ بن جاتی ہے۔ کتابیں اور تاریخ بھی مناظر ہیں۔ شراب اور شعر بھی منظر ہیں۔ چاند اور پھول بھی مناظر ہیں۔

کسی قدیم مصنف کا قول ہے کہ میں چاہتا ہوں دس برس کتابوں کا مطالعہ کرتا رہوں۔ دس برس سفر کرتا رہوں۔ اور دس برس اپنی چیزوں کی ترتیب اور حفاظت میں خرچ کروں۔ میرا خیال ہے اس آخری کام کے لئے دس برس بہت زیادہ ہیں۔ دس برس کافی ہونا چاہئیں۔ رہا مطالعہ اور سفر تو دس برس کیا اس سے دگنی مدت بھی میرے دل کو مطمئن نہیں کر سکتی ہو زنگ جی کے قول تو اسکے لئے تین سو برس کی عمر چاہئے۔ پڑانے لوگوں کا قول تھا کہ اچھی شاعری اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہنے والا

✓ دنیا میں ناکام ہو اور یا بالکل غریب ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ناکام شخص کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کی مثال پری خوبی سے پیش کر سکتا ہے۔ امیر اور کامگار لوگوں کی شاعری اچھی نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ وہ غربت پر آہیں بھر سکتے ہیں نہ ناکامی اور بدبختی کا ماتم کر سکتے ہیں۔ وہ تو صورت ہواؤں بادلوں اور چاند و شبنم پر شعر کہہ سکتے ہیں۔ بھلا یہ سچی چیزیں اچھی کیونکر ہوں گی۔ ایسے شخص کیلئے عمدہ قطعیں لکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ سفر کرے تاکہ وہ اپنے سفر کے دوران میں پہاڑوں اور دریاؤں کے علاوہ عام لوگوں کے رسم و رواج انکے رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کر سکے۔ شاید اس طرح جنگ یا قحط کی ماری ہوئی دنیا کے آلام اسکی نظموں میں بارپائیں۔ اس طرح اپنے گیتوں اور اپنی آہوں کیلئے دوسروں کے آلام مستعار لینے سے اچھی شاعری ہو سکتی ہے اور اسکے لئے افلاس اور ناکامی کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔

ع - کچھ زندگی کے بارے میں

✓ جذبہ کائنات کی بنیاد ہے۔ اور ذہن رسا کائنات کی چھت ہے۔
 ✓ شرفا کی نفرت کا نشانہ بننے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ عام لوگوں کی توہین کا نشانہ بن جائیں۔ کوئی مٹھوز فاضل اگر آپ کی ذات سے لاعلم ہے تو اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ معمولی سرکاری تھن آپ کو فیل کر دے۔
 آدمی وہ جس کی زندگی یوں ہو جیے کوئی نظم ہوتی ہے۔ اور چیز وہ جو تصویر نظر آئے۔

✓ دنیا میں ایسے مناظر بہت ہیں جن کا تذکرہ تو بے حد نفس ہوتا ہے مگر حقیقت

لے غائب اس سے مراد یہ ہے کہ شاعر عمالی میں گہرائی "عم" سے آتی ہے۔ مصنف۔

میں یہ مناظر بہت ادا ^{دیکھنا} ہوتے ہیں۔ مثلاً دھند یا بارش کے مناظر بعض حالات کا تذکرہ نہیں تو بڑے شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت انہیں برداشت کرنا امکان سے باہر ہوتا ہے۔ مثلاً بیماری اور غریبی کے حالات بعض آوازیں ایسی ہیں کہ انکا ذکر سنو تو بڑی حسین معلوم ہوں گی۔ لیکن وہ سخت عامیانه ہوتی ہیں مثلاً پھول بیچنے والی لڑکیوں کی آوازیں۔

میں خود کسان نہیں بن سکتا۔ صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اپنے باغ کو خود پانی سے سینچ دوں۔ میں لکڑیاں نہیں بن سکتا۔ صرف اپنے باغ سے بے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر سکتا ہوں۔

جن چیزوں سے مجھے کوفت ہوتی ہے وہ گنتی میں دس ہیں۔

۱۔ کتابوں کو آسانی سے کیرا لگ جاتا ہے۔

۲۔ گرمی کی راتوں کا سارا لطف مجھ کو کی بدولت غارت ہو جاتا ہے۔

۳۔ ہتھالی کی ہلکی چھت بہت جلد ٹپکنے لگتی ہے۔

۴۔ گل داؤدی کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں۔

۵۔ صنوبر کے درختوں پر بڑی بڑی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔

۶۔ بانس کے پیڑوں سے اتنے زیادہ پتے گرتے ہیں۔

۷۔ کنول اور تیج کے پھول اتنی جلد ہی مرجھاتے ہیں۔

۸۔ پانی کو کے پودے میں اکثر سانپ چھپا ہوتا ہے۔

۹۔ کلڑی کی جالیوں پر معمولوں کے ساتھ کانٹے لگی ہوتے ہیں۔

۱۰۔ سینہ یا فاریشت کھانے میں زہریلے نمائند ہوتے ہیں۔

۱۱۔ کھجوروں میں سوآن کا پھول جو جبہ و دفع آلام کا نام دیا گیا ہے لیکن مزید

یکوئل نہ بنو۔ کیونکہ وہ خون کے آنسو بہاتی ہے۔ جن سے پھول اُگتے ہیں۔
 میرے نزدیک مکمل اور مثالی زندگی یہ ہے کہ ایسے مقام پر پیدا ہوں جہاں
 امن و امان ہو۔ بہاریاں اور ٹھیلے ہوں۔ اور وہاں کا حاکم افسانہ پسند اور دیانت دار
 ہو۔ ہم ایسے خاندان کے رکن ہوں جس کے مالی حالات اطمینان بخش ہوں ہمیں ایسی سبھی
 جو عقل مند ہو۔ اور ایسے بیٹے پیدا ہوں جو ذہین اور اچھے ہوں۔

اگر آپ کے سینے میں بہاؤ اور دادوں کے مناظر محفوظ ہیں تو آپ شہر میں
 بھی اسی طرح رہ سکتے ہیں۔ گویا بہاؤ کے گھنے جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔

خاموش رات کو اکیلے بیٹھے رہنا۔ چاند کو اپنے دل کے آلام کی داستان
 سنانا۔ پر نقار رات کو تہنہا رہنا۔ اور رات کے جھینگروں کو اپنا راز دالہ جاننا
 یہ ہے زندگی۔ — جو شخص شہر میں رہتا ہو اسے چاہئے کہ تصویروں کو قدرتی مٹا
 سمجھے۔ گلے کے پھولوں کو اپنا باغ جانے۔ اور کتابوں کو اپنا سچا دوست خیال کرے۔
 کسی مشہور عالم سے یہ کہنا کہ وہ آپ کے بچوں کو تعلیم دے۔ کسی اچھے
 برہا کر استقامتی جواب مضمون لکھنے کی مشق کرنا۔ اور کسی مشہور ادیب کو اپنا ادبی
 استاد ٹھہرانا۔ — یہ تینوں چیزیں سرسبز غلط اور نامناسب ہیں۔

سچاری کے لئے یہ لازم نہیں کہ شراب سے پرہیز کرے اسے صرف اس لئے
 اور بازاری باتوں سے احتراز لازم ہے۔ سرخ لباس والی نامہ نینوں کیلئے یہ ضروری
 نہیں کہ انھیں ادب کی سمجھ ہو۔ ان کے لئے ہی کافی ہے کہ جو چیز آرٹسٹک ہو
 اس کا ذوق رکھتی ہوں۔

اگر ٹیکسی وصول کرنے والے کی آمد سے کوفت ہوتی ہو تو زمین کا پتہ
 پہلے سے ادا کر دیں۔ اگر آپ کو بدھ مت کے ٹھنڈے دل سے مذہبی بحث میں

ہے تو آپ ان کی خانقاہوں کے لئے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہیں۔
 ہر چیز بھول جانا آسان ہے۔ صرف شہرت کا خیال نہیں بھلا یا جاسکتا
 ہر چیز سے بے پروائی برتنا بھی مشکل نہیں۔ البتہ شراب کے تین پیالوں سے کون
 بے نیاز ہو سکتا ہے ؟

شراب چائے کی جگہ لے سکتی ہے۔ لیکن چائے شراب کی جگہ نہیں لے
 سکتی۔ نظیں نثر کی جگہ پر کر سکتی ہیں۔ لیکن نثر نظم کی جگہ نہیں پر کر سکتی۔ ڈرامائی
 نظیں گیتوں کی جگہ لے سکتی ہیں۔ لیکن اس کا الٹ ممکن نہیں۔ چاندنیوں کی جگہ
 لے سکتا ہے لیکن شمعیں چاند کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ قلم زبان کی جگہ لے سکتا ہے
 لیکن زبان قلم کی جگہ نہیں لے سکتی۔ خادمہ کی جگہ مرد ملازم کام کر سکتا ہے۔
 لیکن وہ خادمہ کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔

سینے میں بے اضمافی کے دکھ کو شراب میں غرق کیا جاسکتا ہے لیکن
 دنیا میں بہت بڑی بے اضمافی کو صرف تلوار ہی سے غرق کیا جاسکتا ہے۔
 مصروف آدمی کا باغ اس کے گھر کے پاس ہونا چاہئے۔ اور با فراغت شخص
 کا باغ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر۔

دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو کسی پہاڑی غازی رہنے والے عارن کی سی
 سرسبز بل سکتی ہیں۔ مگر جنہیں ان سرسبزوں کی کچھ خبر نہیں ان میں مچھیرے لکر ہارے۔ باغیان
 اور کسان شامل ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں کہ باعوں۔ ایوانوں اور ماہ پیکر دشتہ عورتوں
 کی سنگت انھیں میر ہوتی ہے۔ مگر انھیں ان سے لطف اٹھانا نہیں آتا۔ ان میں امیر
 سوداگر اور اعلیٰ افسران شامل ہیں۔

درد کا برداشت کرنا آسان ہے لیکن کھینچنے کی خواہش کو دبانا مشکل ہے۔ کرنا دیا
 زائقہ برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن کھینچنے کی خواہش نہیں کھاسکتا۔

فراغت والے شخص کا قلمدان برا خوبصورت ہونا چاہئے لیکن مصروفیت والے شخص کا قلمدان خوبصورت ہونا لازم ہے۔

دل بہلا دے کے لئے جو داشتہ رکھی جائے اسے خوبصورت ہونا چاہئے لیکن جو عورت اولاد کے لئے گھر میں ڈالی جائے اسکا خوبصورت ہونا لازم ہے۔

سفید بگلوں کو دیکھ کر روماتی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ گھوڑا انسان میں شجاعت کا اندازہ پیدا کرتا ہے۔ نسترنگ گوشہ نشینی کا میلان پیدا کرتا ہے۔ اور ہمنو پر نررگانہ دقار پیدا کرتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ کسی دن ایک عریاں ناچ کا انتظام کروں۔ تاکہ ہرزمانے کے مرحوم اہل کمال کی روحیں خوش ہو جائیں۔ اور پھر ہرزمانے کی خوبصورت عورتوں کی روحیں بھی خوش ہو جائیں۔ جب بھی مجھے اس ناچ کی صدارت کے لئے کوئی اہلی عالم دین مل گیا۔ میں فوراً اس ناچ کا انتظام کروں گا۔

یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے کہ لطیف غذاؤں کو جلد جلد زہر مار کیا جائے۔ شاندار مناظر سے عجلت میں گزرا جائے۔ گہرے جذبات کا اظہار سچی ہو خوبصورت دن کو کھانے اور شراب پینے میں غارت کیا جائے۔ اور اپنی دولت کو نمائشی عیاشی پر صرف کیا جائے۔

باب یازدہم
سفر کے منزے

۱- سیر و سیاحت

۲- منگ لیاوزے کے سفر

۱۔ بیرونی سیاحت

کبھی سفر ذریعہ مسرت تھا۔ لیکن اب یہ بھی کاروبار بن گیا ہے ہمیں تنگ نہیں کہ آج کل ہمیں سفر کی دو سہولتیں حاصل ہیں۔ جو آج سے سو برس پہلے نہ تھیں حکومتوں نے سفر کے سرکاری دفاتر کھول کر سیاحت کو کاروبار سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جدید زمانے کا انسان اپنے باپ دادا کی نسبت کہیں زیادہ سفر کرنے پر قادر ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر مگر تا بھی ہے۔ پھر بھی سفر پر فن ہے جو اب ختم ہو گیا ہے۔ اس آرٹ کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نقلی سفر کی مختلف صورتوں پر روشنی ڈالی جائے۔

نقلی سفر کی پہلی قسم یہ ہے کہ اپنے ذہن کو بہتر بنانے کے لئے سفر اختیار کیا جائے اصل یہ ہے کہ ذہن اور خیالات کی بہتری پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا چکا ہے۔ اور اسکی اہمیت کو حد سے بڑھا دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر انسان کا ذہن نہیں آسانی سے بہتر بنایا جاسکے تو بات کیا ہوتی۔ کم از کم ان بہتر ذہنوں کا نمونہ مجھے کلبوں۔ اور درنگا ہوں میں تو کہیں نظر نہیں آیا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم فی الواقع اپنے ذہن کو بہتر بنانا چاہتے ہوں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی تعطیلات کے زمانے میں چند ماہ کیلئے اپنے ذہن کی پائل خالی رکھیں اور اسے مکمل چھٹی دیں۔ معلومات میں اضافہ کرنے کے غلط تصور نے سیاحت لینے کا سبب جیسی چیز پیدا کر دی ہے۔ جو میرے نزدیک مان نہ مان میں تیرا ہمانہ قسم کی ہنایت نامعقول مغز جاٹ مخلوق ہے۔ اب کسی دوسرے شہر میں سیاحت کے لئے گئے ہوں۔ تو آپ کسی

باغ۔ کسی یادگاری بت۔ کسی لاٹ سے اس مخلوق کی بکو اس نے بغیر آگے نہیں
 جا سکتے۔ گائیڈ ضرور آپ کو یہ بتا کر چھوڑے گا کہ یہ فلاں شخصیت کا بت
 ہے۔ جو ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوا تھا۔ اور اس کا انتقال ۲۲ دسمبر ۱۹۵۸ء
 کو ہوا۔ غالباً اسی زمرے میں انگریزی سکولوں کی سسر قسم کی اتنا نیاں بھی آتی ہیں،
 جو اسکول کے بچوں کو کسی قبرستان میں لپیٹیں گی۔ اور کسی کتاب سے کسی قبر میں سونے
 والے کی تاریخ وفات پڑھ کر سنائیں گی۔ یہ بتائیں گی کہ اس نے کس تاریخ کو شادی
 کی اور یہ کہ اس کی بیوی کا نام۔ عمر وغیرہ کیا تھی؟ وہ اپنی انھیں احمقانہ معلومات
 کی بنا پر بچوں کی ساری سیر غارت کر کے دم لیتی ہیں۔ سیاحوں کی صورت میں اچھے
 خانے پکی عمر کے لوگوں کو بھی بچہ بنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کا گائیڈ انھیں بڑی شد و مد پر غر
 متعلق بات بکچر دیتا ہے جو انھیں منہا ہی پڑتا ہے۔ ان سیاحوں میں جو لوگ ذرا محتاط
 قسم کے ہوتے ہیں وہ اسکول کے اچھے بچوں کی طرح نوٹ بک نکال کر کچھ یاد نہیں
 بھی لے لیتے ہیں۔ دنیا بھر کے سیاحوں کا یہی حال ہے۔ چینی سیاح اگر ریڈیو سنی جائیں
 تو انھیں بھی امریکی سیاحوں کی طرح یہ عذاب اٹھانا پڑتا ہے فرق اتنا ہے کہ چینی
 گائیڈ پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے۔ بلکہ کھیل سونے والے ہمارا ورک ان بچے ہوتے ہیں۔ انکی
 ہتیا کردہ معلومات غلط ضرور ہوتی ہیں۔ مگر انکی اپنی شخصیت پیشہ ور گائیڈ کی نسبت
 بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دن میں سوچاؤ میں ہو چکی ادنی
 پہاڑی دیکھنے گیا۔ واپس آیا تو دماغ میں مہارنجی واقعات سن اور تاریخوں کا عجیب بہ
 بنا ہوا موجود تھا۔ یہ ساری معلومات شاندار پل کے بارے میں تھیں جو تلوار کے تالاب
 کے اوپر پانی کی سطح سے چھپ چھپ ٹٹا اور نچا معلق ہے میرے خود ساختہ گائیڈ نے جو سنتے
 بیچے والا ایک لڑکا تھا۔ مجھے بتایا کہ پل کی سنگین سلوں میں دو گول سوراخوں میں سے ایک

تلوار اڑ رہے کی طرح اڑ کر اوپر آئی تھی۔ اور یہ وہ جگہ ہے۔ جہاں مشہور حسینہ کی شہرہ اپنا سنگار کیا کرتی تھی۔ حالانکہ اسکے سنگار کی روایتی جگہ یہاں سے دس میل دور ہے۔ میرا یہ گائیڈ لڑکا بس سنتے ہی بیچنا جانتا تھا۔ مگر اس کی ان معلومات سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ لوگ کہانیاں کس طرح بنتی بگڑتی ہیں اور ان کے بیان میں کیا کیا تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

نقلی سیاحت کی دوسری صورت یہ ہے کہ بعد میں دینگیں اور پھر درماتیں کرنے کے لئے سفر اختیار کیا جائے۔ ہانگ چاؤ کے پاس ہوا پاؤ ایک جگہ ہے جو چائے اور چائے کے پانی کے لئے مشہور ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ وہاں جا کر چائے پیتے ہوئے اپنی تصویریں کھینچواتے ہیں۔ ہوا پاؤ میں جانے پتے ہوئے تصویر کھینچنا اور اسے اپنے دوستوں کو دکھانا بڑا آرتھک سمجھا جاتا ہو گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ وہاں کی چائے کے ذائقے پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اور تصویر کھینچنے پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اور پھر یہ جذبہ جنون کی حد تک بھی دیکھا گیا ہے۔ خصوصاً جن سیاحوں کے پاس کیمرے ہوتے ہیں۔ ان کی کچھ نہ پوچھئے۔ ذرا لنڈن یا پیرس کے سیاحوں کی کسی ٹولی کو دیکھ لیجئے جو خاص بسوں میں سفر کرتی پھرتی ہیں۔ یہ سیاح اپنے کیمروں سے تصویریں کھینچنے میں اتنے مصروف ہوتے ہیں۔ کہ وہ تصویر کے اصل موضوع کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتے بھی نہیں۔ یہ تسلیم کہ گھر پہنچ کر وہ ان مشہور مقامات کو تصویر کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں تو پھر سفر کی کیا ضرورت ہے لندن کے ٹرافالگر سکوائر یا پیرس کے کسی مشہور مقام کا فوٹو تو نیویارک یا سنگھائی یا کلکتہ کہیں بھی مل سکتا ہے۔ پھر یہ تاریخی مقامات موضوع سفر بن جاتے ہیں اور یہ ایسے مقامات نہیں رہتے جنہیں دیکھنا چاہئے یا جو واقعی قابل دید ہیں چنانچہ کوئی شخص جتنے زیادہ مقامات کی سیر کر لگا اسکی یادداشت اتنی ہی زیادہ ہوگی اور اس طرح

زیادہ سے زیادہ مقامات اسکی گفتگو کا موضوع بن سکیں گے۔ گویا علم کی یہ خواہش سیاح کو ایک دن میں زیادہ تاریخی عمارتیں۔ یادگاریں اور مقامات دیکھنے پر مجبور کرے گی۔ اس کے ہاتھ میں ان تمام جگہوں کی ایک فہرست ہے۔ اور ایک مقام یا عمارت دیکھ لینے کے بعد وہ اس فہرست پر نشان بنا دیتا ہے کہ یہ مقام تمہیں تیغ ہو گیا۔ آپ ہی انصاف کریں کہ یہ کیا سیاحت ہے۔

اس قسم کا احمقانہ سفر ایک تیسری قسم کی سیاحت کو جنم دیتا ہے اور وہ یہ کہ ایک لگے بندھے پر وگرام کے مطابق سیاحت کی جائے۔ اس پر وگرام کی رو سے سیاح صاحب کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لندن سے وہی آنا کتنے بجے پہنچیں گے اور وہاں کتنے گھنٹے ٹھہریں گے۔ اور بوڈا آپسٹ میں ان کا قیام کتنا ہوگا۔ اس قسم کا سیاح گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے سفر کا مکمل گوشوارہ تیار کر لیتا ہے اور اس پر سختی سے کاربند رہتا ہے۔ یہ شخص گھر میں بھی گھڑی اور کیانٹیکر کا بال بندھا غلام ہوتا ہے۔ اور گھر سے باہر بھی گھڑی اور یہ کہ ہاتھوں میں اسکی مہار ہوا کرتی ہے۔

نقلی سیاحت کی تین صورتیں میں نے عرض کر دی ہیں جو آجکل عام ہیں۔ میرے نزدیک سیر و سیاحت کے اصل مقاصد اور ہیں۔ سیاحت کا اولین مقصد یہ ہونا چاہئے۔ کہ آدمی اپنی ہستی کو گم کر دے۔ نامعلوم اور اچھی بنا جائے۔ زیادہ شاعرانہ زبان میں یوں سمجھئے کہ ہمیں خود کو بھلانے کے لئے سفر کرنا چاہئے۔ ہر شخص اپنے شہر میں معزز اور ذمہ دار شہری ہوتا ہے۔ چاہے اُسے اعلیٰ طبقہ کے لوگ کچھ ہی سمجھتے ہوں ہر شخص اپنے شہر میں چند سماجی روایات تو انین اور فرائض کا غلام ہوتا ہے۔ — ایک بینکر کو بچئے اُسے اس کے شہر میں ایک معمولی انسان نہیں سمجھا جاسکتا۔ کوئی شخص اور وہ خود یہ بھول نہیں

سکتا کہ وہ بینکر ہے۔ میرے نزدیک سفر کا صحیح مقصد یہ ہے کہ بینکر بیاحت کے دوران میں اور سفر کی بدولت اپنے آپ کو ان لوگوں کے درمیان اپنے جہاں کا بینکر کے بجائے ایک عام انسان سمجھا جائے۔ جو لوگ کاروبار کی غرض سے سفر کرتے ہیں۔ وہ تعارفی خطوط ساتھ لیکر جاتے ہیں۔ مگر کاروباری سفر خالص سیاحت کے زمرے میں نہیں آتا۔ اگر آپ سیاحت پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مختلف شہروں میں رہنے والے لوگوں کے نام تعارفی خطوط سے لیس کر لیں گے تو پھر آپ ایک انسان کی حیثیت سے سفر نہ کریں گے۔ کبھی آپ پر یہ آشکارا ہو جائے گا۔ کہ سماجی درجہ کی مصنوعی تقسیم سے الگ ہو کر آپ خدا کے پیارے ہوئے ایک انسان کی حیثیت سے کیا ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آپ تعارفی خطوط لیکر اگر غیر مالک کی سیاحت کو جائیں تو وہاں یہ متعارف لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور بڑی مستعدی سے اپنے طبقہ کے لوگوں کی بچھپیوں اور مصروفیت میں آپ کی رہنمائی بھی کریں گے۔ لئے لئے بھی پھریں گے لیکن مغنی پیدا کرنے والی کیفیت ایک برعکس ہے کہ اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو جنگل میں پھرے ہوئے ایک اسکاؤٹ کی ہوتی ہے۔ جسے اپنا راستہ خود ڈھونڈنا ہے۔ ایسے موقع پر انسان خود اپنے نفس کے سامنے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ کسی اجنبی شہر میں وہاں کی زبان جاننے بغیر محض اشاروں سے ہوٹل کے بیرے کو بھنی ہوئی مرغی لانے کا آرڈر بھی دے سکتا ہے۔ اور جا پانی زبان جانے بغیر تو کیوں کسی سیاہی سے رہتے بھی دیکھا کرنے پر قادر ہے۔ ایسا سیاح جب گھر آئے گا۔ تو وہ پہلے کی طرح شو فر اور اپنے بیرے کا محتاج رہے گا۔

سیاح سیاح ہمیشہ آوارہ گزد ہوتا ہے۔ اس کی مسرتیں۔

اس کی کمزوریاں۔ اس کی مہم جوئی اور قسمت بازمانی

کے ولولے وہی ہوں گے جو آوارہ گرد سے مخصوص ہیں میرے نزدیک
سفر اور سیاحت یا تو آوارہ گردی ہے یا پھر کچھ نہیں۔ سیاحت کی روح
یہ ہے کہ آپکے فرائض کچھ نہ ہوں۔ آپ مقررہ وقت کے پابند نہ ہوں آپ اپنی
ڈاک سے بے نیاز ہوں۔ آپ دخل در معقولات دینے والے ہمایوں کی زد میں
نہ ہوں۔ آپکے پاس ملنے والے دفعہ آئیں اور آپکی منزل کوئی نہ ہو۔ سچا سیاح
وہ ہے جسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں جائے گا۔ اور مکمل سیاح وہ ہوتا ہے جسے
یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ وہ تو اپنا نام اور اپنا لقب بھی بھول جاتا ہے
۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر تو لنگنے اپنے مثالی مسافر رنگ یاد دہے کی
روئیداد میں اتنا زور دیا ہے (اس کا ترجمہ میں اگلی فصل میں پیش خدمت دینگا)
سچے سیاح کا اجنبی ملک میں کوئی دوست نہیں ہوتا لیکن ایک چنبی راہبہ کے
قول کے مطابق سچا سیاح کسی ایک شخص کی پروا نہیں کرتا۔ بلکہ عام انسانیت کا
مجموعی طور پر خیر خواہ ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی ایک شخص کو دوست نہ رکھنے کا مطلب
یہ ہے کہ ہر شخص اس کا دوست ہے۔ اسے عام انسانیت سے محبت ہوتی ہے وہ عام
انسانوں میں گھل مل جاتا ہے۔ اور عام لوگوں کی دلنوا شخصیت درانکے رسم و رواج
دھونڈتا پھرتا ہے۔ یہ وہ فوائد ہیں جن سے قابل دید مقامات کی سیر کرنے والے
سیاح فطری طور پر محروم رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں اور اپنے ہی وطن
مسافروں سے بات چیت کرتے ہیں اسکی مثال پیرس میں امریکی سیاحوں کی ہے
جو سب کام چھوڑ کر صرف ان ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں جو امریکی سیاحوں کے دل پسند
ہوٹل ہیں۔ یہاں انھیں ان تمام مسافروں سے بار بار سابقہ پڑتا ہے جو انھیں کس کس
جہاز میں ہم سفر تھے۔ یہاں وہی کھانا ملے گا جو وہ وطن میں کھاتے تھے اور کامزہ انھیں

وہی ہو گا جو وطن میں ہوتا تھا۔ سنگھائی میں آنے والے انگریزوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بڑی تحقیق کے بعد انگریزی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ جہاں ناشتے میں خالص انگریزی ناشتہ یعنی بیکن اور انڈے مرتبا اور ٹوس مل سکے۔ انگریز مسافر کا کل مار کے ارد گرد منڈلانے پھریں گے۔ اور رکشا کی سیر سے ہزار چیلے بہا کر کے جان چھڑانے کی کوشش کریں گے ایسے مسافر اور ایسے سیاح کبھی اپنی ملک کے لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور اس طرح سفر کے ایک بہت بڑے فائدے ایک عظیم نعمت سے قطعاً طور پر محروم رہتے ہیں۔

اسکے برعکس اگر آوارہ گردی کی اسپرٹ پیدا کر لیں تو سفر میں فطرت قریب تر ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ سچے سیاح موسم گرما میں صحت افزا مقامات پر جائیں گے۔ جہاں لوگ کم سے کم جاتے ہوں۔ تاکہ وہاں انھیں صحیح معنوں میں سکون و آرام میسر آسکے۔ اور فطرت سے قریب تر آنے کا موقع اور وقت مل سکے۔ اس قسم کے سیاح سفر کی تیاری کے سلسلہ میں دکانوں پر مارے مارے نہ پھریں گے کہ گلابی یا نیلے غسل کے لباس کی خریداری کر سکیں۔ البتہ خواتین کے سلسلہ میں لپ شک کی اجازت ہے۔ کیونکہ سیر و سیاحت کا ہر دلدلادہ روسو کا پیرد ہوتا ہے اور روسو کہتا ہے کہ اپنی فطرت کے قریب تر رہو۔ اور کوئی خاتون اچھی لپ شک کے بغیر قدرتی عورت نظر نہیں آسکتی۔ سفر میں بناوٹ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چھٹی منلے والے لوگ ایسے تفریحی مقامات میں ہجوم کرتے ہیں جہاں ہر کوئی جاتا ہے۔ ایسے قدرت سے قریب تر ہونے کی شرط بالکل فراموش ہو جاتی ہے۔ ان مقامات پر انھیں لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جن سے بھاگ کر وہ ان مقامات کی سیر کر کے چھٹے دن انھیں لوگوں سے ملنے چلنے اور پارٹیوں کا زور بند ہوتا ہے اور ساری تفریح ساری میر

ہو جاتی ہے۔

سیر و سیاحت کی ایک اور قسم بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کچھ نہ دیکھنے اور کسی ملاقات نہ کرنے کے لئے سفر کیا جائے۔ بس جنگل کے جانوروں۔ گلہریوں وغیرہ اور بادلوں اور درختوں کو دیکھنے کے لئے سفر کیا جائے۔ یہ کچھ نہ دیکھنا۔ ذرا وضاحت طلب ہے۔ اس چینی تصور کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو سکتی ہے جو میری ایک امریکی دوست نے مجھ سے بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ چینی دوستوں کے ساتھ اُسے ہانگ چاؤ کے پاس کی پہاڑیوں میں کچھ نہ دیکھنے کیلئے جانا پڑا۔ اس دن صبح کو گہری دُھند چھا رہی تھی۔ اور جوں جوں وہ لوگ پہاڑی پر چڑھتے گئے دھند گہری ہوتی گئی۔ گھاس کی پتیوں پر نمی کی بوندوں کا گرنے کی آواز صاف سنائی دیر ہی تھی۔ ہر طرف دھند ہی دھند تھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ امریکی خاتون کچھ اکتا سی گئی۔ بولی اور پر کیا ملے گا۔ اس کی چینی سہیلیوں نے کہا۔ نہیں ہیں چلی آئیے۔ چوٹی پر پہنچ کر نہایت ہی خوبصورت منظر دیکھنے میں آئے گا۔

تھوڑی دیر وہ ان کے ساتھ طوعاً و کرہاً چلتی گئی۔ کچھ چڑھائی چڑھنے کے بعد اسے ایک بھری سی چٹان نظر آئی جو بادلوں سے دُھندلی ہوئی تھی۔ یہی وہ لے لفظ منظر تھا جسکی اتنی دھوم تھی۔ اس نے پوچھا کہ کیا ہے۔ آخر۔ جواب ملا کہ مکاں بناؤ فرمے۔ امریکی خاتون جل گئی۔ وہ واپس مڑنے کو تھی کہ ساتھیوں نے پھر صراہ کیا۔ آپ تو اس قدر جلد گھبرا گئیں۔ ذرا چوٹی تک پہنچے پھر دیکھئے گا۔ ہر وقت تک بچاری کا لباس انہی سے ٹہرا ہوا دکھاتا لیکن وہ مردہ بدست زندہ پھر چڑھائی چڑھنے لگی۔ آخر خدا نے کرے یہ لوگ چوٹی پر پہنچے۔ دیکھا کہ ہر طرف دھند کے بادلوں جھلسے ہیں۔ کبرے کے انبار لگے ہیں۔ اور درائنق پہ کچھ چوٹیاں ہندی دھندلی نظر

آ رہی ہیں۔ امر کی خاتون نے جل کر کہا۔ یہاں تو دیکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔
 جواب ملا یہی تو نکتہ ہے۔ ہم لوگ یہاں یہی کچھ تھی نہیں دیکھنے آئے تھے۔
 اس سے ظاہر ہے کہ اشیاء کا نظارہ کرنے اور کچھ نہ دیکھنے میں بہت فرق
 ہے۔ بہت سے سیاحوں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت سی چیزیں دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں
 دیکھتے۔ اور جو کچھ نہیں دیکھتے وہی لوگ بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ مشاہدہ
 ہے فلاں مصنف اپنی کتاب کا مواد اٹھنا کرنے فلاں غیر ملک کی سیر کر رہا ہے
 مجھے ہمیشہ اس ابو النجفی پر یقینی آتی ہے۔ دوسرے ملک کو اس خاطر تو حیرت کی
 جائے کہ وہ اپنے ملک۔ اپنے شہر میں بسنے والی مخلوق کی زندگی کا ہر پہلو دیکھ
 چکا ہو۔ اور اسکے تمام پہلوؤں کو کھنگال چکا ہو۔ جس شخص کو اپنے ملک اپنے شہر میں
 کچھ نظر نہیں آیا۔ خود اپنے ملک اپنے شہر میں دیکھنے کا اتنا سامان ہوتا ہے
 کہ ساری عمر اسے دیکھنے کے لئے ناکافی ہے۔ اسے دوسرے ملک میں کیا نظر آئے گا؟
 اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ سیر و سیاحت کی غایت اس کا فلسفہ یہ ہے
 کہ دیکھنے کی صلاحیت سے کام لیا جائے۔ اس صورت میں یہ امتیاز ہی اٹھ جاتا ہے
 کہ سیر و سیاحت کے لئے کسی دوسرے ملک کا سفر کیا جائے یا اپنے ہی لقبہ
 میں آس پاس فراغت کی ایک سہ پہر کو کھیتوں کی سیر کی جائے۔ ان دونوں
 کی غایت اور ماہیت میں کوئی فرق نہیں۔

یعنی ادیب جن شگفتان نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ دونوں
 باتوں میں کوئی فرق نہیں۔ مسافر کے پاس سب سے ضروری سامان یہ ہونا چاہئے
 کہ اسکے دل میں ایک خاص جذبہ ایک خاص ذوق ہو اور اسکی آنکھوں میں یہاں بھرتی ہو
 یعنی لازم یہ ہو کہ محسوس کرنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ اصل نا د سفر میں ادیب

اگر مسافر اور سیاح ان دونوں سے بے بہرہ ہے تو اسکا پہاروں پر جانا اپنا وقت برباد کر لے۔ اور روپیہ ضائع کرنا ہے۔ اسکے برعکس اگر اس کے دل میں خاص جذبہ خاص ذوق موجود ہے اور اسکی آنکھوں میں بصیرت کی روشنی بھی ہے تو وہ پہاروں پر جا کر بغیر بھی سفر و سیاحت کا حقیقی لطف اٹھا سکتا ہے۔ وہ گھر میں بیٹھ کر یا کھیت میں پھر کر کسی آوارہ بدلی کسی کتے یا کسی اکیلے درخت کو دیکھ کر بھی یہ سارا مزہ حاصل کر لے گا۔

گو یا سفر کا حقیقی آرٹ جن ٹنگ تان کے لفظوں میں یہ ہے۔
 میں نے لوگوں کے سفر نامے پڑھے ہیں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بہت ہی کم لوگ سفر اور سیاحت کے حقیقی آرٹ سے واقف ہیں۔ جو شخص سفر کرنا چاہتا ہو۔ وہ آسمان اور زمین سمندر اور خشکی کے لامتناہی مناظر کو دیکھنے، انکی عظمت انکے اسرار کی تہہ تک پہنچنے کے لئے لمبے سے لمبے سفر سے نہ گھبرا کر گیا۔ لیکن اسکے دل کا جذبہ حقیقی۔ اور اس کی آنکھوں میں بصیرت کی روشنی اسے بتا دیتی کہ نظریہ کے مظاہر کے حسن و خوبی اور اسرار کو دیکھنے کیلئے جو بصورت مقامات کو جانا ہی ضروری نہیں۔ ایک دن یہ سیاح اپنی ٹانگوں کی بہت سی طاقت خرچ کر کے اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن کی بہت سی صلاحیتیں خرچ کر کے کسی غار کو دیکھنے کے لئے جاتا ہے۔ اگلے دن وہ پھر اپنی ٹانگوں کا سبیل اپنے ذہن اپنی آنکھوں کی طاقت خرچ کر کے کسی اور خوبصورت مقام سے لطف اٹھانے جاتا ہے۔ اب جو لوگ اس شخص کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے یہی کہتا نہیں گے کہ بھائی کیا مزے لے رہا ہے۔ یہ شخص کہ ہر روز ایک نئی جگہ۔ ایک نئے مقام کی سیر کو جاتا ہے۔ آج ایک غار کو دیکھا تو کل کوئی اور خوبصورت جگہ گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں اصل نکتہ کی بات بالکل نہیں آسکتی۔ نکتہ یہ ہے کہ یہ سیاح

جن دو مقامات کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے پاس پاتل تو نہ تھے۔ کون جانتا ہے کہ ان دو جگہوں میں بیس یا تیس میل کا فاصلہ تھا۔ سات آٹھ میل کا۔ دو ایک میل کا یا صرف آدھ ہی میل کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ہی تو اصل چیز ہے۔ کیونکہ اس شخص کے دل میں خدا نے جو نبی پیدا کیا ہے۔ اور اسکی آنکھوں کو بصیرت کی جو روشنی عطا کی ہے اسکی بدلت اس شخص نے اس درمیانی فاصلہ کو بھی انکھوں اور اسی وحی ذوق شوق سے دیکھا ہوگا۔ جس طرح اس نے اس چٹانی غاریاں جو بھرتی منظر پر نظر ڈالی تھی۔

مجھے تسلیم ہے کہ اس چٹانی غار کی ہیبت اور اس خوبصورت منظر کی عظمت میں ایسا عنصر ہوتا ہے جو آنکھ کو خوفزدہ کرتا ہے۔ اور ان چیزوں کو دیکھ کر لگا ایک ہماری روح حیرت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے کہ ماد فطرت نے اپنی لازوال قوت۔ دانش اور کار سازی کی بدولت کسی کسی چیزیں بنائی ہیں مگر ان پر شکوہ چیزوں سے قطع نظر میں نے تو بارہا کسی معمولی سے پودے۔ بلکہ کسی پرندے کے ایک پر کسی مچھلی کے ایک فلس کسی پھول کی ایک پنکھری گھا سسکی ایک تپتی کو غور سے دیکھا ہے۔ اور یہی پایا ہے کہ ماد فطرت نے کس مہارت کس دانش عظیم کس بے پناہ قوت سے ان بظاہر معمولی چیزوں کو تخلیق کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل کا تیر کسی رست ہاتھی کبھی معمولی سے جانور پر حملہ کرنے میں ایک سی قوت استعمال کرتا ہے۔ اصل میں یہی خاصہ ماد فطرت کا ہے کہ وہ ہر بڑی سے بڑی اور معمولی سے معمولی چیز کی تخلیق میں ایک سی قوت و مہارت خارج کرتا ہے۔ ماد فطرت کسی عظیم چٹانی غار۔ کسی خوبصورت منظر کو تخلیق کرنے میں سارا زور لگا دیتی ہے۔ اور وہ کسی چھوٹے سے پرندے۔ کسی مچھلی۔ کسی پھول۔ گھا سسکی کسی تپتی جگہ پر ندے

کے کسی ننھے سے پر۔ مچھلی کے فلس۔ پھول سینکھری۔ اور چھوٹے سے
 چھوٹے پتے کی تخلیق میں بھی پوری قوت صرف کرتی ہے۔ اسلئے چلانی
 غار یا کوئی خوبصورت منظر ہی تنہا وہ چیزیں نہیں جو آنکھوں اور دل پر
 اپنی ہیبت کا سکہ جاتی ہیں۔ بلکہ اس کا نشا کی معمولی سے معمولی چیز کا ہی عالم ہے
 اس کے علاوہ کیا کبھی ہم نے یہ سوچا ہے کہ یہ جانی غار اور یہ
 خوبصورت منظر کس طرح وجود میں آئے۔ چونگ زے نے کیا خوب کہا ہے۔ گھوڑے
 کے مختلف اعضا کو سمجھنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم گھوڑے کے وجود کو سمجھ گئے
 کیونکہ جسے ہم گھوڑا کہتے ہیں وہ ان اعضا سے پہلے بھی موجود تھا۔ ایک اور
 مثال لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی جھیلوں کے ارد گرد گھنے جنگل موجود
 ہیں۔ اور بڑے بہاؤ والے پتھروں اور ورختوں نے جھاؤنی چھائی ہے۔
 سیاح تو یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ ان گھنے جنگلوں۔ لاتعداد پتھروں اور جھیلوں
 کو جمع کر کے جھیلیں اور بڑے بڑے بہاؤ بنائے گئے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ
 سر بلند چوٹیاں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے مجموعے سے بنتی ہیں۔ اور بڑے بڑے
 آبشار ننھے ننھے نالوں اور جھرنوں سے ملکر بنتے ہیں۔ اگر ہم ان چوٹیوں کو ایک
 ایک کر کے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اتنے وجود میں لانے والے پتھر عام طور پر
 ہاتھ کی سبھیلی سے بڑے نہیں ہوتے۔ اور آبشاروں کو وجود میں لانے والے پائے
 پانی کی معمولی دھاریں ہیں اور بس۔ اسی لئے فلسفی لاؤترنے نے کہا تھا
 تیس تار کسی جگر یا پہنے کے دھرے کے ارد گرد جمع کئے جاتے ہیں اور جب یہ
 افرادیت کھو دیتے ہیں تو ایک بھیہ۔ اور پھر ایک گاڑی چلنی ہوئی وجود
 میں آتی ہے۔ ہم مٹی کو گوندھ کر ایک برتن بناتے ہیں۔ مٹی اپنا وجود

کھو دیتی ہے۔ تو ایک کارآمد برتن ہمیں ملتا ہے۔ ہم دیواروں میں لٹکا کرتے
 ہیں۔ کہ ان میں کھڑکیاں اور دروازے نکالیں۔ جب یہ کھڑکیاں اور
 دروازے اپنا وجود گم کر دیتے ہیں (خلا بن جاتے ہیں) تو ہمیں ہنسے کیلئے کھڑکیاں
 اس طرح جب ہم کسی جانی غار یا کسی خوبصورت مقام کو دیکھتے
 ہیں۔ عمودی سرٹن چوٹیاں دیکھتے ہیں۔ عمودی پہاڑوں میں سے گزرتے ہوئے
 اور بائیں دیکھتے ہیں۔ ان دروں کو دیکھتے ہیں جو آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے اٹھتے پہاڑ
 کی اندھی عمودی گھائی بن جاتے ہیں۔ ان دروں کو دیکھتے ہیں جو نیچے ہوتے
 ہوتے ایک جگہ پہنچ کر دریا بن جاتے ہیں۔ ان دروں کو دیکھتے ہیں جو نشیب
 میں آتے آتے بالکل ہموار سطح مرفح بن جاتے ہیں۔ ان دروں کو دیکھتے ہیں جو
 ذرا سی خمیدگی کے بعد ڈھلوان کی شکل بن جاتے ہیں۔ ان دروں کو
 دیکھتے ہیں جو دو گھاٹیوں کو اس طرح ملاتے ہیں گویا ان پر پل باندھ دیا گیا
 ہو۔ اور پھر ان دروں کو دیکھتے ہیں جو آپس میں ملتے ملتے کسی گہرے پہاڑی
 نامے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان تمام کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے
 کہ چاہے یہ اپنی عظمت اور اپنے پراسرار شکوہ میں کتنے ہمہ گیر اور کتنے ہمہ رنگ
 کیوں نہ ہوں یہ عظمت اور یہ شکوہ اسی وقت پیدا ہوا جب انھوں نے اپنی
 انفرادی شخصیت کھوئی۔ اپنا الگ وجود مٹایا۔ اور ایک کل میں مل کر ایک بونے
 کیونکہ جب یہ اپنا وجود کھینچنے تو پھر کوئی درہ کوئی گھائی۔ کوئی دریا کوئی
 سطح مرفح کوئی نالانہ رہا۔ ایک منظر رہ گیا۔ اور انکے اپنی انفرادیت مٹانے
 اور کل میں مدغم ہونے کا یہ کرشمہ ہے کہ ہمارے سینوں میں ذوق جمال۔ اور ہماری آنکھوں
 میں نور بصیرت پیدا ہوا۔ اور اس ذوق اور بصیرت کو اسردگی اور نظارے کی

آزادی ملی۔ اور چونکہ ہمارے دلوں کا یہ ذوق اور آنکھوں کا یہ نور بصیرت
نظارہ کرنے میں اتنا آزاد ہوا کہ ان کے سامنے منظر ہر فطرت نے اپنا انفرادی
وجود مٹا دیا۔ تو پھر ہمیں کوئی خاص چٹائی غار۔ یا کوئی خاص خوبصورت مقام
دیکھنے کیلئے جانے کی ضرورت کیا رہی ہے اب تو ہر جگہ اور ہر مقام پر یہ
ذوق جمال اور یہ نور بصیرت آسودہ ہو سکتا ہے۔

گو یا ہیرے سینے کے ذوق جمال اور میری آنکھوں کے نور بصیرت کو
یہ آزادی مل گئی کہ جہاں چاہے نظارہ کرے اور جو جگہ دیکھے۔ کیونکہ
ان منظر ہر نے اپنی انفرادیت اپنا الگ وجود جنم کرنا یا تو پھر کیا یہ بالکل غیر ضروری
نہیں کہ میں لازم طور پر کسی چٹائی غار اور ایک خوبصورت مقام کو دیکھنے کے لئے
جاؤں۔ کیونکہ ان مقامات کے درمیانی فاصلے میں ان میں تیس میلوں میں یا ایک
آدھ میل کی مسافت ہی میں کیا ہر قدم پر ایسی چیزیں موجود نہیں جو اپنا وجود
کھو کر کسی گل میں مدغم ہیں۔ کیا اس مسافت میں کوئی چھوٹا سا خمیدہ پل۔ کوئی
تنہا ٹراٹرا پتھر کہیں بہتا پانی۔ کوئی چھوٹا سا گاؤں۔ کوئی جاؤر کیا یہ
سب بھی اسی طرح کے منظر ہر نہیں؟ مجھے کیا معلوم ہے کہ اس چٹائی غار
یا اس خوبصورت مقام کا پر اسرار حسن اسکی عظمت صرف اتنا ہی ہے
مخصوص ہے۔ کیا وہی پر اسرار حسن اور وہی عظمت ان دوسرے
منظر ہر میں نہیں۔؟

ایک بات اور بھی ہے۔ یہ بھی لازم نہیں کہ ہمارے سینوں میں
وہ خاص ذوق جمال اور ہماری آنکھوں میں وہ خاص نور بصیرت ہو۔
اگر چلنے پھرنے اور سیر کرنے کے لئے ان دونوں بیوں کی ضرورت ہے تو پھر

دنیا میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو سفر کے آرٹ کو سمجھتا ہو گا۔
 بندہ چن سنگ تان یہ عرض کرتا ہے کہ نہ کوئی خاص ذوقِ جمال ہرگز،
 جو چلنے پھرنے کے لئے ضروری ہے۔ نہ کوئی خاص نور بصیرت جیسا ہے جو
 ہمیں آزادی سے سیر کرائے۔ مئی فائی نے چٹانوں کی خوبیاں معلوم کرنے
 کے لئے یہ معیار قرار دیا تھا کہ ان میں خطوط کی نزاکت۔ لہروں کا حسن
 صفائی اور نفاست ہونی چاہئے۔ میں پوچھتا ہوں کیا راستے میں جو پانی
 کا چھوٹا سا جوہر کوئی گاؤں کوئی پل۔ پیر یا کوئی کتا دیکھتے ہیں ان میں سب
 میں یہی خصوصیات موجود نہیں ہوتیں۔ اگر ہمیں اتنی خوبیاں نظر نہیں آتیں تو اسکی تہ
 یہ ہے کہ ہمیں انکی طرف اس طرح دیکھنا۔ انکا اس طرح مشاہدہ کرنا نہیں آتا۔
 جس طرح می فائی نے چٹانوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگر ہمیں ان میں بھی خطوط کی
 نزاکت۔ ترکیب کا حسن حد و کی وضاحت نظر آجائے تو ہمیں انکی تکمیل
 پر بھی حیرت ہوگی۔ اور ہمارا ذوقِ جمال اور نور بصیرت انھیں کے گرد گھومے
 گا۔ اور آسودہ ہو سکے گا آخر چوٹیوں۔ پہاڑی سلسلوں اور پہاڑ کے دروں
 گھاٹیوں۔ دریاؤں۔ ڈھلانوں۔ پلوں۔ گہرے کھڈوں۔ چٹانی غاروں اور
 خوبصورت مقامات کی عظمت اور پراسرار حسن میں نفاست۔ لہراؤ۔ وضاحت اور
 نزاکت کے سوا اور کیا ہے؟

”اسی لئے جو لوگ محض چٹانی غاروں اور خوبصورت مقامات دیکھنے پر
 متوجہ ہیں وہ راہ میں بہت کچھ بے دیکھے چھوڑ جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ انھوں نے
 کچھ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ جو کسی جھاڑی یا کسی کتے کی خوبی
 اور پراسرار حسن کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ چٹانی غاروں اور خوبصورت

مقامات میں بھی صرن وہ عناصر دیکھ پائیں گے جن کا علمت خوبی۔ اور
پراسرار حسن سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔

”میرے دوست تو شان نے کہا۔ انسان کی تاریخ میں سفر کا آرٹ
صرن ایک ہستی کو علوم تھا۔ اور وہ کنفیوشس کی ہستی تھی۔ اس کے دوسرے
درجہ پر چینی خطاطی کا استاد وانگ سی چپہ ہے۔ میں نے وضاحت چاہی
تو تو شان نے کہا ”مجھے اسکا اندازہ کنفیوشس کے بارے میں دو تھروں
سے ہوا کہ کنفیوشس کے نزدیک چاول کبھی اتنے سفید نہیں تھے جتنے ہونے
چاہئیں۔ اور گوشت کا تیرہ کبھی اتنا عمدہ نہ تھا جتنا ہونا چاہئے۔“
رہا وانگ تو مجھے اس کے سچے ذوق سفر کا اندازہ اس کی
خطاطی سے ہوا ہے۔“

”میں نے کہا دوست جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے باقی انسانیت
کے ذوق اور سمجھ بوجھ کا تو دیوالہ نکل گیا۔“

”چنانچہ ایک دفعہ تو شان نے مجھے بتایا ”استاد وانگ سی چپہ
کا یہ حال تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتا تو سارا سارا دن اپنے آنکھوں میں پھول
کی ہر شاخ کے ہر پھول کی ہر سی۔ ہر رنگ و ریشہ گنتا رہتا۔ اور اس ہوا
سے کہ دن دن بھر کسی سے کلام نہ کرتا۔ بچارے شاگرد سارا دن اس میں
تولنے اور رومال لئے کھڑے رہتے۔ میں نے پوچھا اسکا ثبوت کیا ہے؟
اس نے کہا ”مجھے اس کا ثبوت میرے دل نے ہی کیا ہے۔۔۔“
یہ ہے تو شان۔ میرا دوست۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اسے
پہچانا نہیں۔ نہ اس کے زبردست تخیل کی قدر کی ہے۔“

۲۔ مینگ لیاؤز کے سفر

یہ ایک چینی اسکچ کا ترجمہ ہے۔ اس میں مرکزی کردار وہ دارہ گرداڑاہ شخص ہے جسے چینی ادب اور ثقافتی روایات نے اپنی تہذیب کے لئے مایہ ناز سمجھا ہے۔ یہ پارہ خوش باشی اور بے فکری کے نظریہ زندگی کا آئینہ ہے ایسی زندگی جو محبت، آزادی اور آوارہ گردی سے عبارت ہے۔ یہ پارہ مینگ کا لکھا ہوا ہے جو سو پھویں صدی کے اواخر میں زندہ تھا تو مینگ کو بھی سو دین چنگ یوان چنگ لانگ کی چاؤ وغیرہ جیسی عظیم شخصیتوں کی طرح چین کے تنگ نظر نقادوں نے کبھی وہ رتبہ نہیں دیا جس کے ہر لحاظ سے وہ مستحق ہیں۔ اب جرمہ ملاحظہ ہو E

۲۔ فرار

”منگ لیاؤز۔ ایک سرکاری اہلکار تھا۔ اسے اپنی سرکاری زندگی ایک آنکھ نہ نہ بھاتی تھی۔ وہ اپنے ضمیر کے خلاف اور اپنی مرضی کے خلاف عمل کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا ضمیر کے خلاف عمل کرنا یہ ہے کہ مہمان اور میزبان ایک دوسرے کے ساتھ نہایت تکلف سے ملتے ہیں۔ اور موسم کے بارے میں چند ایک سرسری باتیں کر نیکی بوجہ انہیں کھول سکتے۔ کئی حضرات زندگی میں پہلی مرتبہ ہم سے ملتے ہیں۔ انکاتیاک اور گرم جو فنی قابل دید ہوتی ہے۔ وہ بات بات میں ہمیں دلی دوست کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن پچھلے ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود سے قطعی غافل اور بے پروا ہو جاتے ہیں۔ ہم کسی شخص کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ اور جو ہنی وہ جاتا ہے ہم اس کی برائی اور عیب جونی کرتے کرتے اسے بدترین شخص کہہ ڈالتے ہیں۔“

اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم لوگ آپس میں ٹھیکہ کر گفتگو کرتے ہیں۔ تو خاص قسم کا رکھ رکھاؤ قائم رکھتے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے نہ جانے کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم گفتگو کے دوران میں بڑی اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں لیکن ہمارے ذاتی اخلاق کا خدایا ہی حافظ ہے۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ ہم نے دل کی بات کہہ دی تو سچ کھل جائے گا۔ اور سچی بات گروی ہو کر تنی ہے! اسلئے ہم اصل بات اصل خیال کو پر دوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اور نہایت معمولی موضوعات پر الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ہم اپنے اصل خیالات چھپانیکے لئے اداکاری کا سہارا لیتے ہیں۔ جھوٹی آہیں بھرتے ہیں۔ اونچی آواز میں بولنا شروع کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے من آنکھیں۔ دہن۔ ناک کچھ بھی ہمارا نہیں رہتا۔ ہمارا غصہ غصہ نہیں ہوتا۔ ہماری ہنسی جھوٹی ہوتی ہے۔ ہماری نرمی اور ملائمت بالکل مصنوعی ہوتی ہے۔

سماج کی یہ پڑائی ریت ہے۔ اور اسے کسی طرح سدھار نہیں جاسکتا خیر۔ تو ہوئیں اپنے ضمیر کے خلاف باتیں اپنی عزت نفس اپنی خودداری کے خلاف ہمیں کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔

ہمیں اپنے برابر کے لوگوں کی خواہ مخواہ عزت کرنی پڑتی ہے اور دن دن بھر ان کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگوں سے اپنے تعلقات بلاوجہ ختم کرتے ہیں اور ان سے اتنا دور ہو جاتے ہیں گو یادہ ہمارے جانی دشمن ہیں۔ اسی طرح بلاوجہ ہم کچھ لوگوں کے قریب تر آنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان میں ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں پھر یہ کہ جو ہنی کوئی صاحب اختیار حاکم زبان کھولتا ہے۔ ہم پوری آواز سے اسکی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حاکم صرف ایک اشارے سے ہماری زندگی ختم کر سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بڑی خصو صیت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں۔ حالانکہ

دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا کیا پرانے
 بادشاہوں نے یہ سماجی قانون اسلئے بنائے تھے کہ ہم اس صورت میں انکی پابندی
 کریں۔ ہم سرکاری لباس پہنتے ہیں۔ پیٹی اور لکس لگا کر قیدی بندر کی طرح کرتے
 ہیں۔ اور جسم پر کہیں کھلی ہو تو ہم مارے تمیز اور آداب کے ہاتھ بڑھا کر کھجی بھی نہیں
 ہدیہ ہے کہ جب بازاروں کی سیر کرتے پھرتے ہوں اسوقت بھی ہم سماج کے سخت گیر
 قوانین اخلاق کے ضابطوں اور آداب کے تقاضوں کی پابندی کرنے پر مجبور ہیں ہماری آنکھیں
 ہماری ناک تک تو دیکھ سکتی ہیں لیکن دور تک دیکھنے کی جرأت و تاب نہیں رکھتیں اگر
 دیکھیں تو دوسرے فوراً یہ کھوج لگانے کی کوشش کریں گے کہ ہمارا مقصد کیا ہے کہیں
 چل پھر رہے ہوں یا بیٹھے ہوں تو ضرورت دعا جت کے لئے بھی معذرت کے بغیر ہم
 جاسکتے۔ اور اونچے افسروں کا تو عجب حال ہے انکے سامنے ہر وقت تلوار منڈلاتی رہتی
 ہے۔ اور لوگوں کی نکتہ چینیاں انکا پیچھا کرتی ہیں۔ سردی گرمی انھیں پریشان کرتی ہے
 مال جمع کرنے کی حرص اور نقصان کا ڈران کے دلوں کو کھائے جاتا ہے۔ اور
 یہی فکر انھیں لے ڈوبتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نہایت عالی درجہ اور عالی ظرف
 لوگ جب حاکم بنائے گئے تو انھیں بھی اسی چکر میں گرفتار ہونا پڑا۔
 اپنے دل اور اپنی روح کو انھیں بندھنوں سے آزاد کرانے کے لئے جنگ
 لیاوزے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ یہی اسکے سفر کے بنیادی وجوہ ہیں۔

اس مرحلے پر شاید یہ اعتراض ہو کہ تاؤ و قانون فطرت کے پیر و دلوں کو کھجی
 وہ تنہا رہتے ہیں اور تنہائی محسوس نہیں کرتے۔ ہجوم میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن
 ہجوم کا شور انھیں پریشان نہیں کرتا۔ یہ لوگ دنیا میں رہتے ہیں مگر دنیا سے بالکل الگ
 جہان بناتے ہیں وہ کسی بندھن کسی قید کے زندانی نہیں ہوتے مگر انھیں آزادی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی

انکے سکون و اطمینان کا حال یہ ہے کہ بہت جلد انکی بائیں نعل سے بید مخنوں کا پورا
 آگ آتا ہے۔ اور کوئی پرندہ انکے بالوں میں گھولنا بنا لیتا ہے اور شانسی اور آنت کی
 معراج یہی ہے۔ برتن مانجھنا اور خاک رو بی کرنا لوگوں کے نزدیک سب گھٹیا درجے کے
 کام ہیں۔ لیکن درویش ان سے گھبراتا نہیں۔ تم بتاؤ کہ تم جو سرکاری زندگی کی قیود سے
 گھبراتے ہو۔ اور ان دیکھے مقامات کا سفر اختیار کر کے جسم کو آزادی دینا چاہتے ہو
 اس کی بدولت کیا تم اپنی روح کو اپنے جسم کا غلام تو نہیں بنا رہے؟“

اور منگ لیا وزے جو اب دیتا ہے۔ جو شخص قانون فطرت کا عارن ہے
 وہ اگر پانی میں کودے تو اس کا دامن تر نہ ہوگا۔ آگ میں کودے تو آگ اسے نہ جلا گی۔
 وہ ٹھوس چیزوں پر ایسے چل سکتا ہے۔ جیسے خلا میں اڑ رہا ہے اور خلا میں ایسے چل سکتا
 ہے جیسے ٹھوس زمین پر چل رہا ہے۔ یہ اس کے لئے بالکل معمولی باتیں ہوں گی مگر میں
 اس قانون فطرت کا عارن نہیں۔ میں اس کا شدید انی اس کا متوالا ضرور ہوں جو
 شخص اس کا عارن ہے اسے اپنے آپ پر پوری قدرت ہوتی ہے اور ساری کائنات
 کے اسرار اسکے لئے حل کردئے جاتے ہیں۔ اسے ہجو م کے شور اور گندگی میں پھینک
 دے تو وہ کنول کے پھول کی طرح نظر آئیگا جو میلے اور گندے پانی میں بھی آگ
 سکتا ہے۔ یہ پانی آسے چھو تا ضرور ہے لیکن اسے گندہ نہیں بنا سکتا۔ چنانچہ
 قانون فطرت رتاؤ کے عارفوں کو دنیا میں کہیں آنے والے کی ضرورت نہیں
 ہوتی۔ مگر میں اتنا اونچا نہیں ہوں۔ میری مثال بید مخنوں کی ہے جو ہوا کے رحم و کرم پر ہوتا ہے
 جب ہوا ساکن ہو تو یہ بھی ساکن ہوتا ہے جب ہوا چلتی ہے تو یہ بھی جھومنا شروع کر دیتا ہے
 میں تو پانی میں ریت کی طرح ہوں اگر پانی صاف ہو تو ریت بھی صاف ہو گی پانی
 گدلا اور مٹیالا ہو گا تو ریت بھی گندی ہوگی۔ کئی بار مجھے پاکیزگی اور شانسی ملتا ہے اور یہ کیفیت پورا

پورا دن رہی ہے لیکن پھر مل بھٹکتے ہیں غائب ہو گئی ہے۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہر چیز کو اسکے حال پر رہنے دوں اور مادی ماحول میں مجھے پریشان نہ کر سکے۔ تاؤ کے قانون فطرت پر عمل کرنا کبھی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اگر شہنشاہ اس پر عمل کر سکتے تو پھر جاؤ تو۔ سو تو جیسے لوگوں کو دینا چھوڑ کر جی کی ہاٹروں میں گوشتہ نشینی کیوں اختیار کرنی پڑی۔ شہزادے اس پر عمل کر سکتے تو ساکی امینی تڑپا لیبہ کی کھوپ میں کیوں دینا گذرہ کرنا پڑا؟ اگر حکومت کے کارندے تاؤ کے قانون فطرت پر عمل کر کے اسی دنیا میں رہ سکتے تو پھر یوآن منگ کو اپنا عہدہ چھوڑ کر کیوں جانا پڑا؟ اسی لئے میں اپنے دل کو دنیوی بندھنوں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ اپنی روح کو ان سے دستگیری دلاتا چاہتا ہوں اور پتھر کیلئے بیفکری کی دنیا میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔

— تاکہ اس کا جواب سن کر اس کا دوست کہتا ہے اچھا اپنے

سفر کے حالات مجھے لکھتے رہنا۔ منگ لیا ورے جواب دیتا ہے۔

جو شخص سفر کرتا ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسکی آنکھیں اور کان اور اسکی

روح آسودہ ہو۔ وہ ملک ملک کی سیر کرتا ہے تاکہ مدعائے حقیقی کو پالے۔ ان علاقوں

اور درویشوں سے ملے جو قانون فطرت پر حاوی ہیں۔ وہ ہوا کے دوش پر سوار ہاں

جاتا ہے جہاں ہوائیں اسے لیجاتی ہیں۔ ان سیاحتوں سے وہ جب واپس آتا ہے

تو وہ حجرے میں بند ہو جاتا ہے۔ اور سکون سے اپنی موت کا انتظار کرتا ہے۔ میں

تاؤ کے قانون فطرت پر حاوی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری روح میرے جسم

کے اندر ہی رہے۔ میں اپنی خوبیوں کو حلم اور نرمی سے جاگ کر کرنا چاہتا ہوں و خلا

بنکر خلا ہی میں ملنا چاہتا ہوں۔ مگر ابھی میں اس پر قادر نہیں۔ میں نے کوشش کی تھی

کہ میری روح میرے جسم کا ساتھ دے۔ مگر میری روح میرے جسم سے کہیں غائب ہو گئی

میں نے اپنی خوبیوں کو حلیم اور نرمی سے اجاگر کرنا چاہا۔ مگر میں یکا یک جذباتی
 طوفانوں میں گھر گیا۔ میں نے چاہا تھا کہ نصفا میں تخیل ہو جاؤں۔ مگر لطافت کی
 بجائے مجھ میں کثافت پیدا ہو گئی۔ سخانتی اور سکون ڈھونڈنے سے نہ ملا تو میں نے
 باہر کی دنیا۔ اپنے گرد پیش کا سہارا لیا کہ شاید اسی طرح روح کو سکون ملے مجھے
 خوشی اپنے دل میں نہ ملی تو میں نے خارجی دنیا سے ایک خوبصورت منظر مانگا لیا
 کہ میں خوش ہو سکوں۔ اسی لئے میرے سفر عجیب و غریب تھے۔

ب سفر کا طریقہ

میں اپنے ایک دوست کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتا ہوں جسے پہاڑوں کے
 کہروں سے بڑی محبت ہے۔ ہم دونوں کے پاس ایک ایک کنڈل ہے۔ ہم نے لمبے
 کرتے پہن رکھے ہیں۔ اور ہمارے پاس ایک سو روپے نقد ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ
 رقم کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم ضرورت کے وقت کام آنے کے لئے بس سو روپے ہی
 رکھتے ہیں۔ شہروں اور دیہات سے گزرتے ہوئے ہم مانگ کر گزارہ کرتے ہیں۔
 ہم سرخ ڈیوڑھیوں سفید مچلوں۔ تاؤ کے مندروں اور کچاریوں کے بھونپڑوں کے گگے
 ہر جگہ خیرات کے لئے صد کرتے ہیں۔ یہ خیال بھی ضرور کرتے ہیں کہ مانگا کیا جائے۔ مثلاً
 ہم صرف چاول مانگتے ہیں۔ شراب نہیں۔ خیرات میں صرف بنزیاں طلب کرتے ہیں۔ پوشت
 نہیں مانگتے۔ لہجہ عاجزی کا ہوتا ہے۔ مگر اس میں کوئی دکھ درد نہیں جھلکتا۔ لوگ
 اگر دیدیں تو بھی ہم چلے جاتے ہیں۔ اور اگر نہ دیں تو بھی ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مانگنے
 کا سارا مقصد تو یہ ہے کہ ہم بھوک اور فاقے کو اپنے سے دور رکھیں۔ اگر ہم سے لوگ
 سختی اور دشمنی سے پیش آتے ہیں تو بھی ہم ان سے جھٹک کر رخصت ہوتے ہیں۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس پاس کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں سے ہمیں کچھ خیرات مل سکے پھر ہم مجبور ہو کر اپنے سو روپے میں سے ایک دو روپے خرچ کر ڈالتے ہیں اور جب بھی ممکن ہو سکے یہ سو روپے پھر پورے کر لیتے ہیں لیکن جب تک بہت مجبوری نہ ہو ہم اس میں سے کچھ خرچ نہیں کرتے۔

”سفر میں ہماری منزل کوئی نہیں۔ جہاں جی چاہا ٹھہر گئے۔ ہمارے سفر کی رفتار بہت ہی دھیمی ہے۔ کچھ تیر نہیں کہ دن بھر میں ہم کتنے میل طے کر لیتے ہیں۔ مگر زیادہ سفر نہیں کرتے کہ کہیں مارے تھکن کے چور ہو کر رہ جائیں۔ راستے میں اگر کہیں پہاڑ یا ندی نالے آجائیں تو چھپے۔ چٹانیں۔ مرغابیاں اور پہاڑ کا پرندے ہم پر جیسے جادو سا کرتے ہیں۔ ہم دریا کنارے یا کسی ٹاپو میں کوئی بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور پتھر پر بیٹھ کر فاصلوں پر نظریں جمالیتے ہیں۔ سفر کرتے ہوئے راستے میں اگر لنگر ہارے پھیرے دیہاتی لوگ یا بوڑھے کسان مل جائیں تو ہم انکا نام نہیں پوچھتے۔ نہ اپنا نام بتاتے ہیں نہ کبھی موسم ہی کی بات معلوم کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے دیہاتی زندگی کی دلفریبی پر بات کرتے ہیں۔ بس کچھ دیر باتیں کر کے ہم خوشی خوشی آگے چل دیتے ہیں۔

سخت سردی اور سخت گرمی میں ہمیں سائے یا پناہ گاہ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ کہیں موسم اپنا برا اثر نہ ڈالے اگر ہم سڑک پر جا رہے ہیں تو دوسروں کو پہلے راستہ دیتے ہیں کشتی میں دریا پار کرنا ہے تو دوسروں کی کشتی میں پہلے سوار ہونے دیتے ہیں لیکن اگر طوفان آ رہا ہے۔ تو ہم دریا پار کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہاں اگر دریا پار کرتے کرتے طوفان آجائے تو ہم اپنے دلوں کو تسلی دیتے ہیں۔ اور مددگی کے ناز کو سمجھتے ہوئے اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں اگر اس طوفان کی وجہ سے ہم ڈوب جائیں تو طاہر ہے خدا کی مرضی یہی ہوگی۔ فکر مندی اور پریشانی ہمیں کب تو

نہیں سکتی۔ چنانچہ اگر ہم سلامت پار نہ اتیریں گے تو سمجھئے ہمارا سفر ہمیں ختم ہو گیا اور اگر خوش بختی سے ہم بچ گئے تو ہم پہلے کی طرح پھر چل کھڑے ہونگے۔ اسی طرح رات میں ہمیں کوئی جھگڑا لو جو ان مل جائے یا راہ چلتے چلتے اس سے بھڑ جائیں تو ہم معافی مانگ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اگر دوسرا فرق ہماری معذرت قبول نہ کرے اور لڑائی جھگڑا اگلے پڑ جائے۔ تو ہمارا سفر رک گیا۔ لیکن اگر اس جھگڑے سے ہم بچ نکلے۔ تو ہماری راہ نور دی پھر شروع ہو جائیگی۔ ہم دونوں میں سے اگر ایک ساکتی بیمار ہو جاوے تو ہم رک جاتے ہیں۔ تاکہ بیمار ساکتی کی تیمارداری کی جاسکے۔ صحت مند ساکتی علاج کے لئے رقم مانگ لاتا ہے۔ اور دل میں تشویش کو پاس نہیں ٹھکنے دیتا۔ وہ اپنے من کے اندر دیکھتا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا۔ چنانچہ اس اعتماد کی بدولت ساکتی کسی سخت بیماری معمولی بیماری میں بدل جاتی ہے۔ اور یہ معمولی بیماری بہت جلد ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اگر قسمت کا کھیا ہی ہے کہ ہمارا وقت آگیا تو سمجھ لو کہ سفر ختم ہو گیا۔ لیکن اگر بچ گئے تو حسب سابق ہمارا سفر پھر شروع ہو جاتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہماری راہ نور دی میں پولیس کے سراغ رساں اور سپاہی ہمیں مشتبہ سمجھیں۔ اور ہمیں جا سوس سمجھ کر گرفتار کر لیں۔ ایسا موقع آنے پر ہم کبھی تو حیلہ لاکے سے کام نکالتے ہیں۔ کبھی خاص سے اگر ان کے جنگل سے نکل سکیں تو سفر ختم ہو گیا۔ اور اگر بچ گئے تو سفر پھر شروع ہو جاتا ہے۔

راتوں کو ہم کسی جھونپڑے کسی غار میں ٹھہر جاتے ہیں اسی جگہ نہ تو کسی منڈکی ڈیوڑھی میں پڑ رہتے ہیں کسی شخص کے گھر کے باہر سو جاتے ہیں یا اونچے درختوں کے نیچے رات گزار لیتے ہیں۔ کون جانے کہ پہاڑوں کی رو میں۔ شیر اور بھیرے جھگڑ کھوج میں لگے رہتے ہوں۔ مگر ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔ اور میں تو خیر کوئی گزند نہیں

بہنچائیں۔ مگر شیروں اور بھیڑیوں سے اپنا بچاؤ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ چونکہ قسمت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے ہم اپنا معاملہ فطرت کے اٹل قانون پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنا چہرہ مہرہ تک اسکا رنگ رد عن تک نہیں بدلتے (چھیننے کے لئے مصنف) اگر جنگلی جانوروں کا کھا جائے گا تو گویا تقدیر میں ہی لکھا ہوا ہوگا۔ اور اس طرح ہمارا سفر بھی ختم ہوگا۔ اگر ایک اور چاروں ہمارا سفر ہوگا۔

ج۔ پائیزہ بلندیاں

و میری منزل کیا ہے؟ میں عام طور پر پانچوں مقدس پہاڑوں۔ اور چاروں مقدس دریاؤں کو دیکھنے جاتا ہوں۔ ان تیرھوں کی یا تیرا بھی کر رہا ہوں جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہیں۔ ان کے علاوہ میں شمالی اور وسطی چین کی توریاستوں کے مشہور پہاڑ اور دریا دیکھنے کیلئے بھی سفر کرتا ہوں۔ لیکن عام طور پر میں توریاستوں کے صرف ان علاقوں میں جاتا ہوں جہاں سے انسان کے قدم گزرے ہوں۔ جہاں تک چین کی آسمانی سلطنت سے باہر کے علاقوں کا تعلق ہے۔ مثلاً ہمالیہ پہاڑ چینی سمندر کے دس چھوٹے اور دس بڑے جزیرے تو میں شاید ہی جگہیں دیکھنے جا سکوں کیونکہ پرواز کے لئے پر میرے پاس نہیں ہیں۔ سیاحت کے دوران میں مجھے امید ہوتی ہے کہ میں ان شائقین علم سے ملوں جو پہاڑوں میں اور پھیلوں کے کنارے رہتے ہیں۔ یا ان صوفیہ سے ملوں جو غاروں میں چلکشی ہیں۔ لیکن جہاں تک زندہ جاوید ہستیوں کا تعلق ہے میں ان سے شاید ہی مل پاؤں کیونکہ خود میرا جسم کافی ہے۔ امر نہیں۔

جب میں پانچوں مقدس پہاڑوں پر جاتا ہوں۔ تو میں آسمانی ہواؤں سے بلبند چوٹی پر کھڑا ہو کر چاروں سمندروں سے آگے نظر دوڑاتا ہوں۔ اور گرد آن گنت

چوٹیل کیڑوں کی طرح سر اٹھائے نظر آتی ہیں۔ ان گنت دریا بل کھاتی ہوئی دھاریوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور ان گنت درخت بند گوبھی کے پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اس بلندی پر کھٹاں میرے کالر سے لپی پڑتی ہے، سفید بدمیاں میری آستین سے کھلتی ہیں اور شاہین اتنے نزدیک معلوم ہوتے ہیں کہ اگر ہاتھ بڑھاؤں تو انھیں چھو لوں۔

سورج اور چاند میرے رخساروں کو چھوتے ہیں اور گنجر جاتے ہیں۔ ایسی بلندیوں پر میں بہت ہی لمبی آواز میں بات کرتا ہوں۔ اس ڈر سے نہیں کہ پہاڑوں کی روحیں ناراض ہوں گی۔ بلکہ اس ادب سے کہ خدائے برتر اپنے تخت پر بیٹھا کہیں میری آواز نہ سن لے۔ اور آسمان کی چھت ہوتی ہے، فضا کی میں خبار کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور نیچے رعد کے کڑکے اور بارش کے جھلے اور طوفان دریا من تار یک ہوتی ہے۔

لیکن اس بلندی پر ہمیں رعد کی گرج یوں سنائی دیتی ہے جیسے کوئی بچہ غول غساں کر رہا ہے۔ اس بلندی پر میری آنکھیں روشنی سے چندھی جاتی ہیں اور میری روح زماں دمکا کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں وہ درد کا سفر کرنے والی ہواؤں کے دوش پر سوار ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کہاں جاؤں۔ سورج مغرب میں چھپ جاتا ہے اور مشرقی افق کے بطن سے چاند ابھرتا ہے تو بادلوں کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ آسمان پر قرمزی اور لاجوردی روشنی کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کی آن میں دور اور قریب کی چوٹیاں گہرے رنگوں کا چولہا تار کر باکل ہلکے رنگوں میں نہا جاتی ہیں۔

یہ پھر آدھی رات کو عجیب سماں ہوتا ہے۔ میں مندروں کی گھنٹیوں کی آواز اور شیر کی گرج سنتا ہوں۔ پھر ہواؤں کی سائیں سائیں کان میں آتی ہے۔ بڑے مندروں کا بڑا اور ڈاڑھ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ میں کپڑے پہن کر باہر آتا ہوں اور نکلتے ہی خسرو گوش کی روح چاند پر نظر پڑتی ہے۔ اوپر کی ڈھلاؤں پر بچی کھچا برف کی تہیں بھی باتی ہیں۔

مات کی ہلکی ہڈیوں کو بے شکل تو دونوں کی صورت میں ڈھال دیتی ہے۔ دُور کے پہاڑ دھندلے
 دھندلے سی لکھنویوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت میں غم سے کھڑا ہوں کہ
 میرا جسم ٹھنڈی ہڈیوں میں گھل گیا ہے اور ساری جسمانی تلاشیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ پھر
 میان مقدس پہاڑوں کے دیوتوں کو دربار لگاتے دیکھتا ہوں جہاں کمتر درجے کی روحیں باریاب
 ہو رہی ہیں۔ ہر طرف شامیاند کے دل سے دل ہیں اور فضا روشن چمکی اور لوبت نقلوں
 کے نقوش سے گونج رہی ہے۔ محل کی چھتیں بادلوں کی چادر میں بلبوس ہیں اور کہروں کے ٹکیرے
 ہر طرف بکبت ہیں۔ اس سے محل یا دربار کی ہر چیز، ہر خط گہرا اور واضح بھی ہے دھندلا
 اور نامعلوم بھی۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور کبھی منظر
 آنکھوں سے دور معلوم ہوتا ہے۔ آہ! دیوتوں کا شگیت سنا کتنی بڑی سعادت ہے لیکن
 ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا یکا یک اسے ختم کر دیتا ہے!

ان پنج مقدس پہاڑوں کے علاوہ کچھ اور مشہور پہاڑ بھی قابل دید ہیں۔ مثلاً
 لہ زے منگ، چن بوا، کوا سوانگ، چن سنگ، او وپی، چن نان، لوفو، مرشاں
 وغیرہ اور ایسے تیرتھ تو ان گنت ہیں جن میں پر یوں اور روجوں کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ میں
 ان تیرتھوں کو دیکھنے کے لئے لکڑی کی کھڑا دیں اور بانس کی چھڑی کے کزنکلتا ہوں۔ سائے
 تیرتھوں کو تو نہیں سکتا لیکن جتنیوں کی بھی یا ترا ہو جاتی ہے کر لیتا ہوں راستے
 میں چشمے کا پانی اور بنا سستی کھالی لیتا ہوں۔ کوئی اونچی اور دشوار گزار چوٹی آجاتی
 ہے یا کوئی معلق گھاٹی راستہ روک لیتی ہے جس پر کوئی آدمی چڑھ نہ سکا ہو تو میں اپنے آپ
 کو رستے سے باز کر کسی نہ کسی طرح چڑھ ہی جاتا ہوں۔ پتھر سے کسی ٹوٹے ہوئے پل یا کسی
 پڑانی عمارت کے کھلے پھانک پر پہنچ کر میں رکتا نہیں بلکہ بے جھک — اندر
 چلا جاتا ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی گہرا غار سامنے آجائے جس میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا

ہو اور صرف اس کی چھت میں سے روشنی کی ایک لکڑی کرن کسی درز سے اندر آ رہی ہو تو میں
 تنکوں وغیرہ کی مشعل جلا کر بے خوفی سے اس غار میں داخل ہو جاتا ہوں۔ خیال یہ
 ہوتا ہے کہ شاید اس غار میں تالون نبطرت تار کا کوئی عارف کامل مل جائے یا شاید یہاں
 کئی امر لوٹ لگی بے یا شاید یہاں عارفوں کی ہڈیاں مسلجائیں جو اس دنیا کو چھوڑ چکے
 ہیں۔

میں مشہور دریاؤں اور چشموں کو دیکھنے بھی جاتا ہوں۔ پانی کے گہرے ذخیبے
 پھلیوں اشہوں اور آبی درختوں کے ٹھکانے ہیں۔ ہوا ساکن ہو اور پانی آہستہ کی طرح ساکتا
 ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سماں اشیا کون سے سو رہا ہے۔ جب چلتے چلتے چنانچہ روشنی
 میں پانی کا رنگ آسمان کے رنگ میں گھل کر ایک ہو جاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب
 آدھوں کے باہر شاہ کی شہزادی اور دریاؤں کی ملکہ اپنی پاکلی میں سوار باہر آئے گی۔ اس کے
 احم میں ہنس رہی ہوگی وہ زمین ریشم میں مسلج ہوگی اور اس کے زریں پاپوش چمکتی ہوئی
 لہریں کودتے ہوں گے۔ یہ جوں کی لمبے گزرتا رہے گا پھر نظروں سے غائب ہو جائیگا
 بائے کتنی ٹھنڈی کتنی خشکی ہوتی ہے اس وقت!

یا پھر وہ وقت ہے کہ طوفان ہوائیں پانی کو کوڑے سے ملتی ہیں اور پھر شہ لہریں ٹھٹی
 ہیں۔ ہمیں تپا چل جاتا ہے کہ سمندر کا عفریت آتی ہے یہ کی سورج سے مل کر یہ طوفان دٹھا
 رہا ہے۔ پھر یہ پھیلی ہوئی دھرتی کی طرح گھما دی جاتی ہے۔ یہ ہماری گھر تنکوں کی
 طرح کانپتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بوڑھا اژدھا چانگ اپنے نو بیٹوں کو ساتھ
 لے کر زمین سے آسمان کو پر لانا کر رہا ہے۔ وہ سماں کتنا ہیبت کتنا پر عظمت ہوتا
 ہے۔

اگر ہمیں عمدہ لباس پہننے والی عورتوں کا حسن پسند ہے تو پھر ہانگ چاڑ کی نثر

جھیل سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ جھیل کے کنارے بید بخنوں کی قطاریں ہیں اور آلوچے کے لگنے پانی میں اپنا عکس ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوا تھا کہ شہنشاہ کی محسوسہ بی بی اپنا سنگار وہاں کھوئے سنگار کر رہی ہے۔ پھر کنول کے پھولوں پر تازگی کی بہاریں آتی ہیں۔ اور چادروں طرف نازک سی باس ہواؤں میں رچ جاتی ہے۔ کنول کے پھولوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی چو اور ہوتے جیسی حسنیاتیں ابھی ابھی منہ پر ہانپھوٹی ہوئی پانی سے نکلی ہیں۔ آسمان صاف ہو اور سورج چمک رہا ہو ساری جھیل پر خیر کن عرس کی تابانی ہوتی ہے۔ اور صبح صبح گوگٹ اپنے اپنے مینار کی باکوں سے جھک کر جھیل کو دیکھتے ہیں۔ اور شام کو جھیل میں رنگین پتلا لعل والی کشتیاں چلتے ہیں تو ہر طرف کیوں کیوں کا افسانوی ہتیم چھا جاتا ہے۔ جب جھیل پر دھند چھا جائے بارش تلی کھڑی ہو اور پہاڑیاں بھڑے بادلوں میں چھپ جائیں تو اس وقت بھی بے پابن خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کی لاکھی شہر کی تکی چٹن پر بل آگئے ہیں۔

د. داپسی

پھر ننگ لیا و زے آہت آہت چلتا ہوا اسی ننگ کے چھ پلوں سے ہوتا ہوا تیان چو اور ننگ چاؤ پہنچتا ہے۔ یہاں وہ چند قدیم فاضلوں کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ پھر بادلوں میں چھپے ہوئے کسی غار میں روشنی بگلیے (ننگ کا کھر ج دگاتا ہے) اس کے بعد پوٹو کا نمبر ہے جو ننگ لیا و زے کا روحانی گھر ہے کیونکہ اسی جگہ رم کی ریلوے کا مندر ہے۔ ننگ لیا و زے یہاں کنول کے پھول لینے اور پھیلے ہوئے سندر کو دیکھنے جاتا ہے جو بہت بڑی مسرت کا سرچشمہ ہے۔

اس طرح ماہ لارڈی اور دشت پھیائی میں منگ یا ڈنڈے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ خوش ہے اور پاپیادہ شیلر دوں ہزاروں میل طے کر ڈالتا ہے۔ اور اگر کسی جگہ وہ کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو کالوں کو خوش آئند محسوس ہو یا آنکھوں کو کھجلی معلوم ہو تو وہ وہاں دس دن کے لئے ٹھہر جاتا ہے

وہ کسی منڈ میں مردانہ شلاٹہ پر غلبہ پانے کے لئے آسن جھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مانگ چاؤ کے پانچ ہزار لفظ — کیا یہ فلسفہ نہایت لطیف اور بے حد دقیق نہیں — تاؤ (قانون فطرت) کی کتابیں — فوسانگ کی کتاب زبر جہد — یں نو کی کتاب الاثنان — کیا ان سب کے اسرار منگ یا ڈنڈے پر کھلے نہیں؟ احکم الحاکمین اس کے زہر تیر دہن کی رہنمائی کرتا ہے اور ہاتھ باندھ اس کی روحانی حوائش کاراں سبر ہے۔ چنانچہ منگ یا ڈنڈے جب بدلتی ہوتی دینا کی علت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے گیان و حیان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا اس کے راہبر اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

بلوڈھ میں ہب ہاتھ باندھ کا سنہری بت رکھا ہے جس کے گرد لوزانی ہالوں کا حلقہ ہے۔ شمعیں جلادی گنگھی ہیں اور لوہان کا نور شہور وار دھواں ہوا میں پھیل رہا ہے۔ تاؤ کے پوجاری پھونس کی چٹانوں پر درجہ بدرجہ بیٹھے ہیں۔ وہ چائے پی رہے ہیں پھیل کھا رہے ہیں اور قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو اپنے سانس روک لیتے ہیں اور پوری شانہ میں کھو جاتے ہیں۔ بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آسن سے اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ چاند درپہوں میں سے جھانک رہا ہے، ساری کائنات خاموشی میں کھو چکی ہے، مندر کا دربان اپنی پیشانی زمین پر رگڑ رہا ہے اور ملازم رٹکا گئیٹھی کے پاس پڑا سو رہا ہے — ایسے موقع پر کوئی مادی خیال فرس

میں کیڑا آسکتا ہے؟

باہر کھلی زمین پر جنگ باندھ چکا ہے کہ ویت میں نیچے دیواریں بچے بھینڑوں
 کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور ان پر سر کھینڈنا چھین ہیں۔ تند و تیز ہوا میں چل
 رہی ہیں اور سورج جگلوں پر لگی ہوئی دھوپ بکھیر رہا ہے۔ ماں موٹی اور بچہ بکریاں
 پہاڑی چراگاہوں سے باڑوں کو لپٹ رہی ہیں اور کھوکھے پرند کھیتوں پر منڈلاتے اچھے
 شور مچا رہے ہیں۔ ایک لڑکا کان پچھڑکے کپڑے پہنے ہاں اٹھاتے شہوت کے
 درخت کے نیچے دھوپ تاپ رہا ہے۔ ایک لڑکی صورت سس کا کٹورہ ہاتھ میں کھانے
 آسے روٹی کھلا رہی ہے۔ سارا منظر ادا س ہے ہم بھی ادا س ہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا
 ہے کہ ہر چیز ایک تصویر کی طرح ہے ساگر کوئی تاؤ کا پارہ سفر میں ایسے مناظر کو معمولی
 سمجھتوں آؤ کھلے سفر ہی کرنا نہیں چاہیے

پھر کوئی بڑا شہر آتا ہے جہاں بازاروں میں کھوے کھوا چھل رہا ہے اور
 گاڑیاں اور گھوڑے درڑے پھر رہے ہیں۔ میناگ یا اونٹے گاتا ہا جا رہا ہے۔ لوگوں
 کو دیکھتا ہے دکانداروں 'قصائیں' موسیقاروں، جماریوں اور کھلاڑیوں کا مشاہدہ کرتا ہے
 جب اس کا دل چاہتا ہے تو وہ کسی ہوٹل میں داخل ہو جاتا ہے۔ تیز شراب سوکھی پھسل
 اور پکی سبزیوں کا آڈر دیتا ہے۔ اور وہ ادا س کا ساتھی مل کر کھاتے ہیں اور شراب
 پیتے ہیں۔ جب نشے کی لہر اٹھتی ہے تو دونوں امر بوٹی کا گیت گاتے ہیں اور طمانیت
 دسکن کی نظروں سے دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ لوگ ان دونوں کو دیکھ کر حیران ہوتے
 ہیں کہ یہ دو شخص کچھنے حالوں بھی اتنے خوش اسے دیکھش نظر آتے ہیں۔ انہیں شک گزرتا
 ہے کہ یہ دونوں انسان نہیں بلکہ پریان ^{ہیں} جو ان لوگوں کا قلب اختیار کر کے یہاں
 آگئی ہیں۔ سمٹوڑی ریر اسی طرح سورج میلانا نے کے بعد دونوں ساتھی آکر چل

رہتے ہیں۔

اور گودھڑ بڑے پتھاروں والے محلوں میں امیر الامرا اور شاہانے یا بڑے بڑے جہد
دار جشن مناتے ہیں قیمتی پلیٹوں میں کھانا لایا جا رہا ہے اور منیر پر حسین گورتوں کا نجوم
ہے۔ ہال میں آرکسٹرانج رہا ہے اور نٹوں کی جھنکار باروں کو حیرتی ہوئی آساننگ
پہنچ رہی ہے۔ باہر پھاٹک پر بوڑھے اور بان بید کا ڈنڈا لے کھڑے ہیں۔ سنگ بیادے
پھاٹک کے اندر جا کر کھانے کے کمرے میں پہنچا ہے کہ کھانا مانگے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی
ہیں۔ اور وہ بلند آواز میں حاضرین سے بڑی تمکنت سے کہتا ہے — "حاضرین والا۔
ذرا یہ شور بند کیجئے اور پھولوں پر شبنم کے قطروں والا گیت سینئے جسے تاؤ کا پر حیرت پر د
پیش کرتا ہے۔

پھولوں پر یہ اداس کے قطرے
کیسے چمکتے ہیں دیکھو!!
تیز ہوا کا خوف نہیں ہے
آنے والی کل سے ڈرو!
پورب اور رواں ہے دریا!
کہکشاں جاتے پھیم کو!
محل مناسے کل تھے جس جا!
آج وہاں پر کھیتی ہو!
اک منگم، اجناسی کل سے
آج کا یہ دن اچھا ہے!
جام بدست گزارو اس کو۔

عیش کرو! بس عیش کرو!

پھولوں پر یہ اوس کی بوندیں
 دکھو کتنی تباہاں ہیں!
 ان کی آب سے ان کی ہستی
 جیسے پیاسے پیاسے موتی!
 مسج کی صنومیں لرزاں ہیں!
 کتے بھیڑ جگل بن بھی!
 آبادی کے گورستان ہیں!
 دیوان رات، ہوا کی چینیخیں
 آٹو بونے، گپڈڑ روئیں!
 تند ہوائیں پتے روئیں
 چٹنے ان کو سمو لیں!!
 راج محل پر کائی جمی ہے!
 عیش کرو! بس عیش کرو!

منگ بیاز نے جب گیت نظم کیا تو ایک بہان بھڑک اٹھا۔ بلا "یہ کون تاڑ
 کا پجاری رنگ میں جنگ ڈلنے آٹپکا۔ دو بے روٹی کا ایک ٹکڑا اور اسے
 رخصت کرو منگ۔ بیاز نے نے روٹی لے لی اور چلا گیا۔ لیکن ایک دم سے بہان
 نے ملازم سے کہا "جلدی جاؤ اسے واپس بلا کر لاؤ۔" پہلے بہان نے کہا
 "مگر یادہ خواہ مخواہ بد مزہ کر رہا تھا ہمیں۔" اس نے میں نے اسے روٹی دیکر

بھیج دیا۔ اب اُسے واپس بلا کر کیا کرنا ہے؟ دوسرے مہمان نے کہا، معلوم ہوتا ہے کہ فالانِ فطرت کے اس پیر و میں کچھ غمیر معمولی باتیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ واپس آئے تو غور سے اُسے دیکھوں اور پہلے نے کہا، "راہ وہ تو ایک معمولی بھکاری ہے۔ اس میں غمیر معمولی بات کیا ہوگی، اُسے تو سچا کھچا کھانا چاہیے اور بس اتنے میں ایک مہمان کہتا ہے۔ جو گیت اُس نے گایا، اُس سے تو پتا نہیں چلتا کہ وہ بس ایک معمولی بھکاری ہے۔"

اس موقع پر ایک رتھ صدمہ لڑکی جس نے سُرخ ریشم کا شفاف لباس پہن رکھا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور کہتی ہے: "میری ناقص رائے میں یہ شخص، انسان نہیں تھا ۲ آسمان کا فرشتہ تھا کہ زمین پر آگیا۔ اس کی آنکھوں اور اس کی پیشانی سے نفاست ہو گیا ہے۔ اس کی آواز صاف اور پاٹھار ہے۔ اُس نے صرف بھکاری کا تو بہرہ و پ بھر رکھا ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عالی خاندان کا آدمی ہے۔ جو گیت اس نے گایا وہ بھی خودصورت اور پر معنی ہے۔ یہ گیت قافی ان لفظ کے گیتوں سے نہیں، آسمانی گیتوں سے لگاتا ہے۔ کون بھکاری ایسا گیت گاسکتا ہے بھلا؟۔ میں پھر عرض کروں گی کہ یہ شخص اصل میں فرشتہ ہے جو انسانی پہرہ میں ہمارے در بیان آیا۔ آپ لوگ اسے ضرور واپس بلائیے تاکہ اُسے ہسم کھو نہ بیٹھیں۔"

آخری مہمان نے جواب دیا، "اس لمبی چوڑی بات کا نایبہ؟ دو گھونٹ شراب کی بات ہے۔ ہم اُسے واپس بلا تے ہیں اور شراب پلاتے ہیں بس معلوم ہو جائے گا کہ وہ بازاری آدمی ہے یا عالی نسب ہے۔"

سُرخ لباس والی حسیہ نہیں مانتی۔ وہ پھر کہتی ہے "خیر! میں تو یہی کہوں گی

کہ ہم لوگوں کی قسمت میں نہیں تھا کہ ایسی جادوؤں مخلوق سے جس بھر کر مل لیتے پھر بنیاد والی ایک حسینہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور کہتی ہے "آپ حضرات مجھ سے شرط لگائیں گے۔ کوئی جا کر تاؤ کے اس پچیداری کو واپس بلا لے۔ اگر وہ عارفِ کامل ثابت ہو۔ تو وہ لوگ شرط جیت گئے جو اسے خیر معمولی انسان کہتے ہیں اور اگر ہم نے دیکھا کہ وہ معمولی بھکاری ہے تو وہ حضرات شرط جیت جائیں گے جو اسے معمولی انسان کہتے رہے ہیں۔" سب لوگ اس تجویز پر اتفاق کرتے ہیں۔

اس پر یہ لوگ ایک خادم کو منگوا کر لائے کیلئے بھیجتے ہیں مگر وہ غائب ہو چکا ہے اور واپس آ کر جب خادم ساری محفل کو یہ بتاتا ہے تو صریح لباس والی لڑکی کہتی ہے "انسوس" وہ جادوئی مخلوق ہمارے ہاتھ سے نکل گئی! کہاں ہے۔ ابھی وہ دروازے سے باہر گئے تھے اور یکایک بالکل غائب ہو گئے۔"

اپنی دھن میں منگ لیا دئے چھڑی اٹھائے، ٹہلتا ٹہلتا شہر کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس سفر میں کوئی درجن بھر شہر میں کے پاس سے ہو کر نکلتا ہے مگر کسی شہر کے اندر نہیں جاتا۔ آخر وہ ایک ایسے شہر کے قریب پہنچتا ہے جس کی فصیل کوستان کے ساتھ ساتھ استوار ہے فصیل پر نہایت عمدہ برج اور دہلے بنے ہیں۔ شہر میں بڑے بڑے مندر سراٹھائے کھڑے ہیں اور پانی کا بہت بڑا تالاب ہے۔ یہ بہار کا نہایت خوبصورت دن ہے۔ شاندار درختوں پر پرندے نغمہ ریز ہیں اور ہر طرف پھول کھلے ہیں۔ شہر کے مرد عورت نئے کپڑے پہنے خوبصورت گاڑیوں میں سوار یا چولہار کا ٹھیوں والے گھوڑے پر چڑھے بہار کا جشن مناتے ہیں شہر سے باہر تے ہیں کچھ لوگ اونچے پیڑوں کے سائے میں مجلسِ جمائے لیا ہے ہیں۔ کچھ نے خوشبودار لمبی گھاس پر تالین بچھا رکھے ہیں۔ کچھ لوگ اونچے میناروں پر نظارہ کرنے چڑھے

ہوتے ہیں۔ کچھ نے ہریلی سہی کشتیوں پر سیر کی ٹھان رکھی ہے۔ بہت سے لوگ شانہ
شانہ سواری کرتے پھول دیکھنے جاتے ہیں۔ کچھ من چلے ہاتھوں میں ہاتھ دے گاتے پھرتے
ہیں۔ منگ لیازے فرط مسترت سے اذ خود رفتہ ہجرت ہے اور بہت دیر تک وہاں پھرتا
رہتا ہے۔

۴ مخر روشن چہرے والا ایک عالم لہا پختہ پہنے، وقار اور تکنت سے چلتا ہوا
قریب آتا ہے اور منگ لیازے کے سامنے آداب بجالا کر کہتا ہے "کیا عارف بھی
بہار کا جشن دیکھنے تشریف لائے ہیں؟" میرے ساتھ چند دوست ہیں جو وریا کے پار
اس چھوٹے سے برج کے قریب چیری کے درختوں کے سائے میں پک ٹکا منگ ہے
سب خوش باش لوگ ہیں۔ مگر آپ شریک محفل ہوں تو بڑی بند پر رہی ہوگی۔"
منگ لیازے خوشی خوشی اس نوجوان عالم کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ وہاں پہنچ
کر دیکھتا ہے کہ چھ سات اہل علم لوگ کہ سب کے سب خوبصورت اور لاجوان ہیں، بیٹھے
ہیں۔ پہلے نوجوان نے ان سب سے تعارف کرایا ہے وہ کہتا ہے "دوستو یہ
بہار کا جشن ہے اور راتے میں مجھے تازہ کے پر رمل گئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ عالی نسب
ہیں اس لئے میں یہ تجویز کر رہا ہوں کہ انہیں بھی عے لوشی میں شریک کر لیا جائے۔
سب حاضرین اتفاق کرتے ہیں اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں منگ لیازے
سب سے آخر میں بیٹھتا ہے۔ شراب کے دور چلتے ہیں۔ اور کافی دور چلنے کے بعد ہر
شخص لٹے کی ترنگ میں جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ باتیں زیادہ دلچسپ اور خوبصورت ہوتی
جاتی ہیں۔ یہ لوگ مختلف لوگوں کے بارے میں امر کے بارے میں چست فقرے اور
کڑی پھبتیاں کہتے ہیں۔ کوئی نظریں پڑھ کر سنا تا ہے جن میں بہار کا رنگ و تاب ہے
تو کوئی دربار کی سیاست پر راتے نئی کرتا ہے۔ کوئی پھول چھنے کے گیتوں کی تان

اڑتا ہے تو کوئی پہاڑوں اور جنگلوں کے خاموش سُن کی تعریف میں قصیدے پڑھتا ہے
 غرض باتوں کا دھارا پورے نورشور سے رواں ہے اور ہر شخص فقرہ بازی میں دوسرے
 پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر منگ لیا وزے چپ چاپ بیٹھا چادوں
 کھاتا رہتا ہے۔ آخر وہ پہلا نوجوان بول اٹھتا ہے "قانونِ فطرت کے عارف کی باتیں
 بھی سننی چاہئیں دوستو! اور منگ لیا وزے کہتا ہے "آپ حضرات جو لاناٹی اور نکتے کی
 باتیں کر رہے ہیں میں ان سے خوب محفوظ رہوں گا۔ بلکہ بہت سی باتیں تو اتنی اعلیٰ پایے
 کی ہیں کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آئیں۔ بھلا اس لکھو میں ایسا حقیر شخص کیا حصے
 سکتا ہے۔"

کچھ دیر بعد حاضرین مجلس دھان کے کھیتوں کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ راستے
 میں کچھ لوگ پھول توڑتے ہیں تو کوئی بید بخنوں کی شاخیں توڑتا ہے۔ ہر طرف بزرے
 کی بہارا اور بہار کا من ہے۔ ہر طرف شائق اور رومی دود کی جھاڑیاں پھولوں سے
 لدی ہوئی نظر آتی ہیں۔ منگ لیا وزے سب سے الگ ایک پہاڑی پگڈنڈی پر ہو
 لیا ہے اور بڑی دیر کے بعد واپس آتا ہے۔ ایک صاحب پوچھتے ہیں آپ اکیلے
 کیوں گئے تھے؟ منگ لیا وزے جواب دیتا ہے "میں اکیلے تو نہ تھا، میرے ساتھ دو
 سنگمڑے اور ایک شراب کی بوتل تھی پھر میں پرندوں کا نغمہ سننے گیا تھا، اس
 پر ایک کہتا ہے۔ "بھئی یہ شخص عجیب باتیں کرتا ہے اور واقعی عجیب آدمی معلوم ہوتا
 ہے۔" منگ لیا وزے اس کے جواب میں بڑے انکسار سے کہتا ہے "بندہ کس قابل
 ہے" سب آپ کی ذرہ لوانی ہے۔

مجلس پھر جہتی ہے ایک شخص کہتا ہے "اس پک نک کے بعد کچھ نظیں لکھے
 بغیر گھر جانا کفر ہے دوسرا شخص تائید کرتا ہے۔"

بہت جلد ایک نوجوان یہ نظم مکمل کیے پڑھتا ہے۔

نشہ ابر سے مدہ پوشش ہیں بید مجنوں
آب و تاب ہر گل خوشترنگ کی ہے متانہ
کوئی اندیشہ نہیں، ہمام اگر خالی ہے
پاردریا ہلکے، وہ دیکھو وہ۔ ہا میخانہ!

اتنے میں ایک اور صاحب اپنی نظم ختم کر چکے ہیں۔

ان پہاڑوں کا پسبزہ، مرے گھڑ تک پہنچا
درو دیوار برستی ہوئی بوندوں سے ہیں تر
موسم گل میں بھی ہو پی نہ سکا اس کے نئے
آنے ہی والے ہیں یخ بستہ زبوں شام و سحر

ان حضرات کے جو مصرعے قلموں کے بعد منگ لیا وزن سے فرمائش کی

جاتی ہے کہ وہ بھی کچھ سنانے۔ وہ اکٹھا کر ہر دو قدر

کھڑا ہو جاتا ہے اور کچھ انکسار، کچھ اصرار کے بعد گاتلے ہے۔
ریگ ساحل مرے قدموں میں کھینچتی

روپ پانی کا رو پہلا ہے اسنہرا بادل
مسک قدموں کی دلی چاپ سے پزل چھین
چھپ گئیں منج پہ طلسمات کالے کر آنچیل!

ظاہر ہے کہ یہ قطعہ پہلے دونوں قطعات سے ہر طرح خوبصورت ہے۔ حاضرین
کو اس کے مضمون پر بڑا چنبھا ہوتا ہے۔ وہ اکٹھا کر منگ لیا وزن کے آگے آداب بجالانے
ہیں اور کہتے ہیں۔ ”سچان اللہ اہم جانتے ہیں کہ آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ بھلا

ایسے اشعار کوئی معمولی شخص کہہ سکتا ہے؟

پھر وہ اس کا نام اور لقب وغیرہ پوچھنے لگتے ہیں۔ لیکن منگ لیا دُزے جواب نہیں دیتا، مسکراتا رہتا ہے۔ وہ مزید اصرار کرتے ہیں تو منگ لیا دُزے کہتا ہے: "میرا نام جان کر آپ کیا کریں گے۔ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں جو ہادوں اور دریاؤں کا سیلابی ہے۔ آپ مجھے "بادلوں اور دریاؤں کا دیہاتی مسافر" کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اس سے حاضرین کا اشتیاق اور بھی بڑھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "آئیے ہمارے ساتھ شہر چلتے"۔ لیکن منگ لیا دُزے مسکرا کر جواب دیتا ہے: "میں فقیر آدمی ہوں ہاتھ گھوم پھر رہا ہوں اور یہ ساری دنیا میرا گھر ہے۔ مگر آپ اتنا کرم فرماتے ہیں تو چلے میں تیار ہوں۔"

چنانچہ سب لوگ شہر آتے ہیں اور منگ لیا دُزے باری باری سب کے گھر وہاں میں قیام کرتا ہے۔ دیہاتی کے ان دنوں میں کبھی تو وہ بہت امیر آدمی کے محل میں ہوتا ہے کبھی کسی چھوٹے سے کمرے میں کبھی ادیبوں کے ساتھ ویرجھام میں شریک ہوتا ہے تو کبھی تاج اور گامے سے لطف اٹھاتا ہے۔ وہ ہر جگہ جاتا ہے۔ شہر کے لوگ اس ہادوں اور دریاؤں کے دیہاتی مسافر کا حال سنتے ہیں تو پارٹیوں اور دعوتوں کے رسیا لوگ اسے بار بار دعوتوں میں بلاتے ہیں اور وہ ہر جگہ جاتا ہے۔ لوگ شراب پیتے ہیں تو وہ بھی پیتا ہے۔ لوگ شعر و ادب پر بحث کرتے ہیں تو وہ بھی ان سے شعر و ادب کی باتیں کرتا ہے۔ لوگ جب باہر سیاحت کے لئے جلتے ہیں تو وہ ان کے ہمراہ جاتا ہے مگر حیب وہ اس کا نام اور لقب پوچھتے ہیں تو وہ صرف مسکراتا ہے "جو اب نہیں دیتا۔ شعر و ادب کی بحث میں درگدما اور جدید ادیبوں پر بڑی نئی نئی باتیں کہتا ہے اور ان کے اسلوب اور اندازہ کا بڑا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے۔"

کبھی کبھی وہ قدیم بادشاہوں کے سیاسی نظام پر بھی بات کرتا ہے اور حالات کا ضرہ پر اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے چرت فکردوں سے تو لوگوں کو جید مخطوطہ کرتا ہے۔ منگ لیاؤزے روح کی بالیدگی کے بارے میں تاؤر فالون فطرت کی تعلیم دینے کا بڑا ماہر ہے۔ بعض دفعہ وہ کوئی عامیانا ناچ یا پست مذاقی کا گانا سنا ہے یا لوگ اس کے سامنے اُلٹی سیدھی باتیں کہتے ہیں تاکہ ان چنیروں کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کر سکیں تو وہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ اُسے بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن ایسی محفلوں میں جب نایح گانے کے بعد شمعیں گل کرنے کا وقت آتا ہے اور میزبان اُسے کہتا ہے کہ وہ کبھی کسی رقاصہ لڑکی کے ساتھ نہ چے اور ساری محفل پر یہی کیا چھا جاتا ہے تو منگ لیاؤزے چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے چہرے کی ہشتی سے کسی کو تپہ نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیسا آدمی ہے۔ رات کو سوتے وقت وہ میزبان سے بھوسا بھرا ہوا کبیہ مانگ لیتا ہے۔ اس بنا پر اس کے بارے میں لوگوں کا تعجب اور لوگوں کی توصیف بڑھتی جاتی ہے۔

ایک ہینہ سے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کے بعد وہ یکایک کسی دن الوداع کہ دیتا ہے۔ اور لوگوں کے مسلسل اصرار پر بھی مزید قیام منظور نہیں کرتا۔ اس کے دوست اسے روپیہ اور کپڑے دیتے ہیں الوداعی نطیں کہتے ہیں اور اس کی الوداعی دعوت میں سب معزز لوگ شریک ہوتے ہیں۔ وہ بڑے افسوس اور رنج سے اُسے خدا حافظ کہتے ہیں۔ کئی ایک حضرات تو آئسٹونک بہاتے ہیں۔ منگ لیاؤزے رخصت ہو کر شہر کے آخری دروازے تک پہنچتا ہے اور صرف سو روپے نقد پاس رکھ کر باقی تمام تحفے، کپڑے، روپیہ غریبوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور آگے چل دیتا ہے۔

اس کے دوست یہ سن کر آہ بھرتے ہیں اور ان
رہتی وہ نہیں جانتے کہ اس آدمی کو کیا سمجھیں۔
کی حسرت کی کوئی انتہا نہیں

۷۔ فرار کا فلسفہ

منگکی یاد دہانے سے پہاڑی راستوں پر چلتے چلتے اونٹنی سنگلاخ پہاڑوں کے
درمیان پہنچ جاتا ہے۔ ان پہاڑوں پر ہزاروں پرانے پرانے درخت ہیں جن پر سیلیں
چڑھی ہیں۔ ان کا سیہ اتنا گھنا ہے کہ ان کے نیچے چلتے ہوئے آسمان نظر نہیں آتا۔
انسان کے قدم یہاں تک نہیں پہنچے۔ دور دور تک انسانی آبادی کا پتا نہیں کوئی
لکڑ ہارا، گوالا بھی نظر نہیں آتا۔ منگکی یاد دہانے کو صرف پرندوں اور بندروں کی
آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ تنہا اور سرد ہوا کا ایک جھونکا جسم کو کپکپا دیتا ہے۔ منگکی یاد دہانے
اپنے دوست کے ہمراہ دیر تک چلتا رہتا ہے۔ یکا یک ایک پر مرد سے مڈ بھیر ہوتی
ہے۔ جس کی اونچی پشانی، نازک خطہ رخاں بڑے شاندار ہیں اور جس کی آنکھوں کی
تیلیوں پر ہلکی ہلکی رگیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس کے بال اس کے شانوں پر پڑے
ہیں اور وہ اپنے گھٹنوں کو اپنے سینے سے لگائے ایک چٹان پر براجمان ہے۔
منگکی یاد دہانے آگے بڑھ کر سلام کرتا ہے۔ پر مرد کھڑا اوجھتا ہے اور دیر تک کچھ کہے
بغیر منگکی یاد دہانے کو دیکھتا رہتا ہے۔ منگکی یاد دہانے اس کے سامنے دو زانو
ہو کر پوچھتا ہے "بزرگ" باپ نے یقیناً تار کے قالون فطرت کا عمران حاصل کیا
ہے۔ ورنہ اس پہاڑ کی تنہائی میں آپ کے قدم کیوں کھرتے۔ آپ کا یہ غلام آج
تک آدمی عمر گزارنے کے باوجود تار کو نہیں سکا۔ اس زندگی کی بے مانگی پر میرا
دل نمکین ہے۔ کیونکہ یہ زندگی چمق کے شعلے کی طرح بھڑک کر ختم ہو جاتی ہے

بزرگ باپ مجھ پر کرم کیجئے اور میری جہالت کو منجھوے الگ کر دیجئے۔
 پیر مرد یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس نے منگ یاوزے کی بات سنی ہی نہیں۔ لیکن
 منگ یاوزے کے اصرار پر وہ چند باتیں کہتا ہے جو غموں سے آزاد اور شانتی سے بھرپور
 زندگی اور بے عملی کے فلسفے کے بارے میں ہیں پھر اپنی راہ لیتا ہے۔ جب تک
 پیر مرد نظروں سے غائب نہیں ہو جاتا۔ منگ یاوزے کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی ہیں
 کوئی بتائے کہ ان تنہا پہاڑوں میں یہ پیر مرد کہاں سے آیا؟
 منگ یاوزے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یکا یک ایک پرانے دوست سے
 اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے جب اُسے یہ خیال آجاتے کہ کتنے لوگوں
 سے اس کی دوستی تھی اور نظم کے ذوق کی بنا پر ایک دوسرے کے احترام کی بنا پر
 استوار ہوئی یا کتنے لوگوں سے اس کے کاروباری تعلقات ہیں یا کتنے لوگ اس کے
 دل کے قریب ہیں تو منگ یاوزے کا دل چاہتا ہے کہ فوراً ان دوستوں سے ملاقات
 کرے۔ چنانچہ منگ یاوزے اس دوست کے گھر پہنچتا ہے۔ وہ کوئی بہرہ نہیں
 بھرتا۔ دوست اسے خوش آمدید کہتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ منگ یاوزے عجیب کپڑے
 پہنے ہے۔ اُس سے مختلف سوالات کرتا ہے۔ منگ یہ جواب دیتا ہے کہ میں نے
 دیتا ترک کر دی ہے۔ میرا گروہ اب تنگ منگ کا بزرگ چچا چن۔ دوست سے
 پوچھتا ہے۔ سب بچوں بچیوں کی شادی سے فراغت پالی کیا؟۔ نہیں ابھی
 نہیں۔ البتہ جب کشتاوی ہو جائے گی تو میں دریا سے زرے کے پانیوں کی طرح
 آزاد ہو جاؤں گا۔ تاہم اس سے بڑا عارف تو دنیا چھوڑ گیا تھا اور آخر آسمان
 کو چلا گیا تھا۔ لیکن میں کبھی نہ کبھی اپنے وطن واپس جاؤں گا اور اپنے وطن کے مناظر
 کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کروں گا۔" میں زبان اُسے سبزی ترکائی کھلاتا

ہے اور دو دنوں میں تیس برس اُدھر کے زمانے کے تذکروں میں کھو جاتے ہیں گزشتہ واقعات پر انھیں سنسی آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گو باہر چپیرا ایک خواب تھی۔ اس کے بعد دوست آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے "مجھے تمہاری بے فکری اور آزادہ روی کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس دنیا کو دولت اور اقتدار کے بھنورے غرق کر رکھا ہے میں کسی بار دیکھتا ہوں کہ کوئی سفید بالوں والا پیر مرد جس کی کمر میں خم آچکا ہے ابھی تک اپنے منصبی عہدے سے چٹا ہوا ہے اور اپنی دولت اور حکومت کو ہاتھ سے دینے پر رضامند نہیں۔ اگر کسی دن پچھلے عہدے سے سبک دوش ہو گیا تو اس دن بھی وہ ماتھے پر شکن ڈال کر چپیری سے پوچھے گا "گاڑی تیار ہے؟" پھر بڑی بے دلی سے دفتر چھوڑے گا۔ اپنے گاؤں جانے کے لئے طوماد کرنا ہی شہر کے دروازوں سے باہر نکلے گا۔ گاؤں پہنچ کر وہ دھانا یا وال سبزی بونے کو اپنی توہین جانے گا اور سبج و شام یہی پوچھتا رہے گا کہ دارالخلافے کی کیا خبریں ہیں؟ یا وہ دارالخلافے میں اپنے دوستوں کو خط لکھ لکھ کر تازہ ترین حالات سے آگاہی حاصل کرے گا۔ اور وہ انھیں خیالات میں دیم واپس تک اُلجھا رہے گا۔ اب بھی ہوتا ہے کہ شاہی فرمان اس کے عہدے پر بحالی کے لئے پہنچتا ہے مگر اس بذنبیب کی جان لیوے پر ہے اور بعض اوقات تو یہ شاہی فرمان اس کی موت کے چند گھنٹے پہلے پہنچتا ہے۔ ذرا انصاف کرو ایسی حرص و ہوا کس کام کی؟ — مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ان بیوی خواسہوں پر کس طرح قابو پایا ہے اور نہایت مناسب وقت پر مایا کے جال سے کیونکر ہائی حاصل کر لی ہے؟

بگ بیاؤزے کہتا ہے "میں نے اپنی زندگی پر اپنی فسرا سخت میں پوری دلچسپی سے نگاہ ڈالی اور اس کا مشاہدہ کیا۔ میرا خیال ہے جب زندگی کے ایسے کا احساس

منگ یاد دہانے کے سفر

۶۱۱

میرے دل میں پیدا ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور مجھے حیرت ہوئی ہے کہ سورج چاند، تارے اور کہکشاں رات دن مغرب کی سمت سمت مصروف لوگوں کی طرح رواں دواں ہیں۔ آج کا دن گزر گیا اور یہ دن کبھی واپس نہیں آتا۔ کل کا دن آتا ہے مگر وہ آج نہیں ہوتا۔ یہ سال کبھی واپس نہ آنے کیلئے جاتا ہے۔ اور اگرچہ اگلا سال آتا ہے مگر وہ یہ سال نہیں ہوتا۔ گویا فطرت کا زمانہ اور اس کی عمر بتدریج طول پذیر ہے لیکن میری عمر کے سال کم سن کم مرتے ہوتے جاتے ہیں۔ میرے حصے میں شاید ۳۶ ہزار صبحیں ہیں۔ ان کے سوا زمانہ و مکان میں جتنا وقت الٹا وقفہ ہے وہ میں نہیں فطرت کی طویل عمر کے سال رفتہ رفتہ سامنے آتے ہیں مگر میری عمر کے سال رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ زیادہ سے زیادہ ایک سو برس مجھے ملتے ہیں۔ ان ایک سو برسوں کے بعد کے سال میرے نہیں ہوتے۔ پھر ستم ہے کہ "ایک سو سال" یا کہنے کو "یہ ۳۶ ہزار صبحیں" کسی نہیں ہوتیں جیسی ہم چاہتے ہیں انھیں دلوں اور برسوں میں زیادہ ترین اور برس ایسے ہیں جو برے موسم اداسی، تشویش اور بھانگم بھاگ میں گتے ہیں ایسے لمحے کتنے آتے ہیں کہ دن خوب صورت ہوں، پر لطف محفل جمی ہو، چاندنی اور ہوا خوشگوار ہو، ہمارا دل مسرت سے بھر پور اور روح طمانیت سے بھر پور ہو، نغمے اور شعر ہوں، شراب اور سرخوشی ہو اور ہم ان نعمتوں کا مزہ اٹھاتے ہوئے اطمینان سے وقت گزار سکیں؟

چاند اور سورج اپنی اپنی گردش میں رہتے ہیں۔ ان کی برق رفتاری میں گیلیاں سی تیزی ہوتی ہے۔ اور جب وہ مغربی گھاٹیوں میں ڈوبے کو ہوتے ہیں تو اس دنیا کا قوی ترین شخص بھی ان کا راستہ روک نہیں سکتا نہ انھیں واپس مشرق کی طرف جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سوچنا اور چانگالی کی تمام تر فصاحتوں کا دور بھلا نہیں مشرق کافر

پھر سے اختیار کرنے پر رضامند نہیں کر سکتا۔ چوں کہ زے اورین نیک کی طرافت اور حکمت بھی ان کا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ چنگاری نے اپنے کو مل جسم کو ہنک سے نکرا یا تھا اور اسے ایک پرندے کا قالب بلب جو اپنی رنجوری کا سمندر کھریوں سے بھرتا رہتا ہے۔ اس بچدی کا پاپاں خلوص اور صاف دلی بھی ڈوبتے چاند سورج کے زل پر اثر نہیں کر سکتی۔ اور انھیں پھر سے مشرق کا سفر اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ہر زمانے میں اسیوں اور شاگردوں نے اس باسے میں بحث کی ہے اور یہ مدد و دستوں کے لئے ازلی رنجوری کا باعث بن چکا ہے۔

”اور میں نے اس زمانے پر بھی نگاہ ڈالی۔ اس زمین پر ٹیلے آہستہ آہستہ گہری وادیاں بن گئے ہیں۔ اور گہری وادیاں اُلٹ کر پہاڑ بن گئی ہیں۔ اس زمین کے دریا ہتھکے ندی نائے جھیلیں سب کا پانی ازلی ابدی طور پر مشرق کی طرف بہتا ہوا سمندر میں گرتا ہے اور فانگ ننگ پری کا کہتا ہے کہ اس نے سمندر کو تین بار تہوت کے میدان میں بدلتے دیکھا ہے۔“

پھر میں نے اس زمین کے جانداروں پر نظر ڈالی اور مشاہدہ کیا کہ کس طرح یہ جاندار پیدا ہوتے ہیں، بوڑھے ہوتے ہیں بیمار پڑتے ہیں پھر مر جاتے ہیں اور پھر اور یا تکا درم اور مایا کی چکی پیستے ہیں۔ سیتل کی طرح کہ نیچے آگ جلائی جائے تو جلد ہی جھک کر کھ جاتا ہے۔ شمع کی طرح کہ موادوں سے مدھم ہوتی ہے اور جلد ہی بج جاتی ہے۔ کشتی کی طرح کہ کھلے سمندر میں اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے اور ہر موج لہو سے کٹا لے لے اور وہی دور دورے جاتی ہے اور یہ کشتی انجانی سمتوں کی طرف بہتی ہی چلی جاتی ہے۔“

اس کے علاوہ انسان کی سات خواہشیں برابر گھن کی طرح اُسے کھاتی

رہتی ہیں جسمانی لذتیں اسے گھلاتی رہتی ہیں انسان کبھی بہت ہی مایوس ہوتا ہے کبھی حد سے زیادہ خوش مگر عام طور پر اسے اندیشے کھائے جاتے ہیں۔ حد سے حد سو برس کی عمر اس کا مقصد ہے مگر وہ ہزار برس کی زندگی کے منصوبے بنا لے۔ اس کی مثال تو اس تیل کی ہے جو آگ پر رکھا ہے لیکن اس کے خواب، اس کی حرص اور انگلیں کائنات کی وسعتوں سے بھی وسیع ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے کہ بڑھاپا آتے ہی ان کی حالت بہت جلد اتر ہو جاتی ہے۔ زندگی کی اصلی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی روح اس فانی قالب کو چھوڑ کر رخصت ہو جاتی ہے۔

”میں نے شہزادوں اور بڑے بڑے امیران کبیر، بحر نیلوں اور زریروں کو دیکھا ہے ان کے محلوں کی چھتیں بادلوں سے باتیں کرتی ہیں۔ کھانے کا وقت آتا ہے تو ہزاروں آدمی ان کے دسترخوان پر ہوتے ہیں۔ صبح کو ان کے محسوس کے سچا تک کھلتے ہیں تو ملاقاتوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ دن رات ان کے یہاں جشن مناتے جاتے ہیں۔ ان کے دیوانوں میں سبھی بنی عورتوں کے پرے کے پرے نظر آتے ہیں۔ قریب سے کوئی پروہت یا بجاہی نکل جاتے تو یہ لوگ اس پر پھتیاں کتے ہیں۔ اور اس بے چاری میں ہمت نہیں ہوتی کہ انکے اٹھ کر ان کی طرف تو کیا ان کے محلوں کی طرف بھی دیکھا جاسکے۔ مگر یہی پروہت یا بجاہی کوئی مینس یا تیس برس بعد ادھر سے پھر گزرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ محلوں کی جگہ جنگلی گھاس اُگی ہے، ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر کھرا اور شبنم ہے، سورج کی ہلکی دھوپ گھنڈر پر چمکتی ہے اور ماتم کٹاں ہوا بے باس در گھنڈوں سے روتی ہوئی گزرتی ہے۔ وہ جگہ جو کبھی نعروں اور شادیوں کا تاج اور جشن طرب سے معمور تھی اب دیران ہے اور وہاں گوالوں کے چند لڑکوں کے سوا کوئی نہیں جاتا۔ جب یہ امرا اور بڑے آدمی اپنے اقتدار کی معراج پر تھے، ہر طرف ان کا ظمی بول رہا تھا اور وہ اپنے

شہزادوں اور مہتمموں میں ہمہ تن کھڑے ہوتے تھے تو کیا انھیں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ کبھی یہ دن بھی آئے گا؟ پھر دل بوجھتا ہے۔ آخر اس دنیا کی شان و شوکت پلک جھپکتے میں کیوں خراب خیال ہو جاتی ہے۔

فرصت سے دونوں میں میں نے شہر کے باہر جا کر دیکھا کہ ہر طرف چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں؟ اسرار اور شائستگی کی اہل علم اور شاعروں کی؟۔ یا یہ ان کے معمولی ملازموں اور چوبداروں کی قبریں ہیں؟۔ یہ لوگ سپرتھے یا محض مسخرے؟ مگر اس پہلی مٹی سے مجھے ان کے بارے میں کیا معلوم ہو سکتا ہے؟۔ اور مجھے خیال آیا کہ جہت لوگ زندہ تھے تو دنیا کی شان و شوکت دولت اور عزت کے کتنے کلبوں کے تھے ان کی انگلیں اور خواہشیں کس طرح ایک دوسرے سے مقناوم رہتی تھیں کس طرح یہ لوگ شہرت کے ستارے تھے اکیسے کیسے منصوبے تیار کرتے تھے جو کبھی پورے نہ ہوں کسی کسی چیز میں جمع کرتے تھے جنہیں یہ لوگ کبھی کام میں نہ لاسکیں۔ ان میں کون ایسا تھا کہ تشویش کا نشانہ تھا غم نگر سے آزاد تھا؟ کون ایسا تھا جس نے لمبے چوڑے منصوبے نہ بنائے تھے اور ہر آن سم توڑ کر سٹش میں زندگی بسر کی تھی؟ مگر ایک سب کو ان کا انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب ہو گئیں اور ان کے سلسلے اندیشے۔ منصوبے ہمیں رہ گئے۔

اور میں بڑے بڑے راکوں کے نیگے پر بھی ٹہرا ہوا اور کئی بار میں نے سوچا ہے کہ اس خاص مکان میں جانے کتنے لوگ بنے گئے اور باری باری جلد سے۔ میں نے دنستروں کی شبلیں دیکھی ہیں اور خیال آیا کہ ان منزلوں سے نہ جانے کتنے نام کتنی دفعہ کاٹے گئے اور ان کی جگہ کتنے نئے ناموں نے لے لی ہیں نے پہاڑی راستوں کو بھی دیکھا ہے اور دریا کی قسبتوں کے گھاٹی بھی دیکھے ہیں

پھاڑوں پر چڑھ کر نیچے میدانوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ سڑکوں اور گھاٹوں پر گاڑیوں اور کشتیوں کی قطار ختم نہیں ہوتی — میں سوچتا ہوں ان گاڑیوں اور ان کشتیوں میں کتنے مسافروں نے سفر کیا ہوگا — زندگی کی اس دانی پر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک — پڑتے ہیں اور ان نظاروں سے دل کی خواہشیں کھنڈی راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہیں!

منگ لیازرے کا دوست جواب دیتا ہے "میں نے سنا ہے 'ین زسے اس حقیقت پر سرور ہے کہ بہت کوئی چیز نہیں — میں نے سنا ہے 'بادشاہ چنگ — اس بات پر آنسو بہا یا کرتا تھا کہ زندگی کا انجام موت ہے اور دانا لوگ اس پر طعنہ زن تھے کہ بادشاہ زندگی کے عرفان سے اتنا بڑگانہ کیوں ہے — میرا خیال ہے کہ تمہارا بھی یہی حال ہے۔ تم بھی دولت کے تیری سے گزر جاتے اور زندگی کی بے شبانہی پر آنسو بہاتے ہو اور اس اور محزون رہتے ہو۔ تم میں ان لوگوں کی دانش نہیں جو زندگی کے راز کے محرم ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

منگ لیازرے کہتا ہے "نہیں یہ بات نہیں۔ زندگی کی بے شبانہی کے احساس نے مجھے غمگین ضرور کیا مگر اسی غمگینی نے مجھ میں شعور پیدا کیا 'میری آنکھیں کھول دیں۔ بادشاہ چنگ کو یہ خوف تھا کہ اس کا اقتدار اور اس کی حکومت اس کی شان و شوکت کا عارضی ہے وہ اس سے اب تک لطف اٹھاتا چاہتا تھا اور انسانی خوشیوں کے سر پہ تیسے کو خشک کر دیتا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس اب تو دولت اور اقتدار کی تاباں بیداری کو خوب خوب جانتا ہوں۔ اس لئے ان کو اپنے سے دور رکھتا ہوں تاکہ میری طبیعت ہی اسی رہے اور ٹھیک گزریے۔ گویا ہم دونوں کے قصاص میں فرق ہے۔"

”کیا تم نے تاؤ کے قانونِ فطرت کا عرفان حاصل کر لیا ہے؟“

”نہیں۔ یہ عرفان ابھی مجھے حاصل نہیں ہوا۔“

”تو میں قانونِ فطرت کو کھوب جاؤں اور بس۔“

”تو پھر تم یہ صحراؤں کی طرف اور آوارہ گردی کیوں کرتے ہو؟“

منگ یازدے کہتا ہے: ”بھائی میری آوارہ گردی کو تاؤ کے قانونِ فطرت

کے ساتھ نہ الجھاؤ۔ میں تو سرکاری عہدہ دار کی زندگی اس کی پابندی اور وہی

مکرہات سے الٹا کیا تھا۔ چنانچہ میں سفر کرتا رہتا ہوں کہ اپنے آپ کو ان پابندیوں

ان مکرہات سے آزاد رکھوں۔ جہاں تک زندگی کے انجامِ موت کا تعلق

ہے مجھے اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا کہ میں اپنے سفر سے واپس آ جاؤں اور

گوشہ نشین ہو دوں۔ اس گڈری میں کنڈل ہاتھ میں لے کر تم اپنا پیٹ

بھرنے کے لئے بھیک مانگتے ہو۔ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے ہو یہ زندگی تمہیں پسند

ہے؟ کیا تم اس حال میں خوش ہو؟“

منگ یازدے کہتا ہے: ”میرے مرشد کا قول ہے، ”مسترت کے حصوں

کارازیہ ہے کہ اپنی مسترتوں کو معمولی اور محدود بنا دو۔ لوگ بڑی بڑی دعوتوں

میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ قسم قسم کے گوشہ نشین کھاتے اور ان کو بھی تمہیں رکھی جاتی

ہیں بکے اور گائیں ان دعوتوں کیلئے کافی جلدی اور سمندر کی نفیس ماکولات

پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے پہل سب کو ان کا مزہ آتا ہے اور تیب پیٹ بھرنے لگتا ہے

تو اس میں کھانوں سے نفرت ہونے لگتی ہے اس لئے سب سے اچھا کھانا ایک

چاول اور تانہ سبزیوں ہیں کہ تاثیر میں ہلکا سا دہ ہے اور صحت کیلئے مفید

ہے۔ اسی کھانے کا مزہ تم بھرتے رہو اور اس کی عادت ہو جاتی ہے ناچنگ

منگ لیادزے کے سفر

۶۱۷

کی مخلوق کو دیکھتے جن میں حسین عورتیں اور خوش رو لڑکے ہوں۔ پہلے ان کا بہت لطف آتا ہے کہ کوئی دف بجاتا ہے، کہیں بٹلے پر تھاپ پڑے ہی ہرے کوئی گار ہا ہے کوئی ساز بجا رہا ہے لیکن یہ کیفیت گزر جاتی ہے اور جب ان مخلوق سے لوگ اٹھتے ہیں تو ان کا دل بھلا ہی لگتا ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کو بان سلگایا، کتا کھلی اور چبچاپ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس طرح روح کو شانتی ملتی ہے اور پختہ پختہ دل کو زیادہ مسرور حاصل ہوتا جاتا ہے۔ کبھی میں بھی ایک قوم دا افسر تھا، لیکن سیری کل دولت چند کتابیں نہیں اور بس۔ بے پہلے میں ان کتابوں کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ پانی کی روحیں ان پر رسکتا کھائیں چتا چب میں نے ان کتابوں کو پانی میں پھینک دیا اور اب ان جسم کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

اب کے میرا سارا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا اس پاس کو فقدا، میرا ماحول پر تو کون جسم آزاد اور روح شانت ہے تو کب زندگی کا زیادہ لطف نہیں؟ اب میں اپنی گدردی اور اپنے کنٹرول کے ساتھ جہاں چاہتا ہوں جاتا ہوں۔ جہاں دل چاہتا ہے کھڑ جاتا ہوں اور جو ملتا ہے کھاتا ہوں۔ کسی جگہ قیام کروں تو مالک کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا اور جاتے وقت اپنا نام نہیں بتاتا۔ اگر سردیوں میں مجھے کھلی جگہ پر پڑے تو تکلیف نہیں ہوتی اور جب شور و غوغا کی محفل میں گھر جاؤں تو مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ لہذا میری آواز گدردی، میری مستحق سیاحت کا مقصد یہی ہے کہ میں تاد کے قانونِ نطرت کا شعور حاصل کروں اسے اچھی طرح سیکھوں۔ دوست نے یہ سن کر کہا تمہاری باتیں سن کر اس پر معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جسم کو کھنڈک پہنچانے والی دوا پی لی ہے۔ مجھے جو بے اطمینانی کا بخار چڑھا ہوا تھا

سفر کے ذریعے

وہ غیر محسوس طور پر اتر گیا ہے۔

[اس بیان کے بعد چین کے تینوں مذاہب کی عیسائی پر ایک ٹولیں کی گئی ہے اور خدا بوندھو ہاتھ تمار جنوں پر بوں کے وجود کے ثبوت دینے گئے ہیں۔ — مصنف]

پھر ایک نوجوان آتا ہے اور منگ لیا وزے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے۔ جہاں
سیاں جاؤ۔ فیر کو چاہیے کہ کھانا بلجائے تو چلا جائے۔ مادراگرم اسی طرح
فضوں بک بک کرتے رہو گے تو میں تمہیں پکڑ کر حاکم کی عدالت میں لے جاؤں گا اور
تم پر جادو ڈونہ کر نیکیا مقدمہ چلا دوں گا۔

ہی ان غصے میں اسٹین چڑھا لیتا ہے جیسے منگ لیا وزے کو ملے ہے
ہی والا ہے مگر منگ لیا وزے سکرانا رہتا ہے۔ آخر کچھ راہ گریٹ بچاؤ کرتے ہیں اور
منگ لیا وزے گاتا ہوا اپنی راہ لیتا ہے۔ وہ رات کو میرائے میں پیام کرتا ہے
جہاں ایک خوش لباس عورت دروازے سے جھانکتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ قریب
آتی ہے اور منگ لیا وزے کو چھوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ منگ لیا وزے سوچتا
ہے کہ یہ عورت ضرور کوئی اور درجہ بد سے ہے۔ اور چپ چاپ تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ عورت
کہتی ہے میں ایک پری ہوں اور تمہیں بچانے آئی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم تارے
قانون فطرت کا ادا کرنے کے لیے بڑی ریاضت کر رہے ہو۔ اس سے علاوہ
کچھ جہنم میں میری تمہاری ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ مجھ پر رشک نہ کرنا میں تیار
ساتھ طلسمات کی دتیا کو چلوں گی۔ منگ لیا وزے کو فوراً یاد آتا ہے کہ جب جنگ سے
جنگ نشان کے مقام پر قانون فطرت کی ریاضتوں میں مشغول تھا تو اسے کبھی
اسی طرح بہکا گیا تھا اور آخر شیطان نے اسے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کھلی جا

رہی کئی۔ اور وہ عرفان کے حصول کے بغیر ہی مراکتھا۔ گویا یہ ضروری ہے کہ جب
 بردھیں انسان کو بہکائیں تو وہ اس کی زندگی تباہ کرتی ہیں اس لئے ان سے بچنا چاہیے۔
 اگر صوتی لوگ اور درویش ان کے فریب میں قلعہ ملی سے آجائیں تو یہاں کے لئے اچھا
 نہیں روح کی بقا اور نفس پر غالب آنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس لئے منگ لیا ڈرے
 اپنے درمیان میں مست بیٹھتا ہے۔ اور وہ عورت بیکاروں سے غائب
 ہو جاتی ہے۔ کون جانے وہ کسی کا بھوت تھی یا بہکانے والی بد روح تھی؟
 اسی طرح تین برس تک منگ لیا ڈرے اتنا سفر جاری رکھتا ہے اور
 کھگ ساری دنیا میں گھومتا رہتا ہے۔ جن چیزوں کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا جو
 آوازوں سے اپنے کانوں سے سنتا ہے یا جو چیز اپنے ہاتھوں سے چھوتا ہے جن حالات
 کا سامنا کرتا ہے، جن لوگوں سے ملتا ہے وہ سب اس کی خودی کی تربیت
 میں کام آتے ہیں اور اس کی بابت اس آزاد روی کا اصل مقصد یہی ہے۔
 پھر وہ گھر واپس آجاتا ہے اور زرے منگ کی پہاڑیوں میں ایک چھوٹا
 سا چھوٹا ٹہلے جہاں سے پھر وہ کہیں نہیں جاتا۔

باب (۱۲) دوازدہم
تفاوت کے لئے

- (۱) علم اور ذوق سلیم
(۲) آرٹ، تفریح اور شخصیت
(۳) بڑھتے کا فن
(۴) کچھ بے کافن

اعلم اور ذوق سلیم

تعلیم یا ثقافت کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم میں علم کے سلسلے میں ذوق سلیم اور اطوار کے سلسلے میں خوبی پیدا ہو ضروری نہیں کہ صرف اسی شخص کو شہتہ یا ہنر یا دوسرے نفسوں میں مثالی طور پر تعلیم یافتہ قرار دیا جائے جو بہت پڑھا کھا ہو اور پڑا عالم قاضی ہو تعلیم اور تہذیب کا آئینہ تو اسی شخص کو قرار دیں گے جو پسند کے قابل چیزوں کو اچھا سمجھے اور ان چیزوں کو ناپسند نہ سمجھے جو پسند کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ گویا علم کا مذاق صحیح اور علم کی خوش ذوقی یہ جاننے میں ہے کہ کن چیزوں سے محبت کی جائے اور کن سے نفرت کی جائے۔ آپ متعدد ایسے حضرات سے تقریبات میں ملے ہوں گے جن کا دماغ تاریخی شخصیتوں، واقعات، ان کے مسائل و وقوع وغیرہ کا ذخیرہ رہے اور وہ لوگ کسی غیر ملک مثلاً روس یا مثلاً چیکو سلوواکیہ کے تانہ ترین حالات کے بارے میں بڑے باخبر ہوتے ہیں۔ لیکن ان عالم حضرات کا انداز نظر یا نقطہ نگاہ سراسر غلط ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے ملکر جو کوئی ثقافت ہوتی ہے اس کا آپ کو خوب اندازہ ہوگا۔ ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق مجھے بھی سوچ چکا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں کسی موضوع پر بات چھڑی ان کتاب کے کیردوں نے متعلقہ حقائق اور اعداد و شمار کا انبار حاضرین کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن حال یہ تھا کہ ان کا انداز نظر ان کا وہیہ سراسر غلط تھا۔ ان حضرات میں علم و تفصیل کی کمی نہیں ہوتی لیکن یہ لوگ بصیرت یا مذاق سلیم دلوں سے بالکل "پاک" ہوتے ہیں۔ اس کی

وجہ ہے کہ معلومات وسیع کرنے دعام معنی میں علم و فضل اکیلے صرف محنت سے یاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہا مذاق سلیم اور بصیرت تو اس کا حصول کہیں مشکل ہو گا یا کلمہ و مدارف کا ساتھ پرکھ تمیز اور سمجھ پر ہے۔ چنانچہ چینوں کا قاعدہ ہے کہ کسی صاحب علم کا ذکر کیا کرے گا تو علم و فضل اس کے اخلاق و بصیرت میں ہمیشہ امتیاز کریں گے۔ خصوصاً مورخوں کے بارے میں امتیاز ضرور عمارت کے جاتے ہیں۔ اس کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ تاریخ کی ایک کتاب مسکن ہے بڑی جانکاہی اور محنت سے لکھی گئی ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ اس میں بصیرت اور سمجھ بوجھ بھرے سے غائب ہو اور مصنفانہ اتنی محنت کے باوجود تاریخی شخصیتوں کی تاریخی واقعات کی جو تعبیریں پیش کی ہوں یا ان واقعات سے جو نتائج اخذ کئے آہل وہ بالکل صحیح ہوں ان میں کوئی گہرائی نہ ہو ان میں کوئی بلت نہ ہو ہر چیز بالکل پیش پا افتادہ اور رسودہ ہو۔ ہم اہل چین کے خیال میں ایسے مصنفین علم کے سلسلے میں ذوق سلیم سے بالکل کوٹے ہوتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ معلومات کی وسعت، واقعات اور تفصیلات کا علم حاصل کر لینا بالکل معمولی چیز ہے۔ تاریخ کا کوئی دور اٹھا کر دیکھیے۔ اس دور کے واقعات کو ذہن میں محفوظ کر لینا، رٹ کر انہیں یاد رکھنا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن اس دور کے اہم اور نتیجہ خیز بات کا کھوج لگانا، بھر انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کرنا بہت مشکل چیز ہے۔ ان نتیجہ خیز واقعات کا انتخاب صرف آپ کے انداز نظر پر منحصر ہے اور یہی انداز نظر اصل چیز ہے۔

✓ اس لئے تعلیم یافتہ وہی شخص کہلائے گا جس کی پسند اور ناپسند ٹھیکیا ہوں گی جسے ٹھیک چیزیں اور غروب ہوگی اور غلط چیزوں سے نفور ہوگا یہی وہ چیز ہے عام لفظوں میں ذوق کہا جاتا ہے اور ذوق ہی سے دل کشی جنم لیتی ہے۔ اب اس سے آگے چلئے جس شخص کو صحیح ذوق ملا ہو یا جو شخص بصیرت سے

ثقافت کے نئے

بہرہ ور ہو اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ اس میں ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہو۔ وہ اپنی راتے اند پر کھ میں قطعی طور پر آزاد اور غیر جانبدار ہو اور کسی قسم کے مجلسی سیاسی ادبی نفاکارانہ یا علمی دباؤ لگی بندھنی باتوں، ابلہ فریبی اور تنگ نظری کا نشانہ نہ ہو سکے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم باغوں کی رنگا ایک نہیں، قسم قسم کی نصوصات سے گھری ہوئی ہے۔ کہیں شہرت کا سراپا ہے تو کہیں دولت کا کہیں وطنیت جی کا رنگ نئی ہے تو کہیں سیاسی بھوت سر پر سوار ہے کہیں ڈکٹیٹروں نے جان غذاب میں کر رکھی ہے تو کہیں نفعیات کے ماہروں نے — آج کل ہمیں تحلیل نفسی کے ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ بچپن میں ہماری آنتوں کے فعل پر ہماری آئینہ زندگی کی انگلیں ہمارے احساس فرض اور ہماری جارحیت کا دار و مدار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس شخص کو دائمی تپش رہے وہ تحلیل اور کھوس بھجاتا ہے — آپ انصاف کریں کہ یہ باتیں سن کر صاحبِ ذوق مسکرا کر چپ ہو رہنے کے سوا کچھ کیا کر سکتا ہے! — یاد رکھنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ جب کوئی شخص غلطی پر ہوا تو اسے غلط سمجھو — اس کے نام کی عظمت سے خوف کھانے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔

نہ اس خیال سے مرعوب ہونے کی ضرورت ہے کہ اس نے بہت سی ایسی کتابیں پڑھی ہیں جو ہمنے کھول کر بھی نہیں دیکھیں۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ ذوقِ سلیم اور حرارت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے ترجمین کے فلسفی شپہ و بصیرت عرفان (مثنوی حقیقی) اور تان جیوٹ جبرارت بے باکی (کوہِ مشہد) لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جس رات یا دوسرے نظموں میں راتے کی نمود قیامی ان لائن میں کتنی کیا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے فلسفی اور اریبا کی زندگی سے تہ چلتا ہے کہ شر و عی سے یہ لوگ اسی ذہنی میاکی

رائے کی ہی خود مختاری سے بہرہ ور تھے۔ ایسے لوگ اپنے عہد کے نہایت شہور اور دیرپا شعرا کو اس وقت تک پسند نہ کرتے تھے۔ جب تک ان کا دل ان کا دلغ ایسا انداز سے اس شاعر کے کام سے متاثر نہ ہو۔ گوہن کی پسندیدگی ان کی ذاتی پرکھ کا آئینہ ہوتی ہے۔

یہی وہ چیز ہوتی ہے جسے ادب کا مذاق صحیح کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص آرٹ کے کسی خاص و بستان کسی خاص مردِ ج انداز کو اس وقت تک قابلِ اعتنا نہ سمجھے گا جب تک اس کا ذوقِ سلیم اس کے حسن و خوبی کی شہادت نہ دے۔ اگر آرٹ کا کوئی مرد جو انداز اس کے ذوق پر باگز رہے گا تو وہ ہرگز اس پر صواب نہیں کر سکتا۔ یہی وہ لکھ ہے جسے آرٹ میں سچے ذوق اور صحیح وجدان کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا شخص فلسفے کے کسی خاص بیج کسی فیشن ایل نظریے سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ چاہے ان نظریات کے ساتھ بڑے بڑے مفکروں کا نام وابستہ ہو۔ جب تک اس کا دل متاثر نہ ہو وہ کسی مصنف سے متاثر نہیں ہوتا اگر کوئی مصنف اس صاحبِ ذوق کو متاثر نہ کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ مصنف غلطی پر ہے۔ یہی وہ منزل ہے جسے ذوقِ سلیم کی منزل کہنا چاہیے۔

یہ تسلیم کہ ایک عمارت رائے کی ایسی غیر جانبداری کیلئے اپنے آپ پر بھروسے کا سنا اعتماد ہونا چاہیے۔ طبیعت میں سادگی اور بھروسے ہونا چاہیے۔ اور یہی اعتماد سادگی اور بھروسے ہمارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ کوئی طالب علم جب اپنی ذاتی پرکھ کا مذاق چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا بھر کی فصویات کا شکار ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیور شمس یہ جانتا تھا کہ علیت کے بغیر غور و فکر اتنا خطرناک نہیں جتنا غور و فکر کے بغیر علیت کا ہونا خطرناک ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

علیت کے بغیر سوچ بچار انسان کا دماغ الاؤتی ہے لیکن

غور و فکر کے بغیر علمیت اُسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

اُس نے اپنے زمانے میں ایسے طالبانِ علم ضرور دیکھے ہوں گے جو سوچ سمجھ سے کام نہ لیتے تھے، محض علم کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے، اسی لئے تو اُس نے اتنی شدید تہذیب کی ضرورت محسوس کی۔ میں سمجھتا ہوں ہم اسے جدید زمانے کے سکولوں میں بھی اس قسم کی سخت تہذیب کی نہایت سخت ضرورت ہے۔ یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ جدید تعلیم اور ہائے سکولوں کا نظامِ تعلیم عام طور پر "علم" حاصل کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے، بصیرت اور سوچ بوجھ کی ترقی کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اس نظامِ تعلیم کا خاصہ ہے کہ طالب علم بہت سا وہ معلومات رکھتا کہ وہ مانع ہیں محفوظ کر لیں اور بس لیکن بھلا "علم" کا بوجھ اور معلومات کا یہ انبار کسی بے علم کو تعلیم یافتہ بنا سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ سکولوں میں سوچ بچار اور غور و فکر کی بہت افسزائی کیوں نہیں کی جاتی؟ آخر اس نظامِ تعلیم نے علم حاصل کرنے کی سہانگی کو مششوں کو بگاڑ کر، انہیں سنج کر کے محض واقعات اور معلومات کو بے سوچے سمجھے حفظ کرنے کی ایک لگی بندھی اور بیزار کنیشن بنا دیا ہے۔

حصول کو زیادہ اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ — ہم کسی گریجویٹ کو تعلیم یافتہ ہونے کا لقب کیوں دیتے ہیں۔؟ صرف اس لئے کہ اُس نے "نفسیات" "قدیم تاریخ" "منطق" وغیرہ کو یاد کرنے میں کچھ گھنٹے اور ہفتے صرف کرتے ہیں؟ ہمارے سکولوں میں امتحانات کے کے نمبروں کا رواج کیوں ہے، ڈپلومے اور ڈگری کیوں دی جاتی ہیں۔؟ ان سندوں اور ڈگریوں نے تعلیم کے سچے مقصد کی جگہ کیوں کر لے لی؟ ہمارے طلباء تعلیم کا مقصد انہیں ڈگریوں اور سندوں کے حصول کو کیوں سمجھتے ہیں؟

ان تمام باتوں کی بنیاد ہی وجہ بڑی سیدھی سادھی ہے۔ یہ نظامِ تعلیم

اس لئے ہم پر مسلط ہوا کہ ہم لوگوں کو تھوک کے سجاوے تعلیم دینے پر تلم ہوئے ہیں۔ اس کی مثال مشنی کارخانہ کی ہے جس میں ہر کام نہایت صحیح مگر بے جا غیر متنوع طریقے سے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ ہر سکل اپنے نام کی لاج رکھنے اور اپنے فارغ التحصیل طلبہ کا معیار ایک سار رکھنے کیلئے سندیں اور ڈپلومے دیتا ہے۔ ڈپلومے دینے کے ساتھ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ جب بندی کی چوائے اور جب بندی امتحانی نمبروں کو جنم دیتی ہے اور نمبر حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کے امتحانات اور ٹسٹ دینے پڑتے ہیں۔ یہ سارا نظم نہایت پختہ منطقی تسلسل اور ترتیب کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کی بچگی سے کوئی مفہم نہیں۔

لیکن اِن مشنی قسم کے امتحانوں اور ٹسٹوں وغیرہ کا نتیجہ بڑا مہلک ہے۔ اتنا مہلک ہے کہ ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ امتحانات کی بروقت واقعات اور کتابی معلومات کے زبانی یاد کرنے کو بردست اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور مذاق سلیم کی تربیت یا پرکھ اور جانچ کی صلاحیت پیدا کرنے کا کوئی سوال نہیں رہتا۔ مجھے اس نظام کا پورا تجربہ ہے۔ کینڈا میں خود سکول میں استاد رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ تاریخی واقعات پر سوالات کا پرچہ بنانا بہت آسان ہے۔ لیکن بہم معاملوں 'بہم نظریوں کے بارے میں سوالات قائم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ پھر ان امتحانی پرچوں کو دیکھ کر نمبر لگانا تو بہت ہی آسان کام ہے۔

خطرہ اس بات کا ہے کہ یہ نظام رائج کرنے کے بعد کہیں ہم یہ بھول جائیں کہ ہم تعلیم کے اصلی اور سچے نصب العین سے دور ہٹ سکتے ہیں اور بار بار ہم اس نصب العین سے دور ہو بھی چکے ہیں۔ کینڈا کے میرے نزدیک تعلیم کا سچا نصب العین یہ ہے کہ علم کے سلسلے میں صحیح اور سچا ذوق پیدا کیا جائے۔ اس مرحلے پر بھی کنفیوٹنس کا قول یاد رکھنا چاہیے کہ:

"وہ علمیت جو محض معلومات کو یاد رکھنے کا نام ہے۔ کسی کو استاد بن

جانیکا اہل نہیں بنا سکتی۔"

گویا تعلیم کے لئے "لازمی معنائیں" اور "لازمی کتابوں" کی کوئی قید نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی نہیں
 سمجھا جاسکتا کہ ٹیکسٹر پڑھنا بالکل "لازمی" ہے۔ ہمارے سکول میں ساقی میں
 مثلاً میں کہ تاریخ اور جغرافیہ کا ایک بنیادی نصاب ہر شخص کو پڑھنا "لازمی" ہے۔ کیونکہ یہ
 بنیادی نصاب ہمارے خیال میں تعلیم یافتہ ہونے کی اولین شرط ہے۔ میری تعلیم
 اچھی خاصی ہوئی ہے پھر بھی مجھے آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ سپین کا دارالحکومت کون سا
 شہر ہے اور ایک وقت میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ ہرانا ایک ایسا جزیرہ ہے جو جنوبی امریکہ کی ریاست
 کیوبا کے پاس واقع ہے۔ چنانچہ تعلیم کا لازمی نصاب قرار دینے میں بڑا عجیب یہی
 ہے کہ جو شخص اس نصاب کو جوں توں کر کے ختم کرے اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے
 کہ جو کچھ کسی تعلیم یافتہ شخص کو آنا چاہیے۔ وہ اسے آتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ بڑا عبرت
 انگیز ہے اور وہ یہ ہے کہ گریجویٹ لوگ امتحان پاس کرنے کے بعد علم حاصل کرنا یا کوئی کتاب
 پڑھنا بالکل ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ انہیں علم حاصل کرنا تھا اپنے حیاں میں وہ
 کر چکے ہوتے ہیں۔

✓ چنانچہ یہ خیال سرے سے ترک کرنا پڑے گا کہ کسی شخص کے علم کو کسی طرح ٹانپا
 ممکن ہے یا اسے کسی کسی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس نے کہا ہے "انسوس
 مسیری جو محدود ہے اور علم لامحدود"۔ علم کا حصول تو کسی نے برا عظیم کی
 دریافت اور اس کی سیاحت کی طرح اسی نے اناطوں فرانس نے کہا تھا "علم حاصل
 کناروح کا ایک تجربہ ہے" ایک ہم ہے! اس لئے اگر تحقیق تجسس اور کھوج کی مصداق
 قائم ہے اسد ذہن تجربوں اور معلومات حاصل کرنیکا اندازہ بھی برقرار رکھے۔

تو علم کا حصول آج کی طرح فذاب نہیں بن سکتا بلکہ ایک نہایت خوش گوار کام ہوگا۔
 علم یہ نہ ہوگا کہ جو معلومات ہمیں گھول کر پلا دی جائیں ہم انہیں پی لیں، جو کچھ یکسانیت
 کے ساتھ ہمیں سکھا دیا جائے سیکھ لیں اور جو بندھی ہوئی چیزیں بتادی جائیں انہیں یاد کر لیں
 بلکہ علم انفرادی مسرت کا ایک مثبت ذریعہ ایک انفرادی نصب العین ہوگا۔ چنانچہ
 اگر سندیں اور ڈگریاں منسوخ کر دی جائیں، امتحانی نمبروں کا طریقہ ختم کر دیا جائے
 ان کو کوئی اہمیت نہ دی جائے تو علم کا حصول ایک مثبت کام بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت
 میں طالب علم بار بار اپنے سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر مجھے
 ڈگری حاصل نہیں کرنی ہے۔ اور امتحانی نمبر وغیرہ فضول چیزیں ہیں تو میرے علم
 حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے۔؟ لیکن موجودہ صورتِ احوال میں یہ سوال طالب علم کے
 ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اس کا جواب گھڑا گھڑا یا موجود ہے۔ کہ تحصیل
 جماعتوں کے بعد اونچی جماعتوں میں جاتا ہے، چنانچہ پڑھنا پڑے گا۔ اور
 امتحان بھی دینے ہوں گے۔ مگر علم کے حصول کے یہ اسباب بخارجی ہیں اور ان
 کو ترک کرنا ہی پڑے گا کیونکہ علم کا حصول ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس میں کسی دوسرے
 کا عمل دخل کسی خارجی سبب کی لاگ نہیں ہونی چاہیے۔ اور آج کل یہ حالت ہے کہ
 بہت سے طلباء تو یونیورسٹی کے رجسٹرار کٹوسے پڑھتے ہیں اور جو نیک لڑکے ہیں
 وہ اپنے والدین سے اپنے استادوں یا اپنی
 ہونے والی بیویوں کیلئے علم حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ ان والدین کے سامنے احسان نا
 شناس نہ ٹھہرائے جائیں جو انہیں تعلیم دلوانے پر اتنا خرچ اٹھا رہے ہیں یا وہ اس
 استاد کے سامنے اچھے بنیں جو ان سے ہنس بانی کا سلوک کرتا ہے اور انہیں
 محنت سے پڑھاتا ہے یا یہ کہ وہ تعلیم ختم کر کے کسی اچھی جگہ ملازم ہو جائیں اور اچھی

خواہ پائیں تاکہ اپنے اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں۔

میرے نزدیک یہ سائے تصورات اخلاق سے گرے ہوئے ہیں
علم کا حصول ایک ذاتی مسئلہ ہونا چاہیے جس میں کسی دوسرے کا، یا کسی خارجی سبب
کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں تعلیم مفید اور مثبت طاقت بن
سکتی ہے اور علم کا حصول غذاب کے بجائے گہری مسترت بن سکتا ہے۔

۴۔ آرٹ تفریح اور شخصیت

آرٹ تخلیق بھی ہے اور تفریح بھی۔ مگر میرے خیال میں آرٹ تفریح
کی حیثیت سے یا روح انسانی کے خالص کھیل کی حیثیت سے زیادہ اہم ہے۔
میں تخلیقی کام کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ یہ تخلیق مقصوری کی صورت میں ہو یا تعمیر
کی صورت میں۔۔۔۔۔ یا ادب کی صورت میں سامنے آئے۔
پھر بھی میرا خیال ہے کہ تھے آرٹ کی روح اسی صورت میں عام ہوگی اور معاشرے
کے رگ و پے میں سما سکے گی کہ بہت سے لوگ آرٹ سے بطور تفریح خط اٹھائیں
وہ آرٹ کی تخلیق کریں لیکن ان میں سے کسی کو بھی زندہ جاوید بن جانے کی امید نہ ہو
آج کل یہ صورت ہے کہ ہر کالج ایسا کھلاڑی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ملک
بھر کے لئے باہر ناز ہو۔ میرے نزدیک زیادہ اہم یہ بات ہے کہ کالج کا ہر لڑکا ٹینس
یا فٹ بال معمولی طریقے پر کھیل سکے اور کالج خواہ کوئی نامور کھلاڑی پیدا
نکرسے۔ اسی طرح یہ بات زیادہ اہم ہے کہ ایک ملک کے تمام بچے اور سب بالغ
لوگ مشغلے کے طور پر کچھ نہ کچھ تخلیق کر سکیں۔ یہ اہم نہیں کہ ایک پوری قوم صرف ایک عظیم

فن کار پیدا کر دکھائے۔ میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ سکول کے ہر بچے کو کوزہ گری اور مجسمہ سازی سکھانی جائے اور ہر کاروباری شخص ہر اقتصادی ماہر ہر ملازم اپنے لئے خود عین کارڈ قسم کی چیزیں بنائے۔ یہ کوئی بات نہیں کہ چند آرٹسٹ پیشے کے طور پر پوری قوم کے لئے یہ چیزیں تیار کرتے رہیں۔

دوسرے نظروں میں یوں کیئے کہ میں زندگی کے ہر شعبے میں "شوقیہ مہارت" کا قائل ہوں! پیشہ ورانہ کمال کا حامی نہیں۔ میں عطلاتی فلسفیوں، شوقیہ گلے والوں، شوق کی خاطر شاعری کرنے والوں، فوڈ گرافروں، جادو کے کھیل اور کرتب دکھانے والوں، حیاتیات کے شوقیہ ماہروں، ہوا بازی کے شوقینوں اور مہاروں کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ ایک دوست کسی شام کے دھند کے میں کوئی نغمہ معمولی طور پر لیتے سے بھی بجا کر سنائے تو مجھے اتنا ہی لطف آیا جتنا وہی نغمہ کسی نہایت صاحب کمال پیشہ ور ساز نواز سے سننے سے آ سکتا ہے۔ رہے جادو کے کھیل تو ہر شخص اپنے دوست کے کرتبوں سے خوب لطف اٹھاتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے بلکہ انھیں شیکسپیر کا کوئی ڈرامہ اسٹیج پر دیکھ کر بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوقیہ کاموں اور خصوصاً شوقیہ آرٹ میں بے ساختگی زیادہ ہوتی ہے اور سچے آرٹ کی بنیادی خوبی یہی برجستگی ہے۔ چین میں اسی لئے مصوری کو اہل علم کا شوق سمجھا جاتا ہے اور اسے پیشہ آرٹسٹ کا کام نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اگر کھیل اور شوق کا جذبہ قائم ہے تو آرٹ تجارتی اور کاروباری نہیں ہونے پاتا ورنہ دوسری صورت میں ہر کام کی طرح اس میں بھی کاروبار دخیل ہو جاتا ہے۔

کھیل کا خاصہ ہے کہ اسے بلا وجہ کھیلا جائے اور اس کی کوئی جواز موجود نہ ہو۔ کھیل کا بنیادی سبب خود کھیل ہے۔ انسانی ارتقاء کی سبب سے اسے اس منظر پر لے کر آئے۔

ہے۔ حسن وہ چیز ہے کہ اسے بقا کی کش مکش سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حسن کی ایسی صورتیں بھی ہیں کہ خود جانوروں کی برادری کیلئے بھی تباہ کن ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بارہنگے کے خوب بڑھے ہوئے سینگ اپنی جگہ حسن کی تصویر ہوں گے۔ لیکن اس جانور کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہوئے ہونگے۔ ڈارون کو یہ بات سوچھگئی تھی بتاتا اور حیوانات کی دنیا میں اتنا حسن موجود ہے کہ اس کا سائنسی سبب نہیں بتایا جاسکتا اس لئے اس نے جنسی انتخاب کا مسئلہ وضع کیا اور ارتقاء کے اصول میں اسے ایک ثانوی مگر اہم سبب قرار دیا۔

چنانچہ اگر آرٹ کو ہم انسان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کا ایک ناپ رزومت سے بھی ناپنا حصہ نہ سمجھیں اور یہ محسوس نہ کریں کہ آرٹ بذاتہ ایک آوازِ غیر پابند چیز ہے اور محض اپنی خاطر زندہ ہے تو آرٹ کے معنی ہماری سمجھ میں کبھی نہیں آسکتے۔ یہ وہی رسوائے زمانہ نظر ہے جسے "فن برائے فن" کا نام دیا گیا ہے۔

میں اسے ایسا مسئلہ نہیں سمجھتا جس پر سیاست دانوں کو کچھ کہنے سننے کا حق حاصل ہو۔ میں اسے ایک ایسی ناقابل تبدیل حقیقت گردانتا ہوں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر فنی تخلیق کا ماخذ، منبع اور مبداء جسمانی قوت ہے اور بس اسے شہر نے اپنی قوت کے زعم میں جدید آرٹ کی بہت سی قسموں کو اخلاق سے گری ہوئی قرار دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں جن مصوروں نے اس ڈکٹیٹر کو خوش کرنے کے لئے اس کی تصویریں بنائیں اور جرمینی کے آرٹ میوزم میں ان کی نمائش کی گئی وہ مصور اخلاق کے لحاظ سے جید گھٹیا لوگ تھے کمرشل آرٹ بھی صحیح فنی تخلیق کی مدح کا طوق ہے مگر سیاست تو آرٹ کو بالکل مردہ کر دیتی ہے کیونکہ آزادی آرٹ کی روح ہے مگر ہمارے موجودہ زمانے کے آمر حکمران سرکاری حکم دے کر سیاسی آرٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں یہ

۴۳۳
آرٹ تفریح اور شخصیت
معلوم نہیں کہ جس طرح طوائف سے سچی محبت خریدنا ممکن ہے یا کسی طرح تلوار کی نوک پر آرٹ
کی تخلیق کرنا بھی ممکن نہیں۔

آرٹ کی روح کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم آرٹ کو انسانی قوت کا ایک از
حصہ سمجھ لیں۔ اور اس سے جسمانی اسباب پر غور کریں۔ یہی وہ چیز ہے جسے آرٹ کی تخلیقی
ایک کا جذبہ کہاجاتا ہے آرٹ کی تخلیق کے سلسلے میں عام طور پر سناجاتا ہے کہ اس کا منبع
وجدان ہے اور یہ کہ صحیح آئے ہیں غیب سے یہ مضا میں خیال میں گویا آرٹسٹ خود نہیں
جاننا کہ وہ تخلیقی بہرہ وہ جذبہ کہاں سے دل میں در آیا۔ یہ اس طرح کی ایک داخلی اکساہٹ
ہوتی ہے جو سائنس دان کے دل میں حقیقت سے انکشاف کیلئے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ طبع
نتیجے جزیروں کی دریافت کے لئے چنگیاں لیا کرتی ہے۔ اس کا اظہار مشکل ہے
لہ اس کی ماہیت ہی بیان کی جاسکتی ہے۔

آج ہمیں جیاتیات سے علم کی بدولت یہ معلوم ہو چکا کہ ہماری ذہنی زندگی کا
نظام ان پارمون ذرات کی کمی بیشی اور تقسیم سے ترتیب پاتا ہے جو ہمارے خون میں
ہوتے ہیں۔ یہ ذرات مختلف اعصاب پر اثر ڈالتے ہیں اور ان اعصاب کو متاثر کرتے ہیں جو
ہمارے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہیں۔ غصہ اور خون بھی خون میں اکھیں ذرات کی کمی بیشی
سے پیدا ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں، غیر معمولی نظامت یہی ہے کہ بعض انسانی جسموں کے
مندد خاص قسم کا لعاب زیادہ پیدا کرتے ہیں اور ایسا انسان فطری یا جینیسی کہلاتا ہے
چین کے ایک گنام ناول بھارتی نے کہا تھا انسانی جسم کی حرکت اور اس کا سدا کام
اس وجہ سے ہے کہ انسانی جسم میں بعض جگہ کپڑے ہوتے ہیں اس سبب پارے کی رسائی
جدید زمانے کی طبی معلومات اور خونی ذرات تک نہ تھی مگر اس نے ان کیروں کا پتا
چلا ہی لیا جو ہر انسانی فعل کے ذمہ دار ہیں مثلاً خود درنا کیلئے۔ یہی ناکہ خاص قسم کے

کیرٹے ہماری آنکھوں کو کھاتے رہتے ہیں اور انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی نفسانی خواہش پوری کر کے رہے۔ پھر ہر انسان کو بڑبڑانے کی خواہش ہوتی ہے انسان کو دوسروں پر فوقیت جتانیکا بھی جھٹھے۔ انسان کے دل میں شہرت اور اقتدار کی بھوکا بھی ہوتی ہے۔ یہ سب کیا ہیں۔ یہ انھیں "کیرٹوں" کا معاملہ ہے جو اس وقت تک آسودہ نہ ہوں گے۔ جب تک انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیگا۔ کسی کتاب کی تصنیف بھی کیرٹوں کی ایک خاص قسم کی بدولت ہے جو مصنف کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کسی وجہ کے بغیر بچے بکتا ہی رہے۔ اس لئے ہارمون اور "کیرٹوں" کے درمیان انتخاب کا معاملہ پیش ہو تو میں کیرٹے کی اصطلاح تیار نہ پسند کروں گا کہ یہ زیادہ واضح اور سادہ ہے۔

جس شخص میں ان کیرٹوں کی ایک خاص مقدار ہوگی۔ یا معمول سے زیادہ مقدار ہوگی۔ وہ کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے پر مجبور ہوگا کیونکہ اب وہ تخلیق کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کسی بچے کو دیکھیے۔ اگر اس میں عمر کی رعایت سے زیادہ مہمت ہو تو وہ چلنے کے بجائے گود پھاند زیادہ کیا کرتا ہے۔ یہی وافر قوت اگر بڑے آدمی میں ہو تو اس کی چال ناچ اور مورچہ پھال بن جاتی ہے۔ چنانچہ ناچ بھی فضول قسم کی چال ہے۔ فضول اس لئے کہ اس میں انارہت کے خیال سے رجھالیاتی نقطہ نظر سے نہیں) قوت زیادہ خرچ ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ ناپنے والا کمرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لئے سیدھا چلنے کے بجائے نیم دائرے کی صورت میں پینترے بدلتا ہوا چلتا ہے پھر بھی ناچ اپنا آرٹ ہے کہ کوئی شخص ناچتے ہوئے جب اولٹنی کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص کو حکم دیدیا جاتے کہ وہ سر یاہ دانانہ یا فاشی نظام یا اشتراکی نظریے کے مطابق رقص کرے تو رقص سے تفریح کا سارا عنصر قائب ہو جائیگا اور وہ عین بے ساختگی نہ رہے گی جو ناچ کا اصل مقصد ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کیونسل

سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہے یا پارٹی سے اپنی وفاداری ثابت کرنا چاہے تو ایسے موقع پر اسے قدم قدم چلنا چاہیے 'ناخپا ہرگز' نہ چاہتیے اصل میں ہمارے کیونستھ بھائی کام اور محنت کے تقدس کو تو خوب سمجھ گئے ہیں مگر کھیل کا مقدس ہونا ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مہذب آدمی آج کل کی مہذب دنیا میں پہلے ہی سے ضرورت سے زیادہ کام کر رہا ہے۔ آج کل انسان جتنا کام کرتا ہے حیوانات میں کسی نوع کسی نسل کا جانور اتنا کام نہیں کرتا۔ آج کل کے انسان کے پاس فرصت اور فراغت کا وقت بہت کم ہے کھیل اور آرٹ کے لئے اسے اس سے بھی کم وقت ملتا ہے۔ اس پر ان چند لمحات کے لئے بھی یہ کہہ دیا جائے کہ انھیں اس عفریت یعنی حکومت کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے بڑھ کر زیادتی اور کیا ہوگی!

سو قرار پایا کہ آرٹ کی ماہیت اصلی اور اس کی حقیقت کھیل اور صرف کھیل (مشغلہ) اس نظریے کی روشنی میں آرٹ اور اخلاقیات کا تعلق سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے 'حسن' محض حسن ترکیب یا حسن عمل ہے۔ اور یہ حسن چال چلن 'برتاؤ' کے علاوہ اچھی تصویر یا کسی خوب صورت پل میں بھی نظر آتا ہے۔ آرٹ مقصدی موسیقی اور تصوی سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ دنیا کا ہر چیز میں حسن ترکیب ممکن ہے۔ کسی دوڑ میں دوڑنے والے کو دیکھتے اس میں بھی حسن ترکیب نظر آئے گا کوئی شخص اگر بچپن اور جوانی سے پختہ عمری اور بڑھاپے تک حسن ترکیب سے زندگی بسر کرے تو یہ حسن ترکیب نمایاں اور ناقابل تردید ہوگا۔ انتخابی مہم اگر اچھی لڑی جائے تو اس میں بھی حسن ترکیب ہوگا اور اگر سہسی امید کھو گئے میں اسی نفاست کا لحاظ رکھا جائے جس طرح پرلے چین کے عہد بدار رکھتے تھے تو اس میں بھی حسن ترکیب نظر آئے گا۔ ہر انسانی فعل ہیئت اور اظہار سے مرکب ہے اور اظہار کی ہر صورت آرٹ کی نوعیت میں آتی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے

کہ انہار سے آرٹ کو محض موسیقی، رقص اور مصوری کے گئے تھے شجروں ہی تک محدود کر دیا جائے۔

آرٹ کی یہ ایک عمومی تعریف ہوئی۔ لیکن اس کے مطابق یہ طے پایا گیا کہ اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں حسن ترکیب اور آرٹ میں حسین شخصیت دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور دونوں کی ایک جیسی اہمیت ہے۔ اس کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری ہر جسمانی حرکت میں وہی نقاست ہو جو کسی نظم کی حرکت و غما میں ہوتی ہے۔ پس اگر ہم میں قوت کا وہ فرقہ موجود ہے تو ہم جو کچھ کریں گے اس میں ایک خوش اسلوبی، ایک حسن ادا، ایک حسن ترکیب ضرور ہو گا۔ یہ خوش اسلوبی اور لطافت جسمانی قوت کی بدولت پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کوئی کام دوسروں سے بہتر طریقے پر کر رہا ہوں۔ یعنی زیادہ حسین انداز میں۔ کر سکتا ہوں۔ نظریاتی اعتبار سے نہیں بلکہ حسن ہر شخص کے کام میں نظر آئے گا جو اچھا کام کر رہا ہو گویا کسی کام کو عمدہ انداز و بصانت طریقے پر کرنے کی خواہش، جمالیاتی اچھے قرار پائی۔ اس نظریے سے مطابق عملگی سے کیا ہوا قتل، خوبی سے انجام کو پہنچانی جانے والی سازش بھی حسین چیز ہوگی چاہے یہ کام اپنی جگہ کتنے ہی بُرے اور قابل مذمت کیوں نہ ہوں۔ زندگی کی ٹھوس تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے کاموں میں خوش اسلوبی، حسن ادا اور صلاحیت سب کا مظاہرہ موجود ہے یا کیا جاسکتا ہے۔ کسی چیز کی یا کسی شخص کو اچھی طرح مناسب داد دینا ایک حسین داد کہلاتے گا۔ اور جس داد سے بد مذاقی جھلکتی ہوگی اسے داد نہیں، بیداد کہیں گے۔

چین میں تیسری اور چوتھی صدی میں چن خاندان حکمران رہا اس خاندان کے بعد حکومت کے آخر میں گفناؤ زندگی اور ذاتی آرام کی برکتیں عروج پر نظر آتی ہیں۔

یہ وہی زیادہ ہے جب با فراغت گفتگو کا ناٹھن چلا تھا اور تکلف اور نفاست کی انتہا
 نسائی ملبوسات پر ہوتی تھی۔ حسین لوگوں کی مجلس کی نہ تھی۔ بڑی خوبصورت ڈاڑھیاں رکھنے
 کا بھی رواج اور مردانہ ڈاڑھیاں سے ساتھ اور جید ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں
 نظر آنے لگے۔ یہ لباس اس طرح کا تھا کہ اگر جسم سے کسی حصے کو سہلانا یا کھجانا چاہیں تو ہر
 حصے تک ان کپڑوں میں سے ہاتھ جاسکے۔ ہر کام میں خوش اسلوبی اور نفاست اور
 آئی تھی۔ اسی زمانے میں چودھری مورچھل کا رواج ہوا۔ وضع یہ تھی کہ گھوڑے کی دم کے بال
 ایک لکڑی کے سرے پر نفاست سے باندھ دئے جاتے اور اس سے مکھیاں
 اور پھر اڈانیکا کام لیا جاتا۔ یہ مورچھل گفتگو سے موقع پر بڑی اہم چیز تھی کہ باتیں ہو رہی
 ہیں اور ہاتھوں میں مورچھل ہل رہے ہیں۔ چنانچہ آج بھی اہلیان اور وادت کی گفتگو
 کو چوتان، مورچھل کی گفتگو کہا جاتا ہے۔ دستور یہ تھا کہ گفتگو کے دوران میں چودھری مورچھل
 ہاتھ میں رہے اور اسے بڑی نفاست سے ہوا میں ہلاتے رہیں۔ یہی حال پنکھیا
 کلبے کے پنکھیا بھی گفتگو کا ایک حسین لازمہ ہو گئی۔ بات کرنے والا اسے کھولتا، ہوا میں
 ہلاتا پھر بند کر دیتا۔ چنانچہ کیا چوکیا پنکھیا، دونوں گفتگو کے انداز میں اسی طرح حصہ گیر
 ہوتے ہیں جیسے سیر کا اسلوب ہاتھ کی چھری کا مہارا سیتل ہے۔

مغرب میں زندگی کی نفاستوں میں سب اعلیٰ نفاست مجھے یہ نظر آئی کہ پریشا
 رجرمنی کے رتیں نادے دیوان خانوں میں۔ کسی خاتون کا سامنا کرتے ہی
 ایڑیاں فوجی انداز میں ملا کر جھک جاتے ہیں اور جرمن رٹھکیاں ایک بگ دمہ رنگ
 کے پچھے لے جا کر بڑے حسین انداز میں کورنش سجالاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ بڑی خوبصورت
 چیز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کا رواج کچھ کچھ اٹھتا جا رہا ہے۔
 خوش تیزی اور آداب کے بہت سے طرز طریقے ہیں جن میں رائج ہیں اس

سلسلے میں انگلیوں، ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت کو بڑی احتیاط اور محنت سے رواں کیا جاتا ہے۔ مانتو لوگوں میں سلام کا طریقہ بڑا حسین ہے مثلاً ایک شخص آپ سے ملنے کرے میں آیا ہے۔ وہ ایک بازو سیدھا جسم کے ساتھ لگا دے گا، ایک ٹانگ کو ذرا سا جھکا گا اور سارا بدن فوراً جھکا کر سیدھا کر لے گا۔ اگر کرے میں آپ کے علاوہ اور حضرات بھی موجود ہیں تو وہ اسی حالت میں اپنی سیدھی ٹانگ کی اٹری پر گھومے گا اور اس طرح حاضرین کی خدمت میں جموعی طور پر آداب سجا لائے گا۔ رہی ہاتھوں اور انگلیوں کی حرکتوں میں نفارست تو چین میں کسی اعلیٰ شاطر کو ذرا شطرنج کے تختے پر ہرے رکھتے اٹھاتے دیکھے۔ اسی طرح قدیم چین کے افسر طبقے کے لوگ غصے کے وقت نہایت خوبصورت حرکتیں کرتے تھے۔ وہ نہایت حسن دخول سے اپنی آستین جھٹکتے اور دایاں بازو یا دونوں بازو ہلاتے ہوئے گرسے۔ یہ باہر بھل جاتے تھے۔

کسی چینی عہدہ دار کا انداز گفتگو بھی سننے کی چیز ہے۔ لفظ اس سے منہ سے عیب خوش الحافی سے ادا ہوتے ہیں۔ اور پکینگ کے لہجے کا حسین آہنگ اس کی ادائیگی میں موسیقی سے پوسے زبرد بگم تے ظاہر ہوتا ہے۔ الفاظ کے حرف دمج و جہت واضح طور پر ادا ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ عہدہ دار صحیح معنی میں عالم بھی ہو تو پھر کیا کہنا۔ وہ ہر فقرے میں چینی ادب کے شہ پائے پیش کرنے پر قادر ہوگا۔ پھر اس افسر طبقے کی سنسی اور تھوکنے کا انداز تو خاص کی چیز ہے۔ خصوصاً سنسی تو بڑی غنائی لے کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔ اس میں تھوڑا سا قطع تھوڑا سا تکلف بھی جھکا جاتا ہے مگر اس کا اختتام پڑا بھر پور ہوتا ہے اور اگر اس سنسی کے ساتھ اس حاکم سے سفید ڈاڑھی بھی ہو تو اس کا لطف و اثر دو بالاً سمجھے۔

یہ سنسی ادا کا بدلے کے لئے ان کی تمام تر ادکاری کا بہت اہم حصہ ہے۔

ان اداکاروں کی ہنسی بڑی احتیاطاً بڑی مشق کا نتیجہ ہوتی ہے اور جب چینی ایسٹج پر کوئی اداکار نہایت خوبصورت طریقے پر ہنسی ادا کرے تو تماشاخانے کے ساتھ تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیا کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہنسی بڑی مشکل چیز ہے۔ کیونکہ ہنسی کی ایک نہیں کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً مسرت کا اہتمام کسی کو دھوکہ دے کر اپنے حیاں میں پھنسا لینے پر فتح مندی کی ہنسی استہزا اور سخاوت کا زہر خند وغیرہ۔ ان میں سب سے مشکل مایوسی کی تلخ ہنسی ہے۔ یہ اس شخص کی ہنسی ہے جسے حالات کی زبردست قوت نے بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہو۔ چین میں تھیٹر کے شوقین ان چیزوں کا بڑا حیاں رکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اداکاروں کے ہاتھوں کی حرکات ان کے قدموں کی چاپ کیا ہے اور کیسی ہے۔ بانڈوں کی ہر حرکت گردن کا ہر خم سر کا ہر خفیف سے خفیف جھکاؤ اکڑ کا خم کھلی آستینوں کا ہر اتنا چال کا ہر قدم پر چینی اداکاروں کی زبردست مشق اور مہارت کا ائینہ دار ہو گا۔ چینی روایات کے مطابق اداکاری کے دو حصے ہیں ایک تو گانا اور دوسرے کوہی اداکاری۔ چنانچہ "گانے" کے ڈرامے الگ ہوتے ہیں اور "اداکاری" کے ڈرامے ان سے مختلف "اداکاری" سے مراد انسانی جسم ہاتھ پاؤں، چہرے کی حرکات سکنا سے انسانی جذبات کی عکاسی اور اظہار ہے۔ چینی اداکاروں کو یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ ناراضی میں سر کیڑ کر ہلایا جاتا ہے، تنک کی حالت میں بھوپ کس طرح ہلتی ہیں۔ اور اطمینان و سکون کے لمحوں میں ڈار ڈھی پر ہاتھ کس طریق سے پھیرا جاتا ہے۔

اب اس مرحلے پر پہنچ کر آرٹ اور اخلاقیات کی بحث شروع ہوتی ہے۔

فانسی ملکوں اور اشتراکی ملکوں میں آرٹ اور پراپگنڈے کو کچھ بے طرح گڈ بڈ کر دیا گیا ہے۔ اور بعض جمہوری ملکوں میں بھی بہت سے اہل رماغ اور دانشوروں نے پراپگنڈے

اور آرٹ کے اس غیر قدرتی ملاپ کو بڑے بھوپن سے قبول کر لیا ہے۔ اسلئے یہ فردی ہے کہ اس مسئلے پر صاف اور واضح بحث کی جائے تاکہ اہل ذوق تمیز کر سکیں فاشی نظام اور اشتراکی نظام دونوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ فرد کو نہ تو تخلیقی شخصیت مانتے ہیں اور نہ اس کو تخلیق کی منزل سمجھتے ہیں بلکہ اس سے پوری طرح چشم پوشی کرتے ہیں اور فرد کے بجائے یا تو ریاست یا کسی معاشرتی طبقے کو تخلیق کی منزل اور تخلیق کا بیج قرار دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ آرٹ اور ادب دونوں کی بنیاد اور دونوں کی تعمیر ذاتی اور انفرادی جذبات پر ہوتی ہے۔ مگر اشتراکی اور فاشی دونوں نظریے ایک ہی طبقے کی جذباتی کش مکش پر زور دیتے ہیں یا صرف ایک معاشرتی گروہ کے جذبات کو قابل اہمیت سمجھتے ہیں اور مختلف افراد کے جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ ان کی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ فرد کی شخصیت مرد قرار پاتی ہے اور آرٹ اور اخلاقیات کے مسئلے پر معقولیت سے بات کر نیکاً سوال و جواب سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ آرٹ اور اخلاقیات کا آپس میں ناتا صرف اسی حد تک ہے جس حد تک کسی فن پارے کی انفرادی خصوصیت فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے اور بس۔ چنانچہ عظیم شخصیت رکھنے والا فنکار عظیم آرٹ تخلیق کرتا ہے اور بے حقیقت شخصیت کا فنکار صرف بے مایہ اور بیچ ملکن فن پیش کرتا ہے جس فنکار کی شخصیت عاجز باقی ہوگی وہ جذباتی آرٹ کی تخلیق کرے گا عشرت پسند آرٹ یا آرٹ پیش کرے گا جس سے جسمانی تعیش اور لذتوں کا رنگ پھوٹ پھوٹ کر نکلے ثقافت اور زمی جس فنکار کی شخصیت سے جوہر ہوں گے وہ نفسی نزم و نازک

اب بھی آرٹ کی تنقید کو "مستوری کی شخصیتیں" قرار دیا جاتا ہے۔

چنانچہ چین میں یہ مسئلہ ہے کہ فن کار کا کام اس کی اپنی شخصیت کے تابع ہے۔ اس شخصیت میں اخلاقی اور فن کارانہ دونوں خصوصیتیں اور دونوں کے تقاضے شامل ہیں۔ اس شخصیت کی بدولت ہی انسانی برادری کو سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، عالی خیالی پیدا ہوتی ہے، زندگی کو ایک خارجی نقطہ نظر سے دیکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ دل سے گھٹیا پن طبیعت سے تنگ خیالی اور غایبانہ پن دور ہو جاتا ہے۔ ان معنی میں یہ شخصیت وہی چیز ہے جسے انگریزی تنقید میں "انڈاز" اور "اسلوب" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک راہ رویا جنت پسند آرٹسٹ آزاد اور غمیر قدامت پسند قسم کے اسلوب کا مالک ہوگا۔ دکھش شخصیت کا مالک اپنے آرٹ میں وہی دکھش اور نزاکت سموے گا اور ذوق سلیم کا مالک عظیم فن کار کسی خاص ڈھب، کسی خاص اسلوب کا غلام ہو کر نہ رہے گا۔ ان معنی میں شخصیت آرٹ کی روح رواں ہے۔ اہل چین کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ اگر مصور کی اخلاقی اور حیاتیاتی شخصیت عظیم نہیں تو وہ کبھی مصور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خطاطی اور مستوری دونوں کا اندازہ کرتے وقت کہاں فن کی سب سے بڑی شرط یہ نہیں ہوتی کہ آرٹسٹ کی تکنیک اچھی ہے یا نہیں بلکہ معیار یہ ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت ارفع اور اعلیٰ ہے یا نہیں۔ اہل چین جانتے ہیں کہ کوئی فن پارہ اعلیٰ تکنیک کا مظاہرہ کر سکتا ہے مگر یہ اعلیٰ تکنیک بھی آرٹسٹ کی گھٹیا شخصیت کو نہیں چھپا سکتی۔ اگر وہ گھٹیا ہے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ بقول انگریزوں کے اس فن پارے میں کوئی خوبی کر دار "نظر نہیں آتی"۔

اب ہم آرٹ اور تمام فنون لطیفہ کے مرکزی اور سب سے اہم مسئلے تک

اور لطیف آرٹ ہی تخلیق کر سکیگا۔ گویا آرٹ اور اخلاقیات کا ناتا مختصر طور پر یہ ہے جو میں نے عرض کیا۔ اس لئے اخلاقیات ایسی چیز نہیں ہے جسے کسی جابر مسکران کی خواہش پر یا پراپیگنڈے کے اعلیٰ افسر کے ہر آن بدلتے ہوئے اخلاقی اصولوں کے مطابق آرٹ پر باہر سے ٹھونساجا سکے۔ اخلاقیات آرٹ کے باطن ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رفن کار کی روح تخلیق اس کے وجدان کا قدرتی ذریعہ انہماک ہے پھر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس میں انتخاب کا اختیار ہمیں حاصل ہو بلکہ اس کی حیثیت ایسی حقیقت کی ہوتی ہے جس سے کسی طرح کا نفر کوئی گریز ممکن نہیں۔ کینہ فطرت کا فن کار کچھ گزہر گز کوئی عظیم تصویر نہیں بنا سکتا۔ اس طرح بڑے دل والا فنکار کبھی گھٹیا تصویر نہیں بنا سکتا چاہے اس کی زندگی خطرے میں ہو

چینی نظریہ یہ ہے کہ آرٹ میں ایک ایسا عنصر ہے جسے پی ان کہا جاتا ہے۔ اسی چیز کو فرد کی شخصیت (پن پی ان) بھی کہا جاتا ہے۔ یا اسی کو کردار کی انفرادیت خصوصیت (پی ان) کہہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس شخصیت اس کردار کی انفرادیت وغیرہ کے کئی گریڈ ہیں۔ اور کسی شخص کی شخصیت کے بائے میں اس کے معیار کے بائے میں نفلوں اور ترکیبوں کا ایک پورا دفتر موجود ہے۔ مثال کے طور پر جو بخاری کہتے ہوئے بدتمیزی اور چرچرین کا مظاہرہ کرے اس کے بائے میں کہا جائے گا کہ وہ "بری جواری شخصیت" کا مالک ہے۔ کوئی پنی والا پی کر خسرستیوں پر اتر آئے تو اسے نرشی کی بری شخصیت" کا مالک ٹھرایا جاتا ہے۔ مشط رنج کے بارے میں بھی ایسی ہی اصطلاحیں موجود ہیں۔ اور شعور ادب یا آرٹ میں بھی اسی طرز پر ہی ہم گردانا جاتا ہے۔ چین میں شعری تنقید کی سب سے پہلی کتاب "شاعری کی شخصیتوں کے نام سے معروض ہے جسے ۵۰ عیسوی کے لگ بھگ چنگ یونگ نے لکھا۔ اب

آگے ہیں چین کے ایک بڑے جرنیل اور وزیر اعظم سنگ کو فان نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ خطاطی میں آرٹ کے دو نندہ اصول کار فرما ہیں یعنی ہدیت اور انہار۔ اس عہد کے سب سے بڑے خطاط ہوساؤچی نے جزل سنگ کے اس نظر توجی کی تائید کی ہے۔ اور اس کی بصیرت کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ چونکہ فنون لطیفہ تمام سے تمام ٹھوس حقیقت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے سلسلے میں ایک مشینی مسئلہ درپیش رہتا ہے اور یہ مسئلہ تکنیک کا ہے اور تکنیک کی جہارت ہر حال میں ضروری ہے۔ مگر آرٹ چونکہ صرف تکنیک کا نام نہیں بلکہ آرٹ روح کا جوہر بھی ہے۔ اس لئے تخلیق فن کے ہر شعبے کے لئے ذاتی انہار بڑا ضروری عنصر ہے۔ فنکار کی انفرادیت ہی وہ چیز ہے جو اس کی تکنیک کے مقابلے میں اس فن پارے کی نمایاں خصوصیت بنتی ہے۔

اس اصول کو اگر انشا پر دازی پر لاگو کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں سب سے اہم چیز مصنف کا ذاتی اسلوب اس کے ذاتی احساسات ہیں جو اس کی پسند ناپسند تھا چند اس کے نظریوں اور خیالات کے روپ میں آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فن کار کے لئے ہمہ وقت خطرہ موجود ہے کہ یہ ذاتی انہار یا "شخصیت" کہیں تکنیک ہی میں دب کر نہ جائے۔ مقبلیوں کے لئے کیا انشا کیا مقصوری کیا اور کیا ہر سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوا کرتی ہے کہ اپنے آپ کو اس فن پارے میں کھو کیوں کر دیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مقبلی ہمیشہ ہدیت اور تکنیک سے خوفزدہ رہتا ہے لیکن یہ یاد ہے کہ کوئی تکنیک کوئی ہدیت ذاتی عنصر کے بغیر کام کی نہیں۔ ہدیت کا حسن خاص سچک رکھتا ہے۔ اور یہی سچک دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ چاہے یہ گالف کھیلنے والے کے ڈنڈے کی جیش کا بانگین ہو یا نٹ بال

ثقافت کے مزے

کھیلنے والوں کا کھیل ہو۔ یہ لچک اپنے اندر لانی اور برجستگی رکھتی ہے اور اظہار کے لئے زردانی ہی ایک ضروری چیز ہے۔ اظہار کی قوت کے سامنے تکنیک رکاوٹ نہیں بن سکتی بلکہ یہ قوت تکنیک کی حد بندیوں کے اندر بڑی آزادی اور خوش اسلوبی سے حرکت کیا کرتی ہے۔

گویا ہر آرٹ کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ اس میں قوت کا کردار ہو۔ یہ قوت کردار کیا چیز ہے؟ یہ وہی عنصر ہے جو کسی فن پارے سے فنکار کی شخصیت یا اس کی روح یا اس کے دل کے بارے میں دیا بقول اہل سین "فنکار کے سینے" کے بارے میں عیاں ہوتا ہے۔ اس قوت کردار "نور اس شخصیت" کے بغیر وہ فن پارہ بے جان ہے۔ تکنیک کا کوئی حسن اس کا کوئی کمال اس فن پارے کو بے جان اور بے روح ہونے سے بچا نہیں سکتا۔ یعنی انفرادیت کی اس معراج کے بغیر "شخصیت" کہتے ہیں خود حسن بھی فرسودہ اور پیش پا افتادہ ہو جاتا ہے۔ جو حسین لڑکیاں دن رات ہانی ڈوڈ کی اسٹار بننے کے خواب دیکھا کرتی ہیں وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ حسن انفرادیت کی معراج کا نام ہے۔ یہ بے چاری کسی نامور اداکار مثلاً جین ہارویا مارن ڈیڑچ کے انداز کی نقل کر کے خوش ہوتی ہیں اور جو ڈرامے پکڑنے سے چہرہ کی تلاش میں پھرتے ہیں وہ ان لڑکیوں کو دیکھ کر سخت بیزار ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہم اپنی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ انفرادی حسن کم نظر آتا ہے۔ بس وہی ایک ہی قسم کی ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی فرسودہ سی نقشیں کھل جاتی ہیں بہت ہیں جن میں کوئی تازگی، کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔ فنون لطیفہ ایک ہیں اور ہر ایک کا بنیادی اصول ایک ہے، یعنی اظہار اور شخصیت۔ چاہے یہ آرٹ اداکاری ہو تصویر کشی ہو یا ادبی کاوشیں ہوں۔ عظیم اداکاروں کی اداکاری دیکھ کر کوئی چاہے تو نثر نگاری کے تمام اسرار و رموز سیکھ

کتاب ہے۔ گویا شخصیت کی دیکھی ہر آرٹ کے نئے بنیادی طور پر فردی ہے۔ کیوں کہ آرٹسٹ،
چاہے کچھ کرے اس کی شخصیت اور اس کا کردار اس کے آرٹسٹ میں مزید جھلکتا
ہے۔

شخصیت کی تبدیلی اخلاقی اور جمالی دونوں لحاظ سے ضروری ہے۔ اور
اس کے نئے علیت اور شائستگی دونوں لازمی ہیں۔ شائستگی ایسی چیز ہے جو
ذوق سلیم کے قریب تر ہے۔ لیکن ہے کہ ذوق سلیم کے ساتھ ہی طبیعت کی یہ شائستگی
اور شائستگی فنکار کو قدامت سے ملے ہوئے۔ مگر علیت دوسری چیز ہے اور یہ دارنہ ہے
کہ کہنی زن پاسے کو دیکھنے یا کسی کتاب کو پڑھنے کا لطف جب ہی آتا ہے کہ اس لطف کے
پیچھے علیت موجود ہو۔ خطاطی اور مصوری کے سلسلے میں یہ بات بڑی واضح طور پر
نظر آتی ہے۔ چینی خطاطی کے عمدہ نمونوں کو دیکھا کریں پتہ چل سکتا ہے کہ فن کا، قدیم
خطاطی کے شاہکاروں سے واقف ہے یا نہیں۔ اگر وہ ان سے واقف ہو گا تو
اس کی علیت کی بدولت اس کی خطاطی میں انداز کی عجیب سی قدامت آجاتے گی۔
مگر اس کے علاوہ اسے اپنے فن پارے میں اپنی شخصیت اپنی روح بھی ڈالنی پڑے
گی جو قدیم اسلوب سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ اس طرح خطاطی اور مصوری
دونوں میں جہاں جہاں خصوصیتوں یا مختلف قسم سے حسن کا بڑا اہم گیر نوع نظر آتا ہے۔
اور کوئی شخص ان فن پاروں کو فن کار کے حسن طبیعت سے الگ نہیں کر سکتا۔ ان
فن پاروں میں کبھی من کی ترنگ، کبھی لوتن کے کرشمے نظر آتے ہیں گے کبھی آوازہ ردی
کا حسن دکھائی دے گا کبھی توت کا احساس ملے گا کبھی جس آوازہ جیوٹ کا
حسن ہو گا کبھی رومانی نضا کا پراسرار جہاں ہو گا کبھی ضبط کا سنجیدہ روپ، ہو گا
کبھی ہانپن کی لچک ہو گی تو کبھی سادگی کا نور کبھی بھولپن اور سادگی کی دیکھی ہو گی کبھی

پڑھے کانن

۶۴۷

حضور میں آگیا۔ یہ صاحب گفتار (کتاب کا مصنف) اس قاری کو اپنے ساتھ
 ایک مختلف ملک یا تاریخ کے ایک مختلف دور میں لے جانے لگایا اس کے سامنے
 اپنی ذاتی ناکامیوں کے تذکرے کرے گا یا وہ کسی شے، کسی خاص پہلو پر باتیں
 کرے گا۔ اور یہ باتیں ایسی ہوں گی جن کے بارے میں اس قاری کو بہت کم معلومات
 ہوں گی۔ اگر یہ کتاب کا مصنف کوئی قدیم زمانے کا اریب ہے تو وہ قاری کو گزری
 ہوئی صدیوں کی روح سے — روح اس سرے کے گا اور کتاب پڑھتے پڑھتے اسے
 زمانے کے قاری کو پتا چلتا جائے گا کہ وہ قدیم مصنف کس وضع کا انسان تھا اس
 کا مشکل شبہت کسی قس اور وہ کیا آدمی تھا۔ چین کے دورِ عظیم تاریخ والوں میں کسی اس
 اور سیماچی ان نے میں بعینہ یہی بات کہی ہے۔ چنانچہ حال کی کردہات کے بارہ کھٹوں
 میں سے صرف دو گھنٹے ایک مختلف دنیا میں سانس لے سکتا اور حال کو جھول سکتا
 ایسی نعمت ہے جس پر اپنے ماحول اور اپنے مہم کے زندانی ضرور شک کریں گے۔
 ماحول کی یہ تبدیلی نفسیاتی لحاظ سے انسان پر بالکل وہی خوش گوار اثر رکھتی ہے جو
 حریف سفر اور سیاحت سے ممکن ہے۔

لیکن مطالعے کا یہی ایک فائدہ نہیں۔ مطالعہ کرتے ہوئے قاری کھیل اور
 تفکر کی دنیا میں پہنچتا ہے۔ کتاب چاہے دنیا کے ٹھوس واقعات سے تعلق رکھتی ہو
 ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا، ان میں زندہ رہنا اور بات ہے اور ان واقعات
 کا بیان کتاب میں پڑھنا بالکل مختلف چیز ہے کیونکہ تحریر میں آکر ٹھوس واقعات ایک
 تماشے، ایک نظارے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور قاری ان واقعات کا تماشائی
 بن جاتا ہے، ان کا ایک حصہ ایک جزو نہیں رہتا۔ لہذا بہتر یہ تحریر وہی ہے
 جو غم و فکر پیدا کرے، قاری کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کرے یہ نہیں کہ وہ واقعات کی

سیدھی سادھی رپورٹ پیش کر دے اور بس۔ ہماری دنیا میں اخبار بینی پر جو اتنا وقت صرف کیا جاتا ہے اس سے مطالعے میں شمار نہیں کرتا کیونکہ اخبار پڑھنے والے عام لوگ دنیا کے واقعات اور حالات کے بارے میں خبریں، تازہ اطلاعات جاسنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نگر اور سرچ کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

مطالعہ کے مقصد کے بارے میں بہترین بات ہے ہوائنگ سٹانکو نے کہی۔

سوائنگ عہد کا یہ شاعر کہتا ہے۔

کوئی صاحب علم اگر تین دن تک مطالعہ نہ کرے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی باقی میں کوئی دلکشی کوئی نثر نہیں رہا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ (آئینے میں) اس کا چہرہ اپنی نہایت نفرت انگیز نظر آتا ہے۔

ہوائنگ کا مطلب یہ ہے کہ مطالعے اور کتاب بینی سے انسان میں دلکشی اور رنگ و آہا پیدا ہوتا ہے جو مطالعے کا اصل مقصد ہے۔

چنانچہ جس مطالعے کا مقصد یہ ہوگا صرف وہی مطالعہ آرٹ کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ نہ اپنے کا فسانا اپنے ذہن کو بہتر بنانے کے لئے کتابیں پڑھتا ہے۔ کیونکہ آپ نے مطالعہ کا یہ مقصد ٹھہرایا تو اس کا سارا مزہ ہی کیر کر اہو گیا۔ جو شخص "معلومات کی زیادتی" اور "ذہنی بہتری" کے لئے کتابیں پڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو عام طور پر یہ تلقین کرتا ہے۔

بچے ٹیکسیر کے تمام ڈرامے اور نظریں پڑھنی چاہئیں، قدیم یونانی ڈرامہ نویس اور فلسفی سوزو کھیز کو پڑھنا چاہیے پھر ڈاکٹر ایلٹ کی تمام کتابیں پڑھنی چاہئیں (جو پانچ فٹ لمبے تالیف پر بھی نہیں سما سکتیں) تاکہ میں بھی تعلیم یافتہ اور صاحب علم بن سکوں۔

پڑھنے کا فن

۶۴۹

میں عرض کروں گا کہ ایسا شخص کبھی تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بے چارہ کسی شام نامے باندھے شیکپیر کا شاہکار سہلٹ پڑھے گا اور بڑی مشکل سے اسے ختم کرے اور اطمینان کا سانس لے گا کہ یہ فذاب بھی ختم ہوا اور اب کبھی کو یہ کر سکیں گے کہ ہاں بجا کی ہم نے بھی سہلٹ پڑھ رکھا ہے۔۔۔ یاد رکھیے کہ جو شخص کسی مجبوری کے احساس سے کوئی کتاب پڑھتا ہے اسے مطالعے اور کتاب بینی کے فن سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ کسی کاروباری قسم کا مقصد سامنے رکھ کر کوئی کتاب پڑھنا بالکل ایسی قسم کا مطالعہ ہے جس طرح اسمبلی کے ممبر حضرات ایوان میں تقریر کرنے سے پہلے پروٹوں اور نائٹوں کی دقت گردانی کیا کرتے ہیں۔ یہ کاروباری مشورے اور کاروباری معلومات کا ایک بہرہ ہے 'مطالعہ ہرگز نہیں ہے'۔

گویا ہوائنگ کے نزدیک مطالعے کی جائز صورت صرف ایک ہے کہ شخصیت کی دیکھی بوجھنے اور گفتار کا لطف ازیا دہ کرنے کے لئے کتاب بینی کی جاتے۔ شخصیت کی اس دیکھی کو جہانی خوبصورتی سے متاثر کرنا پڑے گا۔ ہوائنگ نے کہا ہے کہ تین دن تک کوئی کتاب نہ پڑھنے سے اہل علم کا چہرہ لکرت اگیخڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطالب نہیں کہ وہ واقعی کریم اور گھناؤنا بن جاتا ہے۔ کیونکہ جہانی بدصورتی کا تعلق دیکھی سے بہت کم ہے۔ مثلاً میرے ایک محترم دوست کا سراکل بم کی شکل کلہے لیکن مجھے اسے دیکھنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ اور مغزلی مضمفوتوں میں جہاں تک تصویروں کا تعلق ہے، میرے نزدیک سب سے خوبصورت چہرہ شہور انشا پر دانہ بی کے 'چسٹرن کلہے'۔ میں نے اس کی تصویر دیکھی تو بڑی زبردست دلچسپیوں کا ایک

ثقافت کے مزے

۶۵۰

انہار نظر آیا انکھوں پر یہ بڑا چشمہ لگا تھا، بھری نامی اٹھی ہوئی تھیں اصبحوں کے درمیان
 پیننگری لکیریں بھی تھیں۔ مگر اس تصویر کو دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ اس اونچی پیشانی
 کے پیچھے نہ جانے کتنے خیالات آنکھوں کی کھیل رہے ہیں جو نہ جانے کس وقت ان تیز
 عقاب آ نکھوں سے پھوٹ نکلیں گے۔

یہی وہ چیز ہے جسے ہوانگ نے حسین چہرہ قرار دیا ہے۔ وہ حسن صورت کا
 پاؤڈر اور گروڈ کالمنون اساتہ نہیں بلکہ جسے تخیل کی توت نے حسین بنا لیا ہے۔

یہاں گفتار کا ذہ تو اس کا ظاہر مد اور پڑھنے کے طرز پر ہے۔ اگر گفتار میں
 لطف ہے یا گفتار بے مزہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ مطالعے کا طریقہ کیا ہوگا۔ اگر قاری کتابوں
 سے کچھ لطف کچھ خوشبو اخذ کر لے تو یہی خوشبو اس کی گفتار میں بھی ظاہر ہوگی۔ اور اگر
 ان کی گفتار میں خوشبو ہوگی تو اس کی تحسیر میں بھی وہی لطف وہی خوشبو لازماً جھلک
 اٹھے گی۔

اس لئے میرے نزدیک خوشبو یا ذوق ہی مطالعے کی بنیاد ہے۔ اس کا
 منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص کا ذوق اپنا ہوتا ہے اور پسند آتی ہے۔ یعنی ذوق
 کھانیکا ہے وہی حال مطالعے کا ہے۔ کھانیکا سب سے زیادہ صحت مند طریقہ
 یہ ہے کہ جو پسند ہو وہ کھائیے تاکہ معدہ اسے خوشی سے قبول کرے اور نضم بھی کرے
 مطالعے کا بھی یہی حال ہے کھانے میں گوشت اگر آپ کے لئے مفید ہے تو میرے
 لئے زہر کا حکم رکھتا ہے مطالعے کے سلسلے میں بھی کوئی استاد شاگردوں کو مجبور
 نہیں کر سکتا جو کتابیں اُسے پسند ہیں وہی شاگردوں کو پسند آئیں۔ نہ والدین کو یہ
 امید رکھنی چاہیے کہ ان کے بال بچوں کا وہی مذاق ہوگا جو ان کا ہے۔ اسی لئے یوان چنگ
 لائنگ نے حکم لگا دیا تھا کہ "جو کتابیں پسند آئیں انہیں رہنے دو تاکہ انہیں"

پڑھنے کا فن

۶۵۱

دوسرے لنگ پڑھیں : گویا اس نظریے کے مطابق دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے
 پڑھنا ہر کسی کے لئے ضروری اور ہماری ذہنی میلانات اور دلچسپیاں و رختوں کی طرح بھلتی
 پھولتی ہیں۔ اور وہ اپنی طرح رداں و دھاریاں رہتی ہیں۔ جب تک درخت
 کو مناسب خوراک ملتی رہتی ہے۔ وہ بڑھتا چھوکتا ہے اور جب تک ندی نالوں کا
 دھارا تازہ رہتا ہے پانی رداں رہتا ہے۔ پانی کے راستے میں جب چٹان آجاتی
 ہے تو وہ اس کے ارد گرد گھوم کر نکل جاتا ہے کوئی نشیبی خوبصورت وادی ملتی ہے۔
 تو وہ پھر جاتا ہے کچھ دیر مزے سے سستا تا ہے اور بہتے بہتے جب کسی گہرے
 پہاڑی تالاب یا جھیل میں آسکتا ہے تو اطمینان سے وہیں ٹھہر جاتا ہے۔ جب
 اسے آبشاریں ملتی ہیں تو وہ نیری سے سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح گوش
 کے بغیر یا کسی لگے بندھے مقصد کے بغیر یہ پانی ایک ایک دن ہر دور سمندر تک پہنچ
 جاتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے پڑھنا سب کے لئے
 اشد ضروری ہو۔ ہاں ایسی کتابیں ضرور ہیں جنہیں ہمیں آپ سب کو کسی خاص وقت
 کسی خاص مقام خاص حالات کے تحت اور عمر کے کسی خاص حصے میں
 پڑھ لیتا چاہیے۔

بچے پوچھے تو مطالعہ بھی اسی طرح تقدیر کے تابع ہے جس طرح شادی،
 الزوج اگر ایسی کوئی کتاب (مثلاً انجیل مقدس) موجود ہے جسے پڑھنا سب کے لئے لازم
 ہے تو اس کا بھی ایک معین وقت ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ کے خیالات اور تجربات
 نیکل سے ایک خاص درجے تک نہ پہنچے ہوں تو دنیا کے بڑے بڑے ادبی شاہکاروں
 کا مطالعہ بھی فضول ہوگا۔ کنفیوشس نے کہا تھا "پچاس برس کی عمر کو پہنچو تو نیرنگیوں
 کی کتاب پڑھو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب پنتیا لیس برس کی عمر میں ہرگز نہ پڑھی جائے

چاہیے۔ کنفیوشس کے اپنے اقوال میں جو وہائی، جو نیچگی، پہتاں ہے وہ صرف اسی وقت تک میں آسکتی ہے جب پڑھنے میں خود ہی نیچگی موجود ہو۔

اس کے علاوہ اگر ایک ہی کتاب زندگی کے مختلف مرحلوں پر مطالعہ کر کے دیکھی جائے تو ہر بار اس کا لطف مختلف ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کتاب کے مصنف سے اگر ذاتی ملاقات کے بعد اس کی کتاب پڑھیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔ ذاتی ملاقات نہ سہی تو قصور میں اس کا چہرہ ہرہ اخط و خصال دیکھ لیں تو کتاب کے مطالعے کا کچھ مزہ ہی لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور جب اس مصنف سے

آپ کے ذاتی تعلقات منقطع ہو جاتیں تو پھر وہی کتاب پڑھیے۔ اس مرتبہ مزہ بالکل مختلف ہوگا۔ رہا عمر کے مختلف حصوں میں ایک ہی کتاب کا معاملہ تو نیز نیچگیوں کی کتاب چالیس برس کی عمر میں پڑھیے تو اور ہی لطف ہے اور وہی کتاب پچاس برس کی عمر میں پڑھ کر دیکھیے تو اور ہی لطف ہے۔ کیونکہ اب آپ نے زیادہ زندگی اور زندگی کی زیادہ تبدیلیاں دیکھی لی ہیں۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہر اچھی کتاب کو ایک بار پڑھنے کے بعد دوسری بار بھی پڑھنا چاہیے۔ اس سے نیا لطف آئے گا۔ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پندرہ سو برس کی عمر میں مجھے چارلس گنزلے کا مشہور ناول "جانب مغرب" پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ اسی زمانے میں میں نے ڈکٹورین زلمنے کے مشہور مصنف تھیکرے کا شاہکار ہنری ایسینڈ بھی پڑھا تھا۔ اپنی عمر کے تقاضے کی مطابق میں نے سمندر، مہول اور ولدورز محبت کا ناول "جانب مغرب" تو بہت پسند کیا لیکن میری سمجھ میں اس وقت یہ نہ آیا کہ ہنری ایسینڈ میں آخر کیا بات آجوا سے اتنا سرچڑھایا جاتا ہے۔ بہت بعد میں میں نے یہی ناول پھر پڑھا اور مجھے محسوس

ہوگا کہ اس کا اصل بھلائی نفع زندگی سے اس دور میں نہ آسکتا تھا۔

گویا مطالعہ ایک ایسا کام ہے جس سے دو فرقی ہیں۔ اور یہ فرقی کتاب کا مصنف اور کتاب کا قاری ہیں۔ کتاب کو پڑھنے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اس میں قاری کی بصیرت، اس کے تجربے کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا خود مصنف کی بصیرت اور مشاہدات کا ہے۔ اسی لئے کنفیوشس کی کتاب الاقوال کے بارے میں کنفیوشس فلسفی چنگ پی چو آن نے کہا ہے قاری اور قاری میں بہت فرق ہوتا ہے بعض لوگ کتاب الاقوال کو پڑھ کر کچھ تندرستی محسوس نہیں کرتے، بعض قاریوں کو اس کی ایک دو سطروں سے مزہ آتا ہے اور بعض قاری ایسے ہوتے ہیں کہ کتاب الاقوال پڑھتے ہی ان پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر ناپ چاٹتے ہیں۔

میرے نزدیک اپنے محبوب مصنف کا کھوج لگانا ذہنی ترقی کا نہایت نازک اور نہایت اہم مرحلہ ہے۔ اس دنیا میں ہم مذاقی اور دو ردحوں کی باہمی کشش بڑی چیز ہے۔ اس لئے پرانے اور نئے مصنفوں کی صفوں میں اس ایک مصنف کو ڈھونڈ لینا چاہیے جس کی روح آپ سے ہم آہنگ ہو۔ مطالعے سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط یہی ہے۔ مگر اپنے محبوب مصنف کی تلاش میں آزادی رائے اور خود اختیار کی سے کام لینا چاہیے۔ پوں یہ بتانا یا عین کرنا بہت مشکل ہے کہ میرا محبوب مصنف کون ہے۔ کیونکہ یہی پہلی نظر پر محبت ہو جانے والا معاملہ ہے۔ قاری سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس مصنف کو پسند کرو لیکن جو پہنی کوئی خاص مصنف سامنے آیا قاری کو جیسے خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ میرا محبوب مصنف یہی ہے۔ مصنفین کا یہ کھوج ایسا ہے جس کے واقعات

سے تاریخ ادب سمجھ رہی ہے۔ کئی بار یہ واقعہ گزرا ہے کہ قاری اور مصنف کے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل تھا مگر ان کا انداز خیال ان کے احساسات اتنے ہم آہنگ، اتنے مماثل تھے کہ جو اپنی کسی کتاب کے صفحات پر دو لڑوں کی پہلی ملاقات ہوتی قاری نے یہ محسوس کر لیا کہ اُس نے اس کتاب میں اپنا عکس کو پا لیا ہے چینی روایات میں ایسی ہم آہنگ رودوں کے ملاپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ قاری اور مصنف دونوں ہی ایک روح کے دو قالب تھے چینی ادب میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ سو تنگ پو کو چونگ زے کا نیا قالب کہا جاتا ہے اور یوآن چنگ لانگ کو سو تنگ پو کی روح کا ایک نیا پیکر قرار دیا گیا تھا خود سو تنگ پو کہتا ہے کہ جب میں نے پہلی بار چونگ زے کی تصانیف کو پڑھا تو مجھے یوں احساس ہوا گویا میں چین ہی سے ہی بائیں سوچا آیا ہوں اور وہی نظریات قائم کرتا ہوں۔ یوآن چنگ لانگ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ایک رات اُس نے اتفاقاً اپنے ایک گمنام معاصر سوون چانگ کی نظموں کا مجموعہ پڑھا۔ اضطراب کے عالم میں وہ پانگ سے کود کر فرش پر آ رہا اُس نے اپنے ایک مہمان دوست کو جگایا۔ دوست نے جب یہ نظیں پڑھیں تو دونوں کی داد نے گھر سر پر اٹھالیا۔ دونوں مل کر پڑھتے رہے اور جی کھول کر داد دیتے رہے۔ نوکر بے چارے حیران تھے کہ ایسا شور و فرغ آخر کس لئے برپا کیا جا رہا ہے۔ انگریز خاتون ناول نویس جو جارج ایلیٹ کے قلمی نام سے زندہ جاوید شہرت رکھتی ہے روس کو پہلی بار پڑھ کر لڑ خورنہ ہو گئی تھی۔ جرمن فلسفی نعتے نے پہلی بار شوین ہاڈ کو پڑھا تو اُسے محسوس ہوا جیسے ایک برقی لہر اس کے رگ رپے میں دوڑ گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شوین ہاڈ بہت زیادہ بائوس گرو تھا۔ اور نعتے شاگرد کی حیثیت سے بہت

زیادہ طوفانی مزاج کا آدمی تھا اور اسی لئے بعد میں نطشے نے بغارت کر کے اپنے
گروے بالکل متضاد سخت کوشی کا فلسفہ پیدا کیا۔
میں پھر عرض کروں گا کہ اپنے محبوب مصنف کا کھوج لگانا اور اس کی
کتابیں پڑھنا ہی وہ چیز ہے جس سے قاری کو کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح اپنے
سنیوں کی رانی کو پہلی نظر دیکھتے ہی اس کا اٹان موتا ہے۔ اور ہر چیز ایک نئے معنی
کی حامل ہوتی ہے۔ — یہی وہ عورت ہوتی ہے جو عاشق کے نزدیک ہر
خوبی، ہر حسن کا پیکر ہے۔ اس کا قیدر حنا، اس کا کھڑا اس کی زلفیں، اس کی
آواز اس کا اندازِ کلام، اس کا تبسم — سب کچھ ہی ہوتا ہے جو دل میں پہلے
سے بسا ہوا تھا۔ یہی حال اپنے محبوب مصنف کے عجیب کا ہے۔ اس کا اندازِ بیان
اس کا ذوق، اس کا نقطہ نظر، سوچنے کا انداز، ہر چیز قاری کے دل کو لگتی
ہے اور وہ اس کی لکھی ہوئی ہر چیز سطر، ہر لفظ کو آنکھوں اور دل میں بسا لیتا ہے
اور چونکہ مصنف اور قاری دونوں کے درمیان روحانی یگانگت ہوتی ہے۔ اس
لئے قاری اس مصنف کی ہر بات کو دہت میں جذب کرتا ہے ہر چیز یلو — بدکھاہ
یہ مصنف اسپر جا دو کر دیتا ہے اور قاری اس کے لئے مسخورد ہو کر خوش
ہوتا ہے۔ وقت گزرے پر قاری کی اپنی آواز، اس کا انداز، اس کا سکرانے
کا ڈھنگ اس کا بات کرنے کا طریقہ وہی ہو جاتا ہے جو اس کے محبوب کا
ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ہستی اپنے ادبی محبوب کی ہستی میں گم کر دیتا ہے۔ اور
اس کی کتابوں سے اپنی روح کی غذا حاصل کرتا ہے۔ چند برس اس اسی طرح ہو
جاتے ہیں۔ ہر قاری اپنے ادبی محبوب سے تنگ سا آ جاتا ہے اور وہ
نئے نئے قجوب تلاش کرتا ہے۔ اس طرح وہ دو چار ادبی محبوبوں سے منبٹ لیتا

تفانت کے فتنے

ہے اور ان کی ہستی سے حاصل کرنے کی ہر چیز حاصل کر لیتا ہے تو وہ خود مصنف بن نکلتا ہے۔

مگر یہ خیال رہے کہ بہت سے قارئین کسی مصنف کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ آخر دنیا میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہیں جو محض دل لگی کرتی پھرتی ہیں۔ اور کسی ایک ہستی سے گہرا دلی تعلق پیدا نہیں کر سکتیں۔ ایسے لوگ ہر مصنف کی ہر کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ ہر رطب دیا پس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مگر انہیں اس مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میں نے مطالعے کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں وہ مطالعہ ہرگز شامل نہیں جو باہر مجبوری کیا جائے یا جو فرض قرار پایا ہو۔ چین میں یہ رواج تھا کہ طالب علم کو سخت محنت سے پڑھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ ایک عالم کی کہانی مشہور ہے کہ رات کو مطالعہ کرتے وقت وہ اپنی پنڈلی میں زبور ڈال دیتا تھا تاکہ کتابیں پڑھتے پڑھتے نیند نہ آئے۔ ایک اور صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ خادم کو پاس کھڑا رکھتے اور اسے ہدایت دیتی کہ جو ہنی میں سو جاؤں مجھے فوراً جگا دیا جائے۔ تاکہ کتاب بینی میں صرغ نہ ہو۔! — میرے نزدیک یہ بڑی فطرتوں بات ہے۔ اگر کتاب آپ کے سامنے ہو اور کوئی قدیم مصنف ان صفحات کے واسطے سے آپ کے ساتھ تمہیں کلام ہو اور آپ پر غنودگی طاری ہو جائے تو پھر اس کا اعلان یہی ہو کہ کتاب بند کیجئے اور بستر پر لیٹ کر سو جائیے۔ کیونکہ مصنوعی طریقوں سے اپنے آپ کو بیدار رکھ کر پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جن لوگوں نے علم و ادب میں نام پیدا کیا ہے وہ کتاب کو محنت سے لے کر "اد" یا د کرنے سے عمر بھر نادانانہ لطف رہے ہیں۔ ان کے دل میں کتابوں کی سچی محبت موجود رہتی ہے اور وہ اس لئے پڑھتے

پڑھنے کا فن

رہتے ہیں کہ اس کے بغیر نہیں کیسے!

یہ مسئلے ہونے کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مطالعے کا وقت کون سا ہو اور مطالعہ کیا جائے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں مطالعے کا وقت اور جگہ، روزوں کا کوئی دہرہ نہیں۔ جب مطالعے کو جی چاہے تو ہر جگہ بیٹھ کر پڑھا جاسکتا ہے۔ اگر مطالعے کا ذوق دل میں ہو تو سکول میں اور سکول سے باہر اور سکول کی پابندیوں کے باوجود کتاب بینی ہو سکتی ہے۔ سنگ کو فان کے بارے میں شہر ہے اس کے چھوٹے بھائی نے اُسے لکھا کہ شہر آکر علم حاصل کیجئے کیونکہ شہر میں بہتر درسگاہیں موجود ہیں۔ سنگ کو فان نے جواب میں لکھا اگر دل میں علم کا شوق ہو تو دیہات میں بلکہ صحرا میں یا کسی بازار میں علم حاصل کیا جاسکتا ہے بلکہ گڈریا بن کر یا لکڑہارا بن کر بھی علم حاصل کرنا ممکن ہے اور اگر دل میں علم کا شوق نہ ہو تو نہ صرف دیہاتی سکول ناموزوں ہے بلکہ دیہات کی خاموش فضا میں ایک الگ تھلگ مکان یا کسی طلسماتی تیزیرے میں رہ کر بھی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو میز پر کتاب لے کر بڑے ٹھکے سے بیٹھتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ پڑھنا ممکن نہیں کیونکہ کمرہ اتنا ٹھنڈا ہے اور کرسی اتنی سخت ہے اور روشنی کی چمک زیادہ ہے وغیرہ۔ ایسے ادیب بھی ہیں جو اکثر یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ کمرے میں مچھر بہت ہیں لکھیں تو کیونکر لکھیں؟ کاغذ بہت زیادہ چمکا ہے لکھا نہیں جاتا۔ بازار کا اتنا شور کمرے میں آتا ہے بھلا اس شور میں لکھنا ممکن ہے؟ مگر کمرے والے سب کچھ کرتے ہیں۔ سونگ عہد کے مشہور فاضل اوبانگ اسٹیو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین جگہوں پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ یا تو تکیے پر یا گھوڑے پر یا بیت الخلاء میں۔ اور ایک مشہور فاضل کے بارے

تفاسد کے نرے

میں یہ مسلمہ بات مانی گئی ہے کہ وہ کنفیوٹس کے فلسفے کی کتابیں گرمیوں میں ماڈرن
ننگا ہو کر پڑھنا تھا۔ اس سے برعکس اگر پڑھنے سے دلچسپی نہ ہو تو سال بھر میں کوئی دویم
کوئی مقام مطالعے کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔ دیکھو برا حافل ہو۔

موسم گل میں کتابیں پڑھو
موسم گل سے یہ ہے غماری
گر بیبا آئیں تو سوتے ہی رہو
بسی موسم کی ہیں میندیں پیای
برف گر تہ ہوزمان میں پہا
موسم گل کی کردیتاری

آپ یہ پوچھیں گے کہ جب یہ بات ہے تو پھر پڑھنے کا اصلی فن کیا ہے؟ اس کا
جواب یہ ہے کہ جب پڑھنے کو جی چاہے تو کتاب لے کر بیٹھ جائیے۔ اسی مطالعے
کا لطف آئے گا جو کوشش کے بغیر کیا جاتے جس میں تازگی اور از خود رفتگی کی کیفیت
ہو۔ کسی سہلے دن بھر خیام کی رباعیات اٹھالیجے اور اپنی محبوب کے
ساتھ کنار دریا پہنچ جائیے۔ اگر خوبصورت بادل چھائے ہوں تو پھر کتاب پھوڑو بیٹھے۔
پچ میں پاپی لہنا یا چائے پینا مطالعے کے لطف کو دوبارہ کر دینگا۔

یا پھر سرما کی ایک رات آشدان کے سامنے بیٹھ کر دس بارہ موصوعات پر کتابیں
پاس رکھ لیجئے۔ چائے کی کئیل آگ پر رکھی ہو، دل پسند تمباکو کی کھیلی پاس پڑی ہو اور
خانہ اتقاربات سیاہی اور سوانح وغیرہ پر کتابیں سامنے ہوں۔ ایک ایک
کر کے کتابیں اٹھائیے، ورق اٹھیے پھر جس پر توجہ مرکوز ہو جائے اس کا مطالعہ
کرتے رہیے۔ چن ننگ تان کا کہنا ہے کہ برفباری کی رات میں، بند دروازوں کے
پیچھے کسی ضبط شدہ کتاب کو پڑھنا زندگی کی بہت بڑی مسرت ہے۔ ہا مطالعے کا نوڈ
تو چن پی جو کا یہ قول یاد ہے۔

قدما کا قول ہے کہ کتابیں بے دست و پا اجسام ہیں اور تصویریں نازک اجسام۔۔۔ چنانچہ کتاب کا مطالعہ کرنے یا تصویروں کا الہم کھولنے اور ان کا مطالعہ کرنیکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فراغت اور اطمینان سے انہیں دیکھا جائے۔

فراغت اور اطمینان کے لمحوں میں ہر چیز کے لئے برداشت اور صبر مادوں کا تہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے "اہل علم لوگ کتاب پڑھتے ہوئے کتابت یا طباعت کی غلطیوں کا برا نہیں مانتے۔ اچھا ستیاح بھی پہاڑ پر چڑھتے ہوئے بڑے راستوں کو برداشت کرتا ہے جو شخص برب کا منظر دیکھنے جا رہا ہو وہ راستے میں کچے اونازک تلوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو شخص دیہات کی کھلی فضا میں رہنا چاہے وہ جاہل لوگوں کی صحبت سے گھبراتا نہیں اور جو شخص پھوون کو دیکھتا ہو وہ بڑی تڑپا کو بھی برداشت کر لیتا ہے۔"

مطالعہ سے جو لطف حاصل ہوتا ہے اس کا بہترین اظہار چین کی سب سے بڑی شاعرہ لی چنگ چاؤ نے اپنے سوانح حیات میں کیا ہے۔ اس کے شوہر کو جب شاہی دارالعلوم سے طالب علم کی حیثیت سے ماہانہ وظیفے کی رقم ملتی تو دونوں میاں بی بی کسی ایسے مندر میں چلے جاتے جہاں پُرانی کتابیں اور کتبوں کے چربے فروخت ہوتے تھے۔ وہ جو پسند آتا تھا خرید لیتے تھے اور واپسی میں کچھ کھل بھی خریدتے گھر منج کر وہ پھول کھاتے ہوئے کتبوں کے چربوں کا معائنہ کرتے جاتے یا چائے پیتے اور مختلف کتابوں کے نسخوں کا باہم تقابل کرتے۔ چنانچہ وہ اپنے بارے میں لکھتی ہے۔

"میرا حائفہ بڑا اچھا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد

ثقافت کے زے

بعد ہم دونوں کمرے میں بیٹھ جلتے اور چائے دم کرنے کے لئے رکھ دیتے
 پھر الماری میں چینی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے ایک دوسرے سے
 پوچھتے کہ فلاں عبارت کس کتاب کے کس صفحے کی کونسی سطر شروع ہوتی
 ہے۔ جس کا اندازہ صحیح ہوتا ہے چلتے کا پہلا پیار پینے کے لئے
 ملتا تھا۔ اور جب کسی کا اندازہ بالکل ٹھیک ہوتا تو ہم چائے کی پیالی
 اٹھاتے اور مارے قہقہوں کے دونوں لوٹا پوٹا ہو جلتے۔ بعض اوقات
 چائے ہمارے پیرڈل پر گر جاتی اور پینے کو نہ بچتی — ہم دونوں اسی
 زندگی پر قانع اور خوش تھے اور چاہتے تھے کہ ساری عمر اسی طرح گزر جائے
 اس لئے ہمارے سرفخر سے بلند رہتے حالانکہ ہماری مغربی اور محتاجی کی
 حد نہ تھی۔ رفتہ رفتہ ہمارے پاس کتابوں کا ذخیرہ بڑھتا گیا، فن پاروں
 کی گنتی بھی بڑھتی گئی اور میزوں، کرسیوں، بستر، ہر جگہ کتابیں اور لوازم
 نظر آنے لگے ہم ان سے اپنی آنکھوں اور اپنے ذہنوں سے لطف اٹھاتے
 تھے اور ان کے بارے میں بحث مباحثے کرتے تھے۔ ہماری مسرت ان
 مسترتوں سے کہیں اندر گہری تھی جو امیر لوگوں کو کتے پالنے اگھوٹے
 رکھنے، رقص و سرور کی مخلصین منعقد کرانے سے حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔۔

شاعرہ آئی نے بڑھاپے میں لکھا تھا۔ اس کا محبوب امر چکا تھا اور اس کو
 اس بے چارگی اور بڑھاپے میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھاگنا پڑ رہا تھا کیونکہ ان
 دونوں شمالی چین پر چن قبیلوں کی بلعایدیں جاری تھیں اور کسی کے لئے کہیں کوئی سہا
 امان نہ تھی۔

۴۔ لکھنے کا فن

انشا پر فارسی کا فن، فنِ تحریر محض یا انشا کی تکنیک سے کہیں وسیع تر ہے بلکہ ابتدائی
 کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ پہلے تو انشا کی تکنیک کا ہوا دل سے دور کریں اور ایسے سطحی معاملوں
 سے درگزر کر کے اپنی روح کی گہرائیوں کو ٹوئیں تاکہ وہ اپنی سچی ادبی شخصیت
 کو پروان چڑھا سکیں جو ادب کی اصلی بنیاد ہے۔ جب یہ بنیاد مناسب
 طور پر قائم ہو جائے اور سچی ادبی شخصیت پروان چڑھ جائے تو اسلوبِ تحریر خود
 بخود وجود میں آجاتا ہے اور تکنیک کے پھوٹے موٹے معاملے خود بخود طے
 ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ادیب فصاحت، بلاغت اور گرامر کے ہاتھ میں کچھ لے لے پرما
 کچھ بے تجربہ معلوم ہو تو پروا نہیں بشرطیکہ وہ واقعی اچھی چیزیں لکھے۔ ہر اچھے
 ناشر کے پاس ایسے پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں جو عبارت کے ان معمولی قواعد کا لحاظ
 رکھتے ہیں اور زیر طبع کتابوں کی عبارتوں میں ایسے ہی وقف خاص وقف لازم اور
 اعراب وغیرہ درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص
 گرامر کا بڑا ماہر ہے اور اسلوبِ آرائی کا بھی اُسے ملکہ حاصل ہے۔ مگر سچی ادبی شخصیت
 کی تہذیب و ترقی کے لئے اس نے کوئی کوشش نہیں کی تو وہ کبھی ادیب
 نہیں بن سکتا۔ بوفون کا مشہور قول ہے "اسلوب ہی شخصیت ہے"۔ چنانچہ
 اسلوب لکھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ اسلوبِ تحریر کی کسی خاص نہج کا نام نہیں
 نہ تحریر کی زینت کا نام ہے۔ اسلوب وہ مجموعی تاثر ہے جو قاری کو ایک
 ادیب کے ذہن کے بارے میں حاصل ہوتا ہے اس میں ادیب کی فکری گہرائی
 یا اس کا اچھا پن اس کی بصیرت یا اس کی کورنگاہی اس کی باقی خصوصیات مثلاً

ظرافت، طبع، خوش مذاقی، تیز اور تکیہ طینت اس کی سوچ بوجھ، نزاکت، احساس اور نزاکت اور اک شہادت سے بھرپور کلیت یا کلبیت سے بھرپور شفقت، کوڑ مغز ہی عملی سمجھ اور شعور اور دنیا کے معاملوں کے متعلق اس کا عام رویہ۔ سب کچھ شامل ہیں ظرافت کی تکنیک پیدا کرنے کے لئے کوئی ہدایات کی کتابت نہیں مل سکتی۔

عملی سوچ بوجھ کے پیرہہ قاعدوں کا کورس بازار میں چھپا چھپا یا ملے گا۔ نزاکت احساس پیدا کرنے کے لئے گیارہ قاعدوں پر مشتمل کوئی ہدایت نامہ ہی مل سکتا ہے۔ یہ چیزیں سکھانے سے نہیں آتی، تہذیب نفس سے پیدا ہوتی ہیں۔

فن تحریر کے سطحی مسئلوں کو چھوڑ کر گہری نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس فن میں ادب، فکر، نقطہ نظر، جذبات، مطالعہ اور تحریر سب کچھ شامل ہے۔ سینے چین میں ایک ادبی تحریک چلائی گئی جسے میں نے انہارِ نفس کے نئے وقتان کا نام دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ چینی نظر میں زیادہ سنگتہ، زیادہ انفرادی اسلوب فرسٹ دیا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے اسلوب اور فن تحریر پر متعدد مضامین لکھنے پڑے۔ پھر میں نے سگار کی راکھ کے عام عنوان کے تحت کچھ ادبی مقالے بھی لکھے جن میں انہیں اسلوب و انداز، بیان و انہار پر اپنے خیالات کو نقطوں میں بیان کیا گیا تھا۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ میرے نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی انہیں سے ہو سکتی ہے:

ارتکب اور شخصیت

انشاپر وازی سکھانے والے استاد ادب کے بارے میں یوں بات کرتے ہیں جیسے بڑھئی آرٹس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ نقاد لوگ ادبی مضامین کا

لکھنے کا فن

۶۶۳

تجزیہ تحریر کی تکنیک کے راستے سے کہتے ہیں۔ مثال وہی ہے کہ بختیہ قطب سنا
لیکھتا ہے شان کی بلندی اور اس کی عمارت کا تخمینہ لگانے بیٹھ جائیں۔
انشا کی تکنیک کوئی چیز نہیں۔ میرے نزدیک جو چینی ادیب کسی مقام کے مالک
ہیں۔ ان کا توں بھی یہی ہے۔ انھوں نے تکنیک کی کبھی پرواہ نہیں کی۔
انشا کے لئے تکنیک کا وجود ایسا ہے جیسے تہذیب کیلئے، فقہ کے لئے، بلے
چوڑے توامین۔ یہ مسائل الٹی درجے کے لوگوں سے مخصوص ہیں۔
تبدیوں پر تکنیک کی بحث کا برابر ہی پڑتا ہے۔ تاروں کی تکنیک، طور ایے کی
تکنیک، موسیقی کے قواعد، اداکاری کے ضابطے۔ یہ سب تبدیوں کی آنکھیں
چند ہیادیتے ہیں۔ تبدی بے چارہ نہیں جانتا کہ انشا کی تکنیک کا کسی ادیب کی پیدائش
سے کوئی تعلق نہیں۔ اداکاری کے قواعد بھی عظیم اداکار کے وجود میں آنے سے کوئی تعلق
نہیں رکھتے، تبدی بچا کے کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ "شخصیت" بھی کوئی چیز
ہے جو ارٹ اور ادب میں ہر کاوانی اور عظمت کی اصل بنیاد ہے۔

پ۔ ادب کی پرکھ

جب آپ بہت سے ادیبوں کی کتابیں پڑھ چکیں اور یہ پتا چل جائے کہ فلاں
ادیب منتظر کشتی میں ماہر ہے۔ تو دوسرا نزاکت و نفاست سے مالا مال ہے، تیسرا کہنے
کی بات نہایت اسیلے پن سے کہتا ہے۔ چوتھا قابل بیان دن کشتی کا مالک ہے،
پانچویں کی تحریر عمدہ و سلی کی طرح سرد۔ انگریز ہے اور چھٹے میں وہ سرخوشی و ہوسلا
پن ہے جو اعلیٰ شراب میں ہوتا ہے تو پھر آپ کو بلا خوف و خطر یہ کہہ دینا چاہیے کہ
مجھے فلاں فلاں ادیبوں کی کتابیں پسند ہیں اور میں انہیں پرکھ بھی سکتا ہوں۔ مطالعے

کی اتنی وسعت کی بدولت 'قاری' میں یہ ملکہ پیدا ہو چکتا ہے کہ وہ تخریر میں اعتدال اور نرمی
رہیلے پن اور زور و بیان، قوت اظہار اور طباطبائی کا کمال، برآقی اور تیزی، نزاکت اور
دلکشی میں امتیاز پیدا کر سکے اور ان کی امتیازی خصوصیات کو الگ الگ سمجھ سکے۔

جب وہ ہر انداز ہر اسلوب کا بیدری ہو جاتا ہے تو وہ تنقیدی ہدایات کی کوئی کتاب پڑھے
بغیر بھی یہ بتا سکتا ہے کہ اچھا ادب کون سا ہے۔

ادب کے طالب علم کے لئے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ
مختلف تخریروں کی چاشنی میں امتیاز کرنا سیکھے۔ ادب کی بہترین چاشنی نرم روی اور
ریلا پن ہے۔ لیکن یہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی مصنف کے لئے اپنی تخریر میں پیدا کرنی بہت
مشکل ہیں کیونکہ نرم روی اور سیٹ پن میں بڑا لطیف پردہ حائل ہے۔

جس ادیب میں گہرائی اور اچھ نہ ہوگی وہ سادہ اور آسان اسلوب میں لکھنے کی
لاکھ کوشش کرے اس سے کچھ نہ بنے گا۔ اٹھ اس کا انداز پھدیر کا سلجھا ہو کر
وہ جائے گا۔ قاعدے کی بات یہ ہے کہ تازہ مچھلی کو اس کے اپنے روغن میں پکایا
جا سکتا ہے۔ باسی مچھلی کو تو نمک چرچ اور مسالوں سے فریاد بنایا جاتا ہے بلکہ جتنا
مسالہ ڈالیں اتنا ہی بہتر ہے!

اچھا ادیب یا نگ کیونہی کی اس بہن کی طرح ہے جو اپنی خوبیوں اور تہنی کمال
کی بدولت شہنشاہ کے سامنے غار سے اور پاؤ ڈر کی زینت کے بغیر بھی جانیکی
جراحت رکھتی تھی۔ حالانکہ محل کی باقی تمام حسناؤں کو خانوے اور آرائش کی
سخت محتاجی تھی۔

اسی لئے دنیا میں بہت ہی کم لکھے والے ایسے ہیں جو بڑی سادہ زبان میں کچھ
لکھنے کی جرات کرتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں۔

ج۔ اسلوب خیال

تحریر میں اگر دل کشی اور حسن ہے تو تحریر اچھی ہے۔ اگر تحریر بان سے عاری ہے تو بڑی ہے۔ اس دل کشی کے لئے کوئی خاص ضابطہ نہیں۔ تحریر کی دل کشی اسی طرح تحریر سے چھوٹ نکلتی ہے جس طرح بخور دان سے خوشبو کا دھواں یا جیسے پیٹھ کی چوٹی سے گھٹا اٹھتی ہے جو یہ نہیں جانتی کہ وہ کدھر جائے گی۔ گویا بہترین اسلوب انسانی ہونے کے لئے پانی کی طرح ہے۔

اسلوب زبان خیال اور شخصیت سے مرکب ہے مگر بعض اسلوب ایسے

ہیں جن کا سارا انداز زبان کے زور پر ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ واضح خیالات غیر واضح زبان کے در قالب میں دیکھتے جائیں۔ زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑی واضح زبان میں بہت ہی گھمبائیں کہی جاتی ہیں واضح خیالات نہایت غیر واضح زبان میں بیان کرتا ایسے مصنف کا بندھا ہوا اسلوب ہوتا ہے جو عمر بھر بھرتا رہنے کا نتیجہ کر چکا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی میں یہ تجربہ ہوا ہی نہیں کہ اپنی بیوی کے سلنے چیزوں اور باتوں کی وضاحت کیوں کر کی جاتی ہے۔ اس کی مثال مشہور جرمن فلسفی عمانوئیل کانت ہے۔ ناولسٹ سیمونس پٹلر بھی اسی طرح گھمبائیں کر جاتا ہے۔

ہر شخص کے اسلوب پر اس کے ادبی محبوب کا بڑا اثر پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب مصنف کے انداز فکر اور طرز بیان کو زیادہ سے زیادہ پسند کرتا رہا ہے اصل میں ابتدائی کے لئے اسلوب پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ زندگی کے نچتے دور میں پہنچ کر آدمی اپنے آپ کو پالتا ہے اور اس طرح خود بخود اپنے خاص اسلوب کو

بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔

کسی مصنف سے نفرت ہو تو اس کی کتاب سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کاش سکول
کا استاد اس بات کو پیش نظر رکھیں۔

ہر انسان کا کردار کسی حد تک پیدا ہوا ہوتا ہے۔ یہی حال اس کے اسلوب
کا ہے۔ باقی کا حصہ اس تاثر پر مبنی ہے جو وہ دوسروں سے لیتا ہے۔

جس شخص کا کوئی محبوب ^{مصنف} نہیں وہ راہ گم محروم ہے۔ اس کے ذہن اس کی ہستی
میں کوئی نہر خیزی نہیں۔

دنیا میں ہر شخص کے لئے اس کا محبوب مصنف موجود ہوتا ہے۔ صرف وہ اسے
ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتا۔

کتاب کو یوں جانتے کہ کسی شہر یا زندگی کی تصویر ہے۔ ایسے بھی قاری ہیں
جو نیویارک اور پیرس کی تصویر میں ہی دیکھتے ہیں خود نیویارک اور پیرس نہیں جانتے
عقل مند آدمی وہ ہے جو کتاب میں بھی پڑھے اور زندگی کا بھی مطالعہ کرے۔ کائنات
بہت بڑی کتاب ہے اور زندگی بہت بڑی درس گاہ۔

اچھا قاری مصنف کے تار و پود تک دیکھ لیتا ہے اس کا سیدھا اٹا چھان سارتا
بعض مصنف اپنے قاری کو ہر وقت چھیڑتے یا تھریک دلاتے رہتے ہیں۔ ان
کی مثال یہ ہے جیسے باس میں کوئی پتھر کا کبھی یہاں سمجھی وہاں آگد گویاں کرتا ہے گد گدی
کتنی بڑی بات ہے! کسی موضوع کے بارے میں مطالعہ کر لیا پتھر میں پڑھو یہ ہے کہ سب
پہلے وہ کتاب میں پڑھی جاتیں جو اس موضوع کے بارے میں مخالفانہ رائے رکھتی ہیں۔ اسی صورت
میں قاری کا ذہن اس بات کیلئے تیار ہو سکتا ہے کہ وہ نظروں میں کسی طور پر قبول نہ کرے
جب تاہی اس موضوع کے بارے میں مخالفانہ کتابیں پڑھ لے گا۔ تو وہ اس کے حق

میں ہر بات کو اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ تنقیدی ذہن پیدا کر نیکا صرف، یہی ایک طریقہ ہے۔
 ہر مصنف کو لفظوں میں قدرتی طور پر دلچسپی ہوتی ہے۔ اصل میں ہر لفظ کی اپنی
 ایک شخصیت اور اپنی ایک زندگی ہے۔ نام طور پر لغت کی کتابیں لفظوں کی اس
 پنہاں شخصیت اور زندگی سے عاری نظر آتی ہیں۔ لیکن پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری یا
 مختصر آکسفورڈ ڈکشنری جیسی لغت کی کتابیں اس خصوصیت سے مالا مال ہیں اور لغت
 کی عمدہ کتاب ہر وقت بنا پڑھی جاسکتی ہے جیسے پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری۔

زبان کی کامیں دو ہیں ایک نئی ایک پرانی — پرانی کان قداہوں میں ہے۔
 اور زبان کی نئی کان عوام کی زبان ہے۔ دوسرے درجے کے فنکار بار بار پرانی کان کو
 کھودیں گے مگر اعلیٰ درجے کے فنکار نئی کان سے بہت کچھ حاصل کر پاتے ہیں پرانی
 کان کی صفات کچھلا کر صاف کرنی پڑتی ہے مگر نئی کان کی صفات کچی اور تازہ ہوتی

ہے۔

وانگ چینگ نے پہلی صدی عیسوی ماہرین "اور ذملاً" میں اتیانہ رکھلے
 اسی طرح اس نے ادیبوں اور مفکرین کو بھی علیحدہ علیحدہ شمار کیا ہے۔ جو مجھ سے پوچھے
 تو "ماہرین" کا علم جب وسیع تر ہو جلتے تو وہ فاضلوں کی صف میں آ جلتے ہیں۔
 اور جب کسی ادیب میں تجربے اور فکر کی پختگی آجاتے تو وہ مفکر بن جاتے ہیں۔

جو لوگ بڑے عالم فاضل بنتے ہیں ان کی تحریریں ہر ماہر مانگے مانگے کی ہوتی ہے
 جو لوگ بختے اساتذہ اور ماہرین کی سند پیش کریں اور ان کے اقوال جتنے زیادہ اپنی
 تحریر میں شامل کریں اتنے ہی عالم فاضل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ایک مفکر اس سے
 جگ سے بے نیاز ہو کر اپنے ہی ذہن کی گہرائیوں سے فکر کے نئی نکال لاتا ہے۔
 کتابی علموں کی مثال اس کو ہے کہ جو کچھ کھاتا ہے اسے چاکر اگلا

ثقافت کے فن

ہے اور اپنے بچوں کی چونچ میں چونچ ڈال کر یہی اگلا نوالا انہیں کھلاتا ہے۔ مگر فکر تو
 پیلہ رشیم کی مثال ہے جو شہوت کے تپے کھاتا ہے مگر رشیم اگلتا ہے۔
 تحریر میں آنے سے پیشتر خیالات کا بھی ایک زمانہ حمل ہوتا ہے ویسے ہی
 جیسے ماں کے رحم میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے جنین کی صورت میں ڈار پاتا ہے۔ جب
 آپ کے مجرب مصنفانے آپ کے دل میں خیالوں کا شعلہ روشن کر دیا اور آپ کے
 رگ دپے میں ان خیالوں کی سخیسی دوڑنے لگی تو اس وقت کو زمانہ حمل کا مترادف
 سمجھئے۔ لیکن اس مدت میں اگر کسی واقعہ کر دی جائے اور کوئی شخص مناسب دفع
 کے گزر نیکا انتظار کے بغیر ہی چھپنا شروع ہو جائے تو اسے اسہال کی شکایت سمجھئے
 اب یہ نہ ہوگا کہ درد دائے اور خیالات ایک لڑا ایندہ جیتے جاگتے بچے کو جنم دینے
 پھر جب کوئی ادیب اپنا ضمیر سچے اور معتقدات کے خلاف چیزیں لکھنی شروع
 کر دے تو اس کی مثال مصنوعی اسقاط سے دی جاتی ہے کہ جنین ہمیشہ مردہ ہی
 پیدا ہوگا! — مگر جب کوئی ادیب اپنے ذہن میں سخت بے چینی اور برقی
 اضطراب کی شدید گردش محسوس کرے اور جیتے تک وہ اپنے خیالات کو کاغذ پر منتقل نہ کرے
 اسے چین نہ آئے اور کاغذ پر ان خیالات کے منتقل ہونے پر اسے بے پایاں سکون
 محسوس ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس نے کوئی ادبی شہ پارہ پیدا کیا ہے۔ اسی لئے سچے
 ادیب کو اپنی ادبی اولاد سے — ماں کی سنی محبت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
 ہمیشہ تحریر پہنچا ادبی تخلیق رہی اچھی معلوم ہوتی ہے جو اپنی ہو اور عورت وہ خوبورت
 معلوم ہوتی ہے جو دوسرے کی ہو۔

ادیب کا قلم موتی کی موتی کی طرح مشق سے تیز ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ کشیدہ کاری
 کی عمدہ موتی کی طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن خیالات مشق سے ملائم ہوتے جساتے

لکھنے کا طریقہ

ہیں۔ ان کی کیفیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اگر نیچی چوٹی سے بلند چوٹیوں پر چسپڑے جائیں اور بلند ی پر ہر منظر گولائی میں نظر آئے۔

کسی ادیب کو کسی شخص سے سخت نفرت ہو اور وہ اس کے خلاف سہایت نہر آلود ہجو لکھنے کے لئے قلم اٹھانے کی سوچ رہا ہو مگر ابھی تک وہ اس کی خوبیوں سے واقف نہ ہو تو ادیب کو چاہیے کہ قلم ہاتھ سے رکھے کیونکہ ابھی وہ اس شخص کے خلاف نہر آلود ہجو لکھنے کے قابل نہیں۔

۱۔ اظہارِ نفس کا دبستان

لکھنا اپنی فطرت یا اپنے کردار کے اظہار کا نام ہے اپنی روح کا ایک منظر ہے وہ چیز جسے "آسمانی الہام" کہا جاتا ہے وہ اپنی ہی روح اپنی ہی جو ذی کا ایک پرتو ہے۔ اور اس کی وجہ جسمانی طور پر یہ ہوتی ہے کہ صاحب الہام کے خون میں سرخ ذرات ضرورت سے زیادہ موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ ذرات "قوت" نقطوں میں ڈھل کر ادنی الہام ہو جاتی ہے۔

کسی پرانے استاد کی بنائی ہوئی تصویر دیکھتے یا کسی قدیم مصنف کی کتاب پڑھتے دونوں ان استادوں کی روحوں کے جواہر اصلی کے منظر ہیں۔ جب روح کی یہ قوت یہ جھومر کم ہو جائے یا اس کا سوتا خشک ہو جائے تو بہترین خطاط مصور یا ادیب کے فن پاسے بھی بے جا بنا ہو جاتے ہیں۔

ادب میں "آسمانی الہام" کا ہنگام وہ ہے کہ صبح کے وقت آپ میٹھے سلیو کی نیند سے تازہ دم خود بخود بیار ہوں۔ پھر چائے کا ایک پیالہ پی لیں اور آجیہ دیکھیں جس میں کسی جبر سے آپ کو پریشانی نہ ہو۔ پھر آپ آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں

تفاوت کے نسب

اور ایک روشن دریچے کے سامنے کھڑی میز پر بیٹھ جائیں۔ باہر سورج کی سہانی دھوپ ہو اور ہلکی ہوا چل رہی ہو۔ یہی وقت ہے کہ ادیب اچھے مضامین اور نظمیں اچھے خطوط لکھ سکتا ہے، فن کار اچھی تصویریں بنا سکتا ہے اور ان کے عمدہ عنوانات قائم کر سکتا ہے۔

جس چیز کو ذات "نفس" یا "شخصیت" کہا جاتا ہے وہ اعضا، پٹھوں، اعصاب، معقولیت، جذبات، تہذیب و اخلاق، سمجھ بوجھ، تجربہ اور تعصبات کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ یہ مجموعہ کچھ تو فطری دولت ہے کچھ تمدن کا پیدا کردہ ہے یعنی اس کا کچھ حصہ ہے قدرت کی گود سے لے کر ہم پیدا ہوئے تھے اور باقی حصہ تہذیب نے ہم میں پیدا کیا ہے۔ کسی شخص کی فطرت اس کی پیدائش بلکہ پیدائش کے پہلے سے متعین ہوتی ہے۔ بعض لوگ فطری طور پر سنگدل اور کینے ہوتے ہیں اور بعض فطری طور پر صاف گو کھلے دل والے، جرأت مند اور عالی ظرف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فطری طور پر نرم اندر کمزور کردار کے ہوتے ہیں یا ایسے لوگ کہ فضول بات بے بات پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ یہ گروہی خصوصیات اصل میں ہماری ہڈیوں کا مغز ہیں۔ اچھے سے اچھے والدین اور عمدہ سے عمدہ استاد کسی کی شخصیت کی نوع بدل نہیں سکتا یہ تو فطری باتیں ہیں مگر ان سے الگ وہ خصوصیات بھی ہیں جو ہم میں پیدائش کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ انکا منبع تعلیم اور زندگی کے تجربات ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ذرا بے خیالات اور نظریات اور تاثرات بہت ہی مختلف ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف حصوں میں اس پر مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ وہ مختلف جگہوں سے اپنے خیالات اپنے نظریات اپنے تعصبات اکٹھے کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نظریات اس کے

خیالات اور اس کے نقطہ نظر میں اتنی عدم مطابقت، اتنا تضاد، اتنا پھیر ہوتا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایسے شخص ملتے ہیں کہ کمزور کو بہت چاہتے ہیں مگر بلیوں سے ڈرتے ہیں۔ اور انھیں بے بھائی بند بلیوں کو چاہتے ہیں مگر کمزور ان کو جانا جاتی ہے۔ ایسی تہی انسانی شخصیت کی جتنی قسمیں پائی جاتی ہیں ان کا مطالعہ سب سے عمدہ علم ہے۔

” اظہارِ ذات کے دربان کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ تحریر میں صرف اپنے خیالات اور اپنے محسوسات اپنی سچی چاہتیں اور سچی نفرتیں، ڈنڈ اور مشتعل پوری ایمان داری سے آئیں۔ پھر یہ کہ ان کے اظہار میں برے کو اچھے سے پھیلانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اظہار کے خلوص کے سامنے یہ خدشہ نہ ہو کہ دنیا میرا مذاق اڑائے گی۔ یہ بھلاؤ نہ ہو کہ کہیں میں پرانے داناؤں یا محض راستا دوں کی راستے کو ٹھیلانہ بھڑوں۔ اس دربان کے ادیب کسی مضمون میں سب سے اچھا حصہ دے سمجھتے ہیں جو لکھنے والے کا نائیدہ ہو اس حصے میں سب سے پسندیدہ فقرہ وہ سمجھیں گے جو لکھنے والے کی خصوصیات کا آئینہ دار ہو اور اس حصے میں سب سے اچھی ترکیب وہ سمجھیں گے جو لکھنے والے کی شخصیت کی غیب میں طور پر عکاس ہو۔

اس دربان کا ادیب کوئی منظر، کوئی احساس، کوئی واقعہ بیان کرے گا تو یہ منظر اسی طرح بیان کرے گا جس طرح خود اس نے دیکھا، احساس کا اظہار وہ اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے محسوس کیا۔ واقعہ کا بیان وہ اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے سمجھا۔ جو تحریر اس کو سونپی پر پوری اترے وہی ادب ہے اور جو اس پر پوری نہ اترے وہ ادب نہیں۔

” سرخ شبتان کے کسپے میں جو رڈ کی بین تائے یو ہے وہ بھی ہمارے اسی

دستان کی ایک فرد ہے کیونکہ وہ کہتی ہے "اگر کسی شاعر نے کوئی اچھا مصرعہ کہا ہو تو اس کی فکر نہیں کہ اس کے الفاظ کا آہنگ کتابی قوانین کے مطابق ہے یا نہیں۔" یہ دستان سچے جذبات کا بڑا قائل ہے۔ چنانچہ پر تکلف اسلوب کو شدید بد مذاق سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہ دستان ایسے اسلوب کا حامی ہے جو سادگی اور سیرگاہی میں اپنی مثال آپ ہو۔ یہ دستان فلسفی میں سی۔ آس کے اس مقصد کو حکم گردانتا ہے۔ "تخریر کا واحد مقصد یہ ہے کہ تخریر پر معنی ہو اور بس۔"

ادبی حسن محض معنی خیر کا نام ہے۔

اس دستان کے اصولوں پر چلنے میں ایک خطرہ یہ ہے کہ کہیں لکھنے والے اسلوب بالکل سبک نہ ہو جائے۔ مثال: یوں ٹپک لانا کی تخریریں یا آدھے کہیں اٹکے سپر سے خیالات کے کھنور میں زکھنیں جائے مثال: جن شک تانے یا لکھنے والے کے نظریات مسلمہ اصولوں کے بہت ہی مخالف ہو جائیں (مثال فی جاؤ) اسی لئے دستان کے کنفیوٹسی خیال کے تقادوں کو بڑی نفرت تھی۔ مگر سچ یہ ہے کہ انھیں جدت نگار ادیبوں نے چینی ادب کو موت جیسی یکسانیت اور مرونی سے بچا لیا۔ آئندہ زمانہ بھی انھیں کا ہے۔

سچا ادب کائنات اور انسانی زندگی کے باسے میں سراسر ہجرت کا ایک احساس ہے اور بس۔

جو شخص اپنی نگاہ کھلا لودہ نہیں ہوتے دیتا اس میں ہجرت کا یہ احساس زندہ رہتا ہے۔ پھر اُسے یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ حقیقت کو نسخہ کر کے پیش کرے تاکہ وہ تعجباً ایگزیز چیز نظر آئے۔ اظہارِ نفس کے اس دستان کے خیال اور انکا نقطہ نظر اسی لئے آسانیا اور عجیباً آسان ہے کیونکہ قاری مسخ شدہ مناظر کو عادی ہو چکے ہیں۔

اس دبستان کے نقادوں کو ادیبوں کی کمزوریاں اچھی لگتی ہیں۔ اس دبستان کے تمام ادیب بد ماکی تقالی یا معاصرین تقالی اور ادبی قاعدوں، ضابطوں کے سخت مخالف ہیں۔ اس دبستان کی بنیاد رکھنے والے پیمان بھائیوں کا خیال تھا کہ ادب میں سب سے اہم چیز سچائی ہے۔ لی لی لگنے نے یہ بھی کہا ہے کہ ادب میں اہم چیز لکھنی اور دلچسپی ہے۔ یوان ست سانی کا کہنا ہے لکھنے میں تکنیک کا کیا کام! اور سو رنگ مہر کے لیک بستدائی مصنف کا خیال تھا کہ تحریر میں ہیئت توافق تا اور آتی ہے جیسے لکڑی میں کیڑوں کے کھانے سے چھید پڑجاتی ہیں!

۷۔ بے تکلف اسلوب

بے تکلف اسلوب کا مانک ادیب لگی لپٹی نہیں رکھتا وہ کھسری بات کہتا ہے وہ صاف صاف اپنی کمزوریاں آپ پر واضح کر دیتا ہے۔ اور اس لئے آپ کا تکلف بھی قائم نہیں رہنے دیتا۔

قاری اور مصنف کا باہمی تعلق یہ نہ ہونا چاہیے جو کسی خشک استاد اور اس کے شاگردوں میں ہوتا ہے دونوں کا باہمی ربط بے تکلف دوستوں کا ہونا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں قاری اور مصنف کے درمیان گرمجوشی پیدا ہو سکتی ہے۔

جو شخص اپنی تحریر میں "ہیں" کا لفظ استعمال کرنے سے ڈرتا ہے وہ کبھی اچھا ادیب نہیں بن سکتا۔

میں ایک جھوٹے ادیب کو سچی بات کہنے والے سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اور ہادیب جو نا اعلیٰ اور عاقبت ناندیش بھی وہ عاقبت اور مصالحت میں چھوٹے سے کہیں بہتر ہے کیونکہ یہ عاقبت ناندیشی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے قاری سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہے۔

میں ایک عاقبت ناندیش احمق شخص پر اعتبار کرتا ہوں لیکن ہر دکیل کو شہیے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

یہی عاقبت ناندیش احمق اپنی قوم کا بہترین سفارتی نمائندہ اور مقرر ہے کیونکہ وہ لوگوں کے دل میں لیتا ہے۔

میرے خیال میں اچھا سا لڑکے جو پانزدہ سولہ سال کا ہو۔ اور کیلیہ جاتے کہ سہایت عمدہ باتیں کرنے والے چند لوگ ایک کمرے میں جمع کر دیے جائیں اور انہیں باتیں کرنے دیا جائے۔ قاری وہ باتیں سنتا ہے۔ یہ کوئی دو گھنٹے کی صحبت ہو۔ قاری یہ سننے کے بعد آرام سے بستر پر دراز ہو کر سو جاتے اور اگلے صبح کو جب وہ بیدار ہو اور اپنے معمول کے کام کاج کے لئے کسی بینک یا کسی سکول میں جاتے تو گزشتہ شب کی باتوں کی خوب لوگالوں پر موجود ہو۔

ایسے رستوران بھی ہوتے ہیں جن کے طلائی فریوں کے آئینوں سے سجے ہوئے دعوت کے کردوں میں بڑی شاندار اور پرستکلف دعوتیں دی جاتی ہیں اور پھر ایسے رستوران بھی اکثر ملتے ہیں جہاں بیٹھ کر تھوڑی بہت پی جا سکتی ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ دو تین دوستوں کے ساتھ ایسے ہی کسی چھوٹے رستوران میں جا بیٹھوں اور بڑے اور لمبے لوگوں کی پرستکلف دعوتوں میں شریک نہ ہوں۔ ایک معمولی رستوران میں بیٹھ کر کھانے پینے کا جو لطف آتا ہے ایک دوسرے کو چھڑنے اور ستانے پیمانے اور پیئیں اونڈھانے اور کپڑوں پر مشروب گرانے

سے جو مزہ آتا ہے وہ اعلیٰ پائے کی دعوتوں میں شریک ہونے والے لوگ نہیں سمجھ سکتے
وہ ان مزدوں کو جانتے ہی نہیں۔

ایر لوگوں کے پاس باغات اور ایوان ہیں۔ مگر پہاڑوں کی گودی میں چھپی ہوئی
چھوٹی چھوٹی بھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ان پہاڑی مکاؤں کو بھی سجانے
والے بڑے ذوق اور بڑی نفاست سے سمجھتے ہیں۔ ان کا ماحول اُمر کے ان ایوانوں سے
بہت مختلف ہوتا ہے۔ جن میں قرمزی دروازے اور سبز کھڑکیاں ہوتی ہیں، نوکروں
اور باندیوں کی ایک فوج خدمت کو معین ہوتی ہے۔ مگر ان بظاہر معمولی پہاڑی مکاؤں
میں داخل ہو جتے تو کوئی بھونکتا ہوا گتا آپ کا استقبال نہیں کرتا، اندر آنے پر
نگا چرے بیروں اور درباؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور جب ان مکینوں سے
مل کر رخصت ہوں تو پچھانٹتے پچھرتے دو دہائیات شیر اپنی بے فہم آنکھوں آپ
کو نہیں گھورتے! — سترھویں صدی کے ایک ادیب نے اس صحبت حال کا کیا
خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر ایسے تکلف مکاؤں میں تین عالم آپس میں بیٹھے
بڑے تہذیب و تکلف سے عالمانہ بحث کر رہے ہوں اور کوئی صاحبِ ذوق
اس کمرے میں نیم برہنہ آجائے یا تنگے پاؤں درانہ گھس آئے تو یہ لوگ ناکھوں نہیں
چڑھاتے، وہ تو خوشی کے مارے تالیاں بجا میں گئے اور ایک دوسرے سے جی کھوتی
کر مذاق کریں گے۔ دیکھتے والوں کو شاید حیرت ہو سکین یہ حضرات ایک دوسرے کو
خوب سمجھتے ہیں اسی لئے ان کی خاموش نظریں معنی خیز ہوتی ہیں۔"

من حسن کیسا ہے؟

وہ چیز جسے ادب میں حسن کہا جاتا ہے اور جسے عالمِ انشیا میں حسن قرار دیا

جاتا ہے۔ اس کا دار و مدار بڑی حد تک تبدیلی اور حرکت پر ہے اور اس کی بنیاد زندگی ہے۔ جو حیرت زدہ ہے اس میں تغیر اور حرکت دو لڑائی ہوں گی۔ اور جس چیز میں تغیر اور حرکت ہوگی اس میں قدرتی طور پر حسن بھی ہو گا اب تباہی کے نکتے یا ادب کے لئے بندھے ہوئے قواعد کس طرح ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں چشموں اور دریاؤں میں بے راہبردی، آزادی اور سنگینی کا حسن موجود ہوتا ہے۔ وہ حسن جو انسان کی بنائی ہوئی نہروں میں نظر نہیں آتا حالانکہ انہروں کو انجنیئروں کی ہمارتا اور ان کے حساب سے جنم دیا ہے۔ تاروں کا سبھا آسمان کا ادب ہے۔ اونچے پہاڑ اور پڑے بڑے دریا زمین کا ادب ہے۔ ہوا میں چلتی ہیں اور برلیاں رنگ بدلتی ہیں اور ان کی بدولت ہمیں اعلیٰ کی سی رعنائیاں ملتی ہیں۔ پھر کھراکھ ہے اور درختوں کے پتے گرنے لگتے ہیں اور ہمیں اس تبدیلی کی بدولت خزاں کے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اب ذرا یہ غور کیجئے کہ ستائے اور ستیائے اپنے اپنے محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کیا وہ کبھی سوچتے ہیں کہ انھیں دیکھنے والے ہم نہ مینی انسان۔ کتنا حسین سمجھتے ہیں؟ پھر بھی ستاروں کے مختلف جھمکے جو ہم نے دریافت کر لئے تو یہ محض اتفاقی اور تھا اب زمین کو لیجئے زمین کی سطح کبھی سکراتی ہے کبھی پھلتی ہے اور اس طرح کبھی اونچے پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی گہرے سمندر۔ کیا ہماری دھرتی نے جان بوجھ کر پانچ صدیوں پہلے تخلیق کے متھے کہ ہم ان کی پوجا کیا کریں؟ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تائی ہوا اور کیون لوں کے پہاڑ اپنے عظیم الشان سلسلوں کا آہنگ مے ہاتھ سے سامنے سر بلند ہیں۔ اور سید پالی روشیرہ اور غلمان دونوں سیدنا دلانے والی برفانی چوٹیوں کے ساتھ ہلکے سامنے ہیں کہ ہم دیکھیں اور کچھ کر لطف اٹھائیں۔

یہ خالق اکبر کائنات کے سب سے بڑے استاد فن کے موقلم کی بے پردہ جنبشیں ہیں اور
 بس جو بانگی بدلیاں پہاڑی چوٹیوں سے اٹھلاتی ہوئی نکلتی ہیں اور آگے بڑھ کر طوفانی
 پہاڑی ہواؤں کے بے رحم طمانچے کھاتی ہیں ان کے پاس کیا اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ
 ہم دیکھنے والوں کے لئے اپنا مطلبوں اپنا آنچل درست کیا کریں؟ — مگر یہی بدلیاں سمجھتی
 سنورتی بھی ہیں، کبھی پھلیوں کے نلس کاروپا دکھاتی ہیں، کبھی اطلس بن جاتی ہیں، کبھی
 رگسٹ دوڑتے ہوئے ہنازی کتوں کی شکل بناتی ہیں، کبھی دھاڑتے شیروں، ناچتے
 نقش، انیڈتے ارنے گھوڑوں کے دو قالب بدلتی ہیں اور کبھی حسن و خوبی میں ایک ادبی
 شاہکار نظر آتی ہیں۔ ذرا خزاں زندہ درختوں کو دیکھتے، انھیں گرما کے تھپیڑوں سے مارا
 اب سردی اور پالانار ہا ہے۔ اور یہ پیراب آہستگی سے سانس لے رہے ہیں تاکہ سرما
 کے لئے اپنی قوت محفوظ کر سکیں۔ کیا انھیں اتنی فرصت ہے کہ پرانی شاہراہ پر
 چلنے والے راہی کی نظروں سے لے کر بن سنور سکیں؟ — مگر یہ پیراب کتنے مطمئن اور
 پاکیزہ اور ملول اور تنہا نظر آتے ہیں اور یہی پیراب دانگ دی اور مینی کی تصویروں سے
 کس قدر ارفع اور اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں!

یعنی اس کائنات کی ہر زندہ چیز میں اس کا ادبی حسن پنہاں ہے۔ تاکہ کی
 سوکھی ہوئی بیل کا حسن دانگ سی۔ چچی کی خطاطی سے کہیں اعلیٰ ہے۔ سر بلند
 چٹان کی سنگینی ان کتبوں سے کہیں زیادہ شان دار ہے جو کسی شہنشاہ کے مقبرے
 پر استیادہ ہوں۔ اشیاء کا ادبی حسن تو ان کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے اور لوگ جو اپنی
 فطرت کے تقاضوں کی نگہبانی کریں، انھیں پروان چڑھائیں گے۔ وجود کو حسین ترین
 خطوط کی نزالی کائنات میں سمو لیتے ہیں۔ گویا خطورہ اندامیت کا حسن ایک اعلیٰ چیز ہے
 خارجی لازمہ نہیں۔ گھوڑے کے سم دیکھتے انھیں تیز گامی کے لئے بتایا گیا ہے۔ شیر کے

تعارف کے مزے

پنجوں کو اپنے شکار پر پھینٹنے کے لئے یہ شکل دی گئی ہے۔ جگلوں کی لمبی ٹانگیں دلدرو نہیں پھرنے کے لئے خاص طور پر بنائی گئیں۔ ریچھ کے پنجے برف پر دھپ دھپ چلنے کے لیے ہیں۔ کیا گھوڑا یا شیر بگلا یا ترچھ کبھی اپنی بناوٹ کے حسن اور تناسب پر غور کرتے ہیں؟۔ ان میں سے ہر جانور زندگی میں اپنا کام یا فطری تقاضا پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے مطابق حرکت کا ایک مناسب طریقہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنے نقطہ نظر سے دیکھیں تو گھوڑے کے سرمے شیر کے پنجے بگلا کی ٹانگوں اور ریچھ کے پنجوں کی کتنی موہنی ہے۔ کوئی اپنے خطوط کے بھرے پن کی وجہ سے اچھا لگتا ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی مستور قوت کا احساس ہو جاتا ہے۔ کوئی اپنے خطوط کی نقاشی مگر استقلال کیلئے نمایاں ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ جوڑوں کی سنگینی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ ان کے علاوہ ہاتھی کے پاؤں شیر کی ابال گاتے کی ٹانگیں وغیرہ خطاطی کے مختلف اسالیب کی علامتیں اور مظاہر کی بنیاد ہیں۔ ان کا حسن ان کی نسبتاً ترکیب اور حرکت میں ہے۔ ان کی مخصوص جسمانی ساخت ان کے جسم کے افعال کا نتیجہ ہے۔ اور لکھنے کے حسن کا سائز بھی یہی ہے کہ جب حرکت کا ایک خاص انداز لکھنے پر مجبور کرے تو لکھنے کی اس خواہش کو دہانا نہ چاہیے۔ اور جب حرکت کا انداز لکھنے کا محسوس نہ ہو تو لکھنا بند کر دینا چاہیے۔ اس لئے ایک ادبی شاہکار فطرت کے کسی منظر کی طرح ہے کہ اپنی بے منتی میں بہتیت بے ترتیبی میں ترتیب کھتا ہے۔ اس کی دلکشی اس کا حسن شعوری نہیں بے اختیار ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن تو حسن حرکت کا نام ہے۔ جامد تناسب کا نام حسن نہیں۔ ہر وہ چیز جو زندہ ہے اور جو حرکت کرتی ہے اس میں اس کا اپنا حسن اپنی قوت بہتیت اور خط کا اپنا جمال موجود ہوتا ہے۔

باب سوم

خدا سے نامنا

۱۔ مذہب کا اجیا

۲۔ اپنی کہانی

۱۔ مذہب کا ایجا

اس دنیا میں بے شمار لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خدا اور خدا کی رضا اور خدا کی ناراضی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ تجھے ڈر ہے کہ میں کچھ عرض کروں گا اُسے لوگ کفر قرار دیں گے اور بعض اُسے "پتھیرا" باتوں سے تعبیر کریں گے۔

مطلب کی بات مدلل صورتوں میں ضبط ہو جائے گی۔ مگر اندازہ کیجئے کہ ہم انسان جو اس زمین کے موجودات کا کردار حصہ بھی نہیں اور ہماری زمین جو کل کائنات کے کردار میں حصے بھی نہیں فرمایا ہے، ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کو جانتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ جب تک ہم اپنے گرد و پیش کی کائنات میں پھیلی ہوئی روح حیات سے اپنے آپ کو پوری طرح اور کئی بخش طریقے پر ہم آہنگ کر لیں اس وقت تک زندگی کا کوئی فلسفہ ممکن نہیں کہلا سکتا، نہ انسان کی روحانی زندگی کا کوئی تصور ہی بکریا قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ماننا انسان بہت اہم مخلوق ہے، اتنی اہم کہ وہی ہمارے ممالک کا اہم ترین موضوع ہے۔ اور انسان پرستی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مگر یہ نہ بھولتے کہ انسان ایک بہت ہی شان دار کائنات میں رہتا ہے۔ یہ کائنات اتنی ہی شاندار ہے جتنا خدا انسان ہے۔ اس لئے انسان کے گرد پھیلی ہوئی ایک عظیم کائنات کو جو شخص قابل اعتنا نہیں سمجھتا، اس کائنات کے مبادا اس کی منزل پر غور نہیں کرتا اس کی زندگی صحیح معنی میں زندگی نہیں۔

مذہب جس صورت میں ہم تک پہنچا ہے اس میں تاریخی ارتقا کے ساتھ ساتھ ایسی بہت سی چیزیں شامل ہوتی گئی ہیں جو مذہب کی اخلاقی حدود سے صحیح معنوں میں باہر ہیں۔ ان میں طبعیات بھی ہے اور طبقات الارض کا علم بھی، فلکیات ہے اور نجوم کی سائنس بھی اور جنس اور عورت جیسے معاملوں کے بارے میں تصورات بھی ہیں۔ اگر مذہب اخلاقی حدود تک رہتا تو مذہب کے احیا کا کام اتنا زبردست اور ٹھن نہ ہوتا جتنا ہو چکا ہے۔

عین دوسری جانب سائنس ہے جو آج کل کے انسان کے سامنے کائنات کے اسرار کا ایک نیا اور زیادہ گہرا احساس پیدا کر رہی ہے۔ اور مادے کو ایک ایسی چیز قرار دے رہی ہے جسے قوت کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔ پھر جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے۔ سائنسدان ہر چیز جین کے الفاظ مذہبی تصورات کہنے سے معنی پہنچا رہے ہیں کہ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے وجود کے بجائے ایک بہت بڑے تصور (خدا) کے قریب تر آرہی ہے! — اعلیٰ ریاضی کی رُو سے بھی اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کائنات میں اس سے ارتق ایک مستحکم بھی ہے جس کا اندازہ ریاضی کی رُو سے نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مذہب بہت سے حیاتی میدانوں سے ہٹ جائے۔ قدرتی سائنسوں کے بارے میں مذہب جو کچھ کہتا رہا ہے اس کے بارے میں بھی یہ ماننا ہو گا کہ یہ باتیں مذہب کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ روحانی مشاہدات کا جو انسان باتوں میں نہ ڈھونڈا جائے جن کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً یہ بات کس طرح مذہب کے روحانی نظریوں سے تعلق ہے کہ اتنا نینت کی عمر چار ہزار سال سے یا دس لاکھ سال ہے یا یہ کہ زمین کی شکل چٹھی ہے یا گول ہے یا زمین ایک چلنے کی میز کی طرح کھولی بند کی جاسکتی ہے یا یہ کہ مہدومت کی رُو سے زمین ہاتھی یا گائے کی پشت پر دھری ہے

یا چینی کچھوڑوں کی پیٹھ پر کھڑی ہے

مذہب کو صرف اخلاقیات سے واسطہ رکھنا چاہیے اور یہی اسے کرنا بھی ہوگا
 اخلاقیات بھی اتنی ہی باوقار چیز ہے جتنی پھولوں کی نشوونما یا پھولوں کی پرورش کے
 سائنسی علوم میں یا فلکیات کی تحقیق ہے۔ اسی طرح اگر مذہب کو طب اور علم الاجرام
 سے الگ کر دیا جائے تو اس میں سراسر مذہب کا فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر مذہب کو
 فلکیات، حیاتیات اور طبقات الارض کے علوم میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے اور
 لوگوں کے قدیم رسوم و رواج کے تحفظ کی کیا پڑی ہے۔ اگر مذہب جدید علوم کے بارے
 میں خاموش رہے تو اس کے احترام اور اس کے وقار میں سجدہ اضافہ ہو سکتا
 ہے۔

گویا جدید زمانے کی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ہر فرد کو مذہب کے
 رسمی تقاضات سے اپنے لئے خود مذہب اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ آج کل مذہبی کلیا
 اور عقیدے جس طور پر رائج ہیں ان کے لئے تو دل میں خفا ہی پیدا ہوتی ہے۔
 سائنسی زمانے کا فرد جب اپنے لئے ایک سیدھا سادہ مذہب ڈھونڈنے پر قادر
 ہو جائے گا تو جس خدا کی وہ پرستش کرے گا وہ ایسا خدا نہ ہوگا جسے روز کے
 چھوٹے بوٹے تحفوں سے خوش کیا جاسکتا ہو۔ وہ اس اپنے بندے کی خواہش
 پر ہوا کو شمال کے رخ چلنے کا محض اس لئے حکم نہ دے گا کہ اس کا بندہ شمال کے
 رخ جہاز میں جا رہا ہے۔ ہوا کی سازگاری کے لئے خدا کا شکر عجاں تاگت اٹھائے اور
 سخت بدتمیزی اور خود غرضی ہے۔ اس شکرانے کا مطلب ہے کہ خدا ان بندوں
 سے بالکل محبت نہیں کرتا جو جنوب کے رخ جہازوں میں امدانہ ہوتے۔ چونکہ
 اس کا یہ خاص انخاص اہم بندہ شمال کی طرف جا رہا تھا محض اس لئے اس طرف

شمال کی طرف ہوا کو چلنے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ خدا اور بنارے کے تاتے کی شکر ٹاپی
 کہ دونوں کے درمیان روحانی یگانگی ہو اور ایک فریق دوسرے سے بھیک ہی مانگتا
 نہ رہے۔ موجودہ صورت میں عالی خیال انسان آج کے دروجہ مذہب کو سمجھنے سے عاجز
 ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ مذہب کے روحانی رشتوں کی یہ کاپاپٹ کیونکر ہو گئی
 وہ مذہبوں کی موجودہ صورتوں کی کوئی جامع تعریف پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ نہیں بتا
 سکتا کہ مذہب انسان اور خدا کے ازلی ابدی تاتے کا اعلیٰ نظریے جس میں روحانی رشتوں
 بھی شامل ہے؛ یا مذہب چند اخلاقی سچائیوں کا نام ہے جن پر مسزہبی رہنماؤں نے
 اسرار کا ایسا پردہ ڈالا ہے ان میں ایسی ایسی اختراعات رکھی ہیں اور انہیں اس طرح
 دوسری بیکار باتوں میں چھپا دیا ہے کہ یہ مذہبی رہنما اس سے روٹی کما سکیں؛ یا مذہب
 ایک نادیدہ اور انسانی علم سے بالاتر ہستی کے سلسلے میں محض ہمارے ذہنی گریتوں کا
 نام ہے؛ کیونکہ جو چیزیں دکھی نہ جا سکیں جنہیں سمجھنا انسانی عقل سے باہر ہو
 ان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائی آسان ہوا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں
 بتا سکتا کہ اعتقاد کی بنیاد علم پر رکھی چاہیے یا جہاں علم کی سرحد ختم ہوتی ہے عقیدہ
 وہیں سے شروع ہوتا ہے؛ اور کیا مذہب ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اسے ہر ایرے
 ایرے کے ساتھ پیش کر سکتا ہے؛ یا کیا مذہب آریائی یا یورپی خون کی بقا
 کا جیلہ ہے؛ محض طلاق اور ضبط تولید کی مخالفت کا نام ہے اور اس کی رو
 سے ہر معاشرتی مصلح کو "اشتراکی" اور "سرخا" کہ کر ذلیل کیا جا سکتا ہے؛ کیا
 مسیوح نے روسی ادیب کو نٹا طالسٹائی کو واقعی ایک شدید برقباری کے
 بچانے آنغوش میں لے لیا تھا جب کلیسا سے یونان اسے مدبر قرار دے چکا تھا؛
 ان تمام سوالات کے بعد ایک احساس باقی رہ جاتا ہے یہ احساس شاید

دوسروں کے لئے کچھ بے چینی کا موجب ہو مگر میرے نزدیک بے حد اطمینان بخش ہے۔
 یہ احساس یہ ہے کہ مذہب کا جتنا اور کچھ عنصر ہماری زندگی میں باقی رہ گیا ہو وہ زندگی
 اور اس کی ذمہ داریوں کے حسن اور اس کے ہنرمندانانہ اسرار کے لئے احترام کا
 ایک نہایت سادہ احساس ہے اور بس۔ گویا مذہب سے وہ تمام پرہیز اور خوش
 فہم قسم کے اقیان اور عقیدے چھٹ جائیں گے جو دنیاویات کی موثر گائیوں نے
 خول بنا کر مذہب پر چڑھا رکھے ہیں۔ اس صورت میں مذہب ایک سادہ پھیر رہ
 جاتا ہے اور بہت سے جدید لوگوں کے لئے بچہ کافی روحانی ثابت ہوتا ہے
 فردین وسطی کے روحانی تسلط کا زمانہ تو سمجھئے کہ لہ گیا۔ رہا یہ سوال کہ مذہب کی اپیل
 انسان کو زندہ جاوید بنانے پر مبنی تھی سو اس کا زمانہ بھی نہیں رہا۔ کیونکہ جدید
 زمانے کا آدمی موت آجائے تو مر جانے پر بالکل ماضی ہوتا ہے۔

انسان کو امر ہو جانے سے جو انتہاگ اور دلچسپی رہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق
 انسانی امراض کے علم سے ہے۔ فانی انسان کو امر ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ
 بات سمجھیں بھی سکتی لیکن عسیا بیتا کے اشرنے اس تصور کو ہمارے ذہنوں
 پر اس بڑی طرح سے سوار کیا کہ انسان کی بہت سی توجہ اس طرف مرکوز رہی —
 ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ فانی انسانوں کے دل میں امر ہو جانے کی خواہش ایک ناممکن
 پسے کی طرح چھلکا لیتی تھی ایک ایسا تصویر بن جاتی جو انسانہ اور حقیقت کی درمیانی
 دہلیزے تعلق رکھتا۔ مگر ہوا یہ کہ امر ہو جانے کا خیال ہمارے لئے بے حدام اور
 زندگی موت کا مسئلہ بن گیا۔ بلکہ پادریوں کے لئے تو موت کا خیال یا موت کے بعد
 زندگی کا تصور ان کی زندگی کا پیشہ بن کر رہ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ پچاس سے اوپر
 پہنچ کر بہت سے لوگ (عیسائی ہوں یا کافر) موت سے نہیں ڈرتے اسی لئے وہ

جنت اور دوزخ کی فکر سے بھی آزاد رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زبان سے ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ بھائی میری قبر پر کتبہ لگانا اور قبر کا ڈیزائن اس طرح کا ہو تو اچھا رہے گا بلکہ ان لوگوں کو ہم یہ بھٹا کرتے ہوئے بھی سنتے ہیں کہ مرنے کو دفن کرنے سے اس کا جلانا بہتر ہے! میری مراد صرف ان لوگوں سے نہیں جن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ سیدے جنت میں جائیں گے بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی شمع بجھنے کے بعد روشنی نہیں دے سکتی۔ جدید زمانے کے بہت سے صاحبانِ کمال نے انسانی زندگی کے جاودانی ہونے پر شک ظاہر کیا ہے بلکہ وہ اس جھنجھٹا ہی کو نفسوں سمجھتے ہیں ان میں ایچ جی ونز، حلیم آئن سٹائن اور سر آر تھر کتیو جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں لیکن موت کے خوف پر غالب آنے کے لئے اعلیٰ درجے کا ذہن خاص ضروری بھی نہیں۔ اس خوف پر ہر کوئی غالب آ سکتا ہے۔

انسانی زندگی اور فرد کے امر ہونے کے تصور کے بجائے بہت سے لوگوں نے ایک اور نوع کی بقائے دوام کا تصور پیش کیا ہے جو زیادہ یقین آمیز ہے۔ اس میں کسی نسل کی بقا کسی کے کام اور اس کے اثر کی بقا شامل ہیں۔ مثلاً ایک فرد (ہم آپ) درحقیقت تو مضافتہ نہیں لیکن ہم جو کام اپنے چھپے چھوڑے جا رہے ہیں وہ زندہ رہتا ہے اور ہم سے معاشرے کے افراد پر برا اثر ڈالتا رہتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم شاخ سے پھول توڑ کر اس کی پتیاں نوچ کر زمین پر پھینک دیتے ہیں مگر اس پھول کی خوشبو ہوا میں رچی رہتی ہے۔ گویا فرد کے حمل اور اس کے اثر کی بقا فانی انسان کے امر ہو جانے کے تصور سے کہیں زیادہ معقول زیادہ بے لوث چیز ہے۔ ان معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی پاس میٹر اور موجود اس ایڈریس

ابا تک پہلے درمیان زندہ ہیں کیونکہ ان کا نام زندہ ہے ان کے جسم مردہ ہو چکے
 ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ انسانی جسم چند کیسائی اجزا کا ہرآن بدلتا ہوا
 ایک تصور راتی منظر ہے اور بس! — عمل کی اس پائندگی کے پیش نظر ان کی اپنی
 زندگی اپنی مسرتی کو مجموعی حیات کے بہتے دریا کا ایک قطرہ شمار کرتا ہے اور اس
 مجموعی زندگی کی بہتری کے لئے جو کچھ بن پڑے کرنے سے درپے نہیں کرتا اور اگر ان کا
 ذرا سا کم خود غرض ہو تو اس کے لئے یہی بہتا ہے۔

۲۔ اپنی کہانی

یہ اگر کفر ہے پھر کیا ہے مسلمان ہونا!

میرے نزدیک مذہب بالکل انفرادی اور ذاتی چیز ہے۔ ہر شخص کو لازم ہے کہ وہ
 مذہب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر خود معین کرے اور اگر اس کا دل دریا سے پاک
 اور اس کی نیت صاف ہے تو خدا سے ملزم نہ ٹھہرائیگا۔ ہر شخص کا مذہبی تجربہ
 صرف اسی کے لئے ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اس پر بحث اور جھگڑ کی گنجائش
 نہیں۔ پھر بھی مذہبی مسلوں کے بارے میں ایک دیانت دار اور خوش نیت
 دل کی گنجائش کی کہانی دو مردوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔
 اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مذہب کے بارے میں عمومی باتوں کو چھوڑ کر اپنی کہانی
 بیان کروں۔

عام معنی میں مجھے لا مذہب کہا جاسکتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ تو عیسائیت
 کے خلاف بغاوت ہوتی، مگر میں عرض کروں گا کہ "بغاوت کا لفظ ذرا سخت

ہے۔ اور اس سے میرے دل و دماغ کی صحیح کیفیت بھی ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ میں بہت ہی آہستہ آہستہ عیسائیت کے دین سے دور ہوا ہوں، مگر اس انحراف کے زمانے میں بھی پوسے دلی خلوص اور تقویٰ کے ساتھ ان مذہبی رسوم اور احکام کا پابند رہا ہوں جو آہستہ آہستہ میری گرفت سے دور ہو رہے تھے۔ جیسے ہمیں اپنے دین کے احکام یا معتقدات کے خلاف کبھی نفرت پیدا نہیں ہوتی اس لئے نبیوں کی عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں ایک پادری کے گھر میں پیدا ہوا۔ میری تربیت بھی اسی طرح کی گئی کہ بڑا ہو کر پادری بنوں۔ اس لئے قدرتی طور پر مذہبی کشش کے دور ان میں میرے جذبات مذہب کے خلاف نہیں، مذہب کے حق میں ہے۔ جذبات اور عقل سلیم کے اس تصادم کے دوران میں ایک زمانہ وہ آیا کہ میں نے دین عیسائی کے ایک اہم عقیدے "شہادت مسیح کی بدولت انسانیت کی نجات" سے مکمل انکار کر دیا تھا۔ اس پر وہ پوزیشن ہے کہ ایک لامذہب یا کافر کی ہو سکتی ہے اسی ذہنی حالت میں مجھے سکو ملا اور میرا ذہنی خلحاں دور ہو گیا۔ یہ سارا کام مجھ اس قدرتی طریقے پر انجام پایا کہ جس طرح بالکل قدرتی طریقے پر دقت آئے تو بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے یا جب سیب پک جاتے تو خود بخود زمین پر گر تے ہیں، اسی طرح سیب کے پکے گرنے کا دقت آیا تو میں نے اس کے گرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ تاؤ (قانون نظر) جسے فلسفے میں اس رویے کو تائید کے مطابق زندگی بسر کرنا قرار دیا جاتا ہے۔

مغرب میں اسی چیز کو اپنے ساتھ سچائی اور خلوص برتنے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کائنات کے ساتھ مخلص رہنے کا نام دیا جاتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی شخص جب تک اپنے ساتھ ذہنی طور پر مخلص نہیں رہے خوش نہیں رہ سکتا اور نہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں

کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہی جنت ہے۔ اور لاندہیب ہونیکا مطلب یہ
مدنای یہ ہے۔

واضح ہو کہ لاندہیبیت محض کوئی اصطلاح نہیں جس طرح دین مسیح کا پیر
یا عیسائی ہونا محض ایک اصطلاح ہے اور بس۔ لاندہیبیت محض نفی اور انکار
ہی کا نام نہیں۔ عام لوگ یہی سمجھیں گے لاندہیب ہونیکا مطلب یہ ہے کہ
فلاں شخص عیسائی نہیں۔ اور چونکہ عیسائی ہونے کا قبیح اور واضح مطلب
نہیں اس لئے "عیسائی نہ ہونے" کا مطلب بھی اتنا ہی مبہم ہے۔ اگر آپ
یہ کہیں "لاندہیب ہونیکا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص خدا اور خدا کے دین پر اعتقاد
نہیں رکھتا تو میں پوچھوں گا کہ خدا کی ہستی آپ کے نزدیک کیا مراد ہے؟ اور
خدا کا دین یا زندگی کے بارے میں مذہبی نقطہ نظر" کا کیا مطلب ہے؟۔ حالانکہ
حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنی لاندہیبی کی بدولت مشہور ہوئے ہیں وہ ہمیشہ فطرت
کے تقاضا اور فطرت کے مظاہر کو بڑا پاک اور بڑا مقرب سمجھتے تھے اور
ان کا سجد احترام کرتے تھے۔ لہذا ہمیں "لاندہیبیت" کے لفظ کو اسکے قدیم اور لغوی
معنی میں لینا پڑے گا۔ لاندہیب آدمی سے مراد دنیا ہو گا جو گرجے نہیں جانا
وہ رسم بڑی خوبصورت ہے اور میں اب اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں اور دین مسیح
کے کسی فریے کا یا بند نہیں اور اُس کے کڑے عقائد کو تسلیم نہیں کرتا۔

لاندہیب آدمی جن چیزوں کی نفی اور انکار کرتا ہے وہ اوپر بیان ہوئی
اب ان باتوں کی طرف آئیے جس میں ایک لاندہیب چینی (اور میں) گہری واقفیت
کے بل پر صرف اسی قسم کے لاندہیب انسان کی بات کر سکتا ہوں عقائد لکھا
ہے۔ اسکا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہماری یہ اراضی از زندگی ہی زندگی ہے جسکی ہمیں

ضرورت ہے اور میں اسی سے سروکار ہے وہ اس زندگی کو بہت زیادہ باغز اور بہت بھرپور گزارنا چاہتا ہے اس کے دل میں بارہا اس فانی زندگی کی گہری ٹھنکی کا احساس چٹکیاں بٹیا ہے مگر وہ بخوشی اس کا سا فدا کرتا ہے۔ انسان زندگی میں حسن اور نیکی جہاں کہیں نظر آتے اس کا دل دیکھتے ہی جھوم جاتا ہے اور نیکی کو شکوہ اس کا کام سمجھتا ہے جو اپنا صلہ اور بدلہ آپ ہے وہ ان پابند مذہب لوگوں کو کچھ رحمہم کچھ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو جنت میں جانے کے لئے نیکی کرتے ہیں اور اگر انہیں جنت کا لالچ نہ دیا جائے یا دوزخ سے نہ ڈرایا جاتا تو شاید ہرگز نیکی تو اب کا کوئی کام نہ کریں۔ اگر لامذہبیت یہی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہائے ملک میں بے شہادت "لامذہب" لوگ موجود ہیں۔ مگر انہیں خود معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں۔ گویا ان معنی میں آزاد خیال مذہب پرست اور لامذہب شخص ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں شرط یہ ہے کہ ان میں خدا کے بارے میں بحث نہ چھڑ جائے۔

مجھے مذہبی جذبے کی گہرائی کا حال خوب معلوم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا تسلیم کا عالم میں ہونے کے بغیر بھی یہ بحر بہر شخص کو صاف ہو سکتا ہے اور اگر یہ بات نہیں تو پھر یا تو نیبیا نیت کا دین بیگانہ ہے اور یا اسکی سجد بڑی تادیلیں پیش کی گئی ہیں۔ مجھے ایک بادین اور ایک لامذہب شخص کی روحانی زندگی میں جو فرق نظر آتا ہے وہ سادہ لفظوں میں یہ ہے۔

مومن اعمیائی ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جس پر خدا کی حکمرانی ہے۔ اور جس کا خدا کو ہر دم خیال میں رہتا ہے اسل خدا کے ساتھ اعمیائی مومن کا ایک مستقل ذاتی رابطہ قائم ہے۔ گویا وہ ایسی دنیا کا باسی ہے جس پر ایک ہر بات باپ کی مستقل نگرانی قائم ہے اسکا لکھ لکھا نادر کردار بھی کبھی کبھی اس پر

معیار کو کبھی چھو لیتا ہے جو خدا کا ایک بچہ ہونے کی حیثیت سے اسکے لئے ممکن ہے۔
 بلاشبہ یہ معیار حاصل کرنا یا اسی معیار پر ساری زندگی قائم رہنا مشکل ہے بلکہ اس معیار
 کے مطابق ایک ہفتہ بلکہ ایک دن پورا زندگی بسر کرنا بھی ممکن ہے۔ گویا اس مومن
 کی روزمرہ کی زندگی بشریت اور مومنیت دو حدوں کے درمیان کا شاید لستی رہتی ہے۔
 اس کے برعکس بچا لالاندھیلا اس دنیا میں ایک قسم کی طرح زندگی بسر کرتا ہے
 اسے یہ احساس ڈھارس دینے کے لئے موجود نہیں کہ آسمان پر ایک ذاتِ عالی۔
 اس کی محافظانہ نگراں ہے اور جب نماز اور دعا کے ذریعے سے اس ذات کا رشتہ
 مجھ سے قائم ہو جائے گا تو یہ ذاتِ عالی میری ذاتی بہبود اور صلاح کی ضمانت بخائیگی
 مجموعی طور پر یہ بے چارہ ایسی دنیا میں رہتا ہے جو مومن کی دنیا کہیں کم خوشگوار
 اور کم خوش آئند ہے۔ مگر اس قسم کو رد و قرار وہ فائدے حاصل ہیں جو صرف ایک
 بے یار و مددگار انسان کے حصے میں آتے ہیں۔ ضرورت اسے خود بخود ہی اور اعتماد
 نفس رکھتی ہے اپنی حفاظت آپ کرنا سکھاتی ہے اور اسے ہر قسم کی طرح زیادہ
 سچتہ کار اور سچتہ خیال بھی بنا دیتی ہے۔ میرے معاملے میں یہ ہوا کہ دنیا میں خدا
 کی محبت کے بغیر جینے کے احساس بلکہ تصدیق ہی نے مجھے ڈرایا تھا اور بہت سے لوگوں
 کی طرح جو سیدالشی طور پر مسیحی دین کے پیرو ہوں مجھے یہی خیال بار بار ستاتا رہتا تھا کہ
 اگر میرے دل میں میرے ذاتی خدا کی ہستی موجود نہ ہوگی تو نہ جانے یہ ساری دنیا تہ وبالاً
 ہو جائے گی۔ اس کی وجہ خود اعتمادی اور سچتہ کاری کا فقدان تھا اور بس۔
 خیران باتوں کے باوجود ایک مرحلہ آگتا ہے کہ ایک لاندھیلا مومن کی
 بظاہر خوش ہنسد دنیا کو محض باز سچے طفلان بلکہ نیم بالغ اور خامکار دنیا کے روپ
 میں بھی دیکھے۔ مومن کے تصورات کی دنیا مفید اور عملی دنیا ہی مگر جب تک

اعتقاد کا ٹرہ آنکھوں پر پڑا ہے یہ مفید اور عملی نظر آتی ہے۔ وہ نہ بیلے کی طرح یہ سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے خوش اعتقاد ہی کی یہ دنیا زیادہ رنگین بھی ہے مگر اپنی رنگ آمیزی کی وجہ سے ٹھوس اور سچی نہیں اس لئے بے پایہ بھی ہے۔ میں ذاتی طور پر ہمیشہ سمجھتا رہا ہوں کہ جو چیز رنگین زیادہ ہو اور آسمیں ٹھوس سچائی کم ہو وہ نکتہ سچائی کو جاننے کیلئے ہمیشہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے چنانچہ جو کچھ ہو سو ہو ہمیں سچائی کو جاننا ہی چاہیے۔ نفسیاتی طور پر یہ معاملہ ایک قاتل کے معاملے سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی اگر کسی نے قتل کرنے کی حماقت کی ہو تو بہترین اسلحہ یہی ہے کہ اس قتل کا اعتراف کرے۔ ساسی کے میں کہتا ہوں کہ لائڈز میں بننے کیلئے جس رات لو سمہت درکار ہے۔ لیکن ایک فوجی جبری سے بری چیز کو صبر سے اور خوشی سے قبول کر لیا جائے تو انسان کے دل سے خوف اور خطر دونوں نکل جاتے ہیں اور اسے مکمل ذہنی سکون حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ ذہنی سکون اس حالت کا نام ہے جس میں آپ نے بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔ میرے دل میں جو لائڈز میں چھپا بیٹھا تھا اس نے عیسائیت کو غرور اور عاجزی دونوں کی وجہ سے سمجھ دیا تھا۔ یہ غرور جذباتی غرور تھا اور عاجزی ذہنی انکسار سے عبارت تھی۔ مگر مجموعی طور پر میں نے عیسائیت کو غرور کی وجہ سے کم اور عاجزی کے باعث زیادہ چھوڑا۔ جذباتی غرور کی تفصیل یہ ہے۔ سہلوگ خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بڑے اچھے بنتے ہیں۔ وجہ یہ کہ مذہب کا حکم ہی ہے۔ مجھے اس خیال سے بڑی نفرت ہے۔ آخر سہلوگ محض انسان ہونے کی حیثیت سے خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے اور اچھے بن کر کیوں نہیں دکھ سکتے؟ نظریاتی لحاظ سے اسے "انسان پرستی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ میرے ذہنی غرور کا ذکر تھا جو

بجائیت ایک انسان میری ذات میں جاگزیں تھا رہا عاجزی کا معاملہ تو عرض ہے کہ جدید
 علوم نے ہم پر نکلیات کی پراسرار دنیا میں منکشف کر دی ہیں۔ اس کی بدولت ہم یہ نہیں ان
 سکتا تھا کہ انسان خالقِ کبر کی نظر میں اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ اپنے آپ کو اہم سمجھتا ہے کیونکہ
 ایک انسان ایک فرد کی حیثیت سے اس آریہ زمین کا ایک صحیح مقدار زدہ ہے اور اس کی
 اور اس کی یہ زمین خود نظامِ شمسی کا ایک بہت ہی حقیر حصہ ہے۔ اور یہ نظامِ شمسی کل کا کتنا
 کے شمسی نظام میں ایک ذرہ سے لیا بڑا نہیں۔ جب انسان کی ہستی کا اس
 کا سنا تھا یہ حال ہے تو انسان کی گستاخی تکبر اور شورشِ چشمی ملاحظہ ہو کہ اپنے
 آپ کو کتنا بڑا کتنا اہم سمجھتا ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ
 خالق سمجھنے کا ہمیں کیا حق ہے؟ اور ہمیں اس ذاتِ کبریا کا نام نہ بنجانے کا کیا
 حق ہے۔ حالانکہ اس کی قدرت اور اس کی تخلیق کا کروڑوں حصہ بھی ہم نہیں دیکھ
 سکتے۔ اور اگر اب یہی ہے تو پھر ہمیں اس ذاتِ عالی کے بارے میں نظریے قائم کرتے
 اور حکم لگا دینے کا کیا حق ہے؟

عیسائیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے بڑا
 اہم ہے۔ لیکن اسی عقیدے نے رینڈرہ کی زندگی میں انسان کے دل میں جو غرور جو تکبر
 پیدا کیا ہے اس پر بھی آتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میری والدہ کے خبارے میں اور تدقیق سے چار دن پہلے سخت بارش ہوئی
 جولائی کے مہینے میں چانگ چاڈ میں یہ موسم کا معمول ہے ڈریہ تھا کہ یہ بارش اگر خباری
 رہی تو شہر میں سیلاب آجائیگا اور سبازہ اسی طرح رکھا جائیگا۔ خانہ میں شہرت
 کرنے والے لوگ شگھانی سے آئے تھے اور اگر تدقیق میں زیادہ دیر ہوتی تو سب کا
 آنا منقول جاتا اور سب کو کوفت ہوتی میری ایک رشتہ دار خاتون جو بڑی کڑی تھی

عورت تھیں ہوں۔ مجھے خداوند یسوع پر بھروسہ ہے وہ ہمیشہ اپنے بچوں کا خیال رکھیں گے! چنانچہ انھوں نے دعائیں مانگیں اور بارش بند ہو گئی۔ ظاہری طور پر بند ہو گئی۔ ظاہری طور پر اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ایک چھوٹا سا عیسائی خانہ دان اپنے ایک مرحوم عزیز کو آرام سے پتھر خاک کر سکے لیکن اس اعتقاد کے تحت میں جذبہ یہ نظر آتا تھا کہ جس کو بتنا دیکر خدا شہر جا کر چاؤ کے ہزاروں باشندوں کو بڑی بے پرواہی سے سیلاب کا تجربہ دیتا گیا۔ گویا اس نے ان ہزاروں باشندوں کو اجل کا تجربہ کرنے سے بچانے کے لئے بارش بند نہیں کی بلکہ بارش محض اس لئے بند کی گئی کہ ایک گھرانے کے چند افراد کو خانے اور زمین میں تکلیف ہوتی۔ میرے نزدیک یہ ایسی خود غرض ہے جس کی مثال نہیں ملتی اور میں اگر تسلیم نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خود غرض بندوں کے لیے یہ کچھ کرے گا۔

دوسری مثال ایک عیسائی پادری کی ہے اس نے اپنی سوانح لکھی اور قسارہ مطلق کی قدرت کے کرشمے بیان کرنے کے سلسلے میں بہت جگہ "ثبوت" دیا تھا کہ اس کی ساری زندگی میں خدا کا ہاتھ کار فرما رہا ہے۔ ایک "ثبوت" یہ تھا کہ میں نے وہ چاندی کے ڈالے جمع کئے تاکہ اس رقم سے امریکہ جا سکوں۔ آخر وہ دن آیا تو اس دن خدا نے سارے کی شرح مبادلہ کم کر دی اور مجھے (خدا کے ایک اہم بندے کو) آسانی سے زیادہ روپیہ حاصل ہو گیا۔ اب فرمائیے کہ شرح مبادلہ کم ہو جانے سے اس بھلے مانس کو زیادہ سے زیادہ بیس ڈالر کا فائدہ ہوا ہو گا۔ مگر خدا نے اسے دس بیس ڈالر کا فائدہ پہنچانے کے لئے بیس اور لندن اور نیویارک کی کرنسی مارکیٹ سے ڈالاکری کرنسی کے ہزاروں بیرو پاروں کا کاروبار ختم کر دیا۔ صرف اس لئے کہ اس سے اس "خاص" خاص "نبارے" کو دس یا بیس ڈالر کا فائدہ ہو جائے یہ بھی یاد ہے

کہ خدا کی عظمتوں کے گن گانے کا پھر یہ عیاشی پادریوں اور عام عیاشی دنیا میں
بڑا عام ہے۔

آپ نے دیکھا، انسان جس کی عمر زیادہ سے زیادہ روایتی لحاظ سے "تین
بیس اور دس سال" قرار دی گئی ہے کتنا مہنگا کتنا خود پسند ہے۔

ہو سکتا ہے کہ انسانیت مجموعی طور پر کسی نمایاں پائندے اہم تاریخ کی بھی مانگ
ہو مگر انسان ایک فرد کی حیثیت سے تو بالکل بے پایہ ہے۔ سرتنگ پونے ٹھیک کہا،
انسان کی مثال یہ ہے کہ ایک بے کراں سمندر میں ایک دانہ یا ایک سیا کیرا جو صبح
کو پیدا ہوا اور شام کو مر بھی گیا اس کائنات کے مقابلہ میں اس کی زلیلتا، اس
کی ہستی بس اتنی ہے۔ اس پر کبھی عیاشیت کے پرو عجزی اور فروتنی سے کام نہ
لیں گے وہ اس حقیقت سے مطمئن نہ ہوں گے کہ زندہ گی کا یہ بڑا دریا مجموعی طور پر
جادواں ہے اور وہ اسی دریا کا ایک قطرہ ہیں۔ یہ دریا ازل سے لہکی طرف بڑبڑ
بہ رہا ہے ایک ایسے چشمے کی طرح جو ایک بہت بڑے سمندر میں گر کر اپنی ہستی
بدلتی ہے اور یہ ہستی اس سمندر کے وجود میں قائم بھی رہتی ہے۔

ذرا غماحظا ہو کہ مٹی کا برتن کھارے پوچھتا ہے "مجھے تمہے یہ شکل کیوں
بخشتی اور مجھے اس طرح کیوں بنایا کہ میں ٹوٹ جاؤں؟" مٹی کا برتن اس بات
پر مطمئن نہیں کہ جب وہ ٹوٹ جائے گا تو اپنے پچھے اپنی قسم کے کچھ چھوٹے چھوٹے برتن
رہیں گے، چھوٹے جائے گا۔ انسان کو اتنا شان دار، اتنا کیرت انگیز جسم عطا کیا گیا ہے
مگر انسان اس پر مطمئن نہیں۔ وہ اسی ذلتی جسم سے تنگ ہے۔ وہ کو ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ خدا کو حسین سے نہ بیٹھے دیکھا وہ
ضرور نمازیں پڑھے گا، دعائیں مانگے گا، اس تا در مطلق سے ہر روز کچھ نہ کچھ مانگتا

ایسا رہے گا، مطمئن کبھی نہ ہوگا، امتاعت نہیں کرے گا۔
 ایک چینی فاضل کا ذکر ہے کہ بدھ مت پر اس کا اعتقاد نہیں تھا مگر اسکی
 والدہ بڑی کر بدمکتی۔ دن میں ہزار بار ہاتھ بدمکتی کے نام کا وکیفہ پڑھتی اور
 توایا حاصل کرتی۔ مگر وہی وہ ہاتھ بدمکتی کا نام لیتی بیٹا فوراً پکارتا "اماں بی۔
 تداہنے"۔ ماں کو غصہ آجاتا۔ اور وہ تنگ آجاتی۔ اس پر ایک دن بیٹے نے
 کہا "اب آپ دیکھ لیجئے کہ میں ایک دفعہ آپ کو پکارتا ہوں تو آپ چڑھتی ہیں آپ
 جاتا کہ دن رات میں ہزار بار پکارتی ہیں۔ اگر وہ واقعی سن لیں تو انھیں کتنی کوشت
 ہو!"

ان باتوں کے بعد اب میں پھر اپنی کہانی کی طرف لوٹتا ہوں میرے باپ
 دونوں سخت پابند مذہب عیسائی تھے میرے والد جس طرح کھانے سے پہلے شام
 کی دعا پڑھا کرتے تھے۔ اسے سن لیتا ہی کافی تھا۔ میں بڑا حساس مذہبی خیالات کا بچہ
 تھا۔ ایک پادری کے رٹے کی حیثیت سے مجھے مشنری سکولوں کی تعلیم کی تمام سہولتیں
 میسر آئیں۔ میں نے اس طریقہ تعلیم کی خوبیوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس کی
 کمزوریوں سے نقصان بھی پایا۔ اس سے جو فائدے حاصل ہوئے ان کے لئے
 میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا اور جہاں تک اس کی کمزوریوں کا تعلق ہے ان کا مقابلہ
 کرنے کے لئے میں نے اپنے دل کی قوت سے رجوع کیا۔ کیونکہ چینی فلسفے کی رو سے بڑی
 اور اچھی تقدیر کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز ایک سی ہے۔

والدین نے مجھے چینی فقیر جیکے سے منع کر رکھا تھا چین کے بھائیوں کے
 حوامی گیت سننے کی بھی مجھے اجازت نہ تھی۔ میری زندگی چین کی عظیم حوامی روایات
 اور اس کی دیومالا سے بالکل الگ نفلک تھی۔ بڑا ہو کر جب میں ایک سنری کالج

میں پہنچا تو جو پتھر ڈی مہر ہند کلا سکی چینی زبان میرے والد نے مجھے پڑھائی تھی اسے بھی
 طاق پر رکھ دیا گیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اس طرح میں بالکل مغربی
 انداز کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی قومی روایات سے اس طرح روستا میں ہوا چھ طرح
 کوئی مغربی شخص مشرق کے عجائبات کو تازگی خیال اور دل انساٹ سے زندگی میں
 پہلی بار دیکھتا ہے۔ اپنے کالج کے دنوں میں میں نے جو کچھ لکھا وہ انگریزی فلم
 (فوانسین میں) سے لکھا اور چینی زبان لکھنے کے لئے جو قلم چاہتے ہیں انے بلوغ
 کے زمانے میں اور جوانی تک اسکی شکل زد دیکھی بڑی خوش نصیبی ثابت ہوئی
 اس کی بدولت مشرق کے ذہن اور اس کے کارناموں کی تازگی میرے لئے
 برقرار رہی بلکہ ایک لحاظ سے میں ان روایات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے
 بالکل تیار ہو چکا تھا۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیجئے کہ اہلی کا آتش فشاں پہاڑ دے سووی
 اس ہزاروں برس پہلے ایک شام اپنا لادانہ اگلتا تو پونسی آئی کا شہر تباہ نہ ہوتا مگر اس
 لادے نے شہر پونسی آئی کے تمام آثار اپنے خلاف میں محفوظ رکھے حتیٰ کہ آج ہمیں
 لادے کی تہ ہٹانے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پونسی آئی میں جو گاڑیاں چلتی تھیں ان کے
 پتے کیسے تھے اور پہیوں کا درمیان فاصلہ کیا تھا کیونکہ ان گاڑیوں کے نشانات لادے
 کی تہ سے عین بعین تازہ برآمد ہوئے۔ میرے لئے کبھی مشنری کا سچ کی تعلیم آتش فشاں
 پہاڑ دے سووی اس کا لادانہ ثابت ہوئی۔

مجھے یقین یہ تھی کہ سوچنا خطرناک چیز ہے بلکہ غور و فکر کا تعلق شیطان سے
 ہے۔ بچپن کا زمانہ جو کالج کی تعلیم کا زمانہ تھا میری عمر کا بہت زیادہ نہیں دور
 تھا مگر اسی دور میں ایک کشمکش بھی جاری تھی یہ کشمکش میرے دل اور دماغ کے درمیان
 برپا تھی۔ میرا دل عیسائی زندگی کے حسن اور پاکیزگی کا متوالا تھا اور دماغ ہر چیز کی نہ

تک پہنچنے کے لئے دلیلوں اور منطق کا رسیا تھا مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس دور میں
 مجھ کو وہ روحانی اذیتاؤں کا بڑی محسوس نہ ہوئی جس نے کونٹا طاسطانی جیسے
 حکیم کو قریب خود کشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک مکمل مسیحی
 سمجھتا تھا جس کے اعتقادات میں کوئی بل کونڈا پھیر نہ تھا۔ بس میں ذرا آزاد خیال زیادہ
 تھا اور دنیاویات کے اصول ذرا کم تسلیم کر سکتا تھا تاہم کچھ بنیادوں میں ہر وقت عیسائیت
 کے **الاصول یعنی** حضرت عیسیٰ کے پہاڑی کے خطبے پر ہمیشہ تکیہ کر سکتا تھا اسکا
 حُسنِ عالمگیر اور گہری سچائی ہر وقت میرے لئے ڈھارس بن سکتی تھی اور سچی عیسائیت
 کے اس داخلی شعور ہی نے میری ہمت بندھائی اور مجھے تقویت بخشی۔

لیکن ناہمی عقائد سے میرا ایمان اکٹھا جا رہا تھا پہلے پہل سطحی اصولی باتیں
 ناگوار گزر رہیں۔ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا تھا کہ پہلی صدی عیسوی میں مسیح بھی زندہ
 اپنی قبر سے اٹھیں گے اور ان کے پیغمبر دلیچتا ہستی وغیرہ ابھی جا اٹھیں گے۔ مگر یہ
 بات نہ ہوئی۔ اس پر بھی مسیح کے زندہ ہونے سے اٹھنے کا عقیدہ جوں کا توں موجود
 تھا اسی ہی باتوں پر مجھے شک پیدا ہوا۔

پھر میں دنیا ستلی کلاس میں آ گیا۔ گویا اب میں تقدس سے محروم فضا نہیں
 سانس لے رہا تھا۔ اس جماعت میں آ کر میں نے دوسرے عقائد کا بغور مطالعہ
 کیا۔ مثلاً میں نے یہ پڑھا کہ علماء کو کنیاری مریم کے مسیح کو جنم دینے پر بھی شک ہو اور
 بہت سے امریکی دینی عالم اس باب میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر
 غصہ آیا۔ کیونکہ چینی عیسائیوں کو یہ یقین تھی کہ بلا چون دچرا اس عقیدے کو ماننا
 بس اور نہ انھیں پتہ نہ دیا جائے گا۔ ادھر اسی کلیسا کے غیر الکی عالمی کو اتنی آزاد
 تھی کہ وہ اس عقیدے کو جمل نظر سمجھ سکیں اور اس پر بحث کر سکیں۔ مجھے یہ یاد رہی

غیر مخلصانہ معلوم ہوئی۔

دینیات کی بے مقصد کوششوں کی فریاد تعلیم کے بعد اس اور بھی زور داری سے آزاد محسوس کرنے لگا کہ ان مذہبی مباحث اور بے مقصد علمیت کو سجدوں کی نظر سے دیکھوں نتیجہ یہ کہ میں امتحانات میں اچھا ثابت ہوا میرے پرنسپل کا خیال تھا کہ میں عیسائی پادری بننے کے لئے نظری طور پر لائق نہیں۔ اور ہمارے لائٹ پادری نے مجھے کہہ دیا کہ یہ کام تمھارے بس کا نہیں، بہتر ہو گا تم کا راج چھوڑ دو۔ وہ مجھ پر اپنی تعلیم مسلح کرنا نہ جانتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کبھی اچھی ہی بات ثابت ہوئی۔ اگر میں دینی تعلیم جاری رکھتا اور فضیلت کی سند لے کر پادری بن گیا تو آگے چل کر اپنے ساتھ دریا ستاری نہ برت سکتا اور اپنے آپ کو ہر قدم پر دھوکے دیتا رہتا۔ لیکن "نجات" کی بنیادوں پر پڑی کہ دینیات کے عالم کے عقائد تو کچھ اور ہوتے تھے لیکن عام عیسائی سے کچھ اور عقائد پر چلنے کا حلف لیا جاتا تھا اس فرق ہی نے مجھ میں ایسا احساس پیدا کیا جسے "نجات" کے قریب قریب ایک احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تک میرا یہ خیال سچہ سچہ تھا کہ عیسائی علماء ہی عیسائی دین کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اس کے علاوہ نہ سخت عقائد باہتیں میرے سامنے آتی تھیں اور میں ان پر غلبہ نہیں پاسکتا تھا ایک طرف تو یہ بات تھی کہ عیسائی عالموں نے عیسائیت کے دین کی تعمیر اس سیب روانہ گندم کی بنیاد پر رکھی ہے مگر کبھی تھی جسے آدم نے جنت میں چکھ لیا تھا وہ تھے تھے کہ اگر آدم یہ سیب نہ کھاتے تو گناہِ اولین کا جرد نہ ہوتا۔ اور اگر یہ گناہ نہ ہوتا تو نجات اور شفاعت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس منظر کے

تمام اسرار مجھ پر واضح تھے۔ چاہے سب کا مطلب کچھ بھی لیا جائے مگر اس عقیدے سے عین اٹل خود مسیح کی تعلیمات تھیں جنہوں نے اپنے بڑے بڑے اولیاء میں لیا تھا۔ آدم سے اس گناہ اولین کا نام نہ لیا تھا نہ کبھی نجات و شفا عت کا ذکر لیا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو اب گناہ اولین سے اس احساس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نہ اب اس پر اعتقاد رہا۔ اب میں جانتا ہوں کہ اگر خدا کو مجھ سے میری ماں کے تقابلے میں آدمی محبت بھی ہے تو وہ مجھے بفرخ میں نہ ڈالے گا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو میرا شہر اور میرا اور اکٹھے بتاتا ہے اور میں کسی نہ سبب کی خاطر اس حقیقت کو چھٹلا نہیں سکتا۔ خیر۔ اس سے بھی زیادہ ایک اور مضحکہ خیز قصہ رہتا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ خبت میں آدم و حوا دونوں نے صرف ایک سیب (دائے گندم) کھایا تو خدا اتنا ناراض ہوا کہ اس نے اس لغزش کی پاداش میں آدم و حوا کی اولاد کو نسل در نسل نہ من مہبتیں اٹھانے کی سزا دیدی۔ مگر آدم و حوا کی اسی اولاد نے جیبا خدا کے بڑے حقارت کیوں کر دیا تو اتنا خوش ہوا کہ اس نے سب کو معاف کر دیا۔ آپ چاہیں اس مسئلے کے بارے میں کوئی دلیل پیش کریں یہ جھوٹا ہے تو سفیم نہیں ہو سکا اور یہی وہ چیز تھی جو اس زمانے میں دل کو کھائے جاتی تھی۔

تاہم کالج سے ڈگری لینے کے بعد بھی میں ایک پرجوش عیسائی تھا اور میں پکننگ کے ایک غیر مسیحی کالج میں اتوار کو دنیاویات کی کلاس میں منعقد کرنی شروع کر کے اس پر میرے ساتھیوں کو کچھ کوفت بھی ہوئی۔ مگر میں نے اپنے جذبے کی دھن میں کچھ پرواہ نہ کی اس دنیاویات کی جماعت کا سب کچھ مجھ سے جدا تھا جب کہ مس کے مرتفع پر مجھے چینی بچوں کے سامنے اولاد مسیح کے وقت فرشتوں کے روحانی نعموں کی کہانی سنائی پرتی تھی کیونکہ اس کہانی پر خود میرا کوئی اعتقاد نہ تھا۔ تاہم میں نے

ہر شک کو دیکھ لیا سے دور کر لیا اور میرے دل میں صرف مذہب کی محبت اور خودی
باقی رہ گئے۔ اور خدا کے لئے ایک چارہ سستی غصوں ہونے لگی جس سے میرا دل کرسکون
اور مسرت مل گئی۔ یہ خیال بھی آئے گا کہ اگر یہ جہت میرے دل میں پیدا نہ ہوتی تو میرا
دل کوسکون اور مسرت دہلا دیتا۔ مجھ سے مسرت رہنا پڑتا اور میں ان کے بغیر نہیں
کی طرح دنیا میں بھٹکتا پھرتا۔

آخر میری نجات کا دن بھی آگیا۔ ایک دن ایک ساتھی استاد سے بحث
کے دوران میں میں نے کہا "اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو لوگ نہ کی کرنا چھوڑ دیں اور دنیا
تو بالابو کر رہ جائے۔"

میرا ساتھی کنفیوژن کا پیر تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا "میں نیکی اور
اچھائی کی زندگی خدا کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے گزارنی چاہیے کہ ہم اچھے انسان
ہیں۔ بس!"

انسان کے صرف اور اسکی خودداری کا یہ حوالہ اسی چیز تھی جس نے عیسائیت
کے ساتھ میرا آخری "الا بھی توڑ دیا پھر میں وہ کچھ ہو گیا جسے کبھی لاندہبیا بھی
لمحذ کبھی بے دین کہا جاتا ہے۔

اور آج مجھ پر یہ ساری بات کھل چکی ہے اب میں جانتا ہوں کہ کیا
کیوں ہوا وہ یہ ہے کہ عرف عام میں جس شخص کو "کافر" قرار دیا جاتا ہے اس کے عقیدے
کی دنیا ایک سادہ دین ہے۔ یہ دنیا کوئی دعویٰ نہیں کرتی کوئی دلیل کوئی حجت "شرعی"
پیش نہیں کرتی کیونکہ اسے اسکی ضرورت نہیں ہوتی یہ زندگی کی لذتوں کو زندگی ہی کی
لذت اور زیادتی دل نشین اور دلکش بناتی ہے۔ نیکی کا جواز اس کے نزدیک ہے
کہ نیکی کرنے کے لئے کسی جواز کسی بہانے کی ضرورت ہی نہیں اور نیکی کرنے کا اس

بہتر ہو اذلی ہی نہیں، سکتا، یہ عقیدت کسی انسان سے یہ نہیں کہتے کہ تم نیکی کر دو تو
مختاری سزا یہ ہوگی یا نیکی کرنے کی جزا یہ ملے گی۔ ایسے مفروضات اس دنیا سے کوئی
واسط نہیں رکھتے۔ اس دنیا میں گناہ نجات اور جلیب کوئی چیز نہیں۔ تو سزا آخرت
کچھ نہیں۔ یہ سزا بھی نہیں کہ انسان آپس میں بھائی بھائی بن کر اسے رہیں کر سہانا
پاک تیسرا فرق (خدا) ہی چاہتا ہے۔ یہ تمام عقیدے اب لکھے ہوئے
ہیں، منطقی ان کا سیدھا اور باواسط ثبوت دینے سے عاجز ہے۔ بے دین کی
یہ دنیا صرف سیدھی اور سادہ باتوں سے عبارت ہے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ بات تسلیم
کرنے کو تیار کرنا اپنا جواز آپس ہے تو پھر نیکی کی زندگی گزارنے کے لئے مسزہب کے
بجائے افادات کے لالچ دے سکتے ہیں وہ اس کے لئے بالکل بے حسنی ہو کر رہ جاتے
ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان محبت آخری اور قطعی حقیقت بھائی چلے
ہم میں صلاحیت پیدا ہوتی چاہیے کہ انسان کو ہم پائی کی نظروں سے دیکھیں اور
یہ باہمی چاہت آسمان پر لے کر لے کر تیسرے فرق (خدا) کے ڈر سے نہیں بلکہ ایک
قدرتی اور عام جذبہ ہو۔ مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ عیسائیت، اخلاقیات کو غیر ضروری
طور پر مشکل چیز بنا دیا ہے گناہ کو اسی خوبصورت چیز بنا دیا ہے جسے دیکھ کر کسی
کی رائے ٹپکتے اور وہ اسے بالکل فطری اور موزوں کام سمجھے۔ اس کے برعکس
کفر اور جہنم اور مذہب کو دنیا سے اور اہلیت کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے
اور مذہب میں پھر سے اعتقاد کا امن اور سادگی اور جذبے کی گہرائی کا دستار
پیرا کر سکتا ہے۔

اس میں اس حقیقت کو یاد رکھنا ہے کہ عیسائیت کی پہلی دوسری اور تیسری
صدیوں میں دنیا کی اسی اہلیتیں پیدا ہوئیں کہ حضرت عیسیٰ کا وہ شہر چلے کر

سادہ سچائیوں کے بجائے اکبر، بہت ہی محدود اور خود کھیل سا ڈھانچا بن گیا اور پاپائیت اور پادریوں کے ایک بنے بنائے طبقے کی پشت پناہ بن کر رہ گیا۔ اس کی ساری وجہ ایک لفظ اور صرف ایک لفظ یعنی الہام تھا۔ اس لفظ کی روت سے یہ لازم ہوا کہ خدا اپنے پیغمبر پر کائنات کے کوئی خاص اسرار یا خاص قسم کے روحانی نظام کے بھید الہام کے ذریعے سے کھول دیتا ہے۔ الہام کا یہ دروازہ خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں مثلاً ولیوں وغیرہ پر بھی کھلا رہتا ہے۔ ہر مذہب کا کئی الہام کی یہ شرط ضروری ہو گئی تاکہ ہر مذہب آخرت میں انسان کی بخشش کے لئے اپنا ایک خاص انخاص فارمولہ بتا کر جو دوسرے مذہب کے انسانیوں کے لئے مدیترہ اسکے ————— خپا پنچ ہر مذہب کے لئے پادری پر بہت ہی الہام کے بل پر زندہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے پہاڑ پر اپنے خطبے میں جو بنیادی اور سادہ سچائیوں بیان کی تھیں اسے یہ لوگ ضرور بڑھا کر لیا کہ ننگ مرچ لگا کر پوسٹ مصنوعی انداز میں پیش کر دیں گے۔ جس ننگ کی خلقت پر انھیں اتنی حیرت ہوئی تھی اس پر مذہبی پیشوا اپنا ننگ ضرور بڑھا دیں گے۔ محض اس لئے کہ اپنا کام چلتا رہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے پہلے آدم اور دوسرے آدم وغیرہ کی کہانیاں وضع کیں۔

عیسائیت کی ابتدا میں دل پال کی منطق لوگوں کیلئے بڑی زبردست اور قابل قبول تھی۔ لیکن آج کل انسان کا تنقیدی شعور آنا بیلار ہو چکا ہے کہ اب یہی دلیلیں بڑی اور بے حقیقت نظر آتی ہیں۔ ایسا کی منطق استخراج کی بنیاد پر عمارت بناتی ہے۔ اس منطق کی محنت اور جدید زمانے کے آدمی کے ذہن میں بڑا ہی ہے کیونکہ ہمارا آپ کا ذہن سچائی کو قبول کرنے کے سلسلے میں زیادہ پھیلنا زیادہ وسیع ہو کر چکا ہے۔ اس فرق کی بدولت ہی الہام میں وہ اپیل نہیں رہی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ

ابا پھر بے یقینی اور کفر کو لوٹ چکے الہام سے منکر ہو جائیے تاکہ ایک بار پھر آپ کا ذہن اس عیا بیت کو قبول کر سکے جو ابتدائی اور اصلی تھی اور جو میرے نزدیک زیادہ تسلی بخش مذہب ہے۔

گویا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ "کافر" کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ وہ اسی حد تک لاندہب ہے کہ الہام کی کسی خاص قسم اور نوع پر اعتقاد نہیں رکھتا مگر اسے خدا پر ہمیشہ یقین ہوتا ہے۔ وہ اس اعتقاد کو زبان پر نہیں لاتا، مبادا لوگ کچھ کا کچھ مطلب نکالیں چین میں جنے "لاندہب" اور "کافر" لوگ ہیں سب سے سب خدا پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔ چینی ادب میں خالق کے لفظ سے بار بار واسطہ پڑتا ہے مگر فرق ہے کہ چینی مذہب بڑی دیانت داری سے خالق کائنات کو بھیدوں کے پردوں میں چھپا ہنہ دیتا ہے اور اس خالق کے لئے اپنے دل میں عظمت، تقدس اور تقویٰ کے جذبات بھی رکھتا ہے۔ یہی جذبات اس کے لئے کافی ہیں۔ مگر چینی لاندہب اس اعتقاد کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے بے پایاں حسن ستاروں کی براسرارہ خشکیوں کائنات کی ان گنت چیزوں میں صناعتی کے بحال اور درج انسانی شے وقار کا بھی اتنا ہی گرا شعور رکھتا ہے اور شعور بھی اس کے لئے اطمینان کا باعث ہے۔ وہ موت کو اسی طرح (ایک حقیقت) کے طور پر قبول کرتا ہے جس طرح درد اور آلام کو چھپا پ سہنا چاہیے اور اور دکھ درد کے مقابلے میں یہ سوچتا ہے کہ میں زندگی کی سی بڑی نعمت ملی ہے، تانہ ہواڑوں اور بہاڑوں کی صاف چاندنی جیسے گراں بار نطائے عطا ہو ہیں اس لئے شکایت کرنے کی کیا بجائے اس ہے لہذا وہ دکھ درد کی شکایت نہیں کرتا۔ خدا کی رضا کے آگے سر جھکانا اس کے نزدیک مذہب کی پابندی اور تعوی ہے۔ اور وہ اس تسلیم در رضا کو ملاؤ قانونِ نصرت پر عمل کرنے کا نام دیتا ہے اور خالق

کائنات کی رضا یہ ہے کہ وہ ستر سال کی عمر میں مر جائے تو وہ خوشی خوشی ستر برس کی عمر میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کا یہ سچا اعتقاد ہے کہ دنیا میں دیر ہے اندھیر نہیں اور تقدیر خداوندی کا چکر برابر چلتا رہتا ہے ایک جگہ قائم نہیں رہتا۔ اس لئے دنیا میں کوئی ظلم کوئی نا انصافی، مستقل لعنت بن کر نہیں رہتی اپنے وقت پر مٹا ہی جایا کرتی ہے۔ اور اس لئے جو کچھ اسے تیسرے وہ خدا سے اس زیادہ طلب نہیں کرتا۔

باب چہارم و ہم

سوچنے کا فن

- ۱۔ سوچ میں انسانیت پرستی کی ضرورت
- ۲۔ عقل سلیم کی طرف واپسی
- ۳۔ معقولیت

۱۔ سوچ میں انسانیت پرستی کی ضرورت

سوچنا سائنس نہیں، آرٹ ہے۔ چینی اور مغربی علمیت میں بڑا فرق اس بات کا بھی ہے کہ اہل مغرب میں علم کی کسی شاخ یا شعبے میں مہارت حاصل کرنے کا رواج تو ہے لیکن ان کے غور و فکر، ان کے علم میں انسان پرستی کا ثابہ نہیں۔ ادھر چین کا یہ حال ہے کہ سارا زور زندگی بسر کرنے کے معاملوں اور مسئلوں پر دیا جاتا ہے، اور کوئی علم کسی الگ سائنس کی حیثیت سے موجود نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے علوم میں بھی "سائنسی" انداز کا غور و فکر در آیا ہے۔ ان میں بھی تخصیصی مہارت کی چھاپ اچلی ہے اور سائنسی یا نیم سائنسی انکشافات کا زور بندھ رہا ہے۔ میرا مطلب اس سائنسی غور و فکر سے نہیں جو صحیح معنی میں سائنسی ہو۔ میرا مطلب اس لفظ کے استعمال سے وہی ہے جو آجکل کے عام معنی سے آشکار ہے۔ کیونکہ سچا سائنسی غور و فکر، عقل سلیم اور سوچھ سے اور خاص طور پر انسان کی قوت تخیل سے کسی صورت الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ادھر آجکل کے "سائنسی" تفکر کا حال یہ ہے کہ یہ اپنے اصول اور طریقے اور حدود میں بحد منطقی، نہایت غیر جانبدار اور بے حد خصوصی ہو چکا ہے۔ گویا مشرق کی علمیت اور مغرب کی علمیت میں جو فرق ہے وہ اصل میں منطق اور فراست کے بنیادی تضاد پر جا ختم ہوتا ہے۔ اگر منطق کو سمجھ بوجھ یا فراست سے محروم کر دیا جائے تو منطق انسانی چیز نہیں رہتی۔ ادھر فراست اور سوچھ بوجھ سے اگر منطق کا کوئی واسطہ نہ رہے تو وہ فطرت کی نیرنگیوں کے

اسرار سمجھنے کے قابل نہیں رہتی —

چینی ادب اور فلسفے پر نظر دوڑائیں تو ہمیں ایک بات نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ چینی لٹریچر میں سائنسی علوم نہیں ہیں، انتہا پسندانہ نظریے بھی نہیں اور فلسفے کے ایسے دستان بھی نہیں جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف یا متضاد ہوں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ چین کی ازلی فراست نے اور چین کی معقولیت نے نظریہ بازی اور کٹرا اصول نوازی کا جھگڑا ہی ختم کر رکھا ہے۔ اس موقع پر شاعر لوجوچی کی مثال سے بات واضح ہو جائیگی کہ اس کی طرح ہر چینی اہل علم "کنفیوشس کے دین سے اپنے سمجھاؤ کو ٹھیک کرنے کا کام لیتا تھا، بودھ مت کے ذریعے سے اپنا دل صاف کرتا تھا، پھر تاریخ اور مصوری، پہاڑوں اور دریاؤں سے اور شراب، موسیقی اور شعر سے اپنی روح کو سکون دیتا تھا" گو یادہ اس دنیا کا باسی ہوتے ہوئے بھی اس دنیا سے ملوث نہ تھا۔

اس صورت میں چین کی سرزمین وہ سرزمین ہے۔ جہاں کوئی شخص شدت سے غور و فکر میں الجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ہر شخص زندگی بسر کرنیکی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس سرزمین میں خود فلسفہ بھی معمولی سمجھ بوجھ کی سادہ سا چیز بن جاتا ہے۔ جسے بڑی آسانی سے ایک موٹی کتاب کے صفحات میں یا اتنی آسانی سے دو مصرعوں کے ایک شعر میں بھی بند کیا جاسکتا ہے۔ چین کی سرزمین میں فلسفے کا کوئی نظام موجود نہیں۔ اور دیکھ سکتے ہیں کوئی منطق، کوئی لہجہ یا مابعد الطبیعیات، اور بھی اصطلاحات کا کوئی انبار موجود نہیں۔ اس سرزمین میں اہل مدرسہ کی تنگ نظری اور ملائیت نہیں۔ علمی یا عملی تعصبات یا تشدد کا وجود نہیں۔ ایسی اصطلاحات موجود نہیں جنکی حیثیت محض تصوری یا خبری ہو۔ ایسے لفظ نہیں جو بڑے بڑے

اور لمبے لمبے ہوں۔ اس سرزمین میں گولاً میکا کی قسم کی عطیبت پرستی پیدا نہیں ہو سکتی اور ہر شخص کو اس چیز سے بڑی نفرت ہے جسے جدید فلسفے نے ”منطقی ضرورت“ کا نام دے رکھا ہے۔ چین کی سرزمین، کاروبار میں، وکیلوں سے پاک ہے اور فلسفے میں منطقیوں کا وجود نہیں رکھتی۔ یہاں فلسفے کے تفصیلی نظام تو رائج نہیں لیکن زندگی کے بارے میں ایک گہرا اور شدید احساس ضرور ہے۔ چین میں کوئی کانٹ، کوئی بیگل نہیں۔ وہاں صرف انشا پرداز میں، محققلوں اور مثالی کہانیوں کے مصنف ہیں۔ بدھ مت کی پہیلیوں کے مفسر اور تاؤ کی کہانیوں کے شارح موجود ہیں اور بس۔

مجموعی طور پر چین کا لٹریچر چھوٹی چھوٹی ٹھٹھوں اور چھوٹے چھوٹے مضامین کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ اس شخص کو یہ ذخیرہ واقعی ناقابل اختتام معلوم ہوتا ہے جو انھیں پسند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہی نظمیں اور یہی مضامین رنگارنگی اور تنوع سے اتنے بھرپور ہیں جس طرح فطرت کا کوئی نظارہ بے پایاں حسن کا مالک ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے انشا پردازوں اور خطوط لکھنے والوں کی کمی نہیں جو زندگی کے بارے میں اپنے احساس کو ایک مختصر سی عبارت یا زیادہ سے زیادہ تین چار سولفظوں کے ایک مضمون میں لکھ دینا چاہتے ہیں۔ یہ مضامین عام مغربی اٹروں کے جواب مضمونوں سے بھی مختصر ہوتے ہیں۔ انھیں وقتی تحریروں، خطوط، روزناموں، ادبی جاشیوں اور باقاعدہ مضامین میں کہیں تو قسمت کی بے رحم گردشوں کا ذکر ملے گا، کہیں کسی ایسی عورت کا ذکر ہوگا جس نے پاس کے گاؤں میں خودکشی کی تھی اور کہیں بہار کی پرلطف دعوت یا برف کے کسی جشن یا چاندنی میں کشتی کی سیر کے مزے بھی مل جائینگے۔ انھیں ایسی شام کا بھی ذکر ہوگا جب باہر سخت طوفان

آ رہا تھا اور لکھنے والے نے وہ شام ایک مندر میں گزاری تھی اور وہ گفتگو بھی لکھی ہوگی۔ جسکی وجہ سے یہ شام اسکے ذہن میں محفوظ رہی۔ چینی ادب میں ہمیں ان گنت انشا پر ہا ز ایسے ملیں گے جو شاعر بھی ہیں۔ ایسے شاعر بھی ہیں جو انشا پرداز بھی تھے مگر جنہوں نے کبھی پان سات سو الفاظ سے زیادہ لمبی چیز لکھی ہی نہیں۔ اور اسی مختصر سے پیمانے میں، بلکہ کبھی تو ایک مصرعے میں زندگی کے مکمل فلسفے کا ثور پیش کر دیا ہے۔ بس اسی وجہ سے چین میں فلسفے کے دبستان اور فلسفے کے نظام رائج نہ ہو سکے۔ چین میں ذہنی صلاحیتوں کو معقولیت پسندی اور اس سے بھی زیادہ منکرانہ احساس گرفت میں رکھتا ہے اور سچ یہ ہے کہ چین میں ذہن اور عقل پر اعتماد بھی کم ہی کیا جاتا ہے۔ یہ خیال کی ضرورت شاید نہیں کہ منطقی صلاحیت انسانی ذہن کا نہایت لاجواب ہتھیار ہے۔ اور اسی وجہ سے سائنس نے اپنی تمام فتوحات حاصل کی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مغرب میں انسانی ترقی کی باگ ڈور بنیادی طور پر اب بھی عقل سلیم ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس پر تنقیدی جوہر کا حکم بھی چلتا ہے جو منطقی جوہر سے عظیم تر ہے۔ منطقی جوہر وہ چیز ہے جسے مغرب میں انسانی تفکر کی محرک خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لینا بھی چنداں ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ چین کی نسبت مغرب کا تنقیدی شعور کہیں زیادہ بیدار ہے، لیکن منطق کی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے میرا اشارہ مغربی تفکر کی ایک مخصوص کمی کی طرف ہے۔ یہ تسلیم کہ منطق میں بھی خوبیاں ہیں۔ اور میرے نزدیک جا سوتی اور سراغ سانی کی کہانیوں کو مغرب نے جو ترقی دی ہے وہ مغرب کے منطقی ذہن کی ایک بڑی دلچسپ پیداوار ہے۔ ادب کی یہ صنف چین میں کسی عنوان رائج نہ ہو سکی، نہ ترقی کر سکی، لیکن میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ منطق پر زیادہ توجہ دینا اور اسی کو ہر بات کی بنیاد سمجھنا یا تفکر کو منطق کا غلام بنا دینا ایسی چیز ہے جس میں بہت سے عیب ہیں۔

مغربی علمیت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مغرب کے لوگ علم کے کسی خاص شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کرتے ہیں اور اس طرح انسانی علم کو مختلف شعبوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ منطقی فکر اور خصوصی مہارت کی حد سے بڑھی ہوئی فنی اصلاحوں کی پھر مار کا شاخسانہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب نے فلسفے کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس تہذیب میں سیاسیات اور اقتصادیات کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ عام آدمی فلسفے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ حد تو یہ ہے کہ اس غلطی پر اس کا ضمیر اسے کوئی ملامت نہیں کرتا۔ جدید تہذیب میں عام آدمی بلکہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کا خیال یہ ہے کہ فلسفہ ایک ایسا "مضمون" ہے جس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔

جدید تہذیب کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ فلسفہ جسے انسان کے سینے اور انسان کے چہرے کے ساتھ اتنا فریبی رلبط ہونا چاہئے اب انسانی زندگی سے اتنا دور ہو چکا ہے۔ یونانیوں اور رومنوں کی تہذیبوں میں یہ حال نہ تھا۔ نہ کبھی چین میں یہ اندھیرا ہوا تھا کیونکہ چین میں ہمیشہ سے زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ (فلسفہ) اہل علم کا خاص مشغلہ رہا۔ اب جو فلسفے کو طاق پر بٹھا دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو جدید زمانے کے لوگوں کو چینے کے مسائل سے دلچسپی نہیں رہی (اور یہی فلسفے کا اصل موضوع ہیں) یا ہم فلسفے کے اصلی تصور سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ جدید زمانے میں علم کا احاطہ اتنا وسیع ہو گیا ہے اور علوم کے شعبے (اپنے اپنے خصوصی ماہرین کی شدید نگرانی میں) اتنے بڑھ گئے ہیں کہ فلسفہ اب انسانی علوم کا سردار نہیں رہا۔ اب یہ ایک ایسا علم رہ گیا ہے جس میں کوئی شخص خصوصی مہارت حاصل نہیں کرتا۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ فلسفے کے طالب علموں کو اقتصادیات کے پروفیسروں کے لکچر سننے کیلئے خاص طور سے اجازت

دی جاتی ہے۔ فلسفہ جو انسانی علوم کا سر تاج تھا۔ اب طوائف الملوکی کے زمانے کے چینی شہنشاہ کی طرح ہے جو اتنا کمزور تھا کہ اپنے باج گزار والیوں سے خراج نہ لے سکتا تھا۔ روز بروز اس کا اختیار کم ہوتا جا رہا تھا، علاقے چھین رہے تھے اور اسکی وفاداری کا کلمہ صرف چند شریف خاندان پڑھتے تھے جو بید و ضرمدار، مگر بید غریب بھی تھے۔

تو گویا، انسانی تہذیب اب اس مقام پہنچ گئی ہے جہاں علوم الگ الگ خانوں میں بند ہیں، علم بذات خود کوئی چیز نہیں رہا۔ اب تو بس ”خصوصی مہارت“ رہ گئی ہے۔ تکمیل اور فضیلت، دونوں خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ اب علم کے کسی خاص شعبے کے ماہرین ملتے ہیں، لیکن دانائی کے پیکر، حکیم اور مفکر نہیں ملتے۔

کسی علم میں خصوصی مہارت کا اب جو زور بند دھا ہے اس پر مجھے ایک کہانی یاد آئی ہے۔ کبھی چینی شہنشاہوں کے شاہی باورچی خانوں میں بھی مہارت کا یہی زور تھا۔ ایک دفعہ حکومت کا تختہ لوٹا اور ایک خاندان کی جگہ دوسرے خاندان نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس انقلابی زمانے میں ایک امیر چینی کو ایک ایسی خادمہ ہاتھ لگ گئی جو کبھی شاہی باورچی خانے میں کام کیا کرتی تھی۔ چینی امیر کو اس خادمہ پر فخر ہوا اور اس نے اپنے دوستوں کی دعوت کی تاکہ وہ انھیں اس خادمہ کے ہاتھ کا کھانا کھلائے جسے وہ اپنے خیال میں شاہی باورچین سمجھتا تھا۔ دعوت کا دن آیا تو امیر نے خادمہ سے کہا کہ وہی کھانے پکیں جو شاہی دسترخوان پر ہوتے تھے۔ خادمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ”میں تو کھانا نہیں پکا سکتی“

امیر نے پوچھا، ”تو پھر تم کرتی کیا تھیں؟“

جواب ملا ”میں رات کے کھانے کیلئے سمو سے بنائے میں مدد دیا کرتی تھی۔“

امیر نے کہا ”بہت بہتر تو پھر تم میرے مہمانوں کے لئے عمدہ سمو سے ہی

تیار کر لو۔“

خادمہ نے جواب دیا ”سرکار میں نے کب کہا کہ میں سموسے بنایا کرتی تھی۔ میں نے تو شاہی دسترخوان کے سموسوں میں بھرنے کے لئے پیاز کا ٹٹنے میں مہارت حاصل کی تھی۔“

آج بھی انسانی علم اور درسی تعلیم کے میدان میں حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب حیاتیات کے عالم ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے بارے میں ٹھوڑا سا جانتے ہیں۔ پھر ایک صاحب نفسیات کے ماہر ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے متعلق چند باتیں جانتے ہیں۔ پھر طبقات الارض کے ماہر ہیں جو کائنات اور انسان کی ابتدائی تاریخ کے چند دوروں سے واقف ہیں۔ پھر علم الارثاق کے ماہر ہیں جو وحشی انسان کی فطرت کے متعلق ہی جانتے ہیں باقی کچھ نہیں۔ پھر ایک تاریخ داں ہیں جو اگر صاحب ذوق ہوئے تو شاید ہمیں انسانیت کی گذشتہ تاریخ کے آئینے میں دیکھ کر انسانی دانائی اور حماقت کے متعلق کام کی دو چار باتیں بتا سکیں، ورنہ خیر سلا۔ پھر نفسیات انسانی کے ماہر ہیں جو اکثر ہمیں انسانی چلن کے سمجھنے میں کچھ مدد دیتے ہیں۔ مگر اکثر اوقات ایسی فضول قسم کی گورفتالی فرماتے ہیں کہ انسان دیکھتا رہ جائے۔ یہ حضرات جب اپنی خبر بہ گاہوں سے باہر آتے ہیں تو بڑی تحقیق کے گل کھلاتے ہیں مثلاً یہ کہ ادچی آواز کا اثر چوزوں پر یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ تعلیمی نفسیات کے ماہرین تو ان سے بھی آگے ہیں کہ جب وہ غلط بات کہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتی اور جب وہ ٹھیک بات کہتے ہیں وہ بھی ہماری سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک ایک علم کے کئی کئی شعبوں خصوصی مہارت کا حال

تو یہ ہے، مگر اس خصوصی مہارت کے ساتھ کالمیت کا کہیں وجود نہیں۔ یہ کوئی نہیں کرتا کہ مختلف قسم کے علوم اور ان کے تمام پہلوؤں کو ملا کر ایک اکائی، ایک کل بنا دیا جائے پھر اس کل سے جسے حکمت و دانش کہہ سکتے ہیں مقصد حیات کی خدمت کا کام لیا جائے۔ اس بات کی ضرورت جدید انسان کو محسوس ہونے لگی ہے۔ چنانچہ امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ٹریل میں انسانی تعلقات کا باقاعدہ شعبہ قائم ہے۔ اسی طرح امریکہ کی ایک اور اعلیٰ ہارڈ یونیورسٹی میں بھی اس موضوع پر خاص لکچروں کا انصاب موجود ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ مغربی سائنس دان علوم کے انتشار کو پھر سے ایک جگہ جمع کرنے کیلئے جب تک زیادہ سادہ اور کم منطقی طریق فکر سے کام نہ لیں گے، کچھ نہ بنے گا۔ انسان کی حکمت و دانش یہ نہیں کہ علم کے مختلف شعبوں میں خصوصی مہارت کا انصاب جمع کر دیا جائے تو حاصل جمع حکمت و دانش ہوگی۔ حکمت و دانش صرف بصیرت سے حاصل ہو سکتی ہے، عام سوچ بوجھ، عقل سلیم اور فراست کی ترقی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے زیادہ سلامت طبع اور زیادہ سادہ مگر نرکار د جان کی ضرورت ہے۔ منطقی فکر اور فکر معقول میں بہت فرق ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ خشک اور شاعرانہ سوچ میں جو فرق ہے وہی ان میں بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں علمی اور خشک قسم کا فکر تو بہت ہے مگر شاعرانہ فکر بہت ہی نادر ہے۔ ارسطو اور افلاطون جدید زمانے کے مفکرین نظر آتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ قدیم یونانی لوگ اجکل کے لوگوں سے مشابہت رکھتے تھے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ ارسطو اور افلاطون دونوں جدید فلسفے کے آباو تھے۔ ارسطو کا نقطہ نظر بڑی حد تک انسانی تھا۔ اور اس نے اعتدال کے سنہری راستے کا فلسفہ بھی بتایا ہے۔ پھر ارسطو آج کی

نصابی کتابوں کا باپ ہے کیونکہ ارسطو ہی نے انسانی علم کو مختلف الگ الگ شعبوں میں بانٹا تھا۔ اسی نے طبیعیات سے حیاتیات تک اور سیاسیات سے اخلاقیات تک علوم کے مختلف شعبے مقرر کئے تھے۔ اسکے علاوہ ارسطو ہی کی ذات سے ”علمی اصطلاحات“ کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہوا جو عام آدمی کی سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔ ہونا بھی یہی تھا۔ اور آج امریکی پروفیسر اور ماہرین کیا معاشرتی علوم، کیا نفسیات دونوں میں ایسی ایسی اصطلاحات وضع کر رہے ہیں جو ارسطو کو بھی مات کر دیں۔

رہا افلاطون تو اس میں انسانی بصیرت تو ضرور موجود تھی لیکن ایک طرح افلاطون ہی مجرد اور مطلق تصورات کی اس پرستش کا ذمہ دار ہے جو اسکے نو افلاطونی پیروؤں میں نظر آتی ہے۔ ان پیچاروں میں افلاطون کی سی بصیرت نہیں لیکن ان کے پیرو مصنفین اور مفکرین کسی خیال یا کسی نظریے کے بارے میں یوں بحث کیا کرتے ہیں جیسے ان تصورات اور نظریات کا اپنا ٹھوس وجود بھی ہے۔ جدید نفسیات ہی ایک ایسا علم ہے جس نے حال ہی میں ”عقل“، ”قوت ارادی“، ”جذبہ“ وغیرہ کی الگ حیثیت اور ان کے انفرادی وجود کا تصور ختم کرنا شروع کیا ہے۔ اور اسی کی بدولت ہم ”روح“ کے تصور سے بھی آزاد ہو رہے ہیں جسے قرون وسطیٰ کے عالمان دین نے ایک حقیقی چیز بنا کر دنیا کے ذہن پر آج تک سوار رکھا۔

مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے میننگروں قسم کے سماجی اور سیاسی نعرے اور اصطلاحیں گھڑ رکھی ہیں (مثلاً ”انقلابی“۔ ”انقلاب دشمن“۔ ”بورژوا“ ”سرمایہ دار“ ”سامراجی“۔ ”فراری“ وغیرہ) اور یہ نعرے اور اصطلاحیں انسانی فکر پر اپنا چنگل جمائے ہیں۔ ہم نے تصور ہی کے ذریعے سے ”طبقہ“، ”قوموں کا نصب العین“ اور مملکت یاریاست“ کے وجود تخلیق کر رکھے ہیں۔ اور ہم نے بڑی ظالم منطق سے کام لیکر ریاست

کو ایک ایسے منفردیت کی شکل دینا شروع کی ہے جو فرد کو ہڑپ کئے جا رہا ہے۔
 گویا آجکل غور و فکر کے ایک نئے انداز، ایک نئی طرز کی شاعرانہ سوچ بچار کی بڑی
 ضرورت ہے۔ یہ انداز فکر ایسا ہونا چاہیے جو زندگی کا مستقل مزاجی سے مشاہدہ کر سکے اور
 زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھ سکے۔ مرحوم جیمز ہاروے روبنسن نے ٹھیک کہا تھا
 ”کئی ایک محتاط مبصرین کی ریاستدارانہ رائے یہ ہے کہ تفکر کو انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ
 عالی رتبہ نہ دیا گیا اور سوچ میں رفعت پیدانہ کی گئی تو موجودہ تہذیب کو بہت بڑا دھکا لگے
 گا۔ پروفیسر روبنسن نے یہ بھی کہا تھا کہ ”احتیاط اور بصیرت بظاہر ایک دوسرے کو شک
 کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں دوستی بھی ہو سکتی ہے۔“ جدید اقتصادیات
 اور نفسیات کے ماہرین احتیاط اور دیانت کے توپیلے ہوتے ہیں مگر ان میں بصیرت کی بڑی کمی ہے۔
 انسانی مسائل میں منطق کی ٹانگ اڑانا نہایت خطرناک چیز ہے۔ لیکن موجودہ
 دور میں سائنسی تفکر کی قوت اتنی ہے اور اس کی قدر ایسی ہے کہ بار بار متنبہ کرنے
 کے باوجود تفکر کی یہ خطرناک قسم فلسفے کی دنیا پر چھاپا مارنے سے باز نہیں آتی۔ اور
 ہر ذرا سے یہ یقین ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کا مطالعہ اور جائزہ اسی طرح آسانی
 اور بندھے ٹکے قاعدے سے کیا اور لیا جاسکتا ہے جس طرح زمین دوز نالیوں کے
 جان کو نقشہ دیکھ آجینئر لوگ سمجھ لیتے ہیں، اور یا انسانی فکر کو بھی اسی طرح ناپا
 جاسکتا ہے جس طرح ریڈیائی لہریں ناپی جا رہی ہیں۔ اسکے نتیجے روزمرہ کی سوچ بچار
 میں جو ہوں سو ہوں مگر عملی سیاسیات میں اس کے نتائج تو بڑے تباہ کن ہیں۔

۲۔ عقل سلیم کی طرف واپسی

چینیوں کو ”یہ منطقی طور پر لازم تھا“ جیسے نعروں سے سخت نفرت ہے کیونکہ

ان کے مسائل میں ایسی کوئی لازم چیز موجود نہیں۔ منطق پر چینیوں کو جو بے عمدائی ہے وہ اصل میں لفظوں کی بے اعتباری سے شروع ہوتی ہے۔ پھر ہمیں کسی لفظ کی چیز یا اصطلاح کی تعریف سے نفرت شامل ہوتی ہے۔ اور آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے "انظام فکر" اور ہر قسم کے "تظریے" سے چینی لوگوں کو فطری طور پر نفرت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ الفاظ، تعریف اور نظام ہی کی بدولت فلسفے کے مختلف دبستان وجود میں آسکے ہیں۔ فلسفے کی خرابی اور زوال اسی دم شروع ہوا تھا جب فلسفہ الفاظ کے پھیر میں الجھ کر رہ گیا اس لئے چینی مصنف کو نگہ ٹنگٹان لکھتا ہے کہ "دانا اور عارف لوگ باتیں نہیں کرتے۔ صرف ذی لیاقت لوگ باتیں کرتے ہیں اور احمق لوگ بھت کرتے ہیں۔" یہ اس شخص کا مقولہ ہے جو خود بھت کا بڑا دلدادہ تھا۔

فلسفے کا حال یہی ہے کہ فلسفی لوگوں کا تعلق اہل گفتار ہوتا ہے، خاموش طبعوں سے نہیں۔ ہر فلسفی اپنی آواز اور صرف اپنی آواز سننا چاہتا ہے۔ اور تو اور خود لاؤ تڑے جس نے ہمیں پہلے پہل یہ سکھایا کہ خالق اکبر (اس کے لفظوں میں "وہ عظیم ذات خاموش") بولتا نہیں، آئندہ نسلوں کیلئے کوئی پانچ ہزار الفاظ چھوڑ گیا اور اسکے بعد پہاڑوں میں عزت نشیں ہوا تاکہ خلوت اور سکون میں زندگی کے بقید دن گزارے۔ صاحب گفتار فلسفی کی ایک خاص مثال کنفیوٹس کی ذات ہے جو ۲، سلطنتوں میں گیا تاکہ وہاں کے شاہوں کے سامنے اپنے خیالات بیان کر سکے اسکی ایک مثال سقراط کی ہے جو ایتھنز کے بازاروں میں پھرا کرتا تھا اور دیکھتے دیکھتے سے باتیں کرتا تھا تاکہ وہ انکی باتوں کے نہایت دانشمندانہ جواب دے سکے۔ اس لئے چینی ادیب کا یہ مقولہ "عارف لوگ باتیں نہیں بتاتے" ایک

اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی عارف اور ذمی لیاقت آدمی دونوں میں فرق ہے کیونکہ عارف اور دانا اس زندگی کے بارے میں بات کرتے ہیں جس کے بارے میں انھیں بلا واسطہ عرفان حاصل ہے اور ذمی لیاقت لوگ انھیں داناؤں کی باتوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ رہے احمق لوگ تو وہ ان ذمی لیاقت لوگوں کی باتوں کے بارے میں دیلیس دیتے ہیں اور بحثیں کرتے ہیں۔ فالص گفتار کے غاریوں کی سب سے عمدہ مثال یونانی سوفسطائیوں کی ہے کہ یہ لوگ الفاظ کے باہمی میل اور الٹ پھیر ہی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ فلسفہ جو دانش و حکمت کی محبت کا نام تھا، الفاظ کی محبت بن کر رہ گیا۔ اور جوں جوں یہ سوفسطائی دلیل باری کار حجام بڑھتا گیا فلسفے اور زندگی میں زیادہ سے زیادہ رو دی ہوتی گئی۔ وقت گزرنے پر یہ حال ہو گیا کہ فلسفی لوگ زیادہ سے زیادہ اور لمبے سے لمبے فقرے استعمال کرنے کے ماہر ہو گئے۔ مقولوں کی جگہ طویل فقروں نے لے لی، فقروں کی جگہ دیلیس آگیس، دیلیوں نے رسالوں کا روپ بدلا، پھر رسالوں کے بجائے شرحیں اور تفسیریں آئیں اور شرحوں نے لفظی تحقیق کو رواج دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لفظوں کی شرح کرنے اور لفظوں کے معنی بتانے، لفظوں کی تعریف متعین کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ لفظوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ فلسفے کے جو دبستان قائم ہو چکے تھے ان سے اختلاف کرنے اور ان سے ہٹ کر اپنی راہ نکالنے کیلئے زیادہ سے زیادہ دبستان فکر قائم ہونے لگے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ اور اب یہ حال ہے کہ جینے کا سچا احساس، اپنی حیات کا مخلصانہ شعور لگا ہوں سے بالکل اوجہل ہو گیا ہے۔ اب جب فلسفی بات کریں تو ایک عام آدمی کو یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ”اُپ کس چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں؟“

مگر تاریخ فکریں چند خود مختار رو ہیں بھی آتی رہی ہیں اور ان مفکرین نے زندگی کا بلا واسطہ ربط اپنے فکر و خیال سے محسوس کیا ہے۔ ان میں کوئی گوئے، کوئی سیمونل جانتسن، کوئی ایمرسن، کوئی ولیم جیمز بھی ملتا ہے۔ اور ہر ایک نے فلسفیوں کی زبان میں بات نہیں کی۔ اور ہر ایک نے علم کی درجہ بندی کی سخت مخالفت کی ہے۔ یہی وہ دانشور ہیں جن کی بدولت فلسفے کی اصل روح، اسکا اصلی معنی محفوظ رہا ہے۔ فلسفہ، دانش حیات اور بس۔ زیادہ تر صورتوں میں ان مفکرین نے دلیلوں اور محبتوں کو ہاتھ نہیں لگایا، مقولوں سے کام لیا ہے اور اصل یہ ہے کہ لطائف اور مقولوں میں دل کی بات کہنے کی صلاحیت نہ ہو تو انسان اپنی بات کہنے کیلئے ایک پورا پورا گراف لکھتا ہے۔ جب وہ اپنا مفہوم ایک پورے پیرا گراف میں واضح نہ کر سکے تو وہ استدلال کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے۔ اور جب اس سے بھی وہ اپنا مطلب واضح نہ کر پائے تو وہ ایک پوری کتاب لکھ مارتا ہے۔

لفظوں کی محبت، جہالت کی جانب پہلا قدم ہے۔ اور اصطلاحات اور لفظوں کی منطقی تعریف، دوسرا قدم۔ جتنا زیادہ اور جتنا گہرا تجزیہ کیا جائے گا۔ لفظوں، اصطلاحوں اور ترکیبوں کی زیادہ سے زیادہ منطقی تعریفوں کی ضرورت ہوگی، اور زیادہ سے زیادہ منطقی تعریف کرنے کا یہ مطلب ہوگا کہ انسان قانونی کمال کے اس نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے جو خیالی بھی ہے اور ناممکن بھی۔ چنانچہ قانونی کمال تک پہنچنے کی یہ کوشش ہی جہالت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ الفاظ ہمارے خیالات کی بنیاد، ان کا ساز و برگ، سہی۔ اس صورت انکی منطقی تعریف کی کوشش بھی مستحسن سہی کیونکہ یورپ میں ہر چیز

کی منطقی تعریف کرنے کا یہ جنون سقراط نے اسی لئے پھیلایا تھا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ان لفظوں کا شعور ہوتے ہی (جنکی ہم منطقی تعریف کرتے ہیں) ہمیں ان تشریحی لفظوں کی بھی منطقی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اور آخر یہ سلسلہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ ہمارے الفاظ وہ نہیں رہتے جو زندگی کی تشریح یا زندگی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف لفظوں کی ایک فہرست رہ جاتی ہے جو دوسرے الفاظ کی منطقی تعریف یا تشریح پیش کرتے ہیں اور بس۔ ہر طرف لفظوں کا ایک انبار رہ جاتا ہے اور فلسفی اسی انبار میں کھوئے رہتے ہیں۔

میرے نزدیک الفاظ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مصروف الفاظ اور نکتے الفاظ۔ مصروف اور کارآمد الفاظ وہ ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں۔ نکتے الفاظ وہ ہیں جو صرف فلسفیوں کی بحثوں میں کام آتے ہیں۔ منطقی تعریفوں میں بھی فرق ہے۔ سقراط اور فلسفی بیکن کی منطقی تعریفیں اور ہمارے جدید فیروزوں کی وضاحتیں ایک دوسرے سے کہاں لگا کھاتی ہیں۔ شیکسپیر کو زندگی کا گہرا اور سچا احساس و دلچت ہوا تھا۔ اسے کسی چیز کی تشریح یا منطقی تعریف کی ضرورت نہیں پڑی۔ اصل میں اس نے یہ طاقت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، وہ یہ بھی کہ اسکے الفاظ "جسم" رکھتے تھے۔ اسکی زبان میں انسانی المیے کا وہ دی شان احساس، وہ عظیم روح جاری و ساری تھی جو آجکل نہیں ملتی ہم اسکے الفاظ کو ایک معنی کا پابند نہیں کر سکتے، نہ ان کو ایک خاص عمل کی علامت بنا سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم شیکسپیر کو عورتوں کے بارے میں کسی خاص نظریے کا حامی نہیں ٹھہرا سکتے۔ وجہ یہ ہے، منطقی تعریف کا فطری خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ ہمارے خیالات کا گلا گھونٹتی رہے اور ہمارے تفکر کو اس آب و تاب، اس تخیلی رنگ

روپ سے محروم کر دے جو زندگی کا خاصہ ہے

الفاظ، اظہار کے دوران میں ہمارے خیالات کا تیا پانچا کر دیتے ہیں۔ ان میں قدرتی روانی اور تسلسل نہیں رہنے دیتے۔ یہ بڑی مجبوری ہے۔ اسی طرح کسی ایک نظام فکر کی لگن بھی زندگی کے شعور کھیلے بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ آخر نظام فکر ہے کیا ہے؟ بس حقیقت کے چہرے کا کوئی آڑا تر چہارو پ، اور جو نظام فکر بہت زیادہ منطقی ہوگا اس میں ذہنی کچی اور کج روی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان حقیقت کا صرف ایک پہلو دیکھنا چاہتا ہے اور یہ وہ پہلو ہوتا ہے جس پر اسکی نظر پڑتی ہے اسی کو وہ ذرا بڑھا پڑھا کر ایک نظام فکر بنا دیتا ہے جو اسکے خیال میں بحد منطقی ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا فلسفہ زندگی سے بالکل اجنبی ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص سچائی کے بارے میں بات کرتا ہے وہ محض اپنی بات سے حقیقت کو نجر ورح کرتا ہے جو منطقی دلیل سے حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اسکی دلیلیں حقیقت کو مفلوج کرتی ہیں، اسکا حلیہ بگاڑ دیتی ہیں۔ اور جو ظالم، حقیقت کو کسی ایک دلیل کسی خاص عنوان اور خصوصاً کسی دلستان فکر کا غلام بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ان سے بدتر وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو سچائی کا پرستار کہتا ہے کیونکہ یہی پرستار اپنی غلط بینی سے حقیقت کو اپنے ہاتھ سے دفن کرتا ہے۔ گویا ہر وہ حقیقت جسے کسی نظام فکر کا پابند بنایا گیا ہو اسکی موت واقع ہو چکی اور اسے دفن بھی کر دیا گیا۔ اور یہ لوگ اپنے اپنے نظام فکر کے زندانی حقیقت کی موت پر جو مرتبہ پڑھتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے ”جو میں کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے اور تمہاری بات سراسر غلط ہے“ اس

طرح حقائق اپنے حامیوں کے ہاتھوں موت کی گود میں جا سوتے ہیں۔ فلسفے کے تمام قدیم اور جدید دبستان، فلسفیوں کے تمام قدیم اور جدید دھڑے ایک ہی بات کو ہر پھر کرتا ہے کہ "موجود میں کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے اور تمہاری بات سراسر غلط ہے۔" اس سلسلہ میں جو من فلسفی سب سے بڑے مجرم ہیں۔ لیکن یہ فکری بیماری مغرب کے ہر مفکر کو لاحق رہی ہے۔

اس غیر انسانی منطق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حقیقت کو بھی غیر انسانی بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج ہمارا فلسفہ زندگی سے قطعی طور پر بے تعلق ہے یہ فلسفہ قریب قریب یہ اعلان کر چکا ہے کہ وہ ہمیں زندگی کا اصلی مفہوم اور دانش حیات سکھانے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس فلسفے میں زندگی کیلئے وہ گہرا اور سچا شعور حیات کیلئے وہ لگن بالکل مفقود ہے۔ جسے ہم نے فلسفے کی جان قرار دیا تھا۔ زندگی کا یہی گہرا اور سچا شعور ہے جسے دلیم جمنز نے "تجربات کی دنیا" قرار دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں وقت گزرنے پر دلیم جمنز کا فلسفہ اور اس کی منطقی دلیم مغربی فلسفے اور مغربی انداز فکر کیلئے زیادہ سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی جائیگی۔ مگر مغربی فلسفے کو انسانی فلسفہ بنانے سے پہلے ہمیں مغربی منطق بنا کر دیکھنا چاہیے۔ ایسا انداز فکر کو زندہ کرنا ہوگا جو صحیح اور منطقی اور مسلسل ہی نہ ہو بلکہ حقیقت اور زندگی اور انسانی عظمت کے قریب آتے کیلئے بیقرار ہو۔ مغرب کے غلط انداز فکر کے نمائندے منطقی ڈے کارٹ کا مشہور قول ہے کہ میں سوچ سکتا ہوں اس لیے میں ہوں۔ ہمیں اس کے بجائے لیر کی مشاعرہ دہ کرنا چاہیے کہ "میں ہوں اس لیے میں سوچ سکتا ہوں اور کافی معانی ہوں"۔ کیونکہ زندگی کو دنیا پر ثابت کرنے کیلئے منطق کی مرہون بنتے ہوئے کہہ دینا ہی کیا ہے۔ دلیم جمنز نہیں جانتا تھا کہ نہ چینی انداز فکر کو صحیح ثابت کرنے اور انہوں

انداز فکر منوانے کے لئے اپنی ساری زندگی صرف کر رہا ہے ایک سافر قس تھا
 اگر ولیم جیمز مغربا بننے کے بجائے چینی ہوتا تو وہ اپنی بات متولفہ کے لئے اتنے
 ہزار الفاظ سے کام نہ تھا بلکہ وہ اپنے فلسفے کو دوچار الفاظ کے ایک مضمون میں ملبند
 کر دیتا یا اپنے روزنامے میں دوچار صفحے لکھ دیتا کہ میں سمجھتا ہوں اور میرا یہ خیال
 ٹھیک ہے۔ وہ اگر چینی ہوتا تو الفاظ سے کچھ کتراتا، کچھ جھجکاتا رہتا۔ اسے یہ نہ
 ہوتا کہ میں جتنے زیادہ الفاظ استعمال کرطاں غلط نہیں کا اسکاں اتنا ہی زیادہ ہوگا۔
 لیکن ولیم جیمز طبعی اعتبار سے بالکل چینی تھا، زندگی کی گہرے شعور اور انسانی
 تجربات کے اعتبار سے بالکل چینی تھا۔ اس نے شینی قسم کی منطق پرستی کنجیلاق
 لغات کی۔ خیالات کے بہار اور تسلسل کا وہ بھی قائل تھا اسے ان لوگوں سے سخت
 پڑھتی جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف انھیں نے اس کائنات کی اہم ترین اور قطعی سچائی
 کا کھوج لگایا ہے اور اس حقیقت کو انھوں نے ایک خود کفیل قسم کے نظام فکر میں حلقہ
 بند کر دیا ہے۔ تمام طبعی خاصے چینیوں کے ہیں اور ولیم جیمز اس اعتبار سے
 بھی چینی تھا کہ وہ کہتا تھا "آرٹسٹ میں احساس ادراک کے ذریعے سے حقیقت کی سچائی
 کی صدا حقیقت ہونی چاہیے۔ یہی ادراک حقیقت فنکار کے لئے ضروری ہے، لہذا سچائی
 حقیقت اس کے مقابلے میں بالکل سچ ہے۔" ولیم جیمز کے نزدیک فلسفی وہ شخص ہے
 جو اپنے ادراک اور احساس کو ہر آن زندگی پر مرکوز رکھے اور زندگی کے عظیم اثرات
 دھارے کا برابر شاہد کرتا ہے۔ وہ ہر آن اس بات کیلئے تیار ہے کہ زندگی سچا
 نئی اور محال سے محال چیزیں اس کے سامنے پیش کرتی ہے، وہ ایسے ایسے
 عجیب و غریب واقعات اور مشاہدات کے لئے تیار ہے جو لپٹا ہوا نہیں اور ناممکن نظر آتے ہیں
 لیکن درحقیقت بالکل صحیح ہوں اور وہ زندگی کی مضاد باتوں کیلئے بندھے ہوئے ہیں۔

عقل سلیم کی طرف ماسی

۷۲۳

قانونوں سے ہٹی ہوئی چیزوں، استثنائی صورتوں کے لئے ہمیشہ دلچسپی محسوس کرے۔
 اس لحاظ سے ولیم جیمز وہ شخص ہے کہ کسی نظام فکر کا پابند ہونے سے منکر ہے وہ
 کسی نظام فکر کو غلط نہیں کہتا بلکہ محض اس کی پابندیوں کی وجہ سے اس کا مخالف
 اسی لئے اس کے خیالات نے مغربی فلسفے کے ہر نظام فکر کا تختہ الٹ کر رکھ دیا اس
 کا قول ہے کہ فلسفے کی تاریخ میں سب سے اہم سنگ میل یہ ہے کہ کائنات کے متعلق
 دو نظریوں میں امتیاز لیا گیا۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی وجود ہے
 دوسرا ہے اس لئے مادے اور روح کی تفریق غلط ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہیں
 اور دوسرا نظریہ اس کے عین الٹا، یعنی کثرت و وجود کا نظریہ ہے۔ اسی لئے
 ولیم جیمز کی بدولت مغربی فلسفہ اپنے طمسائی ہوائی قلعوں کو چھوڑ کر زندگی سے ایک
 بار پھر قریب آسکا تھا۔

کنفیوشس نے کہا ہے "سچائی اور حقیقت انسانی فطرت سے دور نہیں جا
 سکتی۔ اگر جس چیز کو حقیقت کہا جاتا ہے وہ انسانی فطرت سے الگ ہو جاتا تو وہ
 سچائی نہ ہوگی، کوئی اور چیز ہوگی!" — ایک جگہ اس نے سب سے بڑی چیز کو ذرا مزاح کے
 لہجے میں یوں کہا ہے کہ "حقیقت سے انسان عظیم نہیں ہوتے بلکہ انسان حقیقت
 کو عظیم بناتا ہے۔" میرے خیال میں یہ فقرہ ولیم جیمز کی زبان سے بھی دہرایا جاتا تھا
 ہمارے یہ دنیا کوئی منطقی نتیجہ کوئی منطقی دلیل نہیں۔ یہ ایک جتنی جاگتی چیز
 ہے کائنات بولتی نہیں مگر کائنات نہ صرف کائنات دلیلوں میں نہیں سمجھتی لیکن
 اصلیت کی منزل کو پہنچ جاتی ہے ایک نہایت ذہین انگریز ادیب نے کہا ہے :-
 "کائنات کے اسرار میں عقل ایک چھوٹی سی چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔
 انسان کو اپنے شعور اور اس کے گہرے گہرے غورو

کے وقت بھی دل کی گہرائیوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی عقل اور اس کی حیرت دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں۔ تنگ اور امیدہ چڑھاں چڑیے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری فطرت میں کاڈرنا رہے ہیں اور اسی کشمکش کی بدولت اصل حقیقت دھری رہ جاتی ہے۔

میر خیال ہے کہ مغربی منطق پرستیوں کو کچھ کچھ نردستی اور انکسار کا خیال ہو جائے کچھ انہی بے مانگی کا احساس پیدا ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائیں ان کی نجات اور فلاح کا راستہ یہی ہے کہ ہر گھل کی جدلی مادیت نے ان کے سرورں میں جو سودا بھڑا ہے اسے اس کا کوئی علاج کر دے۔

معقولیت

منطق کے تقابلیں میں عملی سوچ بوجھ ہے جسے آپ معقولیت کا جذبہ کہہ لیجئے تو بہتر ہوگا۔ میرے نزدیک معقولیت کا جذبہ انسانی تہذیب اور تمدن کی مورچہ کماں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرد معقول تہذیب اور صحبت یافتہ انسانوں میں سب سے بہتر اور نفع انسان ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کبھی مکمل انسان نہیں ہو سکتا انسان یہی کر سکتا ہے کہ اندیدہ اور معقول آدمی بن جائے اور جس جو تو میں معقول ہوتی ہیں وہی نہایت امن و آسائش کی زندگی گزارتی ہیں اور جو میاں بی بی معقولیت سے کام لیتے ہیں وہ خوش رہتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنی بیٹیوں کے لئے مناسب پر تلاش کرنے میں صرف ایک بات کا خیال رکھوں گا کہ کیا وہ لو جو ان معقول آدمی ہے؟ کیونکہ ایسے میاں بی بی اس دنیا میں نہیں ملتے جن میں کبھی مہنگرا نہ ہو ہاں ایسے

معقولیت

۷۲۵

شہرہوں اور بیویوں کا قصہ ضرورہ کیا جا سکتا ہے جو معقولیت سے لیس میں جھگڑا کریں اور معقولیت سے اس جھگڑے کو پھر نہٹالیں گویا صرف معقول انسانوں کی دنیا میں امن اور مسرت کا دور دورہ ہو سکتا ہے اور اگر کسی معقولیت کا دور آیا تو یہی دور دنیا کے لئے امن کا دور ہوگا کیونکہ اس دور کی روح رذائل معقولیت ہوگی۔

معقولیت ہی وہ چیز ہے جو چین مغرب کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ چین اس جذبے سے ملا مال ہے۔ میں صرف اتنا عرض کرنا ہوں کہ یہ چینی تمدن کا بہترین جوہر ہے اور عمدہ ترین پہلو ہے۔ میرے اس انکشاف دیا دے کا بہت اتفاقاً دو امر یکپوے نے دیا ہے جو پوری مدت چین میں رہے ہیں۔ ایک صاحب تیس سال سے چین میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے کہا کہ چین کی ساری زندگی کی بنیاد ایک لفظ چھائیگ لیا ہے جس کے معنی ہیں "معقول بات کرنا"۔ چینی لوگوں کے جھگڑوں میں آخر بات یہ ہوتی ہے "بھئی انصاف کرنا" کیا یہ معقول بات ہے؟ اس کے برعکس چین میں سب بڑی مٹا اور سب سے زیادہ عیب کی بات یہ ہے کہ فلاں شخص "نا معقول بات" کرتا ہے۔ چنانچہ جو شخص غیر معقول بات کا مرتکب ہوتا ہے وہ ہر جھگڑے میں منہ کی کھاتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب "میل وطن اور میرے سموطن" میں لکھا ہے "مغربی لوگوں کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ فلاں بات منطقی طور پر پوری کچھ ہے چینی کے لئے یہ کچھ نہیں کہ کوئی چیز منطقی سمجھ سے ٹھیک ہو چینی کے نزدیک ٹھیک وہی ہے جو منطقی طور پر ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کے مطابق ہو اس کے تقاضا نہ ہو بلکہ اصل یہ ہے کہ چینی کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم ہے کہ ذریعہ بحث مسئلہ یا کوئی معاملہ فطرت انسانی کے عین مطابق بھی ہے یا نہیں۔"

سوچنے کا فن

۷۲۶

تہذیب اور با متبیر آدمی کا وہ ہے جو انسان کے دل کو سمجھ اور فطرت کو تو اس میں
 کا درک لکھتا ہو۔ کنفیوشس کے پیر دُعا کا دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے دل کو
 فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق زندگی بسر کر کے آخری منزل پر پہنچ سکے ہیں۔
 لیکن عارف بھگوانی شخص ادا کرتا ہے جو بے حد معقول آدمی ہو۔ اس کی مثال خود
 کنفیوشس کی ہے جس کی سب سے بڑی خوبیاں یہ پائی جاتی ہیں کہ وہ عملی سوچ بوجھ اور ذوق سلیم
 کے علاوہ فطری خوبیوں سے مالا مال تھا یعنی سچا انسان آدمی تھا۔

تفکر میں انسان پرستی جس چیز کو کہتے ہیں وہ اصل میں معقول سوچ کا
 دہرانا ہے۔ منطقی آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ انسان
 نہیں بتاتا اور اسی لئے وہ ہر بات میں غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے معقول آدمی کا
 سہو ہے۔ اسے ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ کہیں میں ہی غلطی پر نہیں ہوں اسی لئے وہ ہمیشہ
 ٹھیک بھی ہوتا ہے معقول آدمی اور منطقی آدمی میں جو فرق ہے اس کا بڑا عجیب
 مظاہرہ خطوں کے آخر میں دیکھا کیے کہ خط ختم ہو گیا تو لکھنے والے کو کچھ اور خیال
 آیا اور اس نے "مگر" کا لفظ لکھ کر اس کے نیچے وہ تمام معقول باتیں "لجھ کے سوچ"
 ہچکچا ہٹ مزاح اظہر سوچ بوجھ کا ایسا ثبوت دیا اور پر خط میں لکھی ساری باتوں
 کی تردید ہو گئی۔ اصل میں معقول منکر وہی ہے جو کسی دعوے کو لمبی چوڑی دلیل
 سے ثابت کرتے کرتے یکایک یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی دلیلیں غلط ہیں اور اس عملی
 سوچ بوجھ کا وہ یوں مظاہرہ کرتا ہے کہ یکایک اپنی غلطی مان لیتا ہے اور اپنی سزا
 پیش کردہ دلیلوں کو اس طور آن داتا میں ایک فقرے سے فنا کر دیتا ہے۔
 گویا منطقی آدمی تو خط کے متن میں ہی سب کچھ لکھ دیتا ہے۔ اس برعکس

معقولیت

۷۲۷

معقول شخص کو صحیح معنی میں انسانیت سے بہرہ ور ہوتا ہے، غلطی کی آخر کی زلزلہ عبات جو مگر کے عنوان کے نیچے آتی ہے، میں اپنے دل کی بات کہتا ہے۔ ایک باپ کا تصور کیجئے جو اپنی بیٹی کے نام خط لکھ رہا ہے کہ میں تمہیں کالج میں نہیں پڑھا سکتا کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے تین بھائی کالج میں زیر تعلیم ہیں، ان کا خرچہ میں اٹھا رہا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہاری ماں کی طبیعت اب اچھی نہیں رہتی، اسکی دیکھ بھال کے لئے تم گھر آ جاؤ تو بہتر ہے۔ وغیرہ۔۔۔ یہ تمام دلائل منطقی ہوتے ہیں۔ اور ان کا کوئی جواب کوئی رد یا توڑ ممکن نہیں۔ لیکن یہی معقول بات کسی منطقی حکم کے اختتام پر اپنے دستخط کرنے کے بعد ایک جذباتی تقریر میں (مگر کے زیر عنوان) یہ لکھ دیا ہے۔ "بیٹی ایسب دلیلیں فضول ہیں، تم گھر آ جاؤ، میں تعلیم پانے کی تیاری کر رہی جی بن پڑے گا سب تنظیم کر لوں گا۔"

یا ایسے شوہر کا خیال کیجئے جو اپنی بیوی کے نام خط میں لکھتا ہے کہ میں تم سے علیحدہ ہونے اور تمہیں طلاق دینے کا ہستی نیکہ کر چکا ہوں۔ اور میں اسکی وجہ بھی لکھتا ہوں۔۔۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے تمہاری وفاداری پر ہمیشہ شک رہا۔ دوسرے یہ کہ جب میں گھر آتا ہوں تو مجھے کبھی گرم اور تازہ کھا نا نہیں ملا وغیرہ۔ یہ وجوہ اپنی جگہ ٹھوس ہے اور جائز ہیں۔ بلکہ کوئی بھی انہیں عقیدل نہیں سکتا اس کے علاوہ اگر شوہر طلاق کے لئے کسی دلیل کی خدمت حاصل کرے تو اس کے منطقی وجوہ اور بھی مضبوط اور جائز ہو جائیں گے۔ لیکن اس خط کے حتم کرنے کے بعد اس شوہر کے دل میں ایک خیال آتا ہے اور وہ "مگر" کا عنوان لکھ کر ٹوٹے پھوٹے حرف میں یہ لکھ لکھ دیتا ہے "لا حول ولا قوت الا باللہ" سب کیا بکرا اس جہ "تم برا نہ آتا" نام میں خود بھی کوئی اچھا آدمی نہیں بہر کیف میں گھر آ جاؤں گا اور تمہارے پسندیدہ بھول بھی لاؤں گا۔

ان دونوں خطوں کی مندر بہ نسبت لیلیں بڑھتی کھوس اور جائز ہیں لیکن ان خطوط
 متن میں انسان نہیں، منطق بول رہی ہے۔ معقولیت صرف ان خطوں کے آخر کی ان
 عبارتوں میں ہے جو زائد عبارت کہلاتی ہیں اور مرکز کے زیر عنوان لکھی جاتی ہیں
 ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان باپ ایک انسان شہر بولی رہا ہے۔ منطق
 نہیں بولی رہی۔ کیونکہ ذہن انسانی کا یہ فرض نہیں کہ بڑی اہمقاہہ قسم کی منطقی دلیلیں
 گھر گھر کر حاضر کرتا رہے بلکہ ذہن انسانی کا کام یہ ہے کہ انسانی خواہشوں جذبوں
 اندازن کی موج کے ہر آن بدلنے بیٹے لھالیں میں ٹکراتے بہتے طوفان کے
 درمیان توازن قائم رکھے۔ رہی سچائی تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ انسانی معاملوں میں
 ہم جس چیز کو چاہیں حقیقہ ٹھہرائیں۔ منطق کی کردہمی سے کوئی اور لا جواب لا جواب
 دلیل کا جواب ملے اور برو باری، شفقت اور محبت سر دیا جاسکا، لیکن منطقی جواب
 کو محبت بالکل سچ ثابت کر سکتی ہے۔ انسانی معاملوں میں عام طور پر غیر منطقی
 طور طریقہ ہی جی کو لگنے والی بات ہوتی ہے۔ خود سہارا عدالتی قانون بھی۔ مانا ہے کہ وہ
 سو فیصد اور بالکل قطعی قسم کا انصاف کرنیکا مدعی نہیں کیونکہ عدالتی قانون
 متعدد صورتوں میں اپنی دفعت کی ایک معقول تشریح کا سہارا لیتا ہے۔ پھر اپنے
 سب سے بڑے سچ یا سب سے بڑے حاکم کو ہر جرم کی سزا معاف کر دینے کا
 اختیار دیتا ہے۔ اور یہ جھلا کہاں کی منطق ہے؟

معقولیت کا جذبہ ہمارے ہر سوچ اور ہر سانسے تفکر کو انسانی زندگی
 کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اور ہمیں اپنے ہر بار صحیح ہونیکا بھڑکا کھڑا سہارا
 نہیں رہتا۔ معقولیت ہمارے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر بناتے
 دیتی ہو اور ہمارے انداز ہمارے پیر تاڑ کی تما ہے قاعدگیال اور کر دیتی ہے۔ معقولیت کے

عین اُلٹ اکثرین تشدد پسندی اور عقیدے کی تنگ نظری ہیں چاہے خصوصیات
 حالات سے تعلق رکھتی ہوں یا ہمارے انداز اور پرزاد سے متعلق ہوں ہماری
 انفرادی زندگی میں ہوں یا ہماری قومی زندگی پر چھائی ہوں شادی کے سلسلے میں ہوں
 یا مذہب اور سیاسیات پر حاوی ہوں یہ ہیں غیر معقول۔

میراد عوی ہے کہ چین میں مذہبی قسم کی کٹر تشدد پسندی اور تنگ نظری بہت
 کم پائی جاتی ہے۔ ایک چینی سچوم بہت جلد شعل ہو جاتا ہے لیکن معتولیت کی ایک
 عام رو ہی نے ہمارے مذہبی اور عورتوں سے ہمارے مبینہ ظالمانہ
 سلوک کو بڑی حد تک وسیع النظر اور نرم بنا رکھا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ دعویٰ کچھ کچھ
 شرائط کے ساتھ ماننا چاہیے مگر اس دعوے میں حقیقت ضرور ہے معتولیت کے
 اس جذبے کی بددلت ہی ہمارا شہنشاہ جا پانیوں کے شہنشاہ کی طرح نیم دیوتا نہیں
 مانا جاتا تھا۔ اسی لئے چینی تاریخ دانوں نے یہ نظریہ وضع کیا تھا کہ بادشاہ آسمانی فرمان کی
 بددلت حکمرانی کرتا ہے۔ اور جب وہ اچھی طرح حکومت نہیں کرتا تو یہ خدا کی فرمائش تو
 سچو و مسوئع ہو جاتا ہے چین کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی چینی بادشاہ کسی شہنشاہ
 کی بد عزمانی سے تنگ آگے تو انھوں نے بغاوت کی اس خانہ کی حکومت کا تخت
 الٹ دیا اور اس شہنشاہ کا سر قلم کر دیا۔ ایسا ایک وعدہ نہیں بہت قہم ہے شاہی خانہ
 کی اس درگت اور بد عزمانی بادشاہوں کے ساتھ اس سلوک کے چینی قوم میں یہ عقول
 خیال کبھی پیدا نہیں ہوئے دیا کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہیں یا آسمانی مخلوق ہیں یا تم
 سے کم نیم دیوتا ضرور ہیں۔ یہی حال ہمارے ریشیوں جینوں کا ہے۔ انھیں دیوتا
 نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایسے حکما اور دانش مند لوگ سمجھا جاتے ہیں جن کی بددلت ہمیں اچھی
 باتیں حاصل ہوئیں زندگی کے سر رکھنے کا ہی حاصل ہوتی رہے چینیوں کے دیوتا تو وہ کمال کے

سوچے کا فن

۷۳

منظر نہیں بلکہ بشر کی ہی کمزوریاں دکھتے ہیں۔ انہیں بھی امرکائی انہروں کی طرح رشوت دے کر منت سماجت کر کے راستی کیا جا سکتا ہے اور ان سے اپنی من مانی کرائی جا سکتی ہے۔ چینی قوم کا مزاج یہ ہے کہ جو چیز معقولیت کی حد سے گزر جائے اسے برا سمجھا جاتا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "فطرت انسانی سے ہٹی ہوئی" چیز ہے۔ چنانچہ جو شخص بہت زیادہ صوفی صافی ہو یا کمزوریوں سے بالکل مبرا اور نیکیوں کا پلہ ہوا ہے غدار سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ نوپاں کاٹا ہے معقول معنی میں غیر معقول ہے۔

یورپ کی سیاسیات پر نظر ڈالیں تو منطق کی بدولت وہاں انسان کا ذہن اور انسان کا عام بڑا ذہن حد غیر انسانی نظر آتا ہے میں شراکت یا قاسم کے

.....

جو ان نظریوں کی تہ میں کار فرما ہے اور جس کی بدولت انسان اپنے نظریوں کو ان کے منطقی ہملمات کی منزل تک پہنچانے میں کس قدر مستعد اور سب سے بڑی ضرورت سے کام کرتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قدر میں معجزی دنیا میں بالکل اچھ کر رہ گئی ہیں۔ سیاسیات کو انسان کے علم الارتفاع کے ساتھ عجیب طرح ملا دیا گیا ہے اور اس علم الارتفاع کی بدولت ایک قوم نسلی طور پر اپنے آپ کو دوسری سے اعلیٰ ثابت کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ حالانکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسری سے اعلیٰ ثابت کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ حالانکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسری سے اعلیٰ ثابت کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔

.....

ہے اور کچھ نہیں۔ اسی کڑپن اور تعصب کی بدولت آرٹ کو پراپیگنڈے سے مخلط کر دیا گیا ہے حسب الوطنی اور سائنس کا ناتا جوڑ دیا گیا ہے حکومت کو مذہب سے مخلوط کر دیا گیا ہے اور سب سے بڑا اندھیرا ہے کہ حکومت کے اختیارات اور ایک فرد کی آزادی اور اس کے اختیارات میں جو مناسب تعلق اور توازن ہونا

چاہیے اسے بالکل چھٹ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کوئی جتنو بھی یہ یاست کو ایسا خدا بنا کر رکھ سکتا ہے جس کی قربان گاہ پر فرد کے سوچنے کا حق، محسوس کرنے کا حق، اور خوش گوار زندگی بسر کرنے کا حق بھینٹ چڑھایا جائے۔

اشتراکیت اور فاشنزم دونوں ایک ہی جنونی ذہن کی پیداوار ہیں۔ البرٹ پوفیلے نے واقعی ٹھیک کہا تھا "دائیں بازو کے انتہائی خیالات رکھنے والا ذہن، انتہائی بائیں بازو کے ذہن کے بالکل مماثل ہوتا ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت اور فاشنزم دونوں قسم کی حکومتوں اور نظریات کی خصوصیات بالکل ایک ہی ہیں۔ دونوں اندھی طاقت اور اقتدار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک مغربی ذہن کا سب سے سطحی اور احمقانہ مظاہرہ یہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشتراکیت اور فاشنزم دونوں منطقی طور پر کسی چیز کی ضرورت کسی چیز کے غلام ہو نہیں سکتا ہے۔ اس "منطقی لزوم" کی بنیاد مارکس کی جدلیات پر ہے جس کی بنیاد جرمن فلسفی ہگل کی منطق ہے۔ کاش اس بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بھی کوئی صاحبِ دل یہ سمجھ لے کہ انسانیت اپنے ماجدوں کی منطق کے ان گناہوں کی کیا سزا بھگتا ہی ہے جو سنیکڑوں برس پہلے ان پر گولی سے سرزد ہوئے تھے۔

کہنے کا مطالبہ یہ ہے کہ یورپ پر معقولیت کا رواج نہیں معقولیت تو کیا یورپ پر عقل کی بھی گمانی نہیں بلکہ آج یورپ.....
تصعب کے جنگل میں گرفتار ہے۔ یورپ کے حالات کو دیکھ کر کچھ کچھ ڈر اور نے چینی
می محسوس ہوتی ہے اس بے چینی کی وجہ یہ نہیں کہ یورپی ملکوں کی قومیں ایک
دوسرے سے ٹکراتی ہیں ان کی سرحدیں متصادم ہیں انہوں ان کے نوآبادیاتی عزائم
ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اس کی وجہ ان لوگوں کی ذہنی حالت ہے جو آج

سوچنے کا فن

کل پور پے کے سا کم ہیں۔ اس بے چینی اور ڈر کی مثال یہ ہے کہ آپ کسی چینی شہر میں
 ایک ٹیکسی میں سوار ہو جائیں اور پکا ایک آپ کو ایک گاڑی اور پورے با اعتمادی پیدا
 ہو جائے اگر ڈرائیور کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ جس جگہ جا سینگے اسکا صفحہ اور چھوٹا نامہ کون
 سا ہے تو اتنی تشویش کی بات نہیں ہوتی بلکہ جب آپ کو ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد یہ
 پتہ چلے کہ ڈرائیور آپ ہی آپ کو بل فول پک رہا ہے تو آپ اس کے ہوش و حواس پر شک
 گزرتے ہیں۔ آپ کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ نشے میں ہے اور یہ احساس آپ کو سہا سا
 دیتا ہے۔ اور اگر یہ نشے میں دھت ڈرائیور سٹیوں سے مسلح ہو اور آپ کسی عورت کو
 موٹر سے باہر نکل سکے تو بے چینی اور خوف، دھڑکن بڑھ جاتے ہیں۔ کہ
 ہاتھ بٹھکانے کی کافی گنجائش موجود ہے کہ آجکل پورے عالموں کا ذہنی فنا
 ذہن انسان جیسی عظیم الشان چیز کا ایک مضمحل خیر ہے اور کچھ نہیں۔ یہ جنونی اور
 ہڈیا کی کیفیت انسان کی تاریخ میں ایک عارضی دور ہے اور انسانیت سب سے بے خبران
 یہ عارضی پاگل پن ایک باکی طرح خود بخود ختم ہو کر رہے گا۔ فانی انسان کے ذہن کی صلاحیت
 بڑی وسیع ہیں اور ان پر اعتماد رکھنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں ذہن انسانی
 چاہے کتنا محدود ہو وہ پورے ان اندھے ڈرائیوروں کے ذہن سے کہیں زیادہ ارفع
 اور اعلیٰ چیز ہے آخر وہ وقت بھی آئے گا جب دنیا کے تمام انسان اس اولاد
 کی زندگی بسر کر سکیں گے کیونکہ انسان اس وقت معقولیت سے سوچنا بھی سیکھ چکا
 ہو گا۔

تہ

[ڈاکٹر لین پوتانگ نے "جینے کی اہمیت" پہلی بار ۱۹۱۷ء میں شائع کی تھی دوسری عالمگیر جنگ اس دور میں ۱۹۳۹ء کے آخر میں شروع ہوئی تھی اور چھ برس کے اندر اندر دنیا کا سیاسی نقشہ اور نظر یاتی ڈھانچہ تیرپ ڈھانچا گیا۔ یورپ ۱۹۳۹ء سے پہلے کا رفاہی دار اور پورے چکر سے نکل کر اب نیشنل سوشلزم (جرمن نازیٹ) اور کمپنیاں آمرانہ توہمیت (اطالیہ فاشنزم) کی مطلق العنانی کا زندانی تھا۔ ان چھ برس میں یورپ نے ان دونوں نظریوں کی زیر پرستش کی تاکہ وہ دنیا میں ہونے لگیں، اندری اور فاداری بزدلی اور شجاعت کی وہ مثالیں ان چھ برسوں میں یورپ نے دیکھیں جو انسانی تصور میں نہیں آسکتیں یا انھیں چھ برسوں کی خون ریز کشمکش کے بعد یورپ ایک طرف مرنے والی اور دوسری طرف مرنے والی اور دوسری جانب امریکہ کی شینٹی تہذیب کی لانتناہی قوتوں کے سامنے سجدہ پزیر ہو گیا۔ انسان کی امیدیں بدل گئیں زندگی کی فضا اور مرنے کا ماحول بدل گیا لفظوں کے مفہوم بدل گئے پرانے معانی کے لئے نئے لفظوں کے قالب ایجاد ہوئے اور پرانے لفظوں کے لئے مطالبہ کیا گیا اور تیار کر دیا گیا۔

ڈاکٹر لین پوتانگ نے جینے کے عملی فلسفے کے سلسلے میں ان برسوں میں اپنی تحقیقی کوششیں جاری رکھیں اور جنگ کے اس نوحے ماحول میں بھی زندگی پر اور زندگی کے مقصد پر اسی ژرف نگاہی سے تلم لکھا یا جو ان جلیے صاحبان بصیرت ہی کا حصہ ہے۔

اسی لئے ان کے اس تازہ مضمون کو "جینے کی اہمیت" کے نام سے طبع پر پیش

(مشار صدیقی)

کیا گیا ہے۔ [

زندگی کا مقصد جینا

انسانی تہذیب کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جیتے کا فن اور مارنے کا فن زندگی
 کردن اور جنگ آزد کردن (دو لوں ساتھ ساتھ موجود رہیں کسی قوم کی بھی تاریخ اٹھا کر
 دیکھ لیجئے، کبھی ایسا نہیں ہوا اتنی سو برس کا عرصہ خانہ جنگی یا غیر ملکی بیچاروں کے بغیر گزار
 کیا ہو گا یا امن کا زمانہ زیادہ زیادہ دو تین سو برس ہا پھر وہی نوا نیری شروع ہوا ہو گی۔
 اس کی وجہ غالباً ہے کہ انسان ایسا جاندار (چلون) ہے جو جنگ جو بھی ہے اور صلح
 کھل بھی۔ انسان میں جنگ مائی کی جبلت اور امن نیدی کی جبلت بڑی عظیم لیجے
 سے آمیز ہوئی ہے میں جنگ آزمائی کی جبلت کو گوشت خوری اور امن پسندی
 کو سبزی خوری کی جبلتیں قرار دیتا ہوں۔

جنگ انسان کی اس آمیزش سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ انسان کوئی ناقص اور نامکمل
 مخلوق ہے۔ کھلا ایسی تہذیب جس میں انسان کو اس قدر سکین اور پالوتو بنا دیا گیا ہو کہ
 اس میں جنگ جوئی کا جذبہ ہی باقی رہے کس کام کی ہو سکتی ہے، کشمکش کا زندگی سے بولی
 وامن کا واسطہ ہوا ہونا بھی ہی چاہیے۔ اگر جلد و جہد کشمکش اور سخت ... کو شہ زندگی
 سے دور ہو جائے تو پھر انسان کو نرنیل کا گھن لگ جاتا ہو اور چند شیئوں کے مختصر طرے میں پوری
 نل اسی طرح یکا ہو جاتا ہے جس طرح کوئی امیر خاندان چند نت کے بعد کچے اور کم کوش افراد کو ہمنیا
 شروع کر دیتا ہے آپ یہ بیان فرمائیں کہ میں جنگ جلد و جہد کے باہوں میں صرف عرصہ
 کر رہا ہوں کہ حیاتیات کی حالت ہمارا در شہی ہے۔ خدا اپنے سامنے پہلے سوئے مظاہر
 قدرت پر نظر ڈالو ایسے فطری حالاتے جنگ جوئی کی جبلت جئے جانے کی جبالت اس کا

زندگی کا مقصد — جنینا ۷۳۵

دوسرا رخ نظر آئے گی۔ یہ جانتی جانتی جو بڑی حد تک جوتی ہیں ان کے علاوہ
آدھ شوں اور سیاسی عقیدوں سے کہیں گری ہیں۔ جیاتیات کی دنیا میں خونخوار
لڑائیاں ہمیشہ سے سننے بچوں کی محبت کے لازوال مظاہر اور محبوب جی لہجانے کے
حقوں کے ساتھ ساتھ موجود ہی ہیں۔ حیرانی دنیا میں اپنے محبوب جی لہجانے کے
یہ جس وہ ہیں جو خدات کے چہرے کا حسن اور نکھار میں اور انہیں کو ہم کبھی بھولوں کا
زیگ بواکھی عندلیب کا نغمہ کبھی عیسے کی "لی کہاں" کہتے ہیں۔

قدرت کے بھیدوں کے طالب علم کو یہ دیکھ کر غالباً دلی تکلیف پہنچتی ہے کہ ایک
نظاہر پر سکون جنگل میں زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے دونوں ایک نہایت شدید
جنگ جاری رہتی ہے۔ اسے یہ سوچ کر بھی تکلیف ہوتی ہے کہ یہ سفید براق بگڑا ہوا
ڈرتے سوتے کی دوستی میں چپ چاپ مرا تے ہیں۔

..... ایسی ایسی ایک نہایت مضموم

انہ بے گناہ مچھلی کے خوک سے ذرا ہے لیکن قدرت کے بھیدوں کو جاننے والے
اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قدرت کے ان مظاہر میں زندگی کا زبردست جوہر چھپا
ہوا ہے۔ اور یہ نظارہ ایک بہت بڑی تباہی کے بعد نئی زندگی شروع کرتے ہیں۔

جی اٹھنے کی زبردست قوت رکھتے ہیں۔
آج ایک بار پھر یو پ لڑائی کی تباہیوں کا نشانہ بن چکا ہے۔ میونخ کے
عہد نامے کے بعد حالات حافزہ پر نظر رکھنا ہر شخص کو یقین تھا کہ لڑائی ہو کر رہے
گی۔ کیونکہ میونخ کے بعد امن جنگ سے کلا طرح نائل ہو گیا تھا کہ ایک
یا ایک "انگریزوں نے نزدیک عارضی صلح جنگ نہیں زیادہ تباہ کن معنی

اور اب اب یہ حال ہی کہ لڑائی کی آگ بھڑکانے والے امن کے متوالے بن بن
کر دیباگے سامنے آئے ہیں اور دشمنوں نے خود دوسروں پر جارحانہ کارروائیاں کیں

سو چنے کا فن

۷۳۶

آپ نے مغلوب عرفیوں کو "جنگ بازوں" کے لقب سے مطلع کر رہے ہیں۔
 یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا انسان میں پُر امن زندگی بسر کرنے کی جلدی
 آپ میں عارضی طور پر جنگ جوتی کی جبلت نے اپنا زہر کھول دیا ہے؟ اس پر
 منجھ میں سایہ کمال دیا ہے؟ یا اس امن پسندی کو برے سمت کر دیا ہے؟ کیا اسکا
 ہے کہ انسانی تہذیب (انسان کے فنون) اس کے مذاہب انسانی تہذیب کے مترادف ہے
 سائنس کی جدید ترین فتوحات اور زندگی بسر کرنے کے فن۔ کیا یہ جدید انسانی
 جہاد ویر باد ہو جائے گی۔؟

میرا خیال اس دوسرے سوال پر بحث کرنا مناسب ہو گا۔
 آج کی دنیا میں بہت سے لوگ اس حقیقت کا نیا ٹھکانے ہیں کہ جنگ
 بے شمار شہروں کو ہوائی بمباری سے ملیا میٹ کر دیا ہے۔ آج کے اکثر بڑے
 بڑے مفکروں کا خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کی تہذیب مٹ جائے گی۔
 میں ان مفکرین سے اختلاف انسانی حضرت جانتا ہوں۔

یہ طے ہے کہ جنگ جوتی کی جبلت جسے کی جبلت ہی کا وہ راستہ ہے
 یہ بھی ایسا ہے کہ جنگ میں جانے والے کسی بھی شخص نے کبھی جھجھکی جبلت
 ایک علم ترک نہیں کیا۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بچے جانے اور جینے کی جبلت
 جنگ آزمائی کی جبلت سے کہیں زیادہ قوی ہوتی ہے اسکا سادہ بنا یا ممکن ہے
 چونکہ جینے کی جبلت کاٹنا ناممکن ہے اس لئے تہذیب بھی جو زندگی بسر کرنے
 فنون کا مجموعہ ہے) مٹا نہیں جاسکتی لیکن پھر بھی اگر ہم یہ کہیں کہ دنیا
 جدید تہذیب کو مٹا دے گا تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟
 یہ فرود ہے کہ جنگ سے فنون اور سائنسوں (علم و حکمت) کو ہار جائے

زندگی کا مقصد - جیتنا

گی بسر کرنے کی جیت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ سب خیال غالباً کم لوگوں کو آتا ہے۔
 شہر یا نوجوان جو محاذ جنگ پر جانے کے لئے فوج میں بھرتی ہوتا ہے اس کے
 ساتھ ایک نئی دنیا میں نئی مہموں کا مزہ اٹھانے کی جیت اسی طرح موجزن ہوتی
 ہے۔ جس طرح (جنگ جوتی کی جیت کے تحت) لوپ کا لقمہ بن کر نیند سوتے کی
 جیت ہو سکتی ہے۔

کسی محاذ جنگ کے بارے میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سپاہی کو دشمن کے سپاہی
 سے بڑھنے کی خبر سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور اسی مورچے پر کوئی بھولا بھٹکا
 ناپوڑہ پکڑ لینے سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ سپاہی اس کے عین اُلٹ ہے۔ کھلی
 زمین بیکانک دل میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ زندگی ایک زبردست نعمت
 محاذ جنگ جو موت کی خام ارزانی میں اس بات کا اور بھی خیال ہو تا
 زندگی بڑی خوش بڑی بیٹھی چیز ہے۔ خندقوں میں بیٹھ کر انسان دشمن کے
 میں تاریک خیالات کا تانا بانا نہیں بنا کرتا۔ یہ ضرور ہوتا کہ کسی دن نصرت
 یا احساس اُسے اپنی دشمنوں کو ختم کرنے پر تگستا تا بھی ہے۔

خندقوں میں بیٹھ کر ہی ایک دن بیکانک یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام
 چیزیں۔ مثلاً صبح کو کافی کا پیالہ، تازہ اور خوش لوار ہوا، سہ پہر کی سیر، حتیٰ کہ
 تہہ دفتر پہنچنے کے لئے بس پکڑنا اور راہ میں ملنے والے دوستوں سے
 جراتا یہی سب کچھ تہذیب کا تار و پود ہیں۔ کیونکہ یہی سب وہ باتیں ہیں جن
 کی عبارت ہے۔ جنگ وہ چیز ہے جو ہمیں ایسی معمولی چیزوں کی اہمیت
 میں دلاتی ہے جن سے عام طور پر ہم بے خبر رہتے ہیں۔ ذرا جنگ سے واپس
 آئے کسی سپاہی کو کسی عمدہ سیلون میں شیو کراتے دیکھئے وہ اس شیو سے اتنا

سوچنے کا فن

لطف اٹھائے گا کہ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

گویا جینا اور صرف جینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ بات اتنی عیاں اور واضح ہے کہ ہمیں اس کا کبھی خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ پورا من زندگی کے دنوں میں تو ہم اس بات کو مشکوک بھی سمجھتے ہیں اور اس پر اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اخلاقی تدریجوں علم بردار عام طور پر بیکار لیٹے رہنے کو سخت تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مذہبی رہنماؤں کا تو یہ خیال ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے آپ کو تکلیف دینا بہت بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے رہے۔ لیکن محاذ جنگ پر جو سپاہی لڑ رہا ہو اسے ایک نہ ایک دن یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ بستر پر بیکار پڑنے سے رہنا ہنڈیپ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور بستر پر لیٹ کر مزہ کھربنتہ ہو کر لڑائی میں باوردی مرنے سے زندگی کا کہیں زیادہ عمدہ انجام ہے

ختم شد

(سٹوڈنٹس کونسل پریس دہلی)